معارف القرآن

جلد دوم

سورۂ آل عمران و سورۂ نساء

پارہ ۳ رکوع ۹ تا پارہ ۶ رکوع ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف
کراچی ۱۴

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه

ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا

من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له

ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له

ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدًا عبده ورسوله

صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين

معارف القرآن

جلد دوم

سورۂ آل عمران وسورۂ نساء ▫ پارہ:۳، رُکوع:۹ تا پارہ ۶ رُکوع ۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012 موبائل نمبر 0300-3311811

جامع مسجد آرام باغ کراچی

نشانِ مجاریہ: آر۔آر۔او (اوقاف)
R.O. 39-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ''ادارۃ المعارف کراچی'' احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ''معارف القرآن'' مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان، جلد دوم کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمۂ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ''معارف القرآن'' کے مکمل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اَغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ دُرست کروادیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ''معارف القرآن'' حتی الامکان لفظی اور اعرابی اَغلاط سے ان شاء اللہ تعالیٰ پاک ومبرّا ہے۔

نوٹ:۔حکومتِ پاکستان کے قانون کے مطابق کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر 2737 کے تحت تفسیر ''معارف القرآن'' (جلد دوم) کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

المصدق

4-2-2021

GOVERNMENT OF SINDH

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

باہتمام : محمد مشتاق ستی
طبع جدید : محرم ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء ④
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی

عرضِ ناشر:- اگرچہ ''معارف القرآن'' کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ و کتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مطلع فرمائیں۔

ادارۃ المعارف کراچی
احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: 75180
فون: 021-35032020، 021-35123161
موبائل: 0300 - 2831960
ای میل: imaarif@live.com

Idaratul-ma-Arif Karachi-14 Pakistan

دیباچہ طبعِ اوّل

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ ''معارف القرآن'' کی جلد اوّل جس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تفسیر ہے مکمل شائع ہو چکی ہے، اور بحمد اللہ توقع سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جارہی ہے، جس میں سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیات وہی ہیں جن کا ذِکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزوں[۱] کا اِلتزام کیا گیا ہے جو اِن شاء اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوگا۔

ایک تو یہ کہ زیرِ متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دُوسرے یہ کہ ''خلاصۂ تفسیر'' میں اس کا اِلتزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' میں جو شروع میں ''خلاصۂ تفسیر'' مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے اُن کی تشریح اپنی عبارت میں کردی گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ اس ''خلاصۂ تفسیر'' میں حضرتؒ نے یہ اِلتزام کیا ہے کہ ترجمۂ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمے کے اُوپر خط کھینچ کر ممتاز کردیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس ''خلاصۂ تفسیر'' میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامتؒ کا بھی آگیا، اور ضروری تفسیر بھی، اس اِلتزام کے ساتھ ناظرینِ ''معارف القرآن'' کے لئے دو مستند ترجمے مستقل سامنے آجائیں گے، ایک زیرِ متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا، دُوسرا ''خلاصۂ تفسیر'' کے ضمن میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا، باقی خصوصیاتِ تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ۔

بندہ محمد شفیع

دارُالعلوم کراچی نمبر ۱۴

شعبان ۱۳۸۹ھ

---

[۱] دُوسرے ایڈیشن میں جلد اوّل کو بھی ان اُمور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب ''معارف القرآن'' کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (مصحح)

فہرستِ مضامین

سورۂ آلِ عمران تمام شد

❊❊❊

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ

رکوعاتھا ۲۰	۳ سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ ۸۹	اٰیاتھا ۲۰۰

سورۂ آلِ عمران مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں دو سو آیتیں اور بیس رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝١ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝٢ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

الٓمّٓ۔ اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا۔ اُتاری تجھ پر کتاب

بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٣

سچی، تصدیق کرتی ہے اگلی کتابوں کی، اور اُتارا توراۃ اور اِنجیل کو،

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اس کتاب سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے، اور اُتارے فیصلے، بے شک جو منکر ہوئے اللہ کی آیتوں سے

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ

اُن کے واسطے سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا۔ اللہ پر چھپی نہیں

شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ⑤ هُوَالَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ

کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے ماں کے پیٹ میں

كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥

جس طرح چاہے، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، زبردست ہے حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الٓمّٓ ① اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے، ② اس نے تم پر وہ کتاب نازل کی ہے جو حق پر مشتمل ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اور اسی نے توراۃ اور اِنجیل اُتاریں ③ جو اس سے پہلے لوگوں کے لئے مجسم ہدایت بن کر آئی تھیں، اور اسی نے حق و باطل کو پرکھنے کا معیار نازل کیا۔ بیشک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا اِنکار کیا ہے ان کے لئے سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست اقتدار کا مالک اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔ ④ یقین رکھو کہ اللہ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی، نہ زمین میں نہ آسمان میں ⑤ وہی ہے جو ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زبردست اقتدار کا بھی مالک ہے، اعلیٰ درجے کی حکمت کا بھی ⑥

ربطِ آیات

یہ قرآنِ کریم کی تیسری سورت (آلِ عمران) کا پہلا رُکوع ہے، پہلی سورت یعنی فاتحہ جو پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے آخر میں "صراطِ مستقیم" کی ہدایت طلب کی گئی تھی، اس کے بعد سورۂ بقرہ الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے گویا اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ سورۂ فاتحہ میں جو سیدھے راستے کی دُعا کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے قبول کر کے یہ

قرآن بھیج دیا، جو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔ پھر سورۂ بقرہ میں اکثر اَحکامِ شرعیہ کا اِجمالی اور تفصیلی بیان آیا، جس کے ضمن میں جا بجا کفار کی مخالفت اور ان سے مقابلے کا بھی ذِکر آیا۔ آخر میں اس کو فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ کے جملۂ دُعائیہ پر ختم کیا گیا تھا، جس کا حاصل تھا کفار پر غلبہ پانے کی دُعا، اس کی مناسبت سے سورۂ آلِ عمران میں عام طور پر کفار کے ساتھ معاملات اور ہاتھ اور زبان سے ان کے مقابلے میں جہاد کا بیان ہے، جو گویا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ کی تشریح و تفصیل ہے۔

خلاصۂ تفسیر

سورۂ آلِ عمران کی اِبتدائی پانچ آیتوں میں اس مقصدِ عظیم کا ذِکر ہے، جس کی وجہ سے کفر و اِسلام اور کافر و مؤمن کی تقسیم اور باہمی مقابلہ شروع ہوتا ہے، اور وہ اللہ جل شانہٗ کی توحید ہے، اس کے ماننے والے مؤمن اور نہ ماننے والے کافر و غیر مسلم کہلاتے ہیں، اس رُکوع میں پہلی آیت میں توحید کی عقلی دلیل مذکور ہے، اور دُوسری آیت میں نقلی دلیل بیان فرمائی گئی ہے، اس کے بعد کی آیت میں کفار کے کچھ شبہات کا جواب ہے۔

پہلی آیت میں اِرشاد ہے: الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ اس میں لفظ "الٓمّٓ" تو متشابہاتِ قرآنیہ میں سے ہے، جس کے معنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہیں، جس کی تفصیل اس رُکوع کی آخری آیتوں میں آتی ہے، اس کے بعد اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ میں مضمونِ توحید کو ایک دعوے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ اُن کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں۔

اس کے بعد لفظ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ سے توحید کی عقلی دلیل بیان کی گئی، جس کی تشریح یہ ہے کہ عبادت نام ہے اپنے آپ کو کسی کے سامنے اِنتہائی عاجز و ذلیل کر کے پیش کرنے کا، اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس کی عبادت کی جائے وہ عزّت و جبروت کے اِنتہائی مقام کا مالک اور ہر اِعتبار سے کامل ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے، اپنے وجود اور اس کی بقاء میں دُوسرے کی محتاج ہو، اس کا عزّت و جبروت میں کیا مقام ہوسکتا ہے، اس لئے بالکل واضح ہوگیا کہ دُنیا میں جتنی چیزیں ہیں، نہ خود اپنے وجود کی مالک ہیں اور نہ ہی اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں یا پانی اور درخت ہوں یا فرشتے اور پیغمبر ہوں، ان میں کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں، لائقِ عبادت وہی ذات ہوسکتی ہے جو ہمیشہ سے زندہ موجود ہے اور ہمیشہ زندہ و قائم رہے گی، اور وہ صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

اس کے بعد دُوسری آیت میں توحید کی نقلی دلیل بیان فرمائی گئی، اِرشاد ہے: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی توحید کا مضمون جو قرآن نے بیان کیا ہے یہ کچھ قرآن کی یا پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی توراۃ وانجیل وغیرہ کتابیں اور انبیاء اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب کا یہی دعویٰ اور یہی کلمہ تھا، قرآن مجید نے آکر ان سب کی تصدیق کی ہے، کوئی نیا دعویٰ پیش نہیں کیا، جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی اُلجھن ہو۔

آخری دو آیتوں میں توحید کی دلیل کا تکملہ حق تعالیٰ کی صفات علم وقدرت کے بیان سے کیا گیا ہے، کہ جو ذات علمِ محیط اَزَلی کی مالک ہے، اور جس کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے، وہی اس کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، ناقص علم اور محدود قدرت والے کو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:-

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں، اور وہ زندہ (جاوید) ہیں، سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے ہوچکی ہیں اور (اسی طرح) بھیجا تھا توراۃ اور اِنجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے (اور اسی سے قرآن کا ہدایت ہونا بھی لازم آگیا، کیونکہ ہدایت کا مصدّق بھی ہدایت ہے) اور اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کی تصدیق کے واسطے) بھیجے معجزات، بے شک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے (جو توحید پر دلالت کرتی ہیں) ان کے لئے سزا سخت ہے، اور اللہ تعالیٰ غلبہ (اور قدرت) والے ہیں (کہ بدلہ لے سکتے ہیں اور) بدلہ لینے والے (بھی) ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے (نہ کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں (پس ان کا علم بھی نہایت کامل ہے) وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمہاری صورت (وشکل) بناتا ہے ارحام میں، جس طرح چاہتا ہے (کسی کی کیسی صورت اور کسی کی کیسی صورت، پس ان کی قدرت بھی کامل ہے، حیات اور قیومیت اور علم اور قدرت جو اُمہاتِ صفات سے ہیں ان میں کامل طور سے بلاشرکت موجود ہیں جس سے ثابت ہوا کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں، بجز اس (ذاتِ پاک) کے (اور) وہ غلبہ والے ہیں (منکرِ توحید سے اِنتقام لے سکتے ہیں لیکن) حکمت والے (بھی) ہیں (کہ بمصلحت دُنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے)۔

معارف و مسائل

توحید کی طرف دعوت تمام انبیاء کا وظیفہ رہا ہے

دُوسری آیت میں جو نقلی دلیل توحید کی پیش کی گئی ہے، تشریح اس کی یہ ہے کہ جس بات پر بہت سے انسان متفق ہوں، خصوصاً جبکہ وہ مختلف ملکوں کے باشندے اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، اور درمیان میں سینکڑوں ہزاروں برس کا فاصلہ، اور ایک کی بات دُوسرے تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس کے باوجود جو اُٹھتا ہے وہی ایک بات کہتا ہے جو پہلے لوگوں نے کہی تھی، اور سب کے سب ایک ہی بات اور ایک ہی عقیدہ کے پابند ہوتے ہیں، تو فطرت اس کے قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کی توحید کا مضمون اِنسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام لے کر آئے اور ان کے بعد ان کی اولاد میں تو مسلسل اس بات کا چلنا کچھ بعید نہ تھا، لیکن زمانۂ دراز گزر جانے اور اولادِ آدم کے وہ تمام طریقے بدل جانے کے بعد پھر حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں، اس چیز کی دعوت دیتے ہیں جس کی طرف آدم علیہ السلام نے لوگوں کو بلایا تھا، اُن کے زمانۂ دراز گزرنے کے بعد اِبراہیم، اِسماعیل، اِسحاق اور یعقوب علیہم السلام ملکِ عراق وشام میں پیدا ہوتے ہیں، اور ٹھیک وہی دعوت لے کر اُٹھتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے سلسلے کے انبیاء آتے ہیں، اور سب کے سب وہی ایک کلمۂ توحید بولتے ہیں، اور وہی دعوت دیتے ہیں، ان پر زمانۂ دراز گزر جانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام وہی دعوت لے کر اُٹھتے ہیں، اور آخر میں سیّد الانبیاء سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی دعوت لے کر تشریف لاتے ہیں۔

اب اگر ایک خالی الذہن اِنسان جس کو اِسلام اور توحید کی دعوت سے کوئی بغض اور بیر نہ ہو، سادگی کے ساتھ ذرا اس سلسلے پر نظر ڈالے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مختلف زمانوں میں، مختلف زبانوں میں، مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے، اور سب کے سب یہی کہتے اور بتلاتے چلے آئے، اکثر ایک کو دُوسرے کے ساتھ ملنے کا بھی اِتفاق نہیں ہوا، زمانہ تصنیف وتألیف اور کتابت کا بھی نہ تھا، کہ ایک پیغمبر کو دُوسرے پیغمبر کی کتابیں اور تحریریں مل جاتی ہوں، اُن کو دیکھ کر وہ اس دعوت کو اَپنا لیتے ہوں، بلکہ انہی میں ہر ایک دُوسرے سے بہت قرنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے، اس کو اَسبابِ دُنیا کے تحت پچھلے انبیاء کی کوئی خبر نہیں ہوتی، البتہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پاکر ان سب کے حالات وکیفیات سے مطلع ہوتا ہے، اور خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کو اس دعوت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔

اب کوئی آدمی ذرا سا اِنصاف کے ساتھ غور کرے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار اِنسان مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ایک ہی بات کو بیان کریں تو قطع نظر اس سے کہ بیان کرنے والے ثقہ اور معتبر لوگ ہیں یا نہیں، اتنی عظیم الشان جماعت کا ایک ہی بات پر متفق ہونا ایک اِنسان کے لئے اس بات کی تصدیق کے واسطے کافی ہو جاتا ہے، اور جب انبیاء علیہم السلام کی ذاتی خصوصیات اور ان کے صدق و عدل کے اِنتہائی بلند معیار پر نظر ڈالی جائے تو ایک اِنسان یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا کلمہ صحیح اور ان کی دعوت حق اور فلاحِ دُنیا و آخرت ہے۔

شروع کی دو آیتوں میں جو مضمون توحید کا اِرشاد فرمایا گیا اس کے متعلق حدیث کی روایات میں ہے کہ بعض نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے مذہبی گفتگو جاری ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہٗ کی توحید کے ثبوت میں یہی دو دلیلیں باذنِ خداوندی پیش فرمائیں، جن سے نصاریٰ لاجواب ہوئے۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیتوں میں بھی اسی مضمونِ توحید کی تکمیل ہے، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کا بیان ہے، جس سے کسی جہان کا کوئی ذرّہ چھپا ہوا نہیں۔

اور چوتھی آیت میں اس کی قدرتِ کاملہ اور قادرِ مطلق ہونے کا بیان ہے، کہ اس نے انسان کو بطنِ مادر کی تین اندھیریوں میں کیسی حکمتِ بالغہ کے ساتھ بنایا، اور ان کی صورتوں اور رنگوں میں وہ صنعت کاری فرمائی کہ اربوں اِنسانوں میں ایک کی صورت دُوسرے سے ایسی نہیں ملتی کہ اِمتیاز نہ رہے، اس علم محیط اور قدرتِ کاملہ کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، اس کے سوا سب کے سب علم و قدرت میں یہ مقام نہیں رکھتے، اس لئے وہ لائقِ عبادت نہیں۔

اس طرح توحید کے اِثبات کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ کی چار اہم صفات ان چار آیتوں میں آ گئیں، پہلی اور دُوسری آیت میں صفات حیاتِ اَزَلی و اَبدی اور قیومیّت کا بیان ہوا، تیسری سے چھٹی آیت تک علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ مطلقہ کا، اس سے ثابت ہوا کہ جو ذات ان چار صفات کی جامع ہو، وہی عبادت کے لائق ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ

وہی ہے جس نے اُتاری تجھ پر کتاب، اس میں بعض آیتیں ہیں محکم، یعنی ان کے معنی واضح ہیں، وہ اصل ہیں کتاب کی،

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ

اور دُوسری ہیں متشابہ، یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں، سو جن کے دِلوں میں کجی ہے، وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی

مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ

گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے، اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے،

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ

اور مضمون علم والے کہتے ہیں: ہم اس پر یقین لائے، سب ہمارے ربّ کی طرف سے اُتری ہیں، اور سمجھانے سے

اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷

وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے رسول!) وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس کی کچھ آیتیں تو محکم ہیں جن پر کتاب کی اصل بنیاد ہے، اور کچھ دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ اب جن لوگوں کے دِلوں میں ٹیڑھ ہے وہ ان متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تا کہ فتنہ پیدا کریں اور ان آیتوں کی تأویلات تلاش کریں، حالانکہ ان آیتوں کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جن لوگوں کا علم پختہ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ہم اس (مطلب) پر ایمان لاتے ہیں (جو اللہ کو معلوم ہے)۔ سب کچھ ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہے۔" اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ۝۷

ربطِ آیات

پچھلی چار آیتوں میں توحید باری تعالیٰ کا اِثبات تھا، اس آیت میں توحید کے خلاف بعض شبہات کا جواب ہے، واقعہ اس کا یہ ہے کہ ایک دفعہ نجران کے کچھ نصاریٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مذہبی گفتگو شروع کی، آپ نے نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث کی تردید بڑی تفصیل سے فرما کر توحیدِ باری تعالیٰ کو ثابت کیا، آپ نے اپنے دعوے پر اللہ تعالیٰ کی صفات حیاتِ دائمہ، قدرتِ کاملہ، علمِ محیط اور قدرتِ تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے یکتا اور منفرد ہونے سے اِستدلال کیا، اور یہ سب مقدمات نصاریٰ کو تسلیم کرنا پڑے، جب توحید ثابت ہوگئی تو اسی سے تثلیث کے عقیدے کا بطلان بھی ثابت ہوگیا، ان لوگوں نے قرآن کے ان الفاظ پر اپنے کچھ شبہات پیش کئے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کا رُوح اللہ یا کلمۃ اللہ ہونا

مذکور ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شرکتِ الٰہیہ ثابت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان شبہات کو ختم کر دیا کہ یہ کلمات متشابہات ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہیں، جن کی حقیقت پر عوام مطلع نہیں ہو سکتے، عوام کے لئے ان الفاظ کی تحقیق میں پڑنا بھی رَوا نہیں، ان پر اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ جو کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے، مزید تفتیش اور کھود کرید کرنے کی اِجازت نہیں ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو، جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اِشتباہِ مراد سے محفوظ ہیں، (یعنی اُن کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں، (اس) کتاب (یعنی قرآن) کا (یعنی جن کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو بھی ظاہر المعنی کے موافق بنایا جاتا ہے) اور دُوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں (یعنی ان کا مطلب خفی ہے، خواہ مجمل ہونے کی وجہ سے، خواہ کسی نص ظاہر المراد کے ساتھ معارض ہونے کی وجہ سے) سو جن لوگوں کے دِلوں میں کجی ہے وہ تو اس کے اسی حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے، (دِین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد) کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدے میں اس سے مطلب حاصل کریں) حالانکہ اس کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا (یا اگر وہ خود قرآن یا حدیث کے ذریعے سے صراحۃً یا اِشارۃً بتلا دیں، جیسے لفظ ''صلوٰۃ'' کی مراد صراحۃً معلوم ہوگئی، اور اِستواء علی العرش وغیرہ کی تأویل بعض کی رائے پر قواعدِ کلیہ سے معلوم ہوگئی، تو بس اسی قدر دُوسروں کو بھی خبر ہو سکتی ہے، زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا، جیسے مقطّعاتِ قرآنیہ کے الف لام میم وغیرہ کے معنی کسی کو معلوم نہیں ہوئے، اور بعض کی رائے پر اِستواء علی العرش کے معنی بھی معلوم نہیں ہوئے) اور (اسی واسطے) جو لوگ علمِ (دِین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں سب (آیتیں ظاہر المعنی بھی، خفی المعنی بھی) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں، (پس ان کے جو کچھ معنی اور مراد واقع میں ہوں وہ حق ہیں) اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہلِ عقل ہیں (یعنی عقل کا مقتضا بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو، مضر اور فضول قصے میں نہ لگے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آیاتِ محکمات اور متشابہات کا ذِکر فرما کر ایک عام اُصول اور ضابطے کی طرف اِشارہ

کر دیا ہے، جس کے سمجھ لینے کے بعد بہت سے شبہات اور نزاعات ختم ہو سکتے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں، ایک قسم کو ''محکمات'' کہتے ہیں، اور دُوسری کو ''متشابہات''۔

''محکمات'' ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر اور بین ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو، اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں ان کو ''متشابہات'' کہتے ہیں۔ (مظہری)[1]

پہلی قسم کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے ''اُمّ الکتاب'' کہا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری تعلیمات کا اصل اُصول یہی آیات ہوتی ہیں، جن کے معانی اور مفاہیم اشتباہ والتباس سے پاک ہوتے ہیں۔

اور دُوسری قسم کی آیات میں چونکہ متکلم کی مراد مبہم اور غیر متعین ہوتی ہے اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہئے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات ''محکمات'' کے مخالف نہ ہو، اور کوئی ایسی تأویل اور توجیہ صحیح نہ سمجھی جائے گی جو اُصولِ مسلّمہ اور آیاتِ محکمہ کے مخالف ہو، مثلاً قرآنِ حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کر دی کہ ''اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ'' (الزخرف:۵۹) ایسے ہی دُوسری جگہ اِرشاد ہے ''اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ'' (آلِ عمران:۵۹)

ان آیات اور انہی کی مثل دُوسری بہت سی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کی مخلوق ہیں، لہٰذا نصاریٰ کا ان کے بارے میں اُلوہیت اور ابنیّت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔

اب اگر کوئی شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے صرف ''کلمۃ اللہ'' اور ''رُوح منہ'' وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنی لینے لگے جو محکماتِ قرآنیہ اور متواتر بیانات کے منافی ہوں تو یہ اس کی کج رَوِی اور ہٹ دھرمی ہو جائے گی۔

کیونکہ متشابہات کی صحیح مراد صرف اللہ ہی کو معلوم ہے، وہی اپنے کرم و اِحسان سے جس کو جس قدر حصے پر آگاہ کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے، لہٰذا ایسے متشابہات سے اپنی رائے کے مطابق کھینچ تان کر کوئی معنی نکالنا صحیح نہیں ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہوتے ہیں، وہ متشابہات کے بارے میں زیادہ تحقیق و تفتیش نہیں کرتے، بلکہ اِجمالاً ایسی آیات پر اِیمان لے آتے ہیں کہ یہ بھی اللہ کا برحق کلام ہے، اگرچہ اس نے کسی مصلحت کی وجہ سے ہم کو ان کے معانی پر مطلع نہیں فرمایا، درحقیقت یہی طریقہ سلامتی اور اِحتیاط کا ہے، اس کے برخلاف بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دِلوں میں کجی ہے، وہ محکمات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کی کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں، اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق معانی نکال کر لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش

[1] تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۷

کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں جو متشابہات کی تفتیش میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ان سے دُور بھاگیں، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذِکر اللہ تعالیٰ نے (قرآن) میں کیا ہے۔ (بخاری ج:۲) [۱]

ایک دُوسری حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ مجھے اپنی اُمت پر تین باتوں کا خوف ہے، اوّل یہ کہ مال بہت مل جائے، جس کی وجہ سے باہمی حسد میں مبتلا ہو جائیں اور کشت وخون کرنے لگیں، دُوسری یہ کہ کتابُ اللہ سامنے کھل جائے (یعنی ترجمے کے ذریعے ہر عامی اور جاہل بھی اس کے سمجھنے کا مدعی ہو جائے) اور اس میں جو باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں یعنی متشابہات ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں، حالانکہ ان کا مطلب اللہ ہی جانتا ہے، تیسری یہ کہ اُن کا علم بڑھ جائے تو اُسے ضائع کردیں اور علم کو بڑھانے کی جستجو چھوڑ دیں۔ (ابن کثیر بحوالۂ طبرانی) [۲]

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ راسخون فی العلم سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، جو قرآن وسنت کی اسی تعبیر وتشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ اور اِجماعِ اُمت سے منقول ہو، اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز محکمات کو مانتے ہیں، اور متشابہات کے جو معانی ان کے فہم واِدراک سے باہر ہیں، اپنی کوتاہ نظری اور قصورِ علمی کا اِعتراف کرتے ہوئے ان کو خدا کے سپرد کرتے ہیں، وہ اپنے کمالِ علمی اور قوتِ اِیمانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے اِستقامت اور مزید فضل وعنایت کے طلب گار رہتے ہیں، ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات ہی کے پیچھے لگی رہیں، وہ محکمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمے سے آئی ہیں، البتہ ایک قسم یعنی محکمات کے معانی ہمارے لئے معلوم کرنے مفید اور ضروری تھے، تو اللہ تعالیٰ نے وہ پوشیدہ نہیں رکھے، بلکہ کھول کھول کر بیان کردیئے، اور دُوسری قسم یعنی متشابہات کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بیان نہیں فرمائے، لہٰذا ان کا معلوم کرنا بھی ہمارے لئے ضروری نہیں، ایسی آیات پر اِیمان اِجمالاً لے آنا ہی کافی ہے۔ (مظہری ملخصاً) [۳]

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

اے رَبّ! نہ پھیر ہمارے دِلوں کو جب تو ہم کو ہدایت کرچکا، اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس سے رحمت،

[۱] صحیح البخاري، كتاب التفسير، باب منه آيات محكمات ج:۲ ص:۶۵۲

[۲] المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث: ۳۳۶۴

[۳] تفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۱

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

تو ہی ہے سب کچھ دینے والا۔ اے رَبّ ہمارے! تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دِن جس میں کچھ شبہ نہیں،

ع ۹

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾ ع

بے شک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

(ایسے لوگ یہ دُعا کرتے ہیں کہ:) ''اے ہمارے رَبّ! تو نے ہمیں جو ہدایت عطا فرمائی ہے اس کے بعد ہمارے دِلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ ہونے دے، اور خاص اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ بیشک تیری، اور صرف تیری ذات وہ ہے جو بے انتہا بخشش کی خوگر ہے ﴿۸﴾ ہمارے پروردگار! تو تمام انسانوں کو ایک ایسے دن جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔'' بیشک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ﴿۹﴾

ربطِ آیات

پچھلی آیت میں حق پرستوں کے ایک کمال کا ذِکر تھا کہ وہ باوجود علمی کمال رکھنے کے اس پر مغرور نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اِستقامت کی دُعا کرتے تھے، اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ اُن کے دُوسرے کمال کو بیان فرما رہے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ہمارے پروردگار! ہمارے دِلوں کو کج نہ کیجئے، بعد اس کے کہ آپ ہم کو (حق کی طرف) ہدایت کرچکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے (وہ رحمت یہ ہے کہ راہِ مستقیم پر قائم رہیں) بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! (ہم یہ دُعا کجی سے بچنے کی اور حق پر قائم رہنے کی کسی دُنیاوی غرض سے نہیں مانگتے، بلکہ محض آخرت کی نجات کے واسطے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ) آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدانِ حشر میں) جمع کرنے والے ہیں، اس دن میں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں (یعنی قیامت کے دن میں اور شک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف نہیں کرتے وعدے کو (اس لئے قیامت کا آنا

ضرور ہے اور اس واسطے ہم کو اس کی فکر ہے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت اللہ ہی کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے دِل کو نیکی کی جانب مائل کر دیتے ہیں، اور جس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کے دِل کو سیدھے راستے سے پھیر لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "کوئی دِل ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی اُنگلیوں میں سے دو اُنگلیوں کے درمیان نہ ہو، وہ جب تک چاہتے ہیں اس کو حق پر قائم رکھتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں اس کو حق سے پھیر دیتے ہیں۔"[1]

وہ قادرِ مطلق ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو دِین پر قائم رہنے کی فکر ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اپنے اللہ سے اِستقامت کی دُعا مانگتے ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اِستقامت کی دُعا مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِكَ"[2] یعنی "اے دِلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دِلوں کو اپنے دِین پر قائم رکھ۔" (مظہری ج:۲)[3]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ

بے شک جو لوگ کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے سامنے

شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ

کچھ، اور وہی ہیں ایندھن دوزخ کے۔ جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو

قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ

اُن سے پہلے تھے، جھٹلایا اُنہوں نے ہماری آیتوں کو پھر پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر، اور اللہ

۱ سنن ابن ماجة، باب فيما انكرت الجهمية ج:۱ ص:۱۸

۲ مسند احمد، حديث النواس بن سمعان رقم الحديث: ۱۶۹۷۲

۳ تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۳

شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ⑪ قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ

کا عذاب سخت ہے۔ کہہ دے کافروں کو کہ اب تم مغلوب ہوگے اور ہانکے جاؤگے

اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ⑫

دوزخ کی طرف، اور کیا بُرا ٹھکانا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر اَپنالیا ہے، اللہ کے مقابلے میں نہ ان کی دولت ان کے کچھ کام آئے گی، نہ ان کی اولاد، اور وہی ہیں جو آگ کا ایندھن بن کر رہیں گے ⑩ ان کا حال فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے معاملے جیسا ہے۔ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، چنانچہ اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لے لیا، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ⑪ جن لوگوں نے کفر اَپنالیا ہے ان سے کہہ دو کہ تم مغلوب ہوگے اور تمہیں جمع کر کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، اور وہ بہت بُرا بچھونا ہے۔ ⑫

خلاصۂ تفسیر

بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں ہرگز ان کے کام نہیں آسکتے، اُن کے مال (دولت) اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرّہ برابر بھی، ایسے لوگ جہنم کا اِیندھن ہوں گے۔ (ان لوگوں کا معاملہ ایسا ہے) جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے (کافر) لوگوں کا، (وہ معاملہ یہ تھا) کہ اُنہوں نے ہماری آیتوں کو (یعنی اَخبار واَحکام کو) جھوٹا بتلایا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر داروگیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب، اور اللہ تعالیٰ (کی داروگیر بڑی سخت ہے، کیونکہ ان کی شان یہ ہے کہ وہ) سخت سزا دینے والے ہیں۔ (اسی طرح معاملہ ہوگا کہ اُنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی، سو ان کو بھی ایسی ہی سزا ہوگی اور) ان کفر کرنے والے لوگوں سے (یوں بھی) فرمادیجئے کہ (تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ داروگیر صرف آخرت میں ہوگی، بلکہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہوگی، چنانچہ دُنیا میں) عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کئے جاؤگے، اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤگے اور (جہنم) ہے بُرا ٹھکانا۔

معارف ومسائل

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ، ممکن ہے کوئی اس آیت سے یہ شبہ کرے کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مغلوب ہوں گے، حالانکہ سب کفار دُنیا کے مغلوب نہیں ہیں، لیکن یہ شبہ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ یہاں کفار سے مراد تمام دُنیا بھر کے کفار نہیں ہیں، بلکہ اس وقت کے مشرکین اور یہود مراد ہیں، چنانچہ مشرکین کو قتل وقید اور یہود کو قتل وقید کے ساتھ ساتھ جزیہ اور جلاوطنی کے ذریعے مغلوب کیا گیا تھا۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

ابھی گزر چکا ہے تمہارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں میں جن میں مقابلہ ہوا، ایک فوج ہے جو لڑتی ہے اللہ کی راہ میں

وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ

اور دُوسری فوج کافروں کی ہے، دیکھتے ہیں یہ ان کو اپنے سے دوچند صریح آنکھوں سے، اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳

جس کو چاہے، اسی میں عبرت ہے دیکھنے والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

تمہارے لئے ان دو گروہوں (کے واقعے) میں بڑی نشانی ہے جو ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جو اپنے آپ کو کھلی آنکھوں ان سے کئی گنا زیادہ دیکھ رہا تھا۔ اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے۔ بیشک اس واقعے میں آنکھوں والوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان ہے۔ ۝۱۳

ربطِ آیات

پچھلی آیت میں کفار کے مغلوب ہونے کی خبر دی گئی تھی، اب اس آیت سے اس کی ایک مثال بطور دلیل کے بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک تمہارے (استدلال کے) لئے بڑا نمونہ ہے دو گروہوں (کے واقعے) میں جو کہ باہم (بدر کی لڑائی میں) ایک دُوسرے سے مقابل ہوئے تھے، ایک گروہ تو (یعنی مسلمان) اللہ کی راہ میں لڑتے تھے اور دُوسرا گروہ کافر لوگ تھے (اور کافر اس قدر زیادہ تھے کہ) یہ کافر اپنے (گروہ) کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصے (زیادہ) ہیں (اور دیکھنا بھی کچھ وہم وخیال کا نہیں بلکہ) کھلی آنکھوں دیکھنا (جس کے واقعی ہونے میں شبہ نہیں تھا، لیکن کفار کے باوجود اس قدر زیادہ عدد ہونے کے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا) اور (غالب اور مغلوب کرنا محض قبضۂ خداوندی میں ہے) اللہ تعالیٰ اپنی اِمداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دے دیتے ہیں (سو) بلاشک اس (واقعے) میں بڑی عبرت ہے (اور نمونہ) ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

معارف ومسائل

اس آیت میں جنگِ بدر کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، جس میں کفار تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس سات سو اُونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے، دُوسری طرف مسلمان مجاہدین تین سو سے کچھ اُوپر تھے، جن کے پاس کل ستر اُونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں، اور تماشا یہ تھا کہ ہر ایک فریق کو حریفِ مقابل اپنے سے دوگنا نظر آتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کفار کے دِل مسلمانوں کی کثرت کا تصوّر کر کے مرعوب ہو رہے تھے، اور مسلمان اپنے سے دُگنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے، اور کامل توکل و اِستقلال سے خدا کے وعدہ "فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ" (الانفال:۶۶) پر اِعتماد کر کے فتح ونصرت کی اُمید رکھتے تھے، اگر ان کی پوری تعداد جو تین گنی تھی منکشف ہو جاتی تو ممکن تھا خوف طاری ہو جاتا۔ اور یہ فریقین کا دُگنی تعداد دیکھنا بعض احوال میں تھا، ورنہ بعض احوال وہ تھے جب ہر ایک کو دُوسرے فریق کی جمعیت کم محسوس ہوئی، جیسا کہ سورۂ اَنفال میں آئے گا۔

بہرحال ایک قلیل اور بے سروسامان جماعت کو ایسی مضبوط جمعیت کے مقابلے میں ان پیشین گوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں اس طرح کامیاب کرنا، آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرتناک واقعہ ہے۔ (فوائد علامہ عثمانیؒ) [1]

[1] تفسیر عثمانی تحت هذه الآية ج:۱ ص:۱۷۷

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ

سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور مویشی اور کھیتی، یہ

مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ

فائدہ اُٹھانا ہے دُنیا کی زندگی میں، اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانا۔ کہہ دے: کیا بتاؤں میں تم کو

بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اس سے بہتر؟ پرہیزگاروں کے لئے اپنے رَبّ کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

نہریں جاری ہیں ہمیشہ رہیں گے اُن میں، اور عورتیں ہیں ستھری اور رضامندی اللہ کی، اور اللہ کی نگاہ میں ہیں

بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا

بندے۔ وہ جو کہتے ہیں: اے رَبّ ہمارے! ہم اِیمان لائے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو

عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ

دوزخ کے عذاب سے۔ اور صبر کرنے والے ہیں اور سچے اور حکم بجالانے والے اور خرچ کرنے والے

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگوں کے لئے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں، یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دُنیوی زندگی کا سامان ہے (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔ ⑭ کہہ دو! کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتاؤں جو ان سب سے کہیں بہتر ہیں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور پاکیزہ بیویاں ہیں، اور اللہ کی طرف سے خوشنودی ہے۔ اور تمام بندوں کو اللہ اچھی طرح دیکھ رہا ہے ⑮ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ: "اے ہمارے پروردگار! ہم آپ پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب ہمارے گناہوں کو بخش دیجئے، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے۔" ⑯ یہ لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں، سچائی کے خوگر ہیں، عبادت گزار ہیں، (اللہ کی خوشنودی کے لئے) خرچ کرنے والے ہیں، اور سحری کے اوقات میں اِستغفار کرتے رہتے ہیں۔ ⑰

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

پہلی آیتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور ان کے مقابلے میں جہاد کا ذِکر تھا، اور ان آیات میں اسلام و ایمان کی مخالفت اور تمام بداعمالیوں کی اصل منشا کو بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ حبِ دُنیا ہے، کوئی جاہ و مال کے لالچ میں حق کی مخالفت اِختیار کرتا ہے، کوئی نفسانی خواہشات کی وجہ سے، اور کوئی اپنی آبائی رُسوم کی محبت کے سبب حق کے مقابلے پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور ان ساری چیزوں کا خلاصہ ہے حبِ دُنیا۔ مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:-

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، (یا دُوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب اِستعمال کی چیزیں ہیں دُنیوی زندگانی کی اور اَنجامِ کار کی خوبی (کی چیز) تو اللہ ہی کے پاس ہے (جو بعد موت کے کام آوے گی جس کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے) آپ (ان لوگوں سے یہ) فرما دیجئے: کیا میں تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان (مذکورہ) چیزوں سے؟ (سو سنو) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے باغ ہیں (یعنی بہشت) جن کی پائین میں نہریں جاری ہیں ان (بہشتوں) میں ہمیشہ

ہمیشہ کو رہیں گے، (اوران کے لئے) ایسی بیبیاں ہیں جو (ہر طرح) صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لئے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے (بھالتے) ہیں بندوں (کے حال) کو (اس لئے ڈرنے والوں کو یہ نعمتیں دیں گے، آگے ان ڈرنے والوں کی بعضی تفصیلی صفات ذِکر کی جاتی ہیں) (یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچا لیجئے (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور (اللہ تعالیٰ کے سامنے) فروتنی کرنے والے ہیں اور (نیک کاموں میں مال کے) خرچ کرنے والے ہیں اور اخیر شب میں (اُٹھ اُٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

معارف ومسائل

دُنیا کی محبت فطری ہے، مگراس میں غلو مہلک ہے

حدیث میں اِرشاد ہے: "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ"[1] یعنی "دُنیا کی محبت ہر بُرائی کا سرچشمہ ہے۔"

پہلی آیت میں دُنیا کی چند اہم مرغوب چیزوں کا نام لے کر بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوش نما بنادی گئی ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں، جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر اِنسانی رغبت ومحبت کا مرکز ہیں، جن میں سب سے پہلے عورت کو اور اس کے بعد اولاد کو بیان کیا گیا ہے، کیونکہ دُنیا میں انسان جتنی چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، ان سب کا اصلی سبب عورت یا اولاد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد سونے چاندی اور مویشی اور کھیتی کا ذِکر ہے، کہ یہ دُوسرے نمبر میں اِنسان کی رغبت ومحبت کا مرکز ہوتے ہیں۔

خلاصہ ومطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر اِنسان کے دِلوں میں ڈال دی ہے، جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر اِنسان طبعی طور پر ان چیزوں کی طرف مائل اور ان سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دُنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، کسی کو کیا غرض تھی کہ کھیتی کرنے کی مشقت اُٹھاتا، یا مزدوری وصنعت کی محنت برداشت کرتا، یا تجارت میں اپنا روپیہ اور محنت صَرف کرتا، دُنیا کی آبادی اور بقا اس میں مضمر تھی کہ لوگوں کی طبائع میں ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی جائے جس سے وہ خود بخود ان چیزوں کے مہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں پڑ جائیں، صبح اُٹھ کر مزدور اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ کچھ پیسے کمائے، مال دار اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ پیسے خرچ کر کے کوئی مزدور لائے جس سے اپنا کام نکالے، تاجر بہتر سے بہتر سامان مہیا کر کے گاہک کے اِنتظار میں بیٹھتا ہے کہ

[1] المشكوٰة، الفصل الثالث، رقم الحديث: ۵۲۱۱

پیسے حاصل کرے گا، گاہک سو کوششیں کر کے پیسے لے کر بازار پہنچتا ہے کہ اپنی ضروریات کا سامان خریدے، غور کیا جائے تو سب کو دُنیا کی انہیں مرغوبات کی محبت نے اپنے اپنے گھر سے نکالا، اور دُنیا کے تمدنی نظام کو نہایت مضبوط و مستحکم اُصول پر قائم کر دیا ہے۔

دُوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر دُنیوی نعمتوں سے رغبت و محبت اِنسان کے دِل میں نہ ہو تو اس کو اُخروی نعمتوں کا نہ ذائقہ معلوم ہوگا، نہ اُن میں رغبت ہوگی، تو پھر اس کو کیا ضرورت کہ وہ نیک اعمال کی کوشش کر کے جنت حاصل کرے، اور بُرے اعمال سے پرہیز کر کے دوزخ سے بچے۔

تیسری حکمت اور وہی اس جگہ زیادہ قابلِ نظر ہے یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر اِنسان کے دِل میں پیدا کر کے انسان کا اِمتحان لیا جائے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتا ہے، اور کون ہے جو ان چیزوں کی اصل حقیقت اور ان کے آنی فانی ہونے پر مطلع ہو کر ان کی فکر بقدرِ ضرورت کرے، اور ان کو آخرت کی دُرستی کے کام میں لگائے، قرآن مجید کے ایک دُوسرے مقام میں خود اس تزیین کی یہی حکمت بتلائی گئی ہے، اِرشاد ہے:-

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۞ (الکہف)

"یعنی ہم نے بنایا جو زمین پر ہیں زمین کی زینت، تا کہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ دُنیا کی ان مرغوب چیزوں کو اِنسان کے لئے مزین کر دینا بھی ایک فعلِ خداوندی ہے، جو بہت سی حکمتوں پر مبنی ہے، اور بعض آیات جن میں اس قسم کی تزیین کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" (الانفال:۴۸) ان میں ایسی چیزوں کی تزیین مراد ہے جو شرعاً اور عقلاً بُری ہیں، یا تزیین کا وہ درجہ مراد ہے جو حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے بُرا ہے، ورنہ مباحات کو مزین کر دینا مطلقاً بُرا نہیں، بلکہ اس میں بہت سے فوائد بھی ہیں، اسی لئے بعض آیات میں اس تزیین کو صراحۃً حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے ابھی بیان کیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دُنیا کی لذیذ اور مرغوب چیزوں کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و حکمت سے اِنسان کے لئے مزین فرما کر ان کی محبت اس کے دِل میں ڈال دی، جس میں بہت سی حکمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا اِمتحان لیا جائے کہ ان سرسری اور ظاہری مرغوبات اور اس کی چندروزہ لذّت میں مبتلا ہونے کے بعد وہ اپنے اور ان سب چیزوں کے رَبّ اور خالق و مالک کو یاد رکھتا ہے، اور ان چیزوں کو اس کی معرفت اور محبت کا ذریعہ بناتا ہے یا انہی کی محبت میں اُلجھ کر اصلی مالک و خالق کو اور آخرت میں اس کے سامنے پیشی اور حساب و کتاب کو بھلا بیٹھتا ہے، پہلا آدمی وہ ہے جس نے دُنیا سے بھی فائدہ اُٹھایا اور آخرت میں بھی کامیاب رہا، دُنیا کی مرغوبات اس کے لئے سنگِ راہ بننے کے بجائے سنگِ میل بن کر فلاحِ آخرت

کا ذریعہ بن گئیں، اور دُوسرا شخص وہ ہے جس کے لئے یہی چیزیں حیاتِ آخرت کی بربادی اور دائمی عذاب کا سبب بن گئیں، اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ چیزیں دُنیا میں بھی اس کے لئے عذاب ہی بن جاتی ہیں، قرآنِ کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق اِرشاد ہے:-

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (التوبۃ:۵۵)

''یعنی آپ ان کافروں کے مال اور اولاد سے متعجب نہ ہوں کیونکہ ان نافرمانوں کو مال، اولاد دینے سے کچھ ان کا بھلا نہیں ہوا، بلکہ یہ اموال واولاد آخرت میں تو ان کے لئے عذاب بنیں گے ہی، دُنیا میں بھی رات دِن کی فکروں اور مشاغل کے باعث عذاب ہی بن جاتے ہیں۔''

الغرض دُنیا کی جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے اِنسان کے لئے مزین اور مرغوب بنادیا ہے، شریعت کے مطابق اِعتدال کے ساتھ ان کی طلب اور ضرورت کے موافق ان کو جمع کرنا دُنیا وآخرت کی فلاح ہے، اور ناجائز طریقوں پر ان کا اِستعمال یا جائز طریقوں میں اتنا غلو اور اِنہماک جس کے سبب آخرت سے غفلت ہوجائے باعثِ ہلاکت ہے، مولانا رُومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی کیا اچھی مثال بیان فرمائی ہے ؎

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است [۱]

یعنی دُنیا کا ساز وسامان پانی کے مانند ہے، اور اس میں اِنسان کا قلب ایک کشتی کی طرح ہے، پانی جب تک کشتی کے نیچے اور اِردگرد رہے تو کشتی کے لئے مفید اور معین اور اس کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے والا ہے، اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو یہی کشتی کی غرقابی اور ہلاکت کا سامان ہوجاتا ہے، اسی طرح دُنیا کے مال ومتاع جب تک اِنسان کے دِل میں غلبہ نہ پالیں، اس کے لئے دِین ودُنیا میں معین ومددگار ہیں، اور جس وقت اس کے دِل پر چھا جائیں تو دِل کی ہلاکت ہیں، اسی لئے آیتِ متذکرہ میں چند خاص مرغوباتِ دُنیا کا ذِکر کرنے کے بعد اِرشاد ہوتا ہے:-

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ یعنی ''یہ سب چیزیں دُنیوی زندگی میں صرف کام چلانے کے لئے ہیں، دِل لگانے کے لئے نہیں، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا'' یعنی وہ ٹھکانا جہاں ہمیشہ رہنا ہے، اور جس کی نعمتیں اور لذتیں نہ فنا ہونے والی ہیں، نہ کم یا ضعیف ہونے والی۔

دُوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید توضیح کرنے کے لئے فرمایا:-

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ

[۱] ترجمہ:- کشتی کے نیچے پانی کا ہونا کشتی کے لئے مددگار ہے، کشتی میں پانی بھرنا کشتی کی تباہی ہے۔

مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۵ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اِرشاد ہے کہ آپ ان لوگوں سے جو دُنیا کی ناقص اور فانی نعمتوں میں مست ہو گئے ہیں، فرما دیجئے کہ میں تمہیں ان سے بہت بہتر نعمتوں کا پتہ دیتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں اور اس کے فرمانبرداروں کو ملیں گی، وہ نعمتیں سرسبز باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ہر قسم کی گندگی سے پاک وصاف بیبیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہے۔ پچھلی آیت میں دُنیا کی چھ بڑی نعمتوں کو شمار کیا گیا تھا کہ لوگ ان کی محبت میں مست ہیں، یعنی عورتیں، اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیر اور عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، ان کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں میں بظاہر تین چیزوں کا بیان آیا، اوّل جنت کے سرسبز باغات، دُوسرے پاک صاف عورتیں، تیسرے رضائے خداوندی، باقی چیزوں میں سے اولاد کا ذِکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ دُنیا میں تو اِنسان اولاد کی محبت اس لئے کرتا ہے کہ اولاد سے اس کو اپنے کاموں میں مدد ملتی ہے، اور اس کے بعد اس سے اس کا نام زندہ رہتا ہے، آخرت میں نہ اس کو کسی کی مدد کی ضرورت رہے گی، نہ یہ فنا ہوگا کہ اپنے بعد کے لئے کسی ولی یا وارث کی تلاش ہو، اس کے علاوہ دُنیا میں جس کی اولاد ہے وہ سب اس کو جنت میں مل جائے گی، اور جس کی اولاد دُنیا میں نہیں ہے اس کو اوّل تو آخرت میں اولاد کی خواہش ہی نہیں ہوگی، اور کسی کو خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ بھی دے دیں گے، جامع ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی جنتی کو اولاد کی خواہش ہوگی تو بچے کا حمل، پھر ولادت، پھر اس کا بڑا ہو جانا یہ سب تھوڑی دیر میں ہو جائے گا، اور اس کا مقصد پورا کر دیا جائے گا۔ [۱]

اسی طرح جنت میں سونے چاندی کا ذِکر اس لئے نہیں کیا کہ دُنیا میں تو سونا چاندی اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے بدلے میں دُنیا کا سامان خریدا جاتا ہے اور ہر ضرورت کی چیز اسی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے، آخرت میں نہ کسی خرید وفروخت کی ضرورت رہے گی، نہ کسی چیز کا معاوضہ دینے کی ضرورت، بلکہ جس چیز کو جنتی کا دِل چاہے گا، وہ فوراً مہیا کردی جائے گی، اس کے علاوہ جنت میں خود بھی سونے چاندی کی کمی نہیں، کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ جنت کے بعض محلات ایسے ہوں گے جن کی ایک اینٹ سونے کی اور دُوسری چاندی کی ہوگی۔ بہرحال آخرت کے لحاظ سے وہ کوئی قابلِ ذِکر چیز نہیں سمجھی گئی۔

اسی طرح گھوڑوں کا کام دُنیا میں تو یہ ہے کہ اُن پر سواری کر کے مسافتِ سفر قطع کی جائے، وہاں نہ سفر کی ضرورت، نہ کسی سواری کی، البتہ احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ اہلِ جنت کو جمعہ کے روز عمدہ گھوڑے سواری کے لئے پیش کئے جائیں گے، جن پر سوار ہو کر اہلِ جنت اپنے اعزاء واحباب سے ملاقات کے لئے جایا کریں گے۔ [۲]

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب صفة الجنة إلخ باب ما جاء لأدنی اهل الجنة من الكرامة ج:۲ ص:۸۴

[۲] المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۳۹۶۲

خلاصہ یہ ہے کہ وہاں گھوڑے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، جس کا ذکر کیا جائے، اسی طرح مویشی جو کھیتی کا کام دیتے ہیں یا دُودھ کا، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے جنت میں بغیر ان مویشی کے واسطے کے خود عطا فرما دی ہیں۔

یہی حال کھیتی کا ہے کہ دُنیا میں تو کھیتی کی مشقت مختلف اَجناس کے پیدا کرنے کے لئے اُٹھائی جاتی ہے، جنت میں یہ ساری اجناس خود بخود مہیا ہوں گی، وہاں کسی کو کھیتی کی ضرورت ہی کیا ہوگی، اور کسی کو خواہ مخواہ کھیتی ہی سے محبت ہو تو اس کے لئے یہ بھی ہو جائے گا، جیسا کہ طبرانی کی بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ اہلِ جنت میں سے ایک شخص کھیتی کی تمنا کرے گا تو سارا کھیتی کا سامان جمع کر دیا جائے گا، پھر کھیتی کا بونا، لگانا، پکنا اور کاٹنا یہ سب چند منٹ میں ہو کر سامنے آجائے گا،[1] اس لئے نعمائے آخرت میں صرف جنت اور جنت کی حوروں کا ذِکر کر دینا کافی سمجھا گیا، کیونکہ اہلِ جنت کے لئے قرآنِ کریم میں یہ وعدہ بھی ہے کہ: ”وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ“ (الزخرف:۷۱) یعنی ان کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے، اس جامع اِعلان کے بعد کسی خاص نعمت کے ذِکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن ان میں سے چند مخصوص نعمتوں کا ذِکر کر دیا گیا جو ہر جنتی کو بے مانگے ملیں گی، یعنی جنت کے سرسبز باغات اور حسین و جمیل عورتیں اور ان جامع نعمتوں کے بعد ایک سب سے بڑی نعمت کا ذِکر کیا گیا، جس کا عام طور پر اِنسان کو تصوّر بھی نہیں ہوتا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا و خوشنودی ہے، جس کے بعد ناراضی کا خطرہ نہیں رہتا، اور کوئی تمنا نہ رہے گی جو پوری نہ کر دی گئی ہو تو اس وقت حق تعالیٰ خود ان اہلِ جنت کو خطاب فرمائیں گے کہ اب تم راضی اور مطمئن ہو، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟ وہ عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! آپ نے اتنی نعمتیں عطا فرما دی ہیں کہ اس کے بعد اور کسی چیز کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب میں تم کو ان سب نعمتوں سے بالاتر ایک اور نعمت دیتا ہوں، وہ یہ کہ تم سب کو میری رضا اور قرب دائمی طور پر حاصل ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں،[2] اس لئے نعمائے جنت کے سلب ہو جانے کا یا کم ہو جانے کا بھی خطرہ نہیں۔

انہی دو آیتوں کا خلاصہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ وَّمَلْعُوْنٌ مَّا فِیْهَا إِلَّا مَا ابْتُغِیَ بِهٖ وَجْهُ اللهِ، وَفِیْ رِوَایَةٍ: إِلَّا ذِکْرُ اللهِ وَمَا وَالَاهُ أَوْ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا۔

”دُنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے، بجز اُن چیزوں کے جن کو اللہ تعالیٰ کی

[1] اس مضمون کی حدیث صحیح البخاری میں بھی ہے، صحیح البخاری، کتاب المزارعة، باب کراء الأرض بالذهب ج:۱ ص:۳۱۶

[2] جامع الترمذی، ابواب صفة الجنة بابٌ ج:۲ ص:۸۲

رضا جوئی کا ذریعہ بنالیا جائے، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ: بجز ذِکر اللہ کے اور اس چیز کے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو، اور بجز عالم اور طالب علم کے۔''

یہ حدیث ابن ماجہ اور طبرانی نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل فرمائی ہے۔[۱]

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، وہی حاکم انصاف کا ہے،

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ؕ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ

کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے، زبردست ہے حکمت والا۔ بے شک دِین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری،

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ

اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے مگر جب ان کو معلوم ہو چکا

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹

آپس کی ضد اور حسد سے، اور جو کوئی اِنکار کرے اللہ کے حکموں کا تو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ نے خود اس بات کی گواہی دی ہے، اور فرشتوں اور اہلِ علم نے بھی، کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے انصاف کے ساتھ (کائنات کا) انتظام سنبھالا ہوا ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جس کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ۝۱۸ بیشک (معتبر) دِین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے الگ راستہ لاعلمی میں نہیں بلکہ علم آجانے کے بعد محض آپس کی ضد کی وجہ سے اختیار کیا، اور جو شخص بھی اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے تو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۝۱۹

---

[۱] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب مثل الدنيا ج:۲ ص:۳۰۲، والمعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۱۶۸۰

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں توحید کا بیان ہوا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بھی توحیدِ خداوندی کا مضمون ایک خاص انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ اس پر تین شہادتوں کا ذِکر ہے، ایک خود اللہ جل شانہٗ کی شہادت، دُوسرے اس کے فرشتوں کی، تیسرے اہلِ علم کی، اللہ جل شانہٗ کی شہادت تو بطورِ مجاز ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی ذات وصفات اور اس کے تمام مظاہر ومصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں ؎

ہر گیاہے کہ ازز میں روید
وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید[۱]

اس کے علاوہ اس کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول اور کتابیں بھی اس کی توحید پر شاہد ہیں، اور یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں، تو گویا خود اس کی شہادت اس بات پر ہے کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔

دُوسری شہادت فرشتوں کی ذِکر کی گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مقرّب اور اس کے تکوینی اُمور کے اہلکار ہیں، وہ سب کچھ جان کر اور دیکھ کر شہادت دیتے ہیں کہ لائقِ عبادت اللہ تعالیٰ شانہٗ کے سوا کوئی نہیں۔

تیسری شہادت اہلِ علم کی ہے کہ اہلِ علم سے مراد انبیاء علیہم السلام اور عام علمائے اسلام ہیں، اسی لئے اِمام غزالیؒ اور ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ اس میں علماء کی بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کو اپنی اور اپنے فرشتوں کی شہادت کے ساتھ ذِکر فرمایا۔[۲] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہلِ علم سے مطلق وہ لوگ مراد ہوں جو علمی اُصول پر صحیح نظر کر کے یا کائناتِ عالم میں غور وفکر کر کے حق جل وعلا شانہٗ کی وحدانیت کا علم حاصل کرسکیں، اگرچہ وہ ضابطے کے عالم نہ ہوں۔ اور دُوسری آیت میں اللہ کے نزدیک صرف دِینِ اِسلام کا مقبول ہونا، اس کے سوا کسی دِین ومذہب کا مقبول نہ ہونا بیان کر کے مضمونِ توحید کی تکمیل فرمائی، اور اس سے اِختلاف کرنے والوں کی تباہ حالی بیان فرمائی۔ مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:-

گواہی دی ہے اللہ نے (کتبِ سماویہ میں) اس (مضمون) کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی (اپنے ذِکر وتسبیح میں اس کی گواہی دی ہے، کیونکہ ان کے اَذکار توحید سے بھرے ہوئے ہیں) اور (دُوسرے) اہلِ علم نے بھی (اپنی تقریرات وتحریرات میں اس کی گواہی دی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے) اور معبود بھی وہ

---

۱ ترجمہ:- جو گھاس بھی زمین سے اُگتی ہے وحدہٗ لاشریک لہٗ کہتی ہے۔

۲ تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۲۴

اس شان کے ہیں کہ (ہر چیز کا) اِعتدال کے ساتھ اِنتظام رکھنے والے ہیں (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، وہ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں، بلاشبہ دِین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اِسلام ہی ہے اور (اس کے حق ہونے میں اہلِ اسلام کے ساتھ) اہلِ کتاب نے جو اِختلاف کیا (اس طرح سے کہ اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو (اِسلام کے حق ہونے کی) دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دُوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے (یعنی اسلام کے حق ہونے میں کوئی وجہ شبہ کی نہیں ہوئی، بلکہ ان میں مادّہ دُوسروں سے بڑا بننے کا ہے اور اِسلام لانے میں یہ سرداری جو ان کو اَب عوام پر حاصل ہے فوت ہوتی تھی، اس لئے اسلام کو قبول نہیں کیا، بلکہ اُلٹا اس کو باطل بتلانے لگے) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا اِنکار کرے گا (جیسا ان لوگوں نے کیا) تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اس کا حساب لینے والے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے حساب کا انجام عذاب ہوگا)۔

معارف و مسائل

آیت شَهِدَ اللّٰهُ اِلخ کے فضائل

یہ آیتِ شہادت ایک خاص شان رکھتی ہے، اِمامِ تفسیر بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ یہود کے دو بڑے عالم ملکِ شام سے مدینہ طیبہ میں وارِد ہوئے، مدینہ کی بستی کو دیکھ کر آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ یہ بستی تو اس طرح کی ہے جس کے لئے تورات میں پیشین گوئی آئی ہے کہ اُس میں نبی آخر الزماں قیام پذیر ہوں گے، اس کے بعد ان کو اِطلاع ملی کہ یہاں کوئی بزرگ ہیں جن کو لوگ نبی کہتے ہیں، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ پر نظر پڑتے ہی وہ تمام صفات سامنے آگئیں، جو تورات میں آپ کے لئے بتلائی گئی تھیں، حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، پھر عرض کیا کہ آپ احمد ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں میں محمد ہوں اور احمد ہوں، پھر عرض کیا کہ ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں، اگر آپ اس کا صحیح جواب دیں تو ہم اِیمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا: دریافت کرو، انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے بڑی شہادت کونسی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ آیتِ شہادت نازل ہوئی، آپ نے ان کو پڑھ کر سنادی، یہ دونوں اسی وقت مسلمان ہوگئے۔[1]

مسندِ احمد[2] کی حدیث میں ہے کہ عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو اس کے بعد فرمایا:-

وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ يَا رَبِّ۔ (ابن کثیر)

---

[1] تفسیر البغوی ج:۲ ص:۱۷ تحت تفسیر شهد الله الآیة۔

[2] مسند احمد، مسند الزبیر بن العوام رقم الحدیث:۱۳۴۷

''یعنی اے پروردگار! میں بھی اس پر شاہد ہوں۔''

اور اِمام اَعمشؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس آیت کی تلاوت کے بعد یہ کہے کہ "اَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ" تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے فرمائیں گے کہ'' میرے بندے نے ایک عہد کیا ہے، اور میں عہد پورا کرنے والوں میں سب سے زیادہ ہوں، اس لئے میرے بندے کو جنت میں داخل کردو۔'' (ابن کثیر) [۱]

اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' جو شخص ہر نماز فرض کے بعد سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی اور آیت شَهِدَ اللّٰهُ (آل عمران:۱۸) اور قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ سے بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران:۲۶،۲۷) تک پڑھا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمائیں گے اور جنت میں جگہ دیں گے اور اس کی ستر حاجتیں پوری فرمائیں گے جن میں سے کم سے کم حاجت اس کی مغفرت ہے۔'' (رُوح المعانی بحوالہ دیلمی) [۲]

''دِین'' اور'' اِسلام'' کے الفاظ کی تشریح

عربی زبان میں لفظ'' دِین '' کے چند معنی ہیں، جس میں ایک معنی ہیں طریقہ اور رَوِش، قرآن کی اِصطلاح میں لفظ ''دِین'' ان اُصول واَحکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک ہیں، اور لفظ'' شریعت'' یا'' منہاج'' یا بعد کی اِصطلاحات میں لفظ'' مذہب'' فروعی اَحکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف اُمتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا (الشوریٰ:۱۳)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دِین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ دِین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائقِ عبادت نہ ہونے پر دِل سے اِیمان اور زبان سے اِقرار، روزِ قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزا وسزا اور جنت ودوزخ پر دِل سے اِیمان لانا اور زبان سے اِقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی ورسول اور ان کے لائے ہوئے اَحکام پر اسی طرح اِیمان لانا۔

اور لفظ'' اسلام '' کے اصلی معنی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردینا، اور اس کے تابعِ فرمان ہونا، اس معنی کے اِعتبار سے ہر نبی ورسول کے زمانے میں جو لوگ ان پر اِیمان لائے اور ان کے لائے ہوئے اَحکام میں ان کی

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲۵

[۲] وأيضًا كنز العمال رقم الحديث:۵۰۵۶ حرف الهمزة، وروح المعاني تحت هذه الآية ج:۲ ص:۴۵۵

فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے، اور ان کا دِین دِینِ اسلام تھا، اسی معنی کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۷۲﴾ (سورۂ یونس) اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی اُمت کو اُمتِ مسلمہ فرمایا: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ (البقرۃ:۱۲۸)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین نے اسی معنی کے اعتبار سے کہا تھا: وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ (آل عمران)

اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دِین و شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دِینِ محمدی اور اُمتِ محمدیہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے، جبریل علیہ السلام کی ایک حدیث جو تمام کتب حدیث میں مشہور ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی یہی خاص تفسیر بیان فرمائی ہے، آیتِ مذکورہ کے لفظ ''الاسلام'' میں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دِین صرف دِینِ اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابعِ فرمان بنانا اور ہر زمانے میں جو رسول آئے اور وہ جو کچھ اَحکام لائے اس پر ایمان لانا اور اس کی تعمیل کرنا، اس میں دِینِ محمدی کی اگرچہ تخصیص نہیں، لیکن عام قاعدے کے ماتحت حضرت سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان پر اور ان کے لائے ہوئے تمام اَحکام پر ایمان و عمل بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں دِین مقبول وہ تھا جو نوح علیہ السلام لائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں وہ جو ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا اِسلام وہ تھا جو اَلواحِ توراۃ اور موسوی تعلیمات کی صورت میں آیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا اِسلام وہ جو اِنجیل اور عیسوی اِرشادات کے رنگ میں نازل ہوا، اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا اِسلام وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے نقشے پر مرتب ہوا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانے میں ان کا لایا ہوا دِین ہی دِینِ اسلام اور عند اللہ مقبول تھا، جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا، آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دِین دِینِ اسلام کہلایا، جو قیامت تک باقی رہے گا۔ اور اگر اِسلام کے دُوسرے معنی لئے جائیں یعنی وہ شریعت جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے، تو آیت کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں صرف وہی اِسلام مقبول ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے، پچھلے ادیان کو بھی اگرچہ اُن کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اَب وہ منسوخ ہو چکے ہیں، اور دونوں صورتوں میں نتیجۂ کلام ایک ہی ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانے میں اللہ کے نزدیک مقبول دِین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو، اس کے سوا دُوسرا کوئی دِین مقبول نہیں، خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانے کے لئے وہ

اسلام کہلانے کی مستحق نہیں، شریعتِ ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانے میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس شریعت کے جو احکام منسوخ ہوگئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں شریعتِ موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا تو وہ اب اسلام نہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شرائع سابقہ کے جو اَحکام منسوخ ہوگئے، وہ اب اسلام نہیں رہے، اس لئے جو اُمت قرآن کی مخاطب ہے اس کے لئے اسلام کے معنے عام لئے جائیں یا خاص، دونوں کا حاصل یہی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف دِینِ اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے سوا کوئی دِین مقبول اور ذریعۂ نجات نہیں، یہ مضمون قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے، ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارِد ہے: "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" (آل عمران: ۸۵) یعنی "جو شخص اسلام کے سوا کوئی دِین اِختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اس کے تابع جو عمل کیا جائے گا وہ ضائع ہوگا"۔

اس زمانے میں نجات اسلام میں منحصر ہے، غیر مسلم کے اعمالِ صالحہ اور اَخلاقِ حسنہ بھی مقبول نہیں

ان آیات نے پوری وضاحت کے ساتھ اس ملحدانہ نظریے کا خاتمہ کر دیا جس میں اسلام کی رواداری کے نام پر کفر و اِسلام کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ دُنیا کا ہر مذہب خواہ یہودیت و نصرانیت ہو یا بت پرستی ہر ایک ذریعۂ نجات بن سکتا ہے، بشرطیکہ اعمالِ صالحہ اور اَخلاقِ حسنہ کا پابند ہو، اور یہ درحقیقت اسلام کے اُصول کو منہدم کرنا ہے، جس کا حاصل یہ ہوجاتا ہے کہ اسلام کی کوئی حقیقت ہی نہیں، محض ایک خیالی چیز ہے جو کفر کے ہر جامے میں بھی کھپ سکتا ہے، قرآنِ کریم کی ان آیات اور انہی جیسی بے شمار آیات نے کھول کر بتلا دیا ہے کہ جس طرح اُجالا اور اندھیرا ایک نہیں ہوسکتے اسی طرح یہ بات نہایت نامعقول اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی نافرمانی اور بغاوت بھی ایسے ہی پسند ہو جیسے اطاعت و فرمانبرداری، جو شخص اُصولِ اسلام میں سے کسی ایک چیز کا منکر ہے وہ بلاشبہ خدا تعالیٰ کا باغی اور اس کے رسولوں کا دُشمن ہے، خواہ فروعی اعمال اور رسمی اخلاق میں وہ کتنا ہی اچھا نظر آئے، نجاتِ آخرت کا مدار سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری پر ہے، جو اس سے محروم رہا اس کے کسی عمل کا اِعتبار نہیں، قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے اعمال کے متعلق اِرشاد ہے:-

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (الکهف)

"یعنی ہم قیامت کے دن ان کے کسی عمل کا وزن قائم نہ کریں گے۔"

اس آیت میں اور اس سے پچھلی آیت میں چونکہ رُوئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے اس لئے آخرِ آیت میں ان کی بیوقوفی اور غلط کاری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ یعنی ''اہلِ کتاب نے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور اِسلام میں خلاف اور جھگڑا اڈالا تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو کوئی اس معاملے میں اِشتباہ رہ گیا بلکہ ان کو اپنی کتاب توارۃ و اِنجیل سے اور دُوسرے ذرائع سے پوری طرح اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا علم ہو چکا تھا، لیکن مسلمانوں سے حسد اور حبِ جاہ و مال نے ان کو اس اِختلاف میں مبتلا کیا ہے۔''

آخر میں فرمایا ہے: ''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾'' یعنی ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا اِنکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلد اس سے حساب لینے والے ہیں۔'' اوّل تو مرنے کے بعد اس عالم کا اِمتحانِ داخلہ قبر کے اس عالم میں ہوگا جس کو ''برزخ'' کہا جاتا ہے، اور پھر تفصیلی حساب قیامت میں، اس حساب و کتاب کے وقت سب جھگڑوں کی حقیقت کھل جائے گی، باطل پرستوں کو اپنی حقیقت واضح ہو جائے گی، اور پھر اس کی سزا سامنے آجائے گی۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ

پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے: میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر اور انہوں نے بھی کہ جو میرے ساتھ ہیں،

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

اور کہہ دے کتاب والوں کو اور اَن پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو؟ پھر اگر وہ تابع ہوئے

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع ۱۰/۱۱

تو انہوں نے راہ سیدھی پائی اور اگر منہ پھیریں تو تیرے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے، اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر بھی اگر یہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو کہ: ''میں نے تو اپنا رُخ اللہ کی طرف کر لیا ہے، اور جنہوں نے میری اتباع کی ہے انہوں نے بھی۔'' اور اہلِ کتاب سے اور (عرب کے) اَن پڑھ (مشرکین) سے کہہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے، اور اگر انہوں نے منہ موڑا تو تمہاری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانے کی حد

تک ہے، اور اللہ تمام بندوں کو خود دیکھ رہا ہے ﴿۲۰﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

شروع سورت میں توحید کا اِثبات اور تثلیث کا رَدّ کیا گیا تھا، ان آیات میں مشرکین اور منکرین اہلِ کتاب کی حجتوں کا جواب دیا گیا ہے:

(اسلام کے حق ہونے پر دلیل قائم ہونے کے بعد) پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے (خواہ مخواہ کی) حجتیں نکالیں تو آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رُخ خاص اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی (اپنا رُخ خاص اللہ کی طرف کر چکے، یہ کنایہ ہے اس سے کہ ہم سب اسلام اِختیار کر چکے، جس میں اِعتقادِ اُلوہیت کے اِعتبار سے قلب کا رُخ خاص اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے، کیونکہ دُوسرے مذاہب میں کچھ کچھ شرک ہوگیا تھا) اور (اس جواب کے بعد دریافت فرمانے کے طور پر) کہئے اہلِ کتاب سے اور (مشرکین) عرب سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہِ (راست) پر آجائیں گے، اور اگر وہ لوگ (اس سے بدستور) رُوگردانی رکھیں سو (آپ اس کا بھی غم نہ کیجئے، کیونکہ) آپ کے ذمہ صرف (اَحکامِ خداوندی کا) پہنچا دینا ہے اور (آگے) اللہ تعالیٰ خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے (اپنے) بندوں کو (آپ سے کوئی بازپُرس نہیں ہے)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ

جو لوگ اِنکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق

وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

اور قتل کرتے ہیں ان کو جو حکم کرتے ہیں اِنصاف کرنے کا لوگوں میں سے، سو خوشخبری سنادے ان کو

بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۱﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ز

عذابِ دردناک کی۔ یہی ہیں جن کی محنت ضائع ہوئی دُنیا میں اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

جولوگ اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور اِنصاف کی تلقین کرنے والے لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں، ان کو دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنادو۔ ﴿٢١﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا اور آخرت میں غارت ہو چکے ہیں، اور ان کو کسی قسم کے مددگار نصیب نہیں ہوں گے۔ ﴿٢٢﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

شروع سورۃ میں کلام کا زیادہ رُخ نصاریٰ کی طرف تھا، پھر آیت بالا میں اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا عنوان نصاریٰ اور یہود دونوں کو شامل تھا، اب ان آیات میں یہود کے بعض خاص اَحوال کا بیان ہے، ''رُوح المعانی'' میں بروایت ابنِ ابی حاتم اس آیت کی تفسیر میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ بنی اِسرائیل نے تینتالیس نبیوں کو ایک وقت میں قتل کیا، ان کی نصیحت کے لئے ایک سو ستر بزرگ کھڑے ہوئے، اسی دِن ان کا بھی کام تمام کردیا۔ (بیان القرآن)[1]

بے شک جولوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ (جیسے یہود کہ اِنجیل اور قرآن کو نہیں مانتے تھے) اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو (اور وہ قتل کرنا خود ان کے خیال میں بھی) ناحق (ہوتا ہے) اور (نیز) قتل کرتے ہیں ایسے شخصوں کو جو (افعال واخلاق کے) اِعتدال کی تعلیم دیتے ہیں، سو ایسے لوگوں کو خبر سنادیجئے ایک سزائے دردناک کی (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ (مجموعہ افعالِ مذکورہ کے سبب سے) اُن کے سب اعمال (صالحہ) غارت ہوگئے دُنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی) اور (سزا کے وقت) ان کا کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جن کو ملا کچھ ایک حصہ کتاب کا ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف

1 روح المعانی تحت هذه الآية ج:٢ ص:٦٢٠

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ

تاکہ وہ کتاب ان میں حکم کرے پھر منہ پھیرتے ہیں بعضے ان میں سے تغافل کر کے۔ یہ اس واسطے کہ

بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ

کہتے ہیں وہ: ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ دوزخ کی مگر چند دِن گنتی کے، اور بہکے ہیں اپنے دِین میں

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ

اپنی بنائی باتوں پر۔ پھر کیا حال ہوگا جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن کہ اس کے آنے میں کچھ شبہ نہیں

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور پورا پاوے گا ہر کوئی اپنا کیا، اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا کہ انہیں اللہ کی کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ کر انحراف کر جاتا ہے ﴿٢٣﴾ یہ سب اس لئے ہے کہ انہوں نے یہ کہا ہوا ہے کہ ہمیں گنتی کے چند دِنوں کے سوا آگ ہرگز نہیں چھوے گی۔ اور انہوں نے جو جھوٹی باتیں تراش رکھی ہیں انہوں نے ان کے دِین کے معاملے میں ان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے ﴿٢٤﴾ بھلا اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ہم انہیں ایک ایسے دن (کا سامنا کرنے) کے لئے جمع کرلائیں گے جس کے آنے میں ذرا بھی شک نہیں ہے، اور ہر ہر شخص نے جو کچھ کمائی کی ہوگی وہ اس کو پوری پوری دے دی جائے گی، اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا ﴿٢٥﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (سماوی یعنی توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا (کہ اگر ہدایت کے طالب ہوتے تو وہ حصہ اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی تھا) اور اسی کتاب اللہ کی طرف

اس غرض سے اُن کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان (مذہبی اختلافات کا) فیصلہ کردے پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رُخی کرتے ہوئے (اور) یہ (بے اعتنائی) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں (اور یہی ان کا اعتقاد ہے) کہ ہم کو صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی (پھر مغفرت ہو جاوے گی) اور ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان کی تراشی ہوئی باتوں نے (جیسے اسی تراشے ہوئے عقیدے نے ان کو دھوکا دیا کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، اس خاندانی بزرگی سے ہماری نجات ضرور ہو جائے گی، اس کے نتیجے میں وہ اور کتاب اللہ سے بے اعتنائی کرنے لگے) سو (ان اَحوال وافعال واقوالِ کفریہ کے سبب) ان کا کیا (بُرا) حال ہوگا، جبکہ ہم ان کو اس تاریخ میں جمع کرلیں گے جس (کے آنے) میں ذرا شبہ نہیں اور (اس تاریخ میں) پورا پورا بدلہ مل جاوے گا (کہ بے جرم یا زیادہ از جرم سزا نہ ہوگی)۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ

تو کہہ: یا اللہ مالک سلطنت کے! تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے

تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ

چاہے، اور عزّت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے، تیرے ہاتھ ہے سب خوبی، بے شک تو

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز

ہر چیز پر قادر ہے۔ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرے دن کو رات میں،

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ

اور تو نکالے زندہ مردہ سے اور نکالے مردہ زندہ سے، اور تو رزق دے جس کو چاہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

بے شمار۔

آسان ترجمۂ قرآن

کہو کہ: "اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اِقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اِقتدار چھین لیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے عزّت بخشتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رُسوا کر دیتا ہے، تمام تر بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے ﴿۲۶﴾ تو ہی رات کو دِن میں داخل کرتا ہے اور دِن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو ہی بے جان چیز میں سے جاندار کو برآمد کر لیتا ہے اور جاندار میں سے بے جان چیز نکال لاتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے ﴿۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

ان آیات میں اُمتِ محمدیہ کو ایک دُعا و مناجات کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے ضمن میں اُمتِ محمدیہ کے کفار پر غلبہ پانے کی طرف اشارہ بھی ہے، جیسا اس کے شانِ نزول سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رُوم و فارس فتح ہو جانے کا وعدہ فرمایا تو منافقین و یہود نے اِستہزاء کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کما فی روح المعانی عن الواحدی عن ابن عباس وانس۔ [1]

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:-

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہئے کہ اے اللہ! مالک تمام ملک کے آپ ملک (کا جتنا حصہ چاہیں) جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس (کے قبضہ) سے چاہیں ملک (کا حصہ) لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں، آپ ہی کے اِختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں، آپ (بعض موسموں میں) رات (کے اجزاء) کو دِن میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے دِن بڑا ہونے لگتا ہے) اور (بعض موسموں میں) دِن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے رات بڑھنے لگتی ہے) اور آپ جان دار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے بیضہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جان دار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرند سے بیضہ) اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲۶۶

معارف ومسائل

اس آیت کا شانِ نزول اور غزوۂ خندق کا واقعہ

بدر و اُحد میں مشرکینِ مکہ کی مسلسل شکست اور مسلمانوں کے خلاف ہر جد و جہد میں ناکامی کے ساتھ مسلمانوں کی مسلسل ترقی اور اِسلام کی روز افزوں اِشاعت نے قریشِ مکہ اور تمام غیر مسلموں میں ایک بوکھلاہٹ پیدا کردی تھی، جس سے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ ایک عام سازش کی صورت میں یہ ظاہر ہوا کہ مشرکینِ عرب اور یہود و نصاریٰ سب کا ایک متحدہ محاذ مسلمانوں کے خلاف بن گیا، اور سب نے مل کر مدینہ پر یکبارگی حملہ اور فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی، اور ان کا بے پناہ لشکر اِسلام اور مسلمانوں کو دُنیا سے مٹا ڈالنے کا عزم لے کر مدینہ پر چڑھ آیا، جس کا نام قرآن میں ''غزوۂ اَحزاب'' اور تاریخ میں ''غزوۂ خندق'' ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے یہ طے فرمایا تھا کہ غنیم کے راستہ میں مدینہ سے باہر خندق کھودی جائے۔

بیہقی اور ابونعیم اور ابنِ خزیمہ کی روایت میں ہے کہ خندق کھودنے کا کام مجاہدینِ اسلام صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا تو چالیس چالیس ہاتھ لمبی خندق دس دس آدمیوں کے سپرد تھی، یہ خندق کئی میل لمبی اور خاصی گہری اور چوڑی تھی، جس کو غنیم عبور نہ کرسکے، اور کھدائی کے لئے تکمیل جلد سے جلد کرنا تھی، اس لئے جاں نثار صحابہ کرامؓ بڑی محنت سے اس میں مشغول تھے کہ قضائے حاجت اور کھانے وغیرہ کی ضروریات کے لئے یہاں سے ہٹنا مشکل ہو رہا تھا، مسلسل بھوکے رہ کر یہ کام اَنجام دیا جارہا تھا، اور یقیناً کام ایسا تھا کہ آج کل کی جدید آلات والی پلٹن بھی ہوتی تو اس تھوڑے وقت میں اس کام کا پورا کرنا آسان نہ ہوتا، مگر یہاں اِیمانی طاقت کام کر رہی تھی جس نے بآسانی تکمیل کرادی۔

سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک فرد کی حیثیت سے اس کھدائی کے کام میں شریک تھے، اِتفاقاً خندق کے ایک حصے میں پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی، جن حضرات کے حصے میں خندق کا یہ ٹکڑا تھا وہ اپنی پوری قوت صَرف کر کے عاجز ہوگئے، تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ اب حضور کا کیا حکم ہے؟ آپ اسی وقت موقع پر تشریف لائے اور کدال آہنی خود دستِ مبارک میں لے کر ایک ضرب لگائی تو اس چٹان کے ٹکڑے ہوگئے اور ایک آگ کا شعلہ برآمد ہوا، جس سے دُور تک اس کی روشنی پھیل گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حِیرَہ ملکِ فارس کے محلات و عمارات دِکھلائی گئیں، پھر دُوسری ضرب لگائی اور پھر ایک شعلہ برآمد ہوا تو فرمایا کہ اس کی روشنی میں مجھے رُومیوں کے سرخ سرخ محلات و عمارات دِکھلائی گئیں، پھر تیسری ضرب لگائی اور روشنی پھیلی تو فرمایا کہ اس

میں مجھے صنعاء یمن کے عظیم محلات دِکھلائے گئے، اور فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ مجھے جبریلِ امین نے خبر دی ہے کہ میری اُمت ان تمام ممالک پر غالب آئے گی۔ [1]

منافقینِ مدینہ نے یہ سنا تو ان کو اِستہزاء و تمسخر کا موقع ہاتھ آیا، مسلمانوں کا مذاق اُڑایا کہ دیکھو ان لوگوں کو جو حریفِ مقابل کے خوف سے خندق کھودنے میں اس طرح مشغول ہیں کہ ان کو اپنی ضروریات کا بھی ہوش نہیں، اپنی جانوں کی حفاظت ان کو مشکل ہو رہی ہے، ملک فارس و رُوم اور یمن کی فتوحات کے خواب دیکھ رہے ہیں، حق تعالیٰ نے ان بے خبر ظالموں کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾۔

جس میں مناجات ودُعا کے پیرایہ میں قوموں کے عروج وزوال اور ملکوں کے اِنقلاب میں حق جل وعلا شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ایک نہایت بلیغ انداز سے کیا گیا ہے، اور فارس و رُوم کی فتوحات کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا، اس میں دُنیا کے اِنقلابات سے بے خبر قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے ناواقف، قومِ نوح اور عاد وثمود کے واقعات سے غافل اور جاہل، دُشمنانِ اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ظاہری شان وشوکت کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ دُنیا کی ساری طاقتیں اور حکومتیں سب ایک ذاتِ پاک کے قبضۂ قدرت میں ہیں، عزّت وذِلت اسی کے ہاتھ ہے، وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ غریبوں اور فقیروں کو تخت وتاج کا مالک بنادے، اور بڑے بڑے بادشاہوں سے حکومت ودولت چھین لے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ آج کے خندق کھودنے والے فقیروں کو کل شام وعراق اور یمن کی حکومت عطا فرمادے ۔

ذرّہ ذرّہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

جو چیزیں عادۃً بُری سمجھی جاتی ہیں انجام کے اِعتبار سے وہ بھی بُری نہیں

آیت کے اَخیر میں فرمایا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ یعنی آپ کے ہاتھ میں ہے ہر بھلائی، شروع آیت میں چونکہ حکومت دینے اور واپس لینے کا نیز عزّت اور ذِلت دونوں کا ذِکر تھا، اس لئے بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس جگہ بھی "بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَالشَّرُّ" کہا جاتا، یعنی ہر بھلائی اور بُرائی آپ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس آیت میں اس جگہ صرف لفظ "خیر" لاکر ایک اہم حقیقت کی طرف اِشارہ کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو کوئی شخص یا کوئی قوم بُرائی یا مصیبت سمجھتی ہے اور وہ اس خاص

[1] دلائل النبوة للبيهقي رقم الحديث: ١٣٠٦ باب ما ظهر في حفر الخندق إلخ۔

قوم کے لئے گو تکلیف و مصیبت ہوتی ہے، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے وہ بُرائی نہیں ہوتی، قوموں کے عروج ونزول اور اس میں مصائب کے بعد فوائد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو عربی کے مشہور شاعر متنبّی کا یہ مصرعہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ ؂

مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ فَوَائِدُ

یعنی ایک قوم کے مصائب دُوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں۔

مجموعۂ عالم کے مصالح وفوائد پر نظر کرنے والا کسی نہ کسی درجے میں اس حقیقت کو پاسکتا ہے کہ اس میں جتنی چیزیں خراب اور بُری سمجھی جاتی ہیں، وہ اپنی ذات میں چاہے بُری سمجھی جائیں، مگر پورے عالم کو اگر ایک جسم فرض کرلیا جائے تو وہ اس کے چہرے کے خال اور بال ہیں، خال اور بال اگر بدن سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں، لیکن ایک حسین چہرے کا جزء ہونے کی حالت میں یہی چیزیں رونقِ حسن ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم بُرا کہتے ہیں اور بُرا سمجھتے ہیں ان کی بُرائی جزوی ہے اور خالقِ کائنات اور ربّ العالمین کی نسبت اور مجموعۂ عالم کی مصلحت کے اعتبار سے کوئی چیز شر یا خراب نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ؂

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس لئے اس آیت کے ختم میں صرف لفظ ''خیر'' پر اکتفا کر کے فرمایا گیا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ کیونکہ خالقِ کائنات کی حکمت اور حکومت اور مجموعۂ عالم کی مصلحت کے لحاظ سے ہر چیز خیر ہی خیر ہے، یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ختم ہوا، جس میں تمام عالم عناصر کی طاقتوں اور دُنیا کی سب حکومتوں کا حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہونا بیان فرمایا ہے۔

دُوسری آیت میں آسمانی طاقتوں اور فلکیات پر حق جل وعلا شانہٗ کی قدرتِ کاملہ کا احاطہ اس طرح بیان فرمایا ہے: تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ یعنی آپ جب چاہتے ہیں رات کے اجزاء دِن میں داخل فرما کر دِن کو بڑا کردیتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں دِن کے اجزاء رات میں داخل کر کے رات بڑی کردیتے ہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دِن کے بڑے چھوٹے ہونے کا مدار آفتاب کے طلوع وغروب اور اس کی حرکات پر ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہوا کہ آسمان اور اس کے متعلق سب سے بڑا سیارہ شمس اور سب سے معروف سیارہ قمر سب آپ کے احاطۂ قدرت میں ہیں، پھر عالم عناصر اور دُنیا کی باقی طاقتوں میں کسی شک وشبہ کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد عالمِ رُوحانیت پر حق جل وعلا شانہٗ کا احاطۂ قدرت اس طرح بیان فرمایا: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ یعنی ''آپ زِندہ کو مردہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے بیضہ سے بچہ یا نطفے سے انسان یا دانے سے

درخت کو نکال لیتے ہیں، اور مردہ کو زندہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے جانور سے بیضہ اور انسان سے نطفہ یا درخت سے پھل اور دانۂ خشک۔

اور اگر زندہ اور مردہ کا مفہوم عام لیا جائے تو عالم اور جاہل اور کامل و ناقص اور مؤمن و کافر سب کو شامل ہو جاتا ہے، جس سے حق جل وعلاشانہٗ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے تصرفات تمام عالمِ اَرواح اور رُوحانیت پر واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ جب چاہیں تو کافر سے مؤمن یا جاہل سے عالم پیدا کر دیں، اور جب چاہیں مؤمن سے کافر یا عالم سے جاہل پیدا کر دیں، آذر کے گھر میں خلیل اللہ پیدا ہو جائے، اور نوح علیہ السلام کے گھر میں ان کا بیٹا کافر رہ جائے، عالم کی اولاد جاہل رہ جائے اور جاہل کی اولاد عالم ہو جائے۔

اس تفصیل سے آپ نے معلوم کیا ہوگا کہ کیسی بلیغ ترتیب کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا تمام کائناتِ عالم پر محیط ہونا ترتیب وار بیان فرمایا گیا ہے کہ پہلے عالمِ عناصر اور اس کی قوتوں اور حکومتوں کا ذِکر آیا ہے، پھر عالمِ اَفلاک اور اس کی قوتوں کا، اور ان سب کے بعد رُوح اور رُوحانیت کا ذِکر آیا ہے جو درحقیقت سارے عالم کی ساری قوتوں میں سب سے بالاتر قوت ہے، آخرِ آیت میں اِرشاد فرمایا: وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ یعنی "آپ جس کو چاہیں بے شمار رِزق عطا فرمادیں" جس کو کوئی مخلوق نہ معلوم کر سکے، اگرچہ خالق کے علم میں ذرّہ ذرّہ لکھا ہوا ہے۔

آیتِ مذکورہ کی مخصوص فضیلت

اِمام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد سورۂ فاتحہ اور آیۃ الکرسی اور آل عمران کی تین آیتیں ایک آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ آخر تک، اور دُوسری و تیسری آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ سے بِغَيْرِ حِسَابٍ تک پڑھا کرے تو میں اس کا ٹھکانا جنت میں بنادوں گا، اور اس کو اپنے حظیرۃ القدس میں جگہ دوں گا، اور ہر روز اس کی طرف ستر مرتبہ نظرِ رحمت کروں گا، اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا اور ہر حاسد اور دُشمن سے پناہ دُوں گا، اور ان پر اس کو غالب رکھوں گا۔[1]

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ

نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو کوئی

[1] تفسیر البغوی تحت الآیۃ: قل اللّٰھم الآیۃ ج:۲ ص:۲۵

يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ

یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم اُن سے بچاؤ،

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا

اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تو کہہ: اگر تم چھپاؤ گے

مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

اپنے جی کی بات یا اسے ظاہر کروگے، جانتا ہے اس کو اللہ، اور اس کو معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں

وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا

اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن موجود پاوے گا ہر شخص جو کچھ کہ

معانقۃ ۳ — عند المتاخرین ۱۲

عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ښ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ڔ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ

کی ہے اس نے نیکی اپنے سامنے، اور جو کچھ کہ کی ہے اس نے بُرائی، آرزو کرے گا کہ مجھ میں اور اس میں پڑ جائے

اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع

فرق دُور کا، اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے، اور اللہ بہت مہربان ہے بندوں پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

مؤمن لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا یار و مددگار نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، اِلّا یہ کہ تم ان (کے ظلم) سے بچنے کے لئے بچاؤ کا کوئی طریقہ اختیار کرو۔ اور اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے بچاتا ہے۔ اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸﴾ (اے رسول!) لوگوں کو بتادو کہ جو کچھ تمہارے دِلوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اسے جان لے گا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب جانتا ہے، اور اللہ ہر

چیز پر قادر ہے۔ ﴿٢٩﴾ وہ دن یاد رکھو جس دن کسی بھی شخص نے نیکی کا جو کام کیا ہوگا اسے اپنے سامنے موجود پائے گا، اور بُرائی کا جو کام کیا ہوگا اس کو بھی (اپنے سامنے دیکھ کر) یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کی بدی کے درمیان بہت دُور کا فاصلہ ہوتا! اور اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے بچاتا ہے، اور اللہ بندوں پر بہت شفقت رکھتا ہے ﴿٣٠﴾

خلاصہ تفسیر

ربطِ آیت

مذکور الصدر آیات میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور اس ہدایت کی مخالفت کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ تعالیٰ سے دوستی ومحبت کا علاقہ قطع ہو جائے گا، کافروں سے باطنی اور دِلی دوستی تو مطلقاً حرام ہے، اور ظاہری دوستی معاملات کے درجے میں اگرچہ جائز ہے، مگر بلاضرورت وہ بھی پسند نہیں۔

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:-

مسلمانوں کو چاہئے کہ (ظاہراً یا باطناً) کفار کو دوست نہ بناویں مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کرکے (یہ تجاوز دو صورت سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں سے بالکل دوستی نہ رکھیں، دُوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی دوستی ہو اور کفار کے ساتھ بھی دونوں صورتیں ممانعت میں داخل ہیں) اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا سو وہ اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں (کیونکہ جن دو شخصوں میں باہم عداوت ہو ایک سے دوستی کرکے دُوسرے سے دوستی کا دعویٰ قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتا) مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تم اس سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو (وہاں دفع ضرر کی ضرورت ہے) اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتا ہے (کہ اس کی ذات سے ڈر کر احکام کی مخالفت مت کرو) اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس وقت کی سزا کا خوف کرنا ضرور ہے) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (دِل ہی دِل میں) پوشیدہ رکھوگے اپنا مافی الضمیر یا اس کو (زبان وجوارح سے) ظاہر کردوگے اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال میں) جانتے ہیں اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) وہ تو سب کچھ جانتے ہیں، جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے (کوئی چیز ان سے مخفی نہیں) اور (علم کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں (سو اگر تم کسی اَمرِ قبیح کا اِرتکاب کروگے خواہ ظاہراً یا باطناً تو وہ تم کو سزا دے سکتے ہیں) جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا، اور اپنے بُرے کئے ہوئے کاموں کو (بھی پائے گا، اس روز) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب

ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دُور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی (تا کہ اپنے اعمالِ بد کا معائنہ نہ کرنا پڑتا) اور (تم سے پھر مکرّر کہا جاتا ہے کہ) خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتے ہیں (اور یہ ڈرانا اس وجہ سے ہے کہ) اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں (اپنے) بندوں (کے حال) پر (اس مہربانی سے یوں چاہتے ہیں کہ یہ سزائے آخرت سے بچے رہیں، اور بچنے کا طریقہ ہے اعمالِ بد کا ترک کرنا، اور ترک کرنا عادۃً بدون ڈرانے کے ہوتا نہیں، اس لئے ڈراتے ہیں، پس یہ ڈرانا عین شفقت و رحمت ہے)۔

معارف و مسائل

اس مضمون کی آیات قرآنِ کریم میں جا بجا مختلف عنوانات کے ساتھ بکثرت آئی ہیں، سورۂ ممتحنہ میں اِرشاد ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ

''یعنی اے ایمان والو! میرے دُشمن اور اپنے دُشمن یعنی کافر کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو پیغام بھیجو دوستی کے۔''

پھر اس کے آخر میں فرمایا:-

وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ①

''جس شخص نے ان سے دوستی کی تو وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہوگیا۔''

اور دُوسری جگہ میں اِرشاد ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ (المائدۃ:۵۱)

''یعنی اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، کیونکہ وہ آپس میں ہی ایک دُوسرے کے دوست ہیں (مسلمانوں سے ان کو کوئی دوستی اور ہمدردی نہیں) تو جو اُن سے دوستی کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔''

اور سورۂ مجادلہ میں ہے:-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ (المجادلۃ:۲۲)

''یعنی آپ نہ پائیں گے کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ دوستی کریں ایسے لوگوں سے جو مخالف ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے باپ دادا ہی ہوں، یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی، یا اپنے خاندان والے۔''

کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں؟

یہ مضمون بہت سی آیاتِ قرآنیہ میں مجمل اور مفصل مذکور ہے جس میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدّت کے ساتھ روکا گیا ہے، ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقتِ حال سے ناواقف غیر مسلموں کو تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رواداری اور تعلق کی بلکہ حسنِ اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اور دُوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کی بہت سی آیات سے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات اور عمل سے خلفائے راشدین اور دُوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ اِحسان وسلوک اور ہمدردی و غمخواری کے اَحکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں جن کی مثالیں دُنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہیں، تو ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن وسنت کے اَحکام وارشادات میں باہم تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے، مگر یہ دونوں خیال قرآن کی حقیقی تعلیمات پر طائرانہ نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر مختلف مقامات سے قرآن کی آیات کو جو اس معاملے سے متعلق ہیں جمع کر کے غور کیا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لئے وجہِ شکایت باقی رہتی ہے، نہ آیات وروایات میں کسی قسم کا تعارض باقی رہتا ہے، اس لئے اس مقام کی پوری تشریح کر دی جاتی ہے، جس سے موالات اور اِحسان وسلوک، یا ہمدردی و غمخواری میں باہمی فرق اور ہر ایک کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی، اور یہ بھی کہ ان میں کونسا درجہ جائز ہے، کونسا ناجائز، اور جو ناجائز ہے اس کی وجوہ کیا ہیں۔

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دِلی مودّت ومحبت ہے، یہ صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مؤمن کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دُوسرا درجہ مواسات کا ہے جس کے معنی ہیں ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے، یہ بجز کفار اہلِ حرب کے جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس میں اِرشاد ہے:-

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ (الممتحنہ:۸)

"یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دِین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ اِحسان اور اِنصاف کا سلوک کرو۔"

تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے مقصود ان کو دِینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورۂ آل عمران کی آیتِ مذکورہ میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دِیا گیا۔ (بیان القرآن) [1]

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اُجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دُوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بنا پر کفارِ اہلِ حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دِیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اِجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود اُن کے کارخانوں اور اِداروں میں ملازم ہونا، یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ قلبی اور دِلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور اِحسان و ہمدردی و نفع رسانی بجز اہلِ حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس کا مقصد مہمان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اِسلامی معلومات اور دِینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہوکر اس دُنیا میں تشریف لائے، آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو اِحسان و ہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کئے، اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے، مکہ میں قحط پڑا تو جن دُشمنوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا، ان کی خود اِمداد فرمائی، پھر مکہ مکرمہ فتح ہوکر یہ سب دُشمن آپ کے قابو میں آگئے تو سب کو یہ فرما کر آزاد کر دیا کہ "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ"، [2] یعنی آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۰، ۱۱

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۹ ص:۱۱۸

تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے، غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا، کفار نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، کبھی آپ کا ہاتھ انتقام کے لئے نہیں اُٹھا، زبانِ مبارک سے بددُعا بھی نہیں فرمائی، بنوثقیف جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا گیا، [١] جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ عزّت کا مقام تھا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے غیر مسلم محتاج ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفے دیئے، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، یہ سب مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں تھیں، جس موالات سے منع کیا گیا وہ نہ تھی۔

اس تفصیل اور تشریح سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوگیا کہ غیر مسلموں کے لئے اسلام میں کتنی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم ہے، دُوسری طرف جو ظاہری تعارض ترکِ موالات کی آیات سے محسوس ہوتا تھا وہ بھی رفع ہوگیا۔

اب ایک بات یہ باقی رہ گئی کہ قرآن نے کفار کی موالات اور قلبی دوستی ومحبت کو اتنی شدّت کے ساتھ کیوں روکا کہ وہ کسی حال میں کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں رکھی، اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں اس دُنیا کے اندر اِنسان کا وجود عام جانوروں یا جنگل کے درختوں اور گھاس پھوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھولے پھلے پھر مر کر ختم ہوگئے، بلکہ انسان کی زندگی اس جہان میں ایک مقصدی زندگی ہے، اس کی زندگی کے تمام ادوار، اس کا کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب ایک مقصد کے گرد گھومتے ہیں، جب تک وہ اس مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سارے کام صحیح ودُرست ہیں، اس کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں، دانائے رُوم نے خوب فرمایا ؎

زندگی از بہرِ ذکر وبندگی ست
بے عبادت زندگی شرمندگی ست [٢]

جو اِنسان اس مقصد سے ہٹ جائے وہ دانائے رُوم واہلِ حقیقت کے نزدیک انسان نہیں ؎

آنچہ می بینم خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند [٣]

قرآنِ حکیم نے اسی مقصد کا اِقرار اِنسان سے ان الفاظ میں لیا ہے:-

---

[١] سنن ابی داوٗد ج:٢ ص:٤٢٨ کتاب الخراج إلخ باب ما جاء فی خبر الطائف۔

[٢] ترجمہ:- زندگی ذکر اور بندگی کے لئے ہے، بغیر عبادت کے زندگی شرمندگی ہے۔

[٣] ترجمہ:- جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ آدمیت کے خلاف ہے، آدمیت نہیں آدمیت کا غلاف ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ (الانعام)

"آپ کہئے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ربّ العالمین کے لئے ہے۔"

اور جب اِنسان کی زندگی کا مقصد اللہ ربّ العالمین کی اِطاعت وعبادت ٹھہرا تو دُنیا کے کاروبار ریاست وسیاست اور عائلی اور منزلی تعلقات سب اس کے تابع ٹھہرے، تو جو انسان اس مقصد کے مخالف ہیں وہ اِنسان کے سب سے زیادہ دُشمن ہیں، اور اس دُشمنی میں چونکہ شیطان سب سے آگے ہے اس لئے قرآنِ حکیم نے فرمایا:-

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (فاطر:۶)

"یعنی شیطان تمہارا دُشمن ہے، اس کی دُشمنی کو ہمیشہ یاد رکھو۔"

اسی طرح جو لوگ شیطانی وساوس کے پیرو اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے آئے ہوئے اَحکامِ خداوندی کے مخالف ہیں ان کے ساتھ دِلی ہمدردی اور قلبی دوستی اس شخص کی ہو ہی نہیں سکتی جس کی زندگی ایک مقصدی زندگی ہے، اور دوستی ودُشمنی اور موافقت ومخالفت سب اس مقصد کے تابع ہیں۔

اسی مضمون کو صحیحین کی ایک حدیث میں اس طرح اِرشاد فرمایا گیا ہے:-

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ اِیْمَانَهٗ. (بخاری ومسلم)

"یعنی جس شخص نے اپنی دوستی اور دُشمنی کو صرف اللہ کے لئے وقف کردیا اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔" [1]

معلوم ہوا کہ اِیمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ اِنسان اپنی محبت ودوستی اور دُشمنی ونفرت کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنادے، اس لئے مؤمن کی قلبی موالات اور مودّت صرف اسی کے لئے ہوسکتی ہے جو اس مقصد کا ساتھی اور اللہ جل شانہٗ کا تابعِ فرمان ہے، اس لئے قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیتوں میں کافروں کے ساتھ دِلی اور قلبی موالات اور دوستی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ انہی میں سے ہیں۔

آخرِ آیت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے، ایسا نہ ہو کہ چندروزہ اَغراض ومقاصد کی خاطر موالاتِ کفار میں مبتلا ہوکر اللہ جل شانہٗ کو ناراض کر بیٹھو، اور چونکہ موالات کا تعلق دِل سے ہے، اور دِل کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لئے یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص واقع میں تو کفار کی موالات ومحبت میں مبتلا ہو، مگر زبانی انکار کرے، اس لئے دُوسری آیت میں فرمایا کہ تمہارے دِلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف وخبردار ہیں، یہ انکار وحیلہ

[1] اس مضمون کی ایک حدیث صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الإسلام علی خمس إلخ (ج:۱ ص:۶) میں ہے، لیکن بعینہٖ یہ الفاظ مستدرک حاکم رقم الحدیث: ۲۶۴۳ میں ملے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ان کے سامنے نہیں چل سکتا ؂

کار ہا با خلق آری جملہ راست
باخدا تزویر وحیلہ کے رواست [1]

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ

تو کہہ: اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے،

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تو کہہ: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو

لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

محبت نہیں کافروں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اِتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کردے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے ۝۳۱ کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر بھی اگر منہ موڑو گے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا ۝۳۲

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں توحید کا وجوب اور کفر کی مذمت مذکور تھی، آگے اِعتقادِ رسالت اور اِتباعِ رسول کا وجوب بیان فرماتے ہیں، تاکہ معلوم ہوجائے کہ جس طرح انکارِ توحید کفر ہے اسی طرح انکارِ رسالت بھی کفر ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

[1] ترجمہ:- مخلوق کے ساتھ تو جو کچھ بھی کیا جائے چل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکا وفریب کہاں چل سکتا ہے۔

آپ (لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعمِ خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو (کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لئے مبعوث ہوا ہوں، جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسبِ وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا یا معاف کرا لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایت فرمانے والے ہیں (اور) آپ یہ (بھی) فرما دیجئے کہ تم اِطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی (کہ اصل مقصود تو وہی ہے) اور (اطاعت کیا کرو) رسول کی (یعنی میری اِطاعت اس حیثیت سے کرنا ضروری ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میری معرفت اپنی اِطاعت کے طریقے بتلائے ہیں) پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ (آپ کی اِطاعت سے کہ ادنیٰ اس کا اِعتقادِ رسالت ہے) اِعراض کریں سو (وہ لوگ سن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے (اور اس صورت میں یہ لوگ کافر ہوں گے سو ان کو اللہ سے دعوائے محبت کرنا یا ہوسِ محبوبیت رکھنا محض بے حقیقت ہے)۔

معارف ومسائل

محبت ایک مخفی چیز ہے، کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں، اور کم ہے یا زیادہ ہے، اس کا کوئی پیمانہ بجز اس کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے، محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں، ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعوے دار اور محبوبیت کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار بتلایا ہے، یعنی اگر دُنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس کو اِتباعِ محمدی کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص اپنے دعوے میں جتنا سچا ہوگا اتنا ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بنائے گا،، اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہوگا اسی قدر آپ کی اِطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اِتباع کیا اس نے درحقیقت اللہ کا اِتباع کیا، اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔'' (تفسیر مظہری ج:۲)[1]

[1] مشکوۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسُّنَّة ج:۱ ص:۲۷ وتفسیر المظھری۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ

بے شک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾

سارے جہان سے۔ جو اولاد تھے ایک دُوسرے کی، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ نے آدم، نوح، ابراہیم کے خاندان، اور عمران کے خاندان کو چن کر تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی ﴿٣٣﴾ یہ ایسی نسل تھی جس کے افراد (نیکی اور اخلاص میں) ایک دُوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اور اللہ (ہر ایک کی بات) سننے والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے ﴿٣٤﴾

انبیائے سابقین علیہم السلام کا تذکرہ برائے تسلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ ان کو آپ کی نبوّت و رِسالت ہی میں شبہ تھا، ان کی ہدایت کے لئے ان آیات میں کچھ نظائر انبیائے سابقین علیہم السلام کے بیان فرمائے ہیں، جن سے یہ شبہات رفع ہوجائیں، ان انبیائے سابقین علیہم السلام کے تذکرے میں حضرت آدم، نوح، آلِ اِبراہیم، آلِ عمران کا ذِکر تو اِجمال و اختصار کے ساتھ کردیا گیا ہے، اس کے بعد دراصل ذِکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کرنا ہے، اس سے پہلے اُن کی نانی اور والدہ کا بھی تفصیلی تذکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نہایت مفصل ذِکر کیا گیا ہے، جس کی حکمت و مصلحت کا بیان مسئلۂ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کے تحت آئے گا، خلاصہ یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ کو آخر زمانے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کام کرنا ہے، اس لئے ان کی پہچان اور علامات کے بیان کرنے کا اِہتمام قرآن میں سب انبیاء سے زیادہ کیا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے (نبوّت کے لئے) منتخب فرمایا ہے (حضرت) آدم (علیہ السلام) اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) کو اور (حضرت) اِبراہیم (علیہ السلام) کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (جیسے حضرت اِسماعیل علیہ السلام،

حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، اور تمام انبیائے بنی اسرائیل کہ اولاد یعقوب علیہ السلام کی ہیں، اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ اولادِ اسماعیل علیہ السلام سے ہیں) اور عمران کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (اگر یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہیں، اور اگر یہ عمران حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، غرض ان حضرات کو نبوّت کے لئے) تمام جہان (کی مخلوقات) پر (منتخب فرمایا ہے) بعضے ان میں بعضوں کی اولاد ہیں، (جیسے آدم علیہ السلام کی اولاد سب ہیں، اسی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد سب ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولادِ عمران بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں خوب جاننے والے ہیں (کہ سب کے قول سنتے ہیں، سب کے اَحوال کو جانتے ہیں، بس جس کے اقوال واَحوال مناسب شانِ نبوّت کے دیکھے ان کو نبی بنا دیا)۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا

جب کہا عمران کی عورت نے کہ اے رَبّ! میں نے نذر کیا تیرے، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے سب سے آزاد رکھ کر،

فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

سو تو مجھ سے قبول کر، بے شک تو ہی ہے اصل سننے والا جاننے والا۔ پھر جب اس کو جنا، بولی: اے رَبّ!

اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ

میں نے تو اس کو لڑکی جنی، اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا، اور بیٹا نہ ہو

کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا

جیسی وہ بیٹی، اور میں نے اس کا نام رکھا ''مریم'' اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

شیطان مردود سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(چنانچہ اللہ کے دُعا سننے کا وہ واقعہ یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا تھا کہ: ''یا ربّ! میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لئے وقف رکھوں گی۔ میری اس نذر کو قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' ﴿۳۵﴾ پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ (حسرت سے) کہنے لگیں: ''یا ربّ! یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے'' ـــــ حالانکہ اللہ کو خوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے ـــــ ''اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا۔ میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے حفاظت کے لئے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔'' ﴿۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ عمران (پدرِ مریم) کی بی بی نے (حالتِ حمل میں حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں نے نذر (یعنی منّت) مانی ہے آپ (کی عبادت) کے لئے اس بچے کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ (خانۂ خدا کی خدمت کے واسطے) آزاد (فارغ) رکھا جائے گا (اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی) سو آپ (اس کو) مجھ سے قبول کر لیجئے، بے شک آپ خوب سننے والے، خوب جاننے والے ہیں (کہ میری عرض کو سن رہے ہیں، اور میری نیت کو جان رہے ہیں)۔ پھر جب (ان بی بی نے) لڑکی جنی (تو ان کو رَنج ہوا کہ یہ تو خدمتِ بیت المقدس کے لائق نہیں، یہ کام تو مردوں کا ہے، اس لئے حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو حمل لڑکی جنی (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں) حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں (اس لڑکی کی شان) کو جو انہوں نے جنی اور (کسی طرح بھی) وہ لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں (ہوسکتا تھا، بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات و برکات عجیب و غریب ہوں گے، یہ اِرشادِ خداوندی بطور جملۂ معترضہ کے تھا، پھر ان بی بی کا قول ہے) اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اُس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ (اور حفاظت) میں دیتی ہوں شیطان مرُدود سے۔

معارف و مسائل

انبیائے سابقین علیہم السلام کی شریعت میں ایک طریقہ عبادت کا یہ بھی تھا کہ اپنی اولاد میں سے کسی بچے کو اللہ کے

لئے مخصوص کردیں کہ اس سے دُنیا کی کوئی خدمت نہ لیں، حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے اسی قاعدہ کے مطابق اپنے حمل کے متعلق یہ منّت مان لی کہ اس کو خاص بیت المقدس کی خدمت کے لئے رکھوں گی، دُنیا کے کام میں نہ لگاؤں گی، مگر جب حمل سے لڑکی پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے افسوس کیا کہ لڑکی تو یہ کام نہیں کرسکتی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے اِخلاص کی برکت سے اُس لڑکی ہی کو قبول فرمالیا، اور اس کی شان ساری دُنیا کی لڑکیوں سے ممتاز کردی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کو اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک گونہ ولایت حاصل ہے، کیونکہ اگر ماں کو بچے پر ولایت حاصل نہ ہوتی تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نذر نہ مانتیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ ماں کو بھی حق ہے کہ اپنے بچے کا نام خود تجویز کرے۔ (جصّاص)[1]

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

پھر قبول کیا اس کو اس کے ربّ نے اچھی طرح کا قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا، اور سپرد کی زکریا کو،

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ

جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس کچھ کھانا، کہا: اے مریم!

اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ

کہاں سے آیا تیرے پاس یہ؟ کہنے لگی: یہ اللہ کے پاس سے آتا ہے، اللہ رِزق دیتا ہے جس کو چاہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

بے قیاس۔

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ اس کے ربّ نے اس (مریم) کو بطریقِ اَحسن قبول کیا اور اسے بہترین طریقے سے پروان چڑھایا۔ اور

[1] احکام القرآن للجصاص فی احکام سورۃ آل عمران ج:۳ ص:۳۹۵

زکریا اس کے سرپرست بنے۔ جب بھی زکریا ان کے پاس ان کی عبادت گاہ میں جاتے، ان کے پاس کوئی رزق پاتے۔ انہوں نے پوچھا: "مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟" وہ بولیں: "اللہ کے پاس سے! اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" (۳۷)

خلاصۂ تفسیر

(حاصل یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس میں پہنچیں اور وہاں کے مجاورین وعابدین سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے، جا کر کہا کہ اس لڑکی کو میں نے خاص خدا کے لئے مانا ہے، اس لئے میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی، سو اس کو لائی ہوں، آپ لوگ رکھئے۔

حضرت عمران اس مسجد کے اِمام تھے، اور حالتِ حمل میں ان کی وفات ہو چکی تھی، ورنہ سب سے زیادہ مستحق ان کے لینے کے وہ تھے، لڑکی کے باپ بھی تھے اور مسجد بیت المقدس کے اِمام بھی، اس لئے بیت المقدس کے مجاورین وعابدین میں سے ہر شخص ان کو لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ترجیح کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں اُن کی خالہ ہیں اور وہ بمنزلۂ ماں کے ہوتی ہے، اس لئے بعد ماں کے وہی رکھنے کی مستحق ہے، مگر اور لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے، آخر قرعہ اندازی پر اِتفاق قرار پایا، اور صورت قرعہ کی بھی عجیب وغریب خلافِ عادت ٹھہری، جس کا بیان آگے آئے گا، اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کامیاب ہوئے۔

چنانچہ حضرت مریم علیہا السلام ان کو مل گئیں، اور انہوں نے بعض روایات کے مطابق ایک انّا کو نوکر رکھ کر دُودھ پلوایا، اور بعض روایات میں ہے کہ دُودھ پینے کی اُن کو حاجت ہی نہیں ہوئی، غرض وہ خود اُٹھنے بیٹھنے لگیں، ان کو مسجد کے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا، جب کہیں جاتے اس کو قفل لگا کر جاتے، پھر آ کر کھول لیتے، اسی قصے کا ذِکر مختصر آگے آتا ہے، یعنی) پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رَبّ نے بطریقِ اَحسن قبول فرمالیا اور عمدہ طور پر ان کو نشوونما دیا، اور (حضرت) زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا، جب کبھی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس (اسی) عمدہ مکان میں (جس میں اُن کو رکھا تھا) تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں (جبکہ مکان مقفل ہے، باہر سے کسی کے آنے جانے کا اِمکان نہیں) وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (جو خزانۂ غیب ہے اس میں) سے آئیں، بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے اِستحقاق رِزق عطا فرماتے ہیں (جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا)۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ

وہیں دُعا کی زکریا نے اپنے رَبّ سے، کہا: اے رَبّ میرے! عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ،

اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

بے شک تو سننے والا ہے دُعا کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس موقع پر زکریا نے اپنے رَبّ سے دُعا کی، کہنے لگے: "یا رَبّ! مجھے خاص اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما دے۔ بیشک تو دُعا کا سننے والا ہے۔" ﴿۳۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت میں غیر معمولی نشاناتِ قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دُعا فرمائی، جن کا بیان یہ ہے):-

اس موقع پر دُعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رَبّ سے عرض کیا کہ اے میرے رَبّ! عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد، بے شک آپ بہت سننے والے ہیں دُعا کے۔

معارف و مسائل

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا، حضرت زکریا علیہ السلام کے اس وقت تک اولاد نہ تھی، اور زمانہ بڑھاپے کا آ گیا تھا، جس میں عادۃً اولاد نہیں ہو سکتی، اگرچہ خرقِ عادت کے طور پر قدرتِ خداوندی کا ان کو پورا اعتقاد تھا کہ وہ ذات اس بڑھاپے کے موقع میں بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی ایسی عادت آپ نے مشاہدہ نہیں کی تھی کہ وہ بے موقع اور بے موسم چیزیں عطا کرتا ہے اس لئے آپ کو اولاد کے لئے دُعا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن اس وقت جب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بے موسم میوے عطا فرمائے ہیں تو اَب آپ کو بھی سوال کرنے کی جرأت ہوئی، کہ جو قادرِ مطلق بے موقع پھل عطا کر سکتا ہے وہ بے موقع اولاد بھی عطا کرے گا۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دُعا کرنا انبیاء اور صالحین کی سنت ہے۔

ایک دُوسری آیت میں حق تعالیٰ کا اِرشاد ہے: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (الرعد:۳۸) یعنی ''جس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیویاں اور اولاد عطا کی گئیں، اسی طرح یہ نعمت انبیائے سابقین علیہم السلام کو بھی دی گئی تھی۔'' اب اگر کوئی شخص کسی ذریعے سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف فطرت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرے گا بلکہ انبیاء علیہم السلام کی ایک مشترک اور متفق علیہ سنت سے بھی محروم ہوگا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح اور اولاد کے مسئلے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ آپ نے اس شخص کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اِجازت نہیں دی جو بیاہ شادی اور اولاد سے باوجود قدرت کے اِعراض کرتا ہو، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:-

۱- اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ۔ [۱]

''نکاح میری سنت ہے۔''

۲- فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ [۲]

''جو میری سنت سے اِعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

۳- تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ۔ [۳]

''تم خاوند سے دوستی رکھنے والی اور بہت جننے والی سے نکاح کرو، کیونکہ تمہاری کثرت کی وجہ سے میں دُوسری اُمتوں پر فخر کروں گا۔''

ایک دُوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو اولاد اور بیوی کے حصول اور ان کے نیک صالح ہونے کے لئے اپنے اللہ سے دُعائیں کرتے ہیں، چنانچہ اِرشادِ باری ہے:-

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان:۷۴)

''یعنی اللہ کے فرمانبردار لوگ ایسے ہیں جو یہ دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں بیوی بچے ایسے عنایت فرما جنہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور قلب مسرور ہو۔''

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ یہاں آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد یہ ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو اللہ تعالیٰ کی

[۱] سنن ابن ماجة، ابواب النكاح، باب ما جاء في فضل النكاح ج:۱ ص:۱۳۳

[۲] مصنّف عبدالرزاق ج:۲ ص:۱٦٧

[۳] سنن ابي داوٗد، كتاب النكاح، باب في تزويج الأبكار ج:۱ ص:۲۸۰

اِطاعت میں مشغول دیکھے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمِّ سلیم نے درخواست کی کہ آپ اپنے خادم "انس" کے لئے کوئی دُعا فرمائیں تو آپ نے اُن کے لئے یہ دُعا کی:-

اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَبَارِكْ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتَهٗ۔ [1]

"یعنی اے اللہ! اس (انس) کے مال اور اولاد کو زیادہ کر، اور اس چیز میں برکت عطا کر جو کہ آپ نے اس کو عطا کی ہے۔"

اسی دُعا کا اثر تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اولاد سو کے قریب ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت بھی عطا فرمائی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ

پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا

یحییٰ کی جو گواہی دے گا اللہ کے حکم کی اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جاوے گا اور نبی ہوگا

مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

صالحین سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ (ایک دن) جب زکریا عبادت گاہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ: "اللہ آپ کو یحییٰ کی (پیدائش) کی خوشخبری دیتا ہے جو اس شان سے پیدا ہوں گے کہ اللہ کے ایک کلمے کی تصدیق کریں گے، لوگوں کے پیشوا ہوں گے، اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر روکے ہوئے ہوں گے، اور نبی ہوں گے اور ان کا شمار راست بازوں میں ہوگا۔" ﴿۳۹﴾

[1] صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب قول الله تعالىٰ وصلّ عليهم إلخ ج:۲ ص:۹۳۸

خلاصۂ تفسیر

پس پکار کر کہا اس سے فرشتوں نے جبکہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ (نام بیٹا عطا ہونے) کی جن کے اَحوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور (دُوسرے) مقتدائے (دِین) ہوں گے اور (تیسرے) اپنے نفس کو (لذّات سے) بہت روکنے والے ہوں گے اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے اور (پانچویں) اعلیٰ درجے کے شائستہ ہوں گے۔

معارف ومسائل

كَلِمَةُ اللهِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلافِ عادت بلا واسطہ باپ کے پیدا کئے گئے۔

حَصُوْرًا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو لذّات سے بہت روکنے والے تھے، اور لذّات سے روکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا بھی داخل ہے، مثلاً اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا، اس صفت کو موقعِ مدح میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے، حالانکہ احادیث سے نکاح کی فضیلت ثابت ہے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سی ہو کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبے کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو، ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے، اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: "مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ"، یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور زوجیت کے حقوق ادا کرسکتا ہو، تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے، ورنہ نہیں۔ (بیان القرآن) [1]

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ

کہا: اے رَبّ! کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے، فرمایا:

[1] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۶

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿٤٠﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ

اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے۔ کہا: اے رَبّ! مقرر کر میرے لئے کچھ نشانی، فرمایا:

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا

نشانی تیرے لئے یہ ہے کہ نہ بات کرے گا تو لوگوں سے تین دن مگر اِشارے سے، اور یاد کر اپنے رَبّ کو بہت

وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾ ع

اور تسبیح کر شام اور صبح۔

آسان ترجمۂ قرآن

زکریا نے کہا: "یا رَبّ! میرے یہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ مجھے بڑھاپا آ پہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟" اللہ نے کہا: "اسی طرح! اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" ﴿٤٠﴾ انہوں نے کہا: "پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی مقرّر کر دیجئے۔" اللہ نے کہا: "تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ تم تین دِن تک اِشاروں کے سوا کوئی بات نہیں کر سکو گے۔ اور اپنے رَبّ کا کثرت سے ذِکر کرتے رہو، اور ڈھلے دِن کے وقت بھی اور صبح سویرے بھی اللہ کی تسبیح کیا کرو۔" ﴿٤١﴾

خلاصۂ تفسیر

(حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے (جنابِ باری میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آ پہنچا، اور میری بی بی بھی (بڑھاپے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہو جاوے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ اِرادہ کریں کر دیتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار! (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرّر فرما دیجئے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہو گیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم، لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز (ہاتھ یا سر وغیرہ کے) اِشارہ کے (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں اُمید ہے) اور (اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذِکر اللہ پر قادر ہو گے سو) اپنے رَبّ کو (دِل سے بھی) بکثرت یاد کی جیو اور (زبان سے بھی) تسبیح (وتقدیس)

کی جیو دِن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی (کیونکہ ذِکراللہ کی قدرت اس وقت بھی پوری رہے گی)۔

معارف ومسائل

حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا اور اس کی حکمت

اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ ، حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرتِ خداوندی کے معتقد بھی تھے اور نمونہ کا مکرّر مشاہدہ بھی کر چکے تھے اور خود ہی درخواست کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہوگیا تھا، پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ کس طرح لڑکا ہوگا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ مقصود سوال سے کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی کی جو حالتِ موجودہ ہے کہ دونوں خوب بوڑھے ہیں، یہی حالت رہے گی یا کچھ اس میں تبدیلی کی جاوے گی، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے، اور اسی حالت میں تمہارے اولاد ہوگی، اب اس میں کوئی اِشکال نہ رہا۔ (بیان القرآن) [۱]

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانی معلوم کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ہمیں جلدی خوشی ہو، اور بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی شکر میں مشغول ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نشانی عطا کی کہ آپ تین دن تک لوگوں سے سوائے اِشارے کے کوئی کلام نہیں کرسکیں گے۔

اس نشانی میں لطافت یہ ہے کہ نشانی کی درخواست سے جو اُن کا مقصود تھا کہ شکر اَدا کریں، نشانی ایسی تجویز کی گئی کہ بجز اس مقصود کے دُوسرے کام ہی کے نہ رہیں گے، سو نشانی کی نشانی ہوگئی، اور مقصود کا مقصود بدرجۂ اَتم حاصل ہوگیا۔ (بیان القرآن) [۲]

اِلَّا رَمْزًا ؕ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کلام کرنا متعذّر ہو تو اِشارہ قائم مقام کلام کے سمجھا جائے گا، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گونگی باندی سے سوال کیا کہ "اَيْنَ اللّٰهُ؟" اللہ کہاں ہے؟ تو اس نے آسمان کی طرف اِشارہ کیا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ یہ باندی مسلمان ہے۔ (قرطبی) [۳]

---

[۱] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۷

[۲] بحوالہ بالا۔

[۳] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب تحريم الكلام في الصلاة إلخ ج:۱ ص:۲۰۴

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ

اور جب فرشتے بولے: اے مریم! اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنادیا اور پسند کیا تجھ کو

عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ

سب جہان کی عورتوں پر۔ اے مریم! بندگی کر اپنے رَبّ کی اور سجدہ کر اور رُکوع کر

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

ساتھ رُکوع کرنے والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اب اس وقت کا تذکرہ سنو) جب فرشتوں نے کہا تھا کہ: ''اے مریم! بیشک اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزگی عطا کی ہے اور دُنیا جہان کی ساری عورتوں میں تمہیں منتخب کر کے فضیلت بخشی ہے ﴿۴۲﴾ اے مریم! تم اپنے رَبّ کی عبادت میں لگی رہو، اور سجدہ کرو اور رُکوع کرنے والوں کے ساتھ رُکوع بھی کیا کرو۔'' ﴿۴۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے) کہا: اے مریم! بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے اور (تمام ناپسندیدہ افعال و اخلاق سے) پاک بنایا ہے اور (مقبول فرمانا کچھ ایک دو عورتوں کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس زمانے کی) تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلے میں منتخب فرمایا ہے، (اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ) اے مریم! اِطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ (یعنی نماز ادا) کیا کرو اور (نماز میں) رُکوع (بھی) کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رُکوع کرنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ سے مراد اس زمانے میں تمام جہان کی عورتیں ہیں، اس لئے حدیث میں

"سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَاطِمَةُ" کا اِرشاد اس کے منافی نہیں۔

وَارْكَعِي مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ یہاں وَارْكَعِي کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کی قید ذکر کی گئی، لیکن وَاسْجُدِي کے ساتھ مَعَ السّٰجِدِيْنَ کی قید ذِکر نہیں کی گئی، اس سے بظاہر اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ رُکوع کرنے میں لوگ عموماً اِہتمام نہیں کرتے بلکہ معمولی سا جھک کر اُٹھ جاتے ہیں، اس قسم کا رُکوع قیام کے قریب زیادہ ہوتا ہے، اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے راکعین کی قید ذِکر کر کے لوگوں کے لئے ایک نمونہ بتلا دیا کہ تمہارا رُکوع کامل رُکوع کرنے والوں جیسا ہونا چاہئے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ

یہ خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو، اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب ڈالنے لگے

أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اپنے قلم کہ کون پرورش میں لے مریم کو، اور تو نہ تھا اُن کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کے ذریعے تمہیں دے رہے ہیں۔ تم اُس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب وہ یہ طے کرنے کے لئے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا، اور نہ اس وقت تم ان کے پاس تھے جب وہ (اس مسئلے میں) ایک دُوسرے سے اِختلاف کر رہے تھے ﴿۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

یہ قصے (جو اُوپر مذکور ہوئے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِعتبار سے بوجہ اس کے کہ آپ کے پاس کوئی ذریعہ ظاہری ان کے معلوم کرنے کا نہ تھا) من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں جن کی وحی بھیجتے ہیں ہم آپ کے پاس (اس کے ذریعے سے آپ یہ خبریں معلوم کر کے اوروں کو بتلاتے ہیں) اور (ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت مریم علیہا السلام کے رکھنے میں اِختلاف کر رہے تھے جس کا فیصلہ اَخیر میں قرعہ پر قرار پایا تھا) آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے (اور صورت قرعہ نکلنے کی یہ قرار پائی تھی کہ جس کا قلم پانی کی

حرکت کے خلاف اُلٹا بہہ جاوے وہ مستحق سمجھا جاوے، سوقرعہ سے غرض اس اَمر کا طے کرنا تھا) کہ ان سب میں کون شخص حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت (پرورِش) کرے، (پس آپ نہ تو اس وقت موجود تھے) اور نہ آپ ان کے پاس اُس وقت موجود تھے جبکہ وہ لوگ (قبل قرعہ اس مقدمے میں) باہم اِختلاف کررہے تھے (جس کے رفع کی ضرورت کے لئے یہ قرعہ قرار پایا، اور ان خبروں کے دریافت ہونے کے لئے دُوسرے وسائط کا نہ ہونا بھی یقیناً معلوم ہے، پس ایسی حالت میں یہ غیبی خبریں آپ کی نبوّت کی دلیل ہیں)۔

معارف ومسائل

مسئلہ: - شریعتِ محمدیہ میں حنفیہ کے مسلک پر قرعہ کا یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب شرع میں معلوم ومتعین ہیں ان میں قرعہ ناجائز وداخلِ قمار ہے، مثلاً شئ مشترک میں جس کا نام نکل آئے وہ سب لے لے، یا جس بچے کے نسب میں اِختلاف ہو، اس میں جس کا نام نکل آوے وہی باپ سمجھا جاوے، اور جن حقوق کے اسباب رائے کے سپرد ہوں اُن میں قرعہ جائز ہے، مثلاً مشترک مکان کی تقسیم میں قرعہ سے زید کو شرقی حصہ دے دینا اور عمرو کو غربی حصہ دے دینا، یہ اس لئے جائز ہے کہ بلاقرعہ بھی ایسا کرنا اِتفاقِ شریکین سے یا قضائے قاضی سے جائز تھا۔ (بیان القرآن) [1]

یا یوں کہئے کہ جہاں سب شریکوں کے حقوق مساوی نہ ہوں وہاں کوئی ایک جہت ایک شخص کے لئے متعین کرنے کے واسطے قرعہ اندازی جائز ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ

جب کہا فرشتوں نے: اے مریم! اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی جس کا نام مسیح ہے

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ

عیسیٰ مریم کا بیٹا مرتبے والا دُنیا میں اور آخرت میں، اور اللہ کے مقربوں میں، اور باتیں کرے گا

النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾

لوگوں سے جبکہ ماں کی گود میں ہوگا اور جبکہ پوری عمر کا ہوگا، اور نیک بختوں میں ہے۔

[1] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۱۸

آسان ترجمۂ قرآن

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب فرشتوں نے مریم سے کہا تھا کہ: ''اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمے کی (پیدائش) کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، جو دُنیا اور آخرت دونوں میں صاحبِ وجاہت ہوگا، اور (اللہ کے) مقرّب بندوں میں سے ہوگا ﴿۴۵﴾ اور وہ گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرے گا اور بڑی عمر میں بھی، اور راست باز لوگوں میں سے ہوگا۔'' ﴿۴۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی) کہا کہ اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی جو بلا واسطہ باپ کے پیدا ہونے کے سبب کلمۃ اللہ کہلاوے گا) اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ) با آبرو ہوں گے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) دُنیا میں (بھی کہ ان کو نبوّت عطا ہوگی) اور آخرت میں (بھی کہ اپنی اُمت کے مؤمنین کے باب میں مقبول الشفاعت ہوں گے) اور (جیسے ان میں نبوّت وشفاعت کی صفت ہوگی، جس کا تعلق دُوسروں سے بھی ہے، اسی طرح ذاتی کمال کے ساتھ بھی موصوف ہوں گے) من جملہ مقربین (عنداللہ) ہوں گے اور (صاحبِ معجزہ بھی ہوں گے) آدمیوں سے (دونوں حالت میں یکساں) کلام کریں گے، گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں بھی) اور بڑی عمر میں (بھی دونوں کلاموں میں تفاوت نہ ہوگا) اور (اعلیٰ درجے کے) شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

معارف ومسائل

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دلیل بڑی عمر میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام معجزہ ہی ہے

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی بتلائی ہے کہ وہ بچپن کے گہوارے میں جب کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس حالت میں بھی کلام کریں گے، جیسا دُوسری آیت میں مذکور ہے کہ جب لوگوں نے ابتدائے ولادت کے بعد حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت کی بنا پر لعن طعن کیا تو یہ نومولود بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول

اُٹھے: اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ (مریم:۳۰) اِلخ۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جب وہ کہل یعنی ادھیڑ عمر کے ہوں گے، اس وقت بھی لوگوں سے کلام کریں گے، یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بچپن کی حالت میں کلام کرنا تو ایک معجزہ اور نشانی تھی اس کا ذِکر تو اس جگہ کرنا مناسب ہے، مگر ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام کرنا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان مؤمن کافر، عالم جاہل کیا ہی کرتا ہے، یہاں اس کو بطورِ وصفِ خاص ذِکر کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو ''بیان القرآن'' کے خلاصۂ تفسیر سے سمجھ میں آیا، کہ مقصد اصل میں حالتِ بچپن ہی کے کلام کا بیان کرنا ہے، اس کے ساتھ بڑی عمر کے کلام کا ذِکر اس غرض سے کیا گیا کہ ان کا بچپن کا کلام بھی ایسا نہیں ہوگا جیسے بچے اِبتدا میں بولا کرتے ہیں، بلکہ عاقلانہ، عالمانہ، فصیح و بلیغ کلام ہوگا، جیسے ادھیڑ عمر کے آدمی کیا کرتے ہیں، اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعے اور اس کی پوری تاریخ پر غور کیا جائے تو اس جگہ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا تذکرہ ایک مستقل عظیم فائدے کے لئے ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اور قرآنی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زِندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا ہے۔

روایات سے یہ ثابت ہے کہ ان کو اُٹھانے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تقریباً تیس پینتیس[1] سال کے درمیان تھی جو عین عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا، ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کہل کہتے ہیں، وہ اس دُنیا میں ان کی ہوئی ہی نہ تھی، اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام جبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ پھر دُنیا میں تشریف لائیں، اس لئے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہی ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ

بولی: اے رَبّ! کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی بشر نے؟ فرمایا: اسی طرح اللہ

يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

پیدا کرتا ہے جو چاہے، جب اِرادہ کرتا ہے کسی کام کا تو یہی کہتا ہے اس کو کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔

[1] دیکھئے تفسیر قرطبی ج:۲ ص:۹۱۔ لیکن محقق علمائے کرام کی ایک تعداد کی رائے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھائے جانے کے وقت ان کی عمر اَسّی سال تھی۔ ملاحظہ فرمائیے: الجواب الفصیح از مولانا بدرِ عالم میرٹھی۔ محمد تقی عثمانی ۱۴/ ۴/ ۱۴۲۶ھ

آسان ترجمۂ قرآن

مریم نے کہا: ''پروردگار! مجھ سے لڑکا کیسے پیدا ہو جائے گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں؟'' اللہ نے فرمایا: ''اللہ اسی طرح جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے کہ ''ہو جا'' بس وہ ہو جاتا ہے ﴿۴۷﴾

خلاصۂ تفسیر

حضرت مریم علیہا السلام بولیں: اے میرے پروردگار! کس طرح ہوگا میرے بچہ حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے (صحبت کے طور پر) ہاتھ نہیں لگایا (اور کوئی بچہ جائز طریق سے عادۃً بدون مرد کے پیدا نہیں ہوتا، تو معلوم نہیں کہ ویسے ہی محض قدرتِ خداوندی سے بچہ ہوگا یا مجھ کو نکاح کا حکم کیا جائے گا) اللہ تعالیٰ نے (جواب میں فرشتے کے واسطے سے) فرمایا: ایسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے صرف ان کا چاہنا کافی ہے، کسی واسطے یا سببِ خاص کی ان کو حاجت نہیں، اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ (موجود) ہو جا، بس وہ چیز (موجود) ہو جاتی ہے (پس جس چیز کو بلا اسباب و وسائط موجود ہونے کو کہہ دیا وہ اسی طرح ہو جاتی ہے)۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ ج وَرَسُوْلًا

اور سکھادے گا اس کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور توراۃ اور انجیل۔ اور کرے گا اس کو پیغمبر

اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۵ لا اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ لا اَنِّىْٓ اَخْلُقُ

بنی اسرائیل کی طرف، بے شک میں آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لے کر تمہارے رَبّ کی طرف سے کہ میں بنا دیتا ہوں

لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ج

تم کو گارے سے پرندے کی شکل پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو ہو جاتا ہے وہ اُڑتا جانور اللہ کے حکم سے،

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ

اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے، اور بتادیتا ہوں تم کو

بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ

جو کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں، اس میں نشانی پوری ہے تم کو اگر

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ

تم یقین رکھتے ہو۔ اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو توراۃ ہے اور اس واسطے کہ حلال کردوں تم کو

بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

بعضی وہ چیزیں جو حرام تھیں تم پر، اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لے کر تمہارے ربّ کی، سو اللہ سے ڈرو

وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اور میرا کہا مانو۔ بے شک اللہ ہے ربّ میرا اور ربّ تمہارا، سو اس کی بندگی کرو، یہی راہ سیدھی ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہی (اللہ) اس کو (یعنی عیسیٰ ابن مریم کو) کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم دے گا ﴿۴۸﴾ اور اسے بنی اسرائیل کے پاس رسول بنا کر بھیجے گا (جو لوگوں سے یہ کہے گا) کہ: "میں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، (اور وہ نشانی یہ ہے) کہ میں تمہارے سامنے گارے سے پرندے جیسی ایک شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کردیتا ہوں، اور مردوں کو زندہ کردیتا ہوں، اور تم لوگ جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے یا ذخیرہ کر کے رکھتے ہو میں وہ سب بتادیتا ہوں۔ اگر تم ایمان لانے والے ہو تو ان تمام باتوں میں تمہارے لئے (کافی) نشانی ہے ﴿۴۹﴾ اور جو کتاب مجھ سے پہلے آچکی ہے، یعنی توراۃ، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور (اس لئے بھیجا گیا ہوں) تا کہ کچھ چیزیں جو تم پر

حرام کی گئی تھیں، اب تمہارے لئے حلال کر دوں۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ﴿۵۰﴾ بیشک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ یہی سیدھا راستہ ہے (کہ صرف اسی کی عبادت کرو)'' ﴿۵۱﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور اے مریم! اس مولودِ مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ) اللہ ان کو تعلیم فرماویں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (مخصوص) توراۃ اور انجیل اور ان کو (تمام) بنی اسرائیل کی طرف (پیغمبر بنا کر یہ مضمون دے کر) بھیجیں گے کہ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ تا مُّسْتَقِیْمٌ یعنی) میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوّت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے (یقین دِلانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے، پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دُوسرا، تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کھا کرآ) تے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا) بلا شبہ ان (معجزاتِ مذکورہ) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو، اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی توراۃ کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعضی ایسی چیزیں حلال کر دوں جو (شریعتِ موسیٰ علیہ السلام میں) تم پر حرام کر دی گئی تھیں (سو ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہوگی) اور (میرا یہ دعویٰ نسخ بلا دلیل نہیں ہے بلکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوّت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحبِ نبوّت کا قول دعویٰ نسخ میں حجت ہے) حاصل یہ کہ (جب میرا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہو چکا تو میری تعلیم کے موافق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کی مخالفتِ حکم) سے ڈرو اور (دِین کے باب میں) میرا کہنا مانو (اور خلاصہ میری دِینی تعلیم کا یہ ہے کہ) بے شک اللہ تعالیٰ میرے بھی رَبّ ہیں اور تمہارے بھی رَبّ ہیں (یہ تو حاصل ہے تکمیلِ عقیدہ کا) سو تم لوگ اس (رَبّ) کی عبادت کرو (یہ حاصل ہوا تکمیلِ عمل کا) بس یہ ہے راہِ راست (دِین کی جس میں عقائد و اعمال دونوں کی تکمیل ہو، اسی سے نجات و وصول اِلی اللہ میسر ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

مسئلہ:- پرندے کی شکل بنانا تصویر تھا جو اُس شریعت میں جائز تھا، ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہو گیا۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر، بولا: کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ

کہا حواریوں نے: ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم یقین لائے اللہ پر، اور تو گواہ رہ کہ

بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا

ہم نے حکم قبول کیا۔ اے ربّ! ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اُتاری اور ہم تابع ہوئے رسول کے، سو تو لکھ لے ہم کو

مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

ماننے والوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ وہ کفر پر آمادہ ہیں، تو انہوں نے (اپنے پیروؤں سے) کہا: ''کون کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہوں؟'' حواریوں نے کہا: ''ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لاچکے ہیں، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرماں بردار ہیں ﴿۵۲﴾ اے ہمارے ربّ! آپ نے جو کچھ نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی اِتباع کی ہے، لہٰذا ہمیں ان لوگوں میں لکھ لیجئے جو (حق کی) گواہی دینے والے ہیں۔'' ﴿۵۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(غرض بشارتِ مذکورہ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شان سے پیدا ہوئے، اور بنی اسرائیل سے مضمونِ مذکورہ کی گفتگو ہوئی، اور معجزات ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپ کی نبوّت کے منکر رہے) سو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے اِنکار دیکھا (اور اِنکار کے ساتھ درپے اِیذا بھی، اور اِتفاقاً کچھ لوگ ان کو ایسے ملے جو ''حواریین'' کہلاتے تھے) تو (اُن حواریین سے) آپ نے فرمایا: کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (دینِ حق میں بمقابلہ مخالفین ومنکرین کے) میرے

مددگار رہو جاویں اللہ کے واسطے (جس سے دعوتِ دین میں مجھے کوئی ایذا نہ پہنچائے) حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے (دین کے) ہم اللہ تعالیٰ پر (حسبِ دعوت آپ کے) ایمان لائے اور آپ اس (بات) کے گواہ رہئے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرمانبردار ہیں (پھر زیادتِ اہتمام وتوثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے ہمارے رَبّ! ہم اِیمان لائے ان چیزوں (یعنی اُن اَحکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اِختیار کی ہم نے (ان) رسول کی سو (ہمارا ایمان قبول فرما کر) ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو (مضامینِ مذکورہ کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی مؤمنینِ کاملین کے زُمرے میں ہمارا بھی شمار فرمائیے)۔

معارف ومسائل

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ لفظ حواری، حَوَر سے مأخوذ ہے، جس کے معنے لغت میں سفیدی کے ہیں، اِصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کو ان کے اِخلاص اور صفائیٔ قلب کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے ''حواری'' کا لقب دیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو ''صحابی'' کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے حواریین کی تعداد بارہ بتلائی ہے، اور کبھی لفظ ''حواری'' مطلقاً مددگار کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے، اسی معنی سے ایک حدیث میں اِرشاد ہے کہ ہر نبی کا کوئی حواری یعنی مخلص ساتھی ہوتا ہے، میرے حواری زُبیر ہیں۔[1] (تفسیر قرطبی)

فائدۂ مہمّہ

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جب لوگوں کا کفر اور مخالفت محسوس ہوئی اس وقت مددگاروں کی تلاش ہوئی تو فرمایا: مَنْ اَنْصَارِيْٓ ابتدا میں نبوّت کا منصبی کام اور دعوت شروع کرتے وقت تنہا ہی تعمیلِ حکم کے لئے کھڑے ہوگئے تھے، پہلے سے کسی پارٹی یا جماعت بنانے کی فکر میں نہیں پڑے، جب ضرورت پیش آئی تو جماعت سی بن گئی، غور کیا جائے تو ہر کام ایسے ہی عزم وہمت کو چاہتا ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ ۵۴ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى

اور مکر کیا اُن کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ جس وقت کہا اللہ نے: اے عیسیٰ!

[1] صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب فضل الطليعة ج:۱ ص:۳۹۹

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ

میں لے لوں گا تجھ کو اور اُٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کردوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ

ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں سے جو اِنکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک، پھر میری طرف ہے

مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

تم سب کو پھر آنا، پھر فیصلہ کردوں گا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ان کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی، اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾ (اس کی تدبیر اس وقت سامنے آئی) جب اللہ نے کہا تھا کہ: ''اے عیسیٰ! میں تمہیں صحیح سالم واپس لے لوں گا، اور تمہیں اپنی طرف اُٹھالوں گا، اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے ان (کی ایذا) سے تمہیں پاک کردوں گا۔ اور جن لوگوں نے تمہاری اِتباع کی ہے، ان کو قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب رکھوں گا جنہوں نے تمہارا اِنکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، اس وقت میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اِختلاف کرتے تھے۔ ﴿۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اِسرائیل میں سے آپ کے منکرِ نبوّت تھے آپ کو ہلاک کرنے اور اِیذا پہنچانے کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر وحیلہ سے آپ کو گرفتار کرکے سولی دینے پر آمادہ ہوئے) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی (جس کی حقیقت کا اُن لوگوں کو بھی پتہ نہ لگا، کیونکہ انہیں مخالفین میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل پر بنادیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا جس سے وہ محفوظ رہے، اور وہ ہم شکل سولی دیا گیا، ان لوگوں کو اس تدبیر کا علم تک بھی نہ ہوسکا اور دفع پر تو کیا قدرت ہوتی) اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں

(کیونکہ اوروں کی تدبیریں ضعیف ہوتی ہیں، اور کبھی قبیح اور بے موقع بھی ہوتی ہیں، اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خیرِ محض اور موافق حکمت کے ہوتی ہیں، اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت متردّد اور پریشان ہوئے) فرمایا: اے عیسیٰ! (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو (اپنے وقتِ موعود پر طبعی موت سے) وفات دینے والا ہوں (پس جب تمہارے لئے موتِ طبعی مقدّر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دُشمنوں کے ہاتھوں دار پر جان دینے سے محفوظ رہوگے) اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالمِ بالا کی) طرف اُٹھائے لیتا ہوں، اور تم کو ان لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں جو (تمہارے) منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روزِ قیامت تک (گو اس وقت یہ منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں) پھر (جب قیامت آجائے گی اس وقت) میری طرف ہوگی سب کی واپسی (دُنیا و برزخ سے) سو میں (اس وقت) تمہارے (سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کردوں گا ان اُمور میں جن میں تم باہم اِختلاف کرتے تھے (کہ من جملہ ان اُمور کے مقدمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا)۔

آیت کے اہم الفاظ کی تشریح

اس آیت کے الفاظ و معانی میں بعض فرقوں نے تحریفات کا دروازہ کھولا ہے جو تمام اُمت کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور آخر زمانے میں نزول کے منکر ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان الفاظ کی تشریح وضاحت کے ساتھ کردی جائے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ لفظ ''مکر'' عربی زبان میں لطیف وخفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور بُرائی کے لئے ہو تو بُرا ہے، اسی لئے وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ (فاطر:٤٣) میں مکر کے ساتھ ''سیّئ'' کی قید لگائی، اُردو زبان کے محاورات میں ''مکر'' صرف سازش اور بُری تدبیر اور حیلے کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے عربی محاورات پر شبہ نہ کیا جائے، اسی لئے یہاں خدا کو ''خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ'' کہا گیا، مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کردیں، حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھر دیئے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے، تورات کو بدلنا چاہتا ہے، سب کو بددِین بنا کر چھوڑے گا، اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا، اُدھر یہ ہو رہا تھا اور اِدھر حق تعالیٰ کی لطیف وخفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذِکر اگلی آیات میں ہے۔ (تفسیرِ عثمانی) [1]

اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ لفظ ''متوفّی'' کا مصدر ''توفّی'' اور مادّہ ''وَفْیٌ'' ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اِعتبار سے

[1] تفسیر عثمانی تحت هٰذه الآية ج:١ ص:١٩٤

پورا پورا لینے کے ہیں۔ وفاء، اِیفاء، اِستیفاء اسی معنی کے لئے بولے جاتے ہیں۔ توفّی کے بھی اصلی معنی پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتبِ لغت عربی زبان کی اس پر شاہد ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اَجلِ مقدّر پوری کر لیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی رُوح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطورِ کنایہ موت کے معنی میں بھی اِستعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآنِ کریم میں اس لفظ کا اِستعمال ہوا ہے، اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (الزمر:۴۲) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آتی ان کی نیند کے وقت۔''

حافظ ابنِ تیمیہؒ نے الجواب الصحیح (ج:۲ ص:۸۳) میں فرمایا: اَلتَّوَفِّيْ فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ مَعْنَاهَا الْقَبْضُ وَالْاِسْتِيفَاءُ وَذٰلِكَ ثَلَاثَةُ اَنْوَاعٍ، اَحَدُهَا التَّوَفِّيْ فِي النَّوْمِ وَالثَّانِيْ تَوَفِّي الْمَوْتِ وَالثَّالِثُ تَوَفِّي الرُّوْحِ وَالْبَدَنِ جَمِيْعًا۔

اور کلیات ابوالبقاء میں ہے: اَلتَّوَفِّيْ اَلْاِمَاتَةُ وَقَبْضُ الرُّوْحِ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ اَوِ الْاِسْتِيْفَاءُ وَاَخْذُ الْحَقِّ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلَغَاءِ۔

اسی لئے آیتِ مذکورہ میں لفظ مُتَوَفِّيْكَ کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ الہندؒ میں مذکور ہے، اس ترجمے کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے، بلکہ خود آپ کو لے لیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھا لیں گے۔

اور بعض حضرات نے اس کا ترجمہ موت دینے سے کیا ہے، جیسا کہ ''بیان القرآن'' کے خلاصے میں اُوپر مذکور ہے، اور یہی ترجمہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسانید صحیحہ کے ساتھ منقول ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس وقت جبکہ یہودی آپ کے قتل کے درپے تھے آپ کی تسلی کے لئے دو لفظ اِرشاد فرمائے، ایک یہ کہ آپ کی موت اُن کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت میں ہوگی، دُوسرا یہ کہ اُس وقت اُن لوگوں کے نرغے سے نجات دینے کی ہم یہ صورت کریں گے کہ آپ کو اپنی طرف اُٹھا لیں گے، یہی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے۔

تفسیر ''دُرِّ منثور'' میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت اس طرح منقول ہے:-

اَخْرَجَ اِسْحَاقُ بْنُ بِشْرٍ وَابْنُ عَسَاكِرٍ مِنْ طَرِيْقِ جَوْهَرٍ عَنِ الضَّحَاكِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ يَعْنِيْ رَافِعُكَ ثُمَّ مُتَوَفِّيْكَ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ۔ [1]

[1] الدر المنثور تحت هذه الآية في آل عمران ج:۲ ص:۳۴۷

''اِسحاق بن بشر اور ابنِ عسا کر نے بروایت جو ہر عن الضحاک حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اُٹھالوں گا، پھر آخر زمانے میں آپ کو طبعی طور پر وفات دُوں گا۔''

اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ''توفی'' کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم وتاخیر ہے، رَافِعُکَ کا پہلے اور مُتَوَفِّیْکَ کا وقوع بعد میں ہوگا، اور اس موقع پر مُتَوَفِّیْکَ کو مقدم ذِکر کرنے کی حکمت ومصلحت اس پورے معاملے کی طرف اِشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے، یعنی یہ اپنی طرف بلالینا ہمیشہ کے لئے نہیں، چند روزہ ہوگا اور پھر آپ اس دُنیا میں آئیں گے اور دُشمنوں پر فتح پائیں گے، اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہوگی، اس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دُنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِعزاز واِکرام کی تکمیل بھی، نیز اس میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیت کا اِبطال بھی تھا، ورنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعے سے ان کا یہ عقیدۂ باطل اور پختہ ہوجاتا کہ وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرح حی وقیوم ہیں، اس لئے پہلے مُتَوَفِّیْکَ کا لفظ اِرشاد فرماکر ان تمام خیالات کا اِبطال کردیا پھر اپنی طرف بلانے کا ذِکر فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ کفار ومشرکین کی مخالفت وعداوت تو انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ ہی ہوتی چلی آئی ہے، اور عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم اپنے اِنکار اور ضد پر جمی رہی، پیغمبر کی بات نہ مانی، ان کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اِیمان نہ لائی، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کی گئی ہے، یا تو اس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کردیا گیا، جیسے عاد وثمود اور قومِ لوط علیہ السلام وقومِ صالح علیہ السلام کے ساتھ معاملہ کیا گیا، یا پھر یہ صورت ہوتی کہ اپنے پیغمبر کو اس دارُالکفر سے ہجرت کراکے کسی دُوسری طرف منتقل کیا گیا اور وہاں ان کو وہ قوت وشوکت دی گئی کہ پھر اپنی قوم پر فتح پائی، حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کرکے شام میں پناہ لی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کرکے علاقۂ شام میں تشریف لائے اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ تشریف لائے، پھر وہاں سے حملہ آور ہوکر مکہ فتح کیا، یہودیوں کے نرغے سے بچانے کے لئے یہ آسمان پر بلالینا بھی درحقیقت ایک قسم کی ہجرت تھی، جس کے بعد وہ پھر دُنیا میں واپس آکر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے۔

رہا یہ معاملہ کہ ان کی یہ ہجرت سب سے الگ آسمان کی طرف کیوں ہے؟ تو حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں خود فرمادیا ہے کہ ان کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش عام مخلوقات کے طریقِ پیدائش سے مختلف بغیر ماں باپ کے ہے، اسی طرح ان کی پیدائش عام اِنسانوں کی پیدائش سے مختلف صورت سے ہوئی، اور موت بھی عجیب وغریب طریقے سے صدہا سال کے بعد دُنیا میں آخر عجیب ہوگی، تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی ہجرت بھی کسی

ایسے عجیب طریقے سے ہو۔

یہی عجائبِ قدرت تو جاہل نصاریٰ کے لئے اس عقیدے میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے، کہ ان کو خدا کہنے لگے، حالانکہ انہی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعے میں ان کی عبدیت و بندگی اور تابعِ فرمانِ الٰہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں، اور اسی لئے ہر ایسے موقع پر قرآنِ حکیم نے عقیدۂ اُلوہیت کے اِبطال کی طرف اِشارہ کر دیا ہے، آسمان پر اُٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا، اس لئے مُتَوَفِّيْكَ کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا، اس تقدیم و تاخیرِ الفاظ کے ذریعے اسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہوگئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے بَری ہوں، ایک وقت آئے گا جب ان کو بھی موت آئے گی۔

اِمام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآنِ کریم میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر اسی طرح کے مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے، اور پہلے ہونے والے واقعے کو بعد میں بیان فرمایا۔ (تفسیر کبیر ج:۲ ص:۴۸۱)

- وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اُٹھالوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف رُوح کا نہیں بلکہ رُوح مع جسم کا ہے، تو رفعِ عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفعِ رُوحانی ہوا، جسمانی نہیں اُٹھایا گیا، بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ "رفع" کبھی بلندیٔ مرتبہ کے لئے بھی اِستعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (الانعام:۱۶۵)، اور يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (المجادلۃ:۱۱) وغیرہ آیات میں مذکور ہے۔

تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ "رفع" کو رفعِ درجہ کے معنی میں اِستعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرائن کی بنا پر مذکورہ آیات میں ہوا، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ "رفع" کے ساتھ لفظ "اِلیٰ" اِستعمال فرما کر اس مجازی معنی کا اِحتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں وَرَافِعُكَ اِلَيَّ فرمایا، اور سورۂ نساء کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدے کا رَدّ کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا: وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ ۙ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ (النساء) یعنی یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اُٹھالیا، اپنی طرف اُٹھالینا رُوح مع جسد کے زِندہ اُٹھالینے ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

یہاں تک الفاظِ آیت کی تشریح ہوئی۔

آیتِ مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے:-

سب سے پہلا وعدہ یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعے نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقتِ موعود پر ہوگی، اور وہ وقتِ موعود قربِ قیامت میں آئے گا، جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ متواترہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، اور اس کا کچھ حصہ آگے آئے گا۔

دُوسرا وعدہ فی الحال عالمِ بالا کی طرف اُٹھا لینے کا تھا، یہ اُسی وقت پورا کردیا گیا جس کے پورا کرنے کی خبر سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح دے دی گئی: وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (النساء) ''یقیناً ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھالیا''۔

تیسرا وعدہ ان کو دُشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، میں وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور یہود کے سب غلط اِلزامات کو صاف کردیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، قرآنِ کریم نے اس اِلزام کو یہ فرما کر صاف کردیا کہ وہ محض اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے بلاباپ کے پیدا ہوئے، اور یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس سے زیادہ تعجب کی چیز ہے، کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعوے کا اِلزام لگاتے تھے، قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس کے خلاف اپنی عبدیت اور بندگی اور بشریت کا اِقرار نقل فرمایا۔

چوتھا وعدہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ میں ہے کہ آپ کے متبعین کو آپ کے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں اِتباع سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کا اِعتقاد اور اِقرار مراد ہے، ان کے سب اَحکام پر اِیمان واِعتقاد کی شرط نہیں، تو اس طرح نصاریٰ اور اہلِ اسلام دونوں اس میں داخل ہوگئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت ورِسالت کے معتقد ہیں، یہ دُوسری بات ہے کہ صرف اتنا اِعتقاد نجاتِ آخرت کے لئے کافی نہیں، بلکہ نجاتِ آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام اَحکام پر اِعتقاد واِیمان رکھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری اَحکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اِیمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر اِعتقاد واِیمان اِختیار نہ کیا، اس لئے نجاتِ آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر بھی عمل کیا، اس لئے نجاتِ آخرت کے مستحق ہوگئے، لیکن دُنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت پر موقوف تھا، وہ دُنیا

کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو بمقابلۂ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقیناً قیامت تک رہے گا۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بمقابلۂ یہود ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انہیں کی حکومتیں دُنیا میں قائم ہوئیں اور رہیں۔

اِسرائیل کی موجودہ حکومت سے اس پر کوئی شبہ نہیں ہوسکتا

کیونکہ اوّل تو اس حکومت کی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ وہ رُوس اور یورپ کے نصاریٰ کی مشترکہ چھاؤنی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف قائم کر رکھی ہے، ایک دن کے لئے بھی اگر حکومتِ رُوس و امریکا و دیگر ممالکِ یورپ اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹالیں تو دُنیا کے نقشے سے اس کا وجود مٹتا ہوا ساری دُنیا مشاہدہ کرلے، اس لئے یہود یا اِسرائیل کی یہ حکومت حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ایک مجاز تو ہوسکتا ہے اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، اور بالفرض اس کو ان کی اپنی ہی حکومت تسلیم کرلیا جائے تو بھی نصاریٰ اور اہلِ اسلام کے مجموعے کے مقابلے میں اس کے مغلوب و مقہور ہونے سے کونسا صحیح العقل اِنسان اِنکار کرسکتا ہے، اس سے بھی قطع نظر کرو تو قربِ قیامت میں چندروزہ یہود کے غلبے کی خبر تو خود اِسلام کی متواتر روایات میں موجود ہے، اگر اس دُنیا کو اب زیادہ باقی رہنا نہیں ہے اور قیامت قریب ہی آچکی ہے تو اس کا ہونا بھی اسلامی روایات کے منافی نہیں، اور ایسی چندروزہ شورش کو سلطنت یا حکومت نہیں کہہ سکتے۔

پانچواں وعدہ قیامت کے روز ان مذہبی اِختلافات کا فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، جیسا کہ آیت میں اِرشاد ہے ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ۔

مسئلۂ حیات ونزولِ عیسیٰ علیہ السلام

دُنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہوکر دفن ہوگئے اور پھر زِندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآنِ کریم نے سورۂ نساء کی آیت میں واضح کردی ہے، اور اس آیت میں بھی وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ میں اس کی طرف اِشارہ کردیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دُشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود اُنہی کی طرف لوٹادیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُنہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کرکے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زِندہ آسمان پر اُٹھالیا، آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النساء:١٥٧)

''نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا، نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیرِ حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا (کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہولئے)۔''

اس کی مزید تفصیل سورۂ نساء میں آئے گی۔

نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہوگئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اُٹھالئے گئے، مذکورہ آیت نے اُن کے اس غلط خیال کی بھی تردید کردی، اور بتلادیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکا عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اس لئے شُبِّہَ لَهُمْ کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہوگئے۔

ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دُوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے آسمان پر زِندہ اُٹھالیا، نہ ان کو قتل کیا جاسکا، نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قربِ قیامت میں آسمان سے نازل ہوکر یہودیوں پر فتح پائیں گے، اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔

اسی عقیدے پر تمام اُمتِ مسلمہ کا اِجماع و اتفاق ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الحبیر ص:۳۱۹ میں یہ اِجماع نقل کیا ہے، قرآن مجید کی متعدّد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اِجماعِ اُمت سے ثابت ہے، یہاں اس کی پوری تفصیل کا موقع بھی نہیں، اور ضرورت بھی نہیں، کیونکہ علمائے اُمت نے اس مسئلے کو مستقل کتابوں اور رِسالوں میں پورا پورا واضح فرمادیا ہے، اور منکرین کے جوابات تفصیل سے دیئے ہیں، ان کا مطالعہ کافی ہے، مثلاً حضرت حجۃ الاسلام مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تصنیف بزبانِ عربی ''عقیدۃ الإسلام فی حیاۃ عیسٰی علیہ السلام''، حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب مہاجر مدنی کی تصنیف بزبانِ اُردو ''حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام''، مولانا سیّد محمد اِدریس صاحب کی تصنیف حیاتِ مسیح علیہ السلام، اور بھی سینکڑوں چھوٹے بڑے رسائل اس مسئلے پر مطبوع و مشتہر ہوچکے ہیں۔ احقر نے بامرِ اُستاذِ محترم حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ سو سے زائد اَحادیث جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زِندہ اُٹھایا جانا اور پھر قربِ قیامت میں نازل ہونا بتواتر ثابت ہوتا ہے ایک مستقل کتاب ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' میں جمع کردیا ہے، جس کو حال میں حواشی و شرح کے ساتھ حلب شام کے ایک بزرگ علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے بیروت میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

اور حافظ ابنِ کثیرؒ نے سورۂ زُخرف کی آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (الزخرف:۶۱) کی تفسیر میں لکھا ہے:-

وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَخْبَرَ بِنُزُوْلِ عِيْسٰى

عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِمَامًا عَادِلًا ...إلخ۔

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل قیامت نازل ہونے کی خبر دی ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے اور زندہ رہنے، پھر قربِ قیامت میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآنِ کریم کی نصوصِ قطعیہ اور احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے، جن کو علمائے اُمت نے مستقل کتابوں، رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے، جن میں سے بعض کے نام اُوپر درج ہیں، مسئلے کی مکمل تحقیق کے لئے تو انہی کی طرف رُجوع کرنا چاہئے۔

یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دِلاتا ہوں جس پر نظر کرنے سے ذرا بھی عقل و انصاف ہو تو اس مسئلہ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کے چوتھے رُکوع میں حق تعالیٰ نے انبیائے سابقین علیہم السلام کا ذِکر فرمایا تو حضرت آدم، نوح، آلِ ابراہیم، آلِ عمران، سب کا ذِکر ایک ہی آیت میں اِجمالاً کرنے پر اِکتفا فرمایا، اس کے بعد تقریباً تین رُکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کا ذِکر اس بسط وتفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذِکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذِکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کا تفصیلی ذِکر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطنِ مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذِکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن وتشنیع، اوّلِ ولادت میں ان کو بطورِ معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، اُن کی مخالفت، حواریین کی اِمداد، یہودیوں کا نرغہ، ان کو زِندہ آسمان پر اُٹھایا جانا وغیرہ، پھر احادیثِ متواترہ میں ان کی مزید صفات، شکل وصورت، ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن وحدیث میں کسی نبی ورسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے، یہ بات ہر انسان کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا ہے؟

ذرا بھی غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ورسول ہیں، کوئی دُوسرا نبی آپ کے بعد آنے والا نہیں، اس لئے آپ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل اُمت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دے دیں، اس لے آپ نے ایک طرف تو اس کا اہتمام فرمایا کہ آپ کے بعد قابلِ اِتباع کون لوگ ہوں گے، ان کا تذکرہ اُصولی طور پر عام اوصاف کے ساتھ بھی بیان فرمایا، بہت سے حضرات کے نام متعین کر کے بھی اُمت کو ان کے اِتباع کی تاکید فرمائی، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے اُمت کے دِین کو خطرہ تھا۔

بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح دجال تھا، جس کا فتنہ سخت گمراہ کن تھا، اس کے اتنے حالات وصفات بیان فرمادیئے کہ اس کے آنے کے وقت اُمت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابلِ اِقتدا بزرگوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے نبوّت ورِسالت سے نوازا، اور فتنۂ دجال میں اُمتِ مسلمہ کی اِمداد کے لئے ان کو آسمان میں زِندہ رکھا، اور قربِ قیامت میں ان کو قتلِ دجال کے لئے مامور فرمایا، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وصفات بھی اُمت کو ایسے واشگاف بتلائے جائیں جن کے بعد نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کسی اِنسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔

اس میں بہت سی حِکَم ومصالح ہیں، اوّل یہ کہ اگر اُمت کو ان کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آیا تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، اُمتِ مسلمہ ان کے ساتھ نہ لگے گی تو وہ اُمت کی اِمداد ونصرت کس طرح فرمائیں گے۔

دُوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ اس وقت فرائضِ نبوّت ورِسالت پر مامور ہوکر دُنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ اُمتِ محمدیہ کی قیادت واِمامت کے لئے بحیثیت خلیفۂ رسول تشریف لائیں گے، مگر ذاتی طور پر جو اُن کو منصبِ نبوّت ورِسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، بلکہ اس وقت ان کی مثال اس گورنر کی سی ہوگی جو اپنے صوبے کا گورنر ہے، مگر کسی ضرورت سے دُوسرے صوبے میں چلا گیا ہے، تو وہ اگرچہ صوبے میں گورنر کی حیثیت پر نہیں مگر اپنے عہدۂ گورنری سے معزول بھی نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی صفتِ نبوّت ورِسالت سے الگ نہیں ہوں گے، اور جس طرح ان کی نبوّت سے اِنکار پہلے کفر تھا، اس وقت بھی کفر ہوگا، تو اُمتِ مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوّت پر قرآنی اِرشادات کی بنا پر اِیمان لائے ہوئے ہے اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو اِنکار میں مبتلا ہوجائے گی، اس لئے ان کی علامات وصفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو دُنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگر ان کی علامات وحالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دُوسرا آدمی دعویٰ کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ بن مریم ہوں، ان علامات کے ذریعے اس کی تردید کی جاسکے گی، جیسا کہ ہندوستان میں مرزا قادیانی نے دعویٰ کیا کہ میں مسیحِ موعود ہوں، اور علمائے اُمت نے انہی علامات کی بنا پر اس کے قول کو رَدّ کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ اور دُوسرے مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وصفات کا اتنی تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود ان کے قربِ قیامت میں نازل ہونے اور دوبارہ دُنیا میں تشریف لانے ہی کی خبر دے رہا ہے، احقر نے اس مضمون کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے رسالے ''مسیحِ موعود کی پہچان'' میں بیان کردیا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ز

سو وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب دُنیا میں اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ

اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام نیک کئے سو ان کو پورا دے گا

اُجُوْرَهُمْ ط وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ

ان کا حق، اور اللہ کو خوش نہیں آتے بے انصاف۔ یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں

وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ ﴿۵۸﴾

اور بیان تحقیقی۔

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ جو لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے کفر اپنالیا ہے، ان کو تو میں دُنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا، اور ان کو کسی طرح کے مددگار میسر نہیں آئیں گے ﴿۵۶﴾ البتہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان کو اللہ ان کا پورا پورا ثواب دے گا، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۵۷﴾ (اے پیغمبر!) یہ وہ آیتیں اور حکمت بھرا ذِکر ہے جو ہم تمہیں پڑھ کر سنا رہے ہیں ﴿۵۸﴾

ربطِ آیات

اُوپر کی آیت میں مذکور تھا کہ "میں ان اِختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے روز عملی فیصلہ کروں گا" اس آیت میں اس فیصلہ کا بیان ہے:-

خلاصۂ تفسیر

تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ (ان اِختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے سو ان کو (ان کے کفر پر) سخت

سزا دُوں گا (مجموعہ دونوں جہان میں) دُنیا میں بھی (کہ وہ تو ہو چکی) اور آخرت میں بھی (کہ وہ باقی رہی) اور ان لوگوں کا کوئی حامی (طرف دار) نہ ہوگا، اور جو لوگ مؤمن تھے اور انہوں نے نیک کام کئے تھے، سوان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کے) ثواب دیں گے اور (کفار کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے (ایسے) ظلم کرنے والوں سے (جو خدا تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں یعنی چونکہ یہ ظلمِ عظیم ہے، معافی کے قابل نہیں، اس لئے مبغوض شدید ہو کر سزایاب ہو جاتا ہے) یہ (قصۂ مذکورہ) ہم تم کو (بذریعہ وحی کے) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ (آپ کے) من جملہ دلائل (نبوّت) کے ہے اور من جملہ حکمت آمیز مضامین کے ہے۔

معارف و مسائل

مصائبِ دُنیا کفار کے لئے کفارہ نہیں ہوتے، مؤمن کے لئے کفارہ ہو کر مفید ہوتے ہیں

فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اس آیت کے مضمون پر ایک خفیف سا اِشکال ہوتا ہے کہ قیامت کے فیصلہ کے بیان میں اس کہنے کے کیا معنی کہ میں دُنیا و آخرت میں سزا دُوں گا، کیونکہ اس وقت تو سزائے دُنیوی نہیں ہوگی۔

حل اس کا یہ ہے کہ اس کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو یہ کہے کہ اس وقت تو ایک سال کی قید کرتا ہوں، اگر جیل خانے میں کوئی شرارت کی تو دو سال کی سزا کروں گا۔ فقط اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ دو سال آج کی تاریخ سے ہوں گے، پس اس بنا پر یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم ہو جاوے گا، حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعے کی تکمیل بطورِ انضمام ایک سال زائد کے مرتب ہو جاوے گی۔

اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ دُنیا میں تو سزا ہو چکی، اس کے ساتھ سزائے آخرت منضم ہو کر مجموعہ قیامت کے روز تکمیل کر دیا جائے گا، یعنی سزائے دُنیا کفارہ نہ ہوگا سزائے آخرت کے لئے، بخلاف اہلِ ایمان کے کہ اگر ان پر دُنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور عاقبت کی عقوبت خفیف یا دفع ہو جاتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کی طرف لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۷ میں اِشارہ فرمایا گیا، یعنی اہلِ ایمان بسبب ایمان کے محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں، اور اہلِ کفر بسبب کفر کے مبغوض ہیں، مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ (بیان القرآن) [1]

---

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۲۴

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ

ہوجا، وہ ہوگیا۔ حق وہ ہے جو تیرا ربّ کہے پھر تو مت رہ شک لانے والوں میں سے۔ پھر جو کوئی

حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا

جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آچکی تیرے پاس خبر سچی تو تو کہہ دے: آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے

وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ

اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان پھر التجا کریں ہم سب

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ

اور لعنت کریں اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں۔ بے شک یہی ہے بیان سچا،

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا

اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے، اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا۔ پھر اگر قبول نہ کریں

فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾ ع

تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے۔

ع ۶ ۱۴ ۹

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے، اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا: ''ہو جاؤ'' بس وہ

ہوگئے ﴿۵۹﴾ حق وہی ہے جو تمہارے رَبّ کی طرف سے آیا ہے، لہٰذا شک کرنے والوں میں شامل نہ ہوجانا ﴿۶۰﴾ تمہارے پاس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعے کا) جو صحیح علم آ گیا ہے اس کے بعد بھی جو لوگ اس معاملے میں تم سے بحث کریں تو ان سے کہہ دو کہ: ''آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، اور ہم اپنے لوگوں کو اور تم اپنے لوگوں کو، پھر ہم سب مل کر اللہ کے سامنے گڑگڑائیں، اور جو جھوٹے ہوں ان پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔'' ﴿۶۱﴾ یقین جانو کہ واقعات کا سچا بیان یہی ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور یقیناً اللہ ہی ہے جو اِقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک ﴿۶۲﴾ پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو اللہ مفسدوں کو اچھی طرح جانتا ہے ﴿۶۳﴾

خلاصۂ تفسیر

بے شک حالتِ عجیبہ (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک (یعنی ان کی تجویزِ اَزَلی میں) مشابہ حالتِ عجیبہ (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے ہے کہ ان (آدم علیہ السلام) کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہوجا، پس وہ (جاندار) ہوگئے، یہ اَمرِ واقعی (جو اُوپر مذکور ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوجایئے۔ پس جو آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے، تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آجاؤ ہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب دِل سے دُعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں۔ بے شک یہ (جو کچھ) مذکور (ہوا) وہی ہے سچی بات، اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے (یہ توحیدِ ذاتی ہوئی) اور بلاشک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں (یہ توحیدِ صفاتی ہوئی) پھر (ان سب حجتوں کے بعد بھی) اگر (حق قبول کرنے سے سرتابی کریں) تو (آپ ان کا معاملہ حوالہ بخدا کیجئے، کیونکہ) بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد کرنے والوں کو۔

معارف ومسائل

قیاس کی حجیت

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس بھی حجتِ شرعیہ سے ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی، یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ

(اور ماں) کے پیدا کیا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر قیاس کرنے کی طرف اشارہ فرما دیا۔ (مظہری)[1]

مباہلہ کی تعریف

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ إلــخ اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مباہلہ کرنے کا حکم دیا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی اَمر کے حق و باطل میں فریقین میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ جو اس اَمر میں باطل پر ہو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت پڑے، کیونکہ لعنت کے معنی رحمتِ حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہوگا وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا، اُس وقت پوری تعیین صادق وکاذب کی منکرین کے نزدیک بھی واضح ہو جائے گی، اس طور پر دُعا کرنے کو ''مباہلہ'' کہتے ہیں، اور اس میں اصل خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دُعا کرنا ہے، اپنے اعزّہ واقارب کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر جمع کیا جائے تو اس سے اور اِہتمام بڑھ جاتا ہے۔

واقعۂ مباہلہ اور رَدِّ روافض

اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کی جانب ایک فرمان بھیجا جس میں تین چیزیں ترتیب وار ذِکر کی گئی تھیں: ۱-اِسلام قبول کرو، ۲-یا جزیہ ادا کرو، ۳-یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ نصاریٰ نے آپس میں مشورہ کر کے شرحبیل، عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن قیس کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، ان لوگوں نے آ کر مذہبی اُمور پر بات چیت شروع کی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت ثابت کرنے میں ان لوگوں نے اِنتہائی بحث وتکرار سے کام لیا، اتنے میں یہ آیتِ مباہلہ نازل ہوئی، اس پر آپ نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی، اور خود بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، اِمام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تیار ہو کر تشریف لائے، شرحبیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا نبی ہے، نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت ہے، بربادی یقینی ہے، اس لئے نجات کا کوئی دُوسرا راستہ تلاش کرو، ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کر لی جائے، چنانچہ اسی پر سب کا اِتفاق ہو گیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جزیہ مقرّر کر کے صلح کر دی، جس کو

[1] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۵۹

انہوں نے بھی منظور کرلیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج:۱) [1]

اس آیت میں اَبْنَآءَنَا سے مراد صرف اولاد صلبی نہیں ہے، بلکہ عام مراد ہے، خواہ اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو، کیونکہ عرفاً ان سب پر اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا اَبْنَآءَنَا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اَبْنَآءَنَا میں داخل کرنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ آپؓ نے تو پرورش بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پائی تھی، آپ نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، اور آپؓ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاد میں داخل ہیں، لہٰذا روافض کا آپؓ کو اَبْنَآءَنَا سے خارج کرکے اور اَنْفُسَنَا میں داخل کرکے آپؓ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا

تو کہہ: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں مگر

اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رَبّ سوائے اللہ کے،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو: گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو! یہود ونصاریٰ سے) کہہ دو کہ: ''اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم تم میں مشترک ہو، (اور وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو رَبّ نہ بنائیں۔'' پھر بھی اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دو: ''گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔'' ﴿۶۴﴾

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۵۴

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مُسلّم ہونے میں) برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دُوسرے کو ربّ قرار نہ دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، پھر اگر (اس کے بعد بھی) وہ لوگ (حق سے) اِعراض کریں تو تم (مسلمان) لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو (اس بات کے) ماننے والے ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)۔

معارف و مسائل

تبلیغ و دعوت کے اہم اُصول

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اس آیت سے تبلیغ و دعوت کا ایک اہم اُصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اِتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رُوم کے بادشاہ ہرقل کو اِسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اِتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، وہ دعوت نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اِلٰی ھِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ، سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی، اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْٓ اَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّ عَلَیْکَ اِثْمُ الْیَرِیْسِیِّیْنَ، یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (بخاری) [1]

"میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے، رُوم کے بادشاہ ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہو اُس شخص کے

---

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی ...الخ ج:۱ ص:۵

لئے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے، بعد اس کے: میں تجھے اسلام کے بلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا، اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دُہرا اجر دے گا، اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب کسانوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں، اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات پر آ کر جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شریک کریں، اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں کو ربّ بنائیں۔"

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ تم گواہ رہو، اس سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اِتمامِ حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہئے، مزید بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ

اے اہلِ کتاب! کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور توراۃ

وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ

اور انجیل تو اُتریں اس کے بعد، کیا تم کو عقل نہیں؟ سنتے ہو تم لوگ جھگڑ چکے

فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

جس بات میں تم کو کچھ خبر تھی، اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں تم کو کچھ خبر نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ

اور تم نہیں جانتے۔ نہ تھا ابراہیم یہودی اور نہ تھا نصرانی لیکن تھا

حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ

حنیف یعنی سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور حکم بردار، اور نہ تھا مشرک۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی

لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

جو ساتھ اس کے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر، اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں بحث کرتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد ہی تو نازل ہوئی تھیں، کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے؟ ﴿۶۵﴾ دیکھو! یہ تم ہی تو ہو جنہوں نے اُن معاملات میں اپنی سی بحث کرلی ہے جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا۔ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرتے ہو جن کا تمہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے؟ اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ﴿۶۶﴾ ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ تو سیدھے سیدھے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے ﴿۶۷﴾ ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی (آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں۔ اور اللہ مؤمنوں کا کارساز ہے ﴿۶۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اے اہلِ کتاب! کیوں حجت کرتے ہو (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں (کہ وہ طریق یہودیت پر تھے یا نصرانیت پر تھے) حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل، مگر ان کے (زمانہ کے بہت) بعد (اور یہ دونوں طریق ان دونوں کتابوں کے نزول کے بعد سے ظاہر ہوئے، پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان طریقوں پر کس طرح ہو سکتے ہیں؟) کیا (ایسی خلافِ عقل بات منہ سے نکالتے ہو اور) پھر سمجھتے نہیں ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی (گو اس میں ایک غلط مقدمہ لگا کر نتیجہ غلط نکالتے تھے مراد اس سے خوارق ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے کہ یہ مطابق واقع کے ہے، البتہ اس میں یہ مقدمہ غلط ملا لیا گیا کہ ایسے خوارق والا اِلٰہ یا ابنِ اِلٰہ ہوگا، لیکن ایک مقدمہ منشائے اِشتباہ تو تھا، اس لئے اس کو ناکافی واقفیت کہیں گے، جب اس میں تمہاری غلطی ظاہر ہوگئی) سو ایسی بات میں (پھر) کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اَصلاً واقفیت نہیں (کیونکہ اس دعوے کے لئے تو کوئی سبب اِشتباہ کا بھی تمہارے پاس نہیں، کیونکہ ان کے اور ابراہیم علیہ السلام کے فروعِ شریعت میں موافقت بھی نہ تھی) اور اللہ تعالیٰ (ابراہیم علیہ السلام کے طریق کو خوب) جانتے ہیں تم نہیں جانتے (جب تم ایسے بے سروپا دعوے کرتے ہو جس سے علم بھی مثل عدمِ علم کے سمجھا جاتا ہے، تو اَب اللہ تعالیٰ سے ان کے طریق کو سنو کہ) ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو

یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن (البتہ) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحبِ اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے، (سو یہود اور نصاریٰ کو تو مذہبی طریق کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ ہوئی، ہاں) بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے وقت میں) ان کا اِتباع کیا تھا اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اور یہ اِیمان والے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں) اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں اِیمان والوں کے (کہ ان کو ان کے اِیمان کا ثواب دیں گے)۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ط وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ

آرزو ہے بعض اہلِ کتاب کو کہ کسی طرح گمراہ کریں تم کو، اور گمراہ نہیں کرتے مگر

اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اپنے آپ کو اور نہیں سمجھتے۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اِنکار کرتے ہو اللہ کے کلام کا

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

اور تم قائل ہو۔ اے اہلِ کتاب! کیوں ملاتے ہو سچ میں جھوٹ

وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ٨/٧ ١٥

اور چھپاتے ہو سچی بات جان کر۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) اہلِ کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو گمراہ کردے، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی اور کو گمراہ نہیں کررہے، اگرچہ انہیں اس کا احساس نہیں ہے ﴿٦٩﴾ اے اہلِ کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود (ان کے من جانب اللہ ہونے کے) گواہ ہو؟ ﴿٧٠﴾ اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں گڈمڈ کرتے ہو اور کیوں جان بوجھ کر حق بات کو چھپاتے ہو؟ ﴿٧١﴾

خلاصۂ تفسیر

دِل سے چاہتے ہیں بعضے لوگ اہلِ کتاب میں سے اس اَمر کو کہ تم کو (دِینِ حق سے) گمراہ کردیں، گمراہ نہیں کرسکتے مگر خود اپنے آپ کو (وبالِ اِضلال میں گرفتار کررہے ہیں) اور اس کی اِطلاع نہیں رکھتے۔ اے اہلِ کتاب! کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے ساتھ (جو توراۃ اور انجیل میں نبوّتِ محمدیہ پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اِنکار کرنا ان آیات کی تکذیب کرنا ہے، جو کفر ہے) حالانکہ تم (اپنی زبان سے) اِقرار کرتے ہو (کہ وہ آیات حق ہیں، یہ تو ملامت ہوئی ان کے ضلال پر، آگے اِضلال پر ملامت فرماتے ہیں کہ) اے اہلِ کتاب! کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوّتِ محمدیہ) کو غیر واقعی (یعنی عبارت تحریف شدہ یا تفسیرِ فاسد) سے اور (کیوں) چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو (کہ حق بات چھپا رہے ہو)۔

معارف ومسائل

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ اور وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ کے الفاظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر وہ اِقرارِ حق نہ کریں یا ان کو علم نہ ہو تو ان کے لئے کفر جائز ہوگا، وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر اپنی ذات کے اِعتبار سے ایک قبیح فعل ہے، یہ ہر حالت میں ناجائز ہے، البتہ علم واِقرار کے بعد کفر اختیار کرنے میں ملامت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور کہا بعض اہلِ کتاب نے: مان لو جو کچھ اُترا مسلمانوں پر

وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ

دِن چڑھے اور منکر ہوجاؤ آخرِ دِن میں، شاید وہ پھر جاویں۔ اور نہ مانیو مگر اسی کی جو

تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ

چلے تمہارے دِین پر، کہہ دے کہ بے شک ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا

مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ

جیسا کچھ تم کو ملا تھا، یا وہ غالب کیوں آگئے تم پر تمہارے رَبّ کے آگے، تو کہہ: بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے،

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ

دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ بہت گنجائش والا ہے خبردار۔ خاص کرتا ہے اپنی مہربانی

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

جس پر چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے (ایک دُوسرے سے) کہا ہے کہ: ''جو کلام مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے، اس پر دِن کے شروع میں تو اِیمان لے آؤ، اور دِن کے آخری حصے میں اس سے اِنکار کر دینا، شاید اس طرح مسلمان (بھی اپنے دِین سے) پھر جائیں۔ ﴿۷۲﴾ مگر دِل سے اُن لوگوں کے سوا کسی کی نہ ماننا جو تمہارے دِین کے متبع ہیں۔'' آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہی ہدایت ہے جو اللہ کی دی ہوئی ہو۔ یہ ساری باتیں تم اس ضد میں کر رہے ہو کہ کسی کو اُس جیسی چیز (یعنی نبوت اور آسمانی کتاب) کیوں مل گئی جیسی کبھی تمہیں دی گئی تھی یا یہ (مسلمان) تمہارے رَبّ کے آگے تم پر غالب کیوں آگئے!'' آپ کہہ دیجئے کہ فضیلت تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے ﴿۷۳﴾ وہ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے خاص طور پر منتخب کر لیتا ہے، اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے ﴿۷۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور بعضے لوگوں نے اہلِ کتاب میں سے (بطور مشورۂ باہم) کہا کہ (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ ظاہراً) اِیمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی گئی ہے (بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) مسلمانوں پر (مراد یہ ہے کہ قرآن پر اِیمان لے آؤ) شروع دن میں (یعنی صبح کے وقت) اور (پھر) اِنکار کر بیٹھو آخرِ دِن (یعنی شام کو) عجب کیا

(اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی قرآن اور اسلام کے حق میں شبہ پڑ جاوے اور) وہ (اپنے دین سے) پھر جاویں (اور یہ خیال کریں کہ یہ لوگ علم والے ہیں اور بے تعصب بھی ہیں کہ اسلام قبول کرلیا، اس پر بھی جو پھر گئے تو ضرور اسلام کا غیر حق ہونا ان کو دلائلِ علمیہ سے ثابت ہوگیا ہوگا، اور ضرور انہوں نے اسلام میں کوئی خرابی دیکھی ہوگی جب ہی تو اس سے پھر گئے، اور اہلِ کتاب نے بھی باہم کہا کہ مسلمانوں کے دِکھلانے کو صرف ظاہری ایمان لانا) اور (صدقِ دِل سے) کسی کے رُوبرو (دین کا) اِقرار مت کرنا، مگر ایسے شخص کے رُوبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو (اس کے رُوبرو تم کو اپنے قدیم دین کا اِقرار خلوص سے کرنا چاہئے، باقی غیر مذاہب والوں کے یعنی مسلمانوں کے رُوبرو ویسے ہی بہ مصلحتِ مذکورہ زبانی اسلام کا اِقرار کرلینا، حق تعالیٰ ان کی تدبیر کے لچر ہونے کا اِظہار فرماتے ہیں کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ (ان چالاکیوں سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ) یقیناً ہدایت (جو بندوں کو ہوتی ہے) وہ ہدایت اللہ کی (طرف سے ہوتی) ہے (پس جب ہدایت قبضۂ خداوندی میں ہے تو وہ جس کو ہدایت پر قائم رکھنا چاہیں اس کو کوئی دُوسرا کسی تدبیر سے نہیں بچلا سکتا ہے، آگے ان کے اس مشورہ وتدبیر کی علت بتلاتے ہیں کہ اے اہلِ کتاب! تم) ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی (یعنی کتاب اور دینِ آسمانی) یا وہ اور لوگ تم پر غالب آجاویں (اس دینِ حق کی تعیین میں جو) تمہارے رَبّ کے نزدیک (ہے، حاصل علت کا یہ ہوا کہ تم کو مسلمانوں پر حسد ہے کہ ان کو آسمانی کتاب کیوں مل گئی، یا یہ لوگ ہم پر مذہبی مناظرے میں کیوں غالب آجاتے ہیں، اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہلِ اسلام کے تنزل کی کوشش کر رہے ہیں، آگے اس حسد کا رَدّ ہے کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ بے شک فضل تو خدا کے قبضے میں ہے، وہ اس سے جسے چاہیں عطا فرمادیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں فضل کی کمی نہیں اور) خوب جاننے والے ہیں (کہ کس وقت کس کو دینا مناسب ہے اس لئے) خاص کردیتے ہیں اپنی رحمت (وفضل) کے ساتھ جس کو چاہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں (پس اس وقت برعایت حکمت مسلمانوں پر فضل ورحمت فرمادیا اس میں حسد کرنا فضول اور جہل ہے)۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ

اور بعضے اہلِ کتاب میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا تو اَدا کردیں تجھ کو، اور بعضے ان میں وہ ہیں

اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ایک اشرفی تو اَدا نہ کریں تجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے اس کے سر پر کھڑا، یہ اس واسطے کہ

قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہے کہ ہم پر ان لوگوں کے حق لینے میں کچھ گناہ، اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور وہ جانتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اہلِ کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا ایک ڈھیر بھی امانت کے طور پر رکھوادو تو وہ تمہیں واپس کردیں گے، اور انہی میں سے کچھ ایسے ہیں کہ اگر ایک دِینار کی امانت بھی ان کے پاس رکھواؤ تو وہ تمہیں واپس نہیں دیں گے، اِلّا یہ کہ تم ان کے سر پر کھڑے رہو۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس لئے ہے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ: ''اُمیوں (یعنی غیر یہودی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔'' اور (اس طرح) وہ اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں ﴿۷۵﴾

ربطِ آیات

اُوپر کی آیتوں میں اہلِ کتاب کی خیانت فی الدین کا ذِکر تھا، یعنی اِن کا کفر کرنا آیات اللہ کے ساتھ اور خلط کرنا حق اور باطل کا، اور حق کے چھپانے کا، اور تدبیر کرنا مؤمنین کی گمراہی کی، اگلی آیت میں ان کی اموال میں خیانت کرنے کا ذِکر ہے، اور ان میں سے چونکہ بعض امانت دار بھی تھے، اس لئے دونوں قسموں کو ذِکر فرمایا۔

خلاصۂ تفسیر

اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے، اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو اَدا نہ کرے (بلکہ امانت رکھانے کا بھی اِقرار نہ کرے) مگر جب تک کہ تم (امانت رکھ کر) اس کے سر پر (برابر) کھڑے رہو (اس وقت تک تو اِنکار نہ کرے اور جہاں الگ ہوئے پھر اَدا کرنے کا تو کیا ذِکر ہے، سرے

سے امانت ہی سے مکر جاوے) یہ (امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہلِ کتاب کے (مال کے) بارے میں (اگر چوری چھپے لیا جاوے مذہباً) کسی طرح کا اِلزام نہیں (یعنی غیر اہلِ کتاب مثلاً قریش کا مال چرا لینا یا چھین لینا سب جائز ہے، اللہ تعالیٰ آگے ان کے اس دعوے کی تکذیب فرماتے ہیں) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ اس فعل کو حلال سمجھتے ہیں) اور دِل میں وہ بھی جانتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال نہیں کیا، محض تراشیدہ دعویٰ ہے)۔

معارف ومسائل

کسی غیر مسلم کے اچھے اوصاف کی مدح کرنا دُرست ہے

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ اس آیت میں بعض لوگوں کی امانت دار ہونے پر مدح کی گئی ہے، اگر اس بعض سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو اِیمان لا چکے تھے تو ان کی تعریف کرنے میں کوئی اِشکال نہیں، لیکن اگر خاص مؤمن مراد نہ ہوں بلکہ مطلقاً اہلِ کتاب ہوں جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں تو اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا تو پھر ان کی مدح سے کیا فائدہ؟

جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا مقبول ہونا اور چیز ہے اور اس کی مدح کرنا اور چیز ہے، مدح کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اللہ کے ہاں مقبول بھی ہے، اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اچھی بات گو کافر کی ہو وہ بھی کسی درجے میں اچھی ہی ہے، جس کا فائدہ اس کو دُنیا میں ''نیک نامی'' ہے اور آخرت میں عذاب کی کمی۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ کھلے دِل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی اس کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے۔

اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ اس آیت سے اِمام ابوحنیفہؒ نے اِستدلال کیا ہے کہ دائن کو یہ حق ہے کہ وہ مدیون سے اپنا حق وصول کرنے تک اس کا پیچھا کرتا رہے۔ (قرطبی)[1]

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

کیوں نہیں جو کوئی پورا کرے اپنا اِقرار اور وہ پرہیزگار ہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیزگاروں سے۔ جو لوگ

---

[1] التفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۱۷

يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ

مول لیتے ہیں اللہ کے اِقرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول ان کا کچھ حصہ نہیں

فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ص

آخرت میں اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور نہ نگاہ کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا اُن کو

وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

اور ان کے واسطے عذاب ہے دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا پکڑ کیوں نہیں ہوگی؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اور گناہ سے بچے گا تو اللہ ایسے پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے ﴿۷۶﴾ (اس کے برخلاف) جو لوگ اللہ سے کئے ہوئے عہد اور اپنی کھائی ہوئی قسموں کا سودا کر کے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، اور قیامت کے دن نہ اللہ ان سے بات کرے گا، نہ انہیں (رعایت کی نظر سے) دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کا حصہ تو بس عذاب ہوگا، انتہائی دردناک! ﴿۷۷﴾

ربطِ آیات

اُوپر وَيَقُوْلُوْنَ سے اہلِ کتاب کے دعویٰ کی تکذیب مذکور تھی، آگے ان آیات سے اسی تکذیب کی تاکید اور ایفائے عہد کی فضیلت اور نقضِ عہد کی مذمت کی تصریح ہے:-

خلاصۂ تفسیر

(خائن پر) اِلزام کیوں نہ ہوگا (ضرور ہوگا، کیونکہ اس کے متعلق ہمارے یہ دو قانون ہیں، ایک یہ کہ) جو شخص اپنے عہد کو (خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ سے ہوا ہو، یا بشرطِ جواز کسی مخلوق سے) پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں (ایسے) متقیوں کو (اور دُوسرا قانون یہ ہے کہ) یقیناً جو لوگ معاوضہ (یعنی نفع دُنیوی) لے لیتے

ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو (انہوں نے) اللہ تعالیٰ سے کیا ہے (مثلاً انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا) اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے (مثلاً حقوق العباد و معاملات کے باب میں قسم کھالینا) ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ اُن سے (لطف کا) کلام فرماویں گے اور نہ اُن کی طرف (نظرِ محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز، اور نہ اُن کو (گناہوں سے) پاک کریں گے، اور ان کے لئے دردناک عذاب (تجویز) ہوگا۔

معارف و مسائل

عہد کی تعریف اور اس کے خلاف کرنے والے پر چند وعیدیں

عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے، جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے بخلاف وعدہ کے کہ وہ صرف جانبِ واحد سے ہوتا ہے، یعنی عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے۔

اِیفائے عہد کی قرآن وسنت میں بہت تاکید آئی ہے، چنانچہ اُوپر کی آیت نمبر ۷۷ میں بھی عہد کی خلاف ورزی کرنے والے پر پانچ وعیدیں مذکور ہیں:-

۱- ان کے لئے جنت کی نعمتوں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اِرشاد فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق دبایا تو اس نے اپنے لئے آگ کو واجب کر دیا، راوی نے عرض کیا کہ اگر وہ چیز معمولی سی ہو تب بھی اس کے لئے آگ واجب ہوگی؟ آپ نے جواب میں فرمایا: اگر چہ وہ درخت کی سبز ٹہنی ہی کیوں نہ ہو۔ (رواہ مسلم[1] بحوالہ مظہری)

۲- اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن بات نہیں کریں گے۔

۳- اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔

۴- اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کو معاف نہیں کریں گے، کیونکہ عہد کے خلاف کرنے کی وجہ سے عبد کا حق تلف ہوا ہے اور حق العبد کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔

۵- اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ

اور ان میں ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تاکہ تم جانو کہ وہ کتاب میں ہے،

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق المسلم إلخ ج:۱ ص:۸۰

وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ

اور وہ نہیں کتاب میں، اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے، اور وہ نہیں اللہ کا کہا،

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ

اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر۔ کسی بشر کا کام نہیں

اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے لوگوں کو

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ

کہ تم میرے بندے ہوجاؤ اللہ کو چھوڑ کر، لیکن یوں کہے کہ تم اللہ والے ہوجاؤ جیسے کہ تم سکھلاتے تھے

الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ لا وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ

کتاب اور جیسے کہ تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے۔ اور نہ یہ کہے کہ تم کو کہ ٹھہرالو فرشتوں کو

وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ ع ۸ ع ۱۶

اور نبیوں کو رب، کیا تم کو کفر سکھائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہوچکے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور انہی میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے ہیں جو کتاب (یعنی تورات) پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں تا کہ تم (ان کی مروڑ کر بنائی ہوئی) اس عبارت کو کتاب کا حصہ سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں ہوتی۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (عبارت) اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور (اس طرح) وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں ﴿٧٨﴾ یہ کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکمت اور نبوّت عطا کرے، اور وہ اس کے باوجود لوگوں سے

کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ اس کے بجائے (وہ تو یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ، کیونکہ تم جو کتاب پڑھاتے رہے ہو اور جو کچھ پڑھتے رہے ہو، اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے ﴿۷۹﴾ اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا قرار دے دو۔ جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اس کے بعد وہ تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دے گا؟ ﴿۸۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور بے شک ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں (یعنی ان میں کوئی لفظ یا کوئی تفسیر غلط ملا دیتے ہیں اور غلط پڑھنا کج زبانی کہلاتا ہے) تا کہ تم لوگ (جو اس کو سنو تو) اُس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں اور (صرف دھوکا دینے کے لئے اس عملی طریق پر اِکتفا نہیں کرتے بلکہ زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ یہ (لفظ یا مطلب) خدا تعالیٰ کے پاس سے (جو الفاظ یا قواعد نازل ہوئے ہیں ان سے ثابت) ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں (پس ان کا جھوٹا ہونا لازم آ گیا، آگے تاکید کے لئے اس کی پھر تصریح ہے) اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور (اپنا جھوٹا ہونا دِل میں خود بھی) وہ جانتے ہیں۔ کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دِین کی) فہم اور نبوّت عطا فرماویں (جن میں ہر ایک کا مقتضا ہے کفر وشرک سے ممانعت اور) پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ خدا تعالیٰ (کی توحید) کو چھوڑ کر (یعنی نبوّت اور اَمر بالشرک جمع نہیں ہو سکتے) ولیکن (وہ نبی یہ تو) کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) بوجہ اس کے کہ تم کتاب (الٰہی اوروں کو بھی) سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو (اور اس کتاب میں تعلیم ہے توحید کی) اور نہ (وہ بشر موصوف بالنبوۃ) یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دُوسرے) نبیوں کو رَبّ قرار دے لو، کیا (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتلاوے گا بعد اس کے کہ تم (اس عقیدۂ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعمِ خود) مسلمان ہو۔

معارف ومسائل

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی ایک دلیل

مَا كَانَ لِبَشَرٍ وفدِ نجران کی موجودگی میں بعض یہود ونصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمد! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! کہ ہم غیر اللہ کی بندگی

کریں، یا دُوسروں کو اس کی دعوت دیں، حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: یعنی ''جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب وحکمت اور قوتِ فیصلہ دیتا ہے اور پیغمبری کے منصبِ جلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغامِ الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اس کی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے، اس کا یہ کام کبھی نہیں ہوسکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دُوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے، اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوندِ قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔ دُنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے:-

۱- یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں؟

۲- حکومت کے اَحکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادۂ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے؟

کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرّر نہیں کرسکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور اَحکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو، بے شک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبۂ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کرسکی ہو، لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی اِحتمال نہیں، اگر کسی مرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اِطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہوسکے، ورنہ علمِ الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ، یہیں سے عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے، پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک اور خدا کے مقابلے میں بغاوت کرنے کا اِمکان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

اس میں نصاریٰ کے اس دعوے کا بھی رَدّ ہوگیا جو کہتے تھے کہ اِبنیت واُلوہیتِ مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا تھا، اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کردی گئی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کے بجائے آپ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے؟ اور اہلِ کتاب پر بھی تعریض ہوگئی جنہوں نے اپنے اَحبار و رُہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا (العیاذ باللہ)۔ (فوائد عثمانی) [1]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دِیا کتاب اور علم پھر

[1] تفسیر عثمانی تحت هذه الآية ج:۱ ص:۲۰۴

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ

آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے،

قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ

فرمایا کہ کیا تم نے اِقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے: ہم نے اِقرار کیا، فرمایا:

فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ

تو اَب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى

تو وہی لوگ ہیں نافرمان۔ اب کوئی اور دِین ڈھونڈتے ہیں سوا دِین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے اور اسی کی طرف سب پھر جاویں گے۔ تو کہہ: ہم ایمان لائے اللہ پر

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

اور جو کچھ اُترا ہم پر اور جو کچھ اُترا اِبراہیم پر اور اِسماعیل پر اور اِسحاق پر اور یعقوب پر

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ص لَا نُفَرِّقُ

اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے، ہم جدا نہیں کرتے

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ز وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

ان میں کسی کو اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (ان کو وہ وقت یاد دِلاؤ) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ: ''اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور اِیمان لاؤ گے، اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔'' اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا کہ: ''کیا تم اس بات کا اِقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اُٹھاتے ہو؟'' انہوں نے کہا تھا: ''ہم اِقرار کرتے ہیں۔'' اللہ نے کہا: ''تو پھر (ایک دُوسرے کے اِقرار کے) گواہ بن جاؤ، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی میں شامل ہوں ﴿۸۱﴾ اس کے بعد بھی جو لوگ (ہدایت سے) منہ موڑیں گے تو ایسے لوگ نافرمان ہوں گے۔'' ﴿۸۲﴾ اب کیا یہ لوگ اللہ کے دِین کے علاوہ کسی اور دِین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں ان سب نے اللہ ہی کے آگے گردن جھکا رکھی ہے، (کچھ نے) خوشی سے اور (کچھ نے) ناچار ہوکر، اور اسی کی طرف وہ سب لوٹ کر جائیں گے ﴿۸۳﴾ کہہ دو کہ: ''ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو (کتاب) ہم پر اُتاری گئی اُس پر، اور اُس (ہدایت) پر جو اِبراہیم، اِسماعیل، اِسحاق، یعقوب اور (ان کی) اولاد پر ان کے پروردگار کی طرف سے اُتاری گئی، اور اُن باتوں پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دُوسرے) پیغمبروں کو عطا کی گئیں۔ ہم ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی (ایک اللہ) کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔'' ﴿۸۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابلِ ذِکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) سے کہ جو کچھ تم کو کتاب اور علم (شریعت) دُوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آوے جو مصداق (اور موافق) ہو اس (علامت) کا جو تمہارے پاس (کی کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی دلائل معتبرہ عندالشرع سے اس کی رِسالت ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رِسالت) پر (دِل سے) اِعتقاد بھی لانا اور (ہاتھ پاؤں سے) اس کی مدد بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کرکے اِرشاد) فرمایا کہ آیا تم نے اِقرار کیا اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا) وہ بولے کہ ہم نے اِقرار کیا، اِرشاد فرمایا: تو (اپنے اس اِقرار پر) گواہ بھی رہنا (کیونکہ گواہی سے پھرنے کو ہر شخص ہر حال میں بُرا سمجھتا ہے، بخلاف اِقرار کرنے والے کے کہ بوجہ صاحبِ غرض ہونے کے اس کا پھر جانا زیادہ مستبعد نہیں ہوتا، اسی طرح تم صرف اِقراری نہیں بلکہ گواہ کی طرح اس پر قائم رہنا) اور میں (بھی) اس (مضمون) پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اِطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں، سو جو شخص (امتوں میں سے) رُوگردانی کرے گا (اس عہد سے) بعد اس کے (کہ انبیاء تک سے

عہد لیا گیا اور اُمتیں تو کس شمار میں ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں، کیا (دینِ اسلام سے جس کا عہد لیا گیا ہے رُوگردانی کرکے) پھر (اس) دینِ خداوندی کے سوا اور کسی طریقے کو چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ (کی یہ شان ہے کہ ان) کے (حکم کے) سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں میں (ہیں) اور (جتنے) زمین میں ہیں (بعضے) خوشی (اور اختیار سے) اور (بعضے) مجبوری سے اور (اوّل تو اس عظمت ہی کا مقتضیٰ یہ تھا کہ کوئی ان کے عہد کی مخالفت نہ کرے، خاص کر جبکہ آئندہ سزا کا بھی ڈر ہو، چنانچہ) سب خدا ہی کی طرف (قیامت کے روز) لوٹائے (بھی) جاویں گے (اور اس وقت مخالفین کو سزا ہوگی) (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (دینِ اسلام کے اظہار کے لئے خلاصہ کے طور پر یہ) فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس (حکم) پر جو (حضرت) ابراہیم و اسماعیل و یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں ان) کی طرف بھیجا اور اس (حکم و معجزہ) پر بھی جو (حضرت) موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور دُوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (ایمان لانے کے معاملے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں (اس نے ہی دین ہم کو بتلایا، ہم نے اختیار کرلیا)۔

معارف ومسائل

اللہ تعالیٰ کے تین عہد

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں، ایک کا ذکر سورۂ اعراف میں اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ (الاعراف: ۱۷۲) کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوعِ انسان خدا کی ہستی اور رُبوبیتِ عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی، اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

دُوسرے کا ذکر وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ الخ (آل عمران: ۱۸۷) سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہلِ کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔

تیسرے عہد کا بیان وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ سے کیا گیا ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (تفسیر احمدی)

میثاق سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کہاں ہوا؟

میثاق کہاں ہوا؟ یا تو عالمِ اَرواح میں ہوا، یا دُنیا میں بذریعہ وحی ہوا، دونوں اِحتمال ہیں۔ (بیان القرآن) [۱]

میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو قرآن نے کردی ہے، لیکن یہ میثاق کس چیز کے بارے میں لیا گیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی علیہ السلام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ عہد تمام انبیاء سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید ونصرت کریں اور اپنی اپنی اُمتوں کو بھی یہی ہدایت کر جائیں۔

حضرت طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء سے اس لئے لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دُوسرے کی تائید ونصرت کریں۔ (تفسیر ابنِ کثیر) [۲]

اس دُوسرے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝" (الاحزاب) سے بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ عہد ایک دُوسرے کی تائید وتصدیق کے لئے لیا گیا تھا۔ (تفسیر احمدی)

[۳] درحقیقت مذکورہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے دونوں ہی مراد لی جاسکتی ہیں۔ (تفسیر ابنِ کثیر)

تمام انبیاء علیہم السلام سے ایمان کے مطالبے کا فائدہ

بظاہر یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں، ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے تو پھر اَنبیاء علیہم السلام کے اِیمان لانے کا کیا فائدہ؟

ذرا غور کیا جائے تو فائدہ بالکل ظاہر معلوم ہوگا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے اِرشاد پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات پر اِیمان قبول کرنے کا پختہ اِرادہ کریں گے تو اسی وقت سے ثواب پائیں گے۔ (صاوی بحوالہ جلالین)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّتِ عامہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ اِلخ ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دُوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے

---

[۱] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۳۷

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۶۸

[۳] تفسیر ابن کثیر بحوالۂ بالا۔

والا ہوگا، تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوّت پر ایمان خود بھی لائے اور دُوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرے، قرآن کے اس قاعدۂ کلیہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء علیہم السلام سے لیا ہوگا جیسا کہ علامہ سبکیؒ اپنے رسالے "التعظیم والمنة فی لتؤمنن به ولتنصرنه" میں فرماتے ہیں کہ "آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ والا صفات کے بارے میں تائید و نصرت اور آپ پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو، اور کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے اپنی اُمت کو آپ پر ایمان لانے اور تائید و نصرت کی وصیت نہ کی ہو، اور اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ کی اُمت میں شمار ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں ہے بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ خود اِرشاد فرماتے ہیں کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اِتباع کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔[۱]

اور ایک دُوسری جگہ اِرشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآنِ حکیم اور تمہارے نبی ہی کے اَحکام پر عمل کریں گے۔ (تفسیر ابنِ کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت "عامہ اور شاملہ" ہے، اور آپ کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں، اس بیان سے آپ کے اِرشاد "بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَآفَّةً"[۲] کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے، کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ کی نبوّت آپ کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے، صحیح نہیں، بلکہ آپ کی نبوّت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم علیہ السلام کی نبوّت سے پہلے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ "کُنْتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ"[۳] محشر میں شفاعتِ کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شبِ معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء علیہم السلام کی اِمامت کرانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سیادتِ عامہ اور اِمامتِ عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ

اور جو کوئی چاہے سوا دِینِ اسلام کے اور کوئی دِین، سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت

[۱] مشكوٰة، باب الإعتصام بالكتاب والسُّنَّة ج: ۱ ص: ۳۲

[۲] مسند احمد، بداية مسند عبدالله بن العباس رقم الحديث: ۲۶۰۶

[۳] مصنَّف ابن ابی شيبة ج: ۸ ص: ۴۳۸

مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

میں خراب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو کوئی شخص اسلام کے سوا کوئی اور دِین اِختیار کرنا چاہے گا، تو اس سے وہ دِین قبول نہیں کیا جائے گا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو سخت نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ﴿۸۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دُوسرے دِین کو طلب کرے گا تو وہ (دِین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول (ومنظور) نہ ہوگا، اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا (یعنی نجات نہ پاوے گا)۔

معارف ومسائل

اسلام کی تعریف اور اس کا مدارِ نجات ہونا

''اسلام'' کے لفظی معنی اِطاعت وفرمانبرداری کے ہیں، اور اِصطلاح میں خاص اس دِین کی اِطاعت کا نام ''اسلام'' ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اِنسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ اُصولِ دِین تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

پھر لفظ ''اسلام'' کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے اِستعمال کیا جاتا ہے، اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، قرآنِ کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں، انبیائے سابقین علیہم السلام کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی اُمت کو اُمتِ مسلمہ کہنا بھی نصوصِ قرآن سے ثابت ہے، اور اس نام کا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج:۷۸) خلاصہ یہ کہ ہر دِینِ اِلٰہی جو کسی نبی ورسول کے ذریعے دُنیا میں آیا اس کو بھی ''اسلام'' کہا جاتا ہے، اور اُمتِ محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی اِستعمال ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اس جگہ ''اسلام'' کے لفظ سے کونسا مفہوم مراد ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے، نتیجے کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ انبیائے سابقین کے دِین کو جو اِسلام کا نام دیا گیا ہے وہ ایک محدود طبقے اور مخصوص زمانے کے لئے تھا، اس وقت کا اِسلام وہی تھا، اس طبقے اور اُمت کے علاوہ دُوسروں کے لئے اس وقت بھی وہ اسلام معتبر نہ تھا، اور جب اس نبی کے بعد اور کوئی نبی بھیج دیا گیا تو اَب وہ اسلام نہیں رہا، اس وقت کا اِسلام وہ ہوگا جو جدید نبی پیش کرے، جس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی اُصولی اِختلاف نہیں ہوگا، مگر فروعی اَحکام مختلف ہوسکتے ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اِسلام دیا گیا وہ ناقابلِ نسخ دائمی تا قیامت رہے گا، اور حسبِ قاعدۂ مذکورہ آپ کی بعثت کے بعد پچھلے تمام اَدیان منسوخ ہوگئے، اب وہ اِسلام نہیں بلکہ اِسلام صرف وہ دِین ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہنچا، اسی لئے احادیثِ صحیحہ معتبرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اس وقت ان پر بھی میرا ہی اِتباع لازم ہوتا۔[1] اور ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، تو باوجود اپنے وصفِ نبوّت اور عہدۂ نبوّت پر قائم رہنے کے اس وقت وہ بھی آپ ہی کی شریعت کا اِتباع کریں گے۔[2]

اس لئے اس جگہ خواہ **اسلام** کا مفہوم عام مراد لیں یا مخصوص اُمتِ محمدیہ کا دِین مراد لیں، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف وہی دِین اِسلام کہلائے گا جو آپ کے ذریعہ دُنیا کو پہنچا ہے، وہی تمام اِنسانوں کے لئے مدارِ نجات ہے، آیتِ مذکورہ میں اسی کے متعلق اِرشاد فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دُوسرا دِین جو شخص اِختیار کرے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورۃ کی آیت اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے تحت صفحہ: ۴۷ جلد دوم میں گزر گئی۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ

کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہوگئے ایمان لاکر اور گواہی دے کر کہ بے شک رسول

حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ

سچا ہے اور آئیں ان کے پاس نشانیاں لے کر، اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔ ایسے لوگوں کی

---

[1] مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۱۰۴

[2] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۶۷۲

جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۸۷﴾

سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی،

خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۸۸﴾ إِلَّا الَّذِينَ

ہمیشہ رہیں گے اس میں، نہ ہلکا ہوگا اُن سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے۔ مگر جنہوں نے

تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۖ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۸۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ

توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ جو لوگ

كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ

منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں، ہرگز قبول نہ ہوگی ان کی توبہ

وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّونَ ﴿۹۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ

اور وہی ہیں گمراہ۔ جو لوگ کافر ہوئے اور مرگئے کافر ہی تو ہرگز

يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۗ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ

قبول نہ ہوگا کسی ایسے سے زمین بھر کر سونا اگرچہ بدلہ دیوے اس قدر سونا، اُن کو

عَذَابٌ أَلِيمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِينَ ﴿۹۱﴾ ع ۹ / ۱۱ / ۱۷

عذاب دردناک ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلیا؟ حالانکہ وہ گواہی دے چکے

تھے کہ یہ رسول سچے ہیں، اور ان کے پاس (اس کے) روشن دلائل بھی آچکے تھے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا ﴿۸۶﴾ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے ﴿۸۷﴾ اسی (پھٹکار) میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کے لئے عذاب ہلکا کیا جائے گا، اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی ﴿۸۸﴾ البتہ جو لوگ اس سب کے بعد بھی توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلیں، تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۸۹﴾ (اس کے برخلاف) جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ راستے سے بالکل ہی بھٹک چکے ہیں۔ ﴿۹۰﴾ جن لوگوں نے کفر اپنایا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان میں سے کسی سے پوری زمین بھر کر سونا بھی قبول نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے اس کی پیشکش ہی کیوں نہ کرے۔ ان کو تو دردناک عذاب ہو کر رہے گا، اور ان کو کسی قسم کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ ﴿۹۱﴾

خلاصۂ تفسیر

(اوّل اُن مرتدین کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہ کر اس کو ہدایت سمجھتے رہے، چونکہ ان کا اعتقاد یا دعویٰ یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اَب ہدایت فرمائی، لہٰذا اُن کی مذمت میں اس کی نفی بھی فرماتے ہیں کہ بھلا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہوگئے بعد ایمان لانے کے (دِل سے) اور بعد اپنے اس اِقرار کے (زبان سے) کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم دعویٔ رِسالت میں) سچے ہیں، اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل (حقانیتِ اسلام کے) پہنچ چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے (یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی توفیق اِسلام کی نہیں دیتے، بلکہ مقصود ان کے اس دعویٔ مذکورہ بالا کی نفی کرنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے جو اِسلام چھوڑ کر یہ طریق اختیار کیا ہے ہم کو خدا نے ہدایت دی ہے، خلاصہ نفی کا یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا بے ڈھنگا راستہ اِختیار کرے وہ ہدایتِ خداوندی پر نہیں، اس لئے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو خدا نے ہدایت دی ہے، کیونکہ ہدایت کا یہ راستہ نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگ یقیناً گمراہ ہیں اور) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور (بہتیرے) آدمیوں کی بھی (غرض) سب کی (اور پھر وہ لعنت بھی ایسے طور پر رہے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (اور چونکہ اس لعنت کا اثر جہنم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور) ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے سے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت ہی دی جاوے گی (آگے ان کا بیان ہے جو پھر مسلمان ہوگئے ان

کو اس حکم سے مستثنیٰ فرماتے ہیں یعنی) ہاں مگر جو لوگ توبہ کرلیں اس (کفر) کے بعد (یعنی مسلمان ہو جاویں) اور اپنے (دِل) کو (بھی) سنواریں (یعنی منافقانہ طور پر صرف زبان سے توبہ کافی نہیں) سو بے شک (ایسوں کے لئے) خدا تعالیٰ بخش دینے والے، رحمت کرنے والے ہیں، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے اِیمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں (یعنی کفر پر دوام رکھا اِیمان نہیں لائے) اُن کی توبہ (جو کہ اور گناہوں سے کرتے ہیں) ہرگز مقبول نہ ہوگی (کیونکہ توبہ عن المعاصی ایک اِطاعتِ فرعیہ ہے، اور اِطاعتِ فرعیہ کے مقبول ہونے کی شرط اِیمان ہے) اور ایسے لوگ (اس توبہ کے بعد بھی بدستور) پکے گمراہ ہیں۔

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالتِ کفر ہی میں، سو ان میں سے کسی کا (بطورِ کفارہ) زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا، اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے (اور بے دیئے تو کون پوچھتا ہے) ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے حامی (مددگار) بھی نہ ہوں گے۔

معارف و مسائل

ایک شبہ کا اِزالہ

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ الخ اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کسی کو مرتد ہونے کے بعد ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ بہت سے لوگ مرتد ہونے کے بعد اِیمان قبول کر کے ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں جو ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس کی مثال ہمارے محاورات میں ایسی ہے جیسے کسی بدمعاش کو کوئی حاکم اپنے ہاتھ سے سزا دے اور وہ کہے کہ مجھ کو حاکم نے اپنے ہاتھ سے خصوصیت عنایت فرمائی ہے، اور اس کے جواب میں کہا جاوے کہ ایسے بدمعاش کو ہم خصوصیت کیوں دینے لگے، یعنی یہ امر خصوصیت ہی نہیں، اور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایسا شخص کسی طرح قابلِ خصوصیت نہیں ہوسکتا اگرچہ شائستہ بن جاوے۔ (بیان القرآن) [1]

[1] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۳۹

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ

ہرگز نہ حاصل کرسکوگے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ، اور جو چیز خرچ کروگے

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۹۲﴾

سو اللہ کو معلوم ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تم نیکی کے مقام تک اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچو گے جب تک ان چیزوں میں سے (اللہ کے لئے) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ﴿۹۲﴾

ربطِ آیات مع تشریح

اس سے پہلی آیت میں کفار و منکرین کے صدقات وخیرات کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر مقبول ہونا بیان کیا گیا تھا، اس آیت میں مؤمنین کو صدقۂ مقبولہ اور اس کے آداب بتلائے گئے ہیں، اس آیت کے الفاظ میں سب سے پہلے لفظ "بِرّ" کے معنی اور اس کی حقیقت کو سمجھئے، تاکہ آیت کا پورا مفہوم صحیح طور پر ذہن نشین ہوسکے۔

لفظ "بِرّ" کے لفظی اور حقیقی معنی ہیں کسی شخص کے حق کی پوری ادائیگی، اور اس سے کامل سبکدوشی اور احسان اور حسنِ سلوک کے معنی میں بھی آتا ہے، بَرّ بالفتح اور بَارّ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے ذمہ عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کردے، قرآنِ کریم میں بَرًّا بِوَالِدَتِىۡ (مریم: ۳۲) اور بَرًّا بِوَالِدَيۡهِ (مریم: ۱۴) اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ان حضرات کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اپنے والدین کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے والے تھے۔

اسی لفظ بَرّ بالفتح کی جمع "ابرار" ہے، جو قرآنِ کریم میں بکثرت استعمال ہوئی ہے، ارشاد ہے: اِنَّ الۡاَبۡرَارَ يَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا ۚ﴿۵﴾ (الدہر)، اور دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الۡاَرَآئِكِ يَنۡظُرُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (المطففین) اور ایک جگہ ارشاد ہے: اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِىۡ جَحِيۡمٍ ﴿۱۴﴾ (الانفطار) اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "برّ" کا مقابل اور ضد "فجور" ہے۔

امام بخاریؒ کے ادب المفرد میں اور ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچ بولنے کو لازم پکڑو، کیونکہ ''صدق'' ''بِرّ'' کا ساتھی ہے، اور وہ دونوں جنت میں ہیں، اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور کا ساتھی ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں ہیں۔[1]

اور سورۂ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرة: ۱۷۷)، اس آیت میں نیک اعمال کی ایک فہرست دے کر ان سب کو ''بِرّ'' فرمایا گیا ہے، مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ اعمالِ برّ میں افضل ترین برّ یہ ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے، آیتِ مذکورہ میں اِرشاد ہے کہ تم ہرگز ''بِرّ'' کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں میں سے کچھ خرچ نہ کرو، تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کی مکمل ادائیگی اور اس سے پوری سبکدوشی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اپنی محبوب اور پیاری چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کریں، اسی مکمل ادائیگی کو خیرِ کامل یا نیکی میں کمال یا ثوابِ عظیم سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ ابرار کی صفت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں قربان کی جائیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے مسلمانو!) تم خیرِ کامل (یعنی اعظم ثواب) کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی (بہت) پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے اور (یوں) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (گو غیر محبوب چیز ہو) اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (مطلق ثواب اس پر بھی دے دیں گے، لیکن کمالِ ثواب حاصل کرنے کا وہی طریقہ ہے)۔

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جذبۂ عمل

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو قرآنی اَحکام کے اوّلین مخاطب اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ شاگرد اور اَحکامِ قرآنی کی تعمیل کے عاشق تھے، اس آیت کے نازل ہونے پر ایک ایک نے اپنی محبوب چیزوں پر نظر ڈالی، اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخواستیں ہونے لگیں، انصارِ مدینہ میں سب سے زیادہ مال دار حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، مسجدِ نبوی کے بالکل مقابل اور متصل ان کا باغ تھا، جس میں ایک کنواں ''بیر حاء'' کے نام سے موسوم تھا۔ اب اس باغ کی جگہ تو ''بابِ مجیدی'' کے سامنے ''اصطفا'' منزل کے نام سے ایک

[1] الأدب المفرد رقم الحديث: ۳۹۸ ج: ۲ ص: ۸۰ وسنن ابن ماجة، اجتناب البدع والجدل ج: ۱ ص: ۶ ومسند احمد رقم الحديث: ۳۶۵۲ مسند عبدالله بن مسعود رضي الله عنه۔

عمارت بنی ہوئی ہے جس میں زائرینِ مدینہ قیام کرتے ہیں، مگر اس کے شمال مشرق کے گوشے میں یہ بیرحاء اسی نام سے اب تک موجود ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس باغ میں تشریف لے جاتے اور بیرحاء کا پانی پیتے تھے، آپ کو اس کنویں کا پانی پسند تھا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ باغ بڑا قیمتی اور زرخیز اور ان کو اپنی جائیداد میں سب سے زیادہ محبوب تھا، اس آیت کے نازل ہونے پر وہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے تمام اموال میں بیرحاء مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو صَرف فرماویں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تو عظیم الشان منافع کا باغ ہے، میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ اس کو آپ اپنے اقرباء میں تقسیم کر دیں۔ حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورے کو قبول فرما کر اپنے اقرباء اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم فرما دیا (یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے)۔[1] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیرات صرف وہ نہیں جو عام فقراء اور مساکین پر صَرف کی جائے، اپنے اہل وعیال اور عزیز و رشتہ داروں کو دینا بھی بڑی خیرات اور موجبِ ثواب ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنا ایک گھوڑا لئے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے، اور عرض کیا کہ مجھے اپنی املاک میں یہ سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرما لیا، لیکن ان سے لے کر انہی کے صاحبزادے اُسامہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا، زید بن حارثہؓ اس پر کچھ دلگیر ہوئے کہ میرا صدقہ میرے ہی گھر میں واپس آ گیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ (تفسیر مظہری، بحوالہ ابنِ جریر وطبری وغیرہ)[2]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کنیز سب سے زیادہ محبوب تھی، آپؓ نے اس کو لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک کنیز تھی، جس سے وہ محبت کرتے تھے، اس کو اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔

الغرض آیتِ متذکرہ کا حاصل یہ ہے کہ حق اللہ کی مکمل ادائیگی اور خیرِ کامل اور نیکی کا کمال جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، آیتِ مذکورہ میں چند مسائل قابلِ نظر اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله لَنْ تَنَالُوا الآية ج:۲ ص:۶۵۴، وصحیح مسلم، کتاب الزکوٰة، فضل النفقة والصدقة إلخ ج:۱ ص:۳۲۳

[2] تفسیر الطبری تحت قوله تعالیٰ: لَنْ تَنَالُوا الآية ج:۶ ص:۵۹۰

اس آیت میں لفظ برّ تمام صدقاتِ واجبہ اور نفلیہ کو شامل ہے

اوّل:- یہ کہ اس آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے، اس سے مراد بعض حضراتِ مفسرین کے نزدیک صدقاتِ واجبہ زکوٰۃ وغیرہ ہیں، اور بعض کے نزدیک صدقاتِ نافلہ ہیں، لیکن جمہور محققین نے اس کے مفہوم کو صدقاتِ واجبہ اور نفلیہ دونوں میں عام قرار دیا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے واقعات متذکرہ بالا اس پر شاہد ہیں کہ ان کے یہ صدقات، صدقاتِ نفلیہ تھے۔

اس لئے مفہوم آیت کا یہ ہوگیا کہ اللہ کی راہ میں جو صدقہ بھی ادا کرو خواہ زکوٰۃ فرض ہو یا کوئی نفلی صدقہ وخیرات، ان سب میں مکمل فضیلت اور ثواب جب ہے کہ اپنی محبوب اور پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، یہ نہیں کہ صدقہ کو تاوان کی طرح سر سے ٹالنے کے لئے فالتو، بیکار، یا خراب چیزوں کا اِنتخاب کرو۔ قرآنِ کریم کی دُوسری ایک آیت میں اس مضمون کو اور زیادہ واضح اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:-

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ (البقرۃ:۲۶۷)

''یعنی اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ چیزوں کو چھانٹ کر اس میں سے خرچ کرو اور رَدّی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کردو، حالانکہ وہ چیزیں اگر تمہارے حق کے بدلے میں تمہیں دی جائیں تو تم ہرگز قبول نہ کروگے، بجز اس کے کہ کسی وجہ سے چشم پوشی کرجاؤ۔''

اس کا حاصل یہ ہوا کہ خراب اور بیکار چیزوں کا اِنتخاب کرکے صدقہ کرنا مقبول نہیں، بلکہ صدقۂ مقبولہ جس پر مکمل ثواب ملتا ہے وہی ہے جو محبوب اور پیاری چیزوں میں سے خرچ کیا جائے۔

صدقہ کرنے میں اِعتدال چاہئے

دُوسرا مسئلہ:- یہ ہے کہ آیت میں لفظ مِمَّا سے اِشارہ کردیا گیا ہے کہ یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنی چیزیں اپنے نزدیک محبوب اور پیاری ہیں ان سبھی کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جتنا بھی خرچ کرنا ہے اس میں اچھی اور پیاری چیز دیکھ کر خرچ کریں تو مکمل ثواب کے مستحق ہوں گے۔

تیسرا مسئلہ:- یہ کہ محبوب چیز خرچ کرنا صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی بڑی قیمت کی چیز خرچ کی جائے، بلکہ جو چیز کسی کے نزدیک عزیز اور محبوب ہے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل اور قیمت کے اِعتبار سے کم ہو، اس کے خرچ کرنے سے بھی اس

"بِرّ" کا مستحق ہو جائے گا۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو چیز آدمی اِخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرے وہ اگر چہ کھجور کا ایک دانہ ہی ہو، اس سے بھی اِنسان اس ثوابِ عظیم اور بِرّ کامل کا مستحق ہو جاتا ہے جس کا آیت میں وعدہ کیا گیا ہے۔

چوتھا مسئلہ:- یہ ہے کہ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس خیرِ عظیم اور بِرّ کا ذِکر ہے اس سے وہ غریب لوگ محروم رہیں گے جن کے پاس خرچ کرنے کے لئے مال نہیں، کیونکہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ خیرِ عظیم بغیر محبوب مال خرچ کئے حاصل نہیں کی جاسکتی، اور فقراء ومساکین کے پاس مال ہی نہیں جس کے ذریعے ان کی یہاں تک رسائی ہو، لیکن غور کیا جائے تو آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ خیرِ عظیم اور ثوابِ عظیم حاصل کرنا چاہیں تو بجز مالِ محبوب کے خرچ کرنے کا ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا، بلکہ بات یہ ہے کہ یہ خیرِ عظیم کسی دُوسرے ذریعے سے مثلاً عبادت، ذِکر اللہ، تلاوتِ قرآن، کثرتِ نوافل سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے فقراء وغرباء کو بھی یہ خیرِ عظیم دُوسرے ذرائع سے حاصل ہوسکتی ہے، جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں صراحۃً بھی یہ مضمون آیا ہے۔

مالِ محبوب سے کیا مراد ہے؟

پانچواں مسئلہ:- یہ ہے کہ مال کے محبوب ہونے سے کیا مراد ہے؟ قرآن کی دُوسری آیت سے معلوم ہوا کہ محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے کام میں آرہی ہو اور اس کو اس چیز کی حاجت ہو، فالتو اور بیکار نہ ہو، قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے:-

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا (الدہر:۸)

"یعنی اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو حاجت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں، باوجود اس کے کہ اس کھانے کی خود ان کو بھی ضرورت ہے۔"

اسی طرح دُوسری آیت میں اسی مضمون کی اور زیادہ وضاحت اس طرح فرمائی:-

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)

"یعنی اللہ کے مقبول بندے اپنے اُوپر دُوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگر چہ خود بھی حاجت مند ہوں۔"

فالتو سامان اور حاجت سے زائد چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی ثواب سے خالی نہیں

چھٹا مسئلہ:- یہ ہے کہ آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خیرِ کامل اور ثوابِ عظیم اور صفِ اَبرار میں داخلہ اس پر

موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کریں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرورت سے زائد فالتو مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب ہی نہ ملے، بلکہ آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ یعنی "تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔" آیت کے اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ خیرِ کامل اور صفِ اَبرار میں داخلہ خاص محبوب چیز خرچ کرنے پر موقوف ہے، لیکن مطلق ثواب سے کوئی صدقہ خالی نہیں، خواہ محبوب چیز خرچ کریں یا زائد اور فالتو اشیاء، ہاں مکروہ اور ممنوع یہ ہے کہ کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہی طریقہ اِختیار کرلے کہ جب خرچ کرے فالتو اور خراب چیز کا ہی اِنتخاب کر کے خرچ کیا کرے، لیکن جو شخص صدقہ خیرات میں اپنی محبوب اور عمدہ چیزیں بھی خرچ کرتا ہے، اور اپنی ضرورت سے زائد چیزیں، بچا ہوا کھانا، یا پُرانا کپڑے، عیب دار برتن یا اِستعمالی چیزیں بھی خیرات میں دے دیتا ہے، وہ ان چیزوں کا صدقہ کرنے سے کسی گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ اس کو ان پر بھی ضرور ثواب ملے گا، اور محبوب چیزوں کے خرچ کرنے پر اس کو خیرِ عظیم بھی حاصل ہوگی، اور صفِ اَبرار میں اس کا داخلہ بھی ہوگا۔

آیت کے اس آخری جملے میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کی اصلی حقیقت اللہ پر روشن ہے کہ وہ اس کے نزدیک محبوب ہے یا نہیں، اور اِخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہے یا ریا و شہرت کے لئے، محض کسی کا زبانی دعویٰ اس کے لئے کافی نہیں کہ میں اپنی محبوب چیز کو اللہ کے لئے خرچ کر رہا ہوں، بلکہ علیم و خبیر جو دِل کے پوشیدہ رازوں سے وقف ہے، دیکھ رہا ہے کہ واقع میں اس کے لئے خرچ کا کیا درجہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ

سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اِسرائیل کو، مگر وہ جو حرام کرلی تھیں اِسرائیل نے

عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ

اپنے اُوپر توراۃ نازل ہونے سے پہلے، تو کہہ: لاؤ توراۃ اور پڑھو اس کو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

اگر تم سچے ہو۔ پھر جو کوئی جوڑے اللہ پر جھوٹ اس کے بعد

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ

وقف جبرئیل علیہ السلام

تو وہی ہیں بڑے بے انصاف۔ تو کہہ: سچ فرمایا اللہ نے، اب تابع ہو جاؤ دینِ ابراہیم کے جو ایک ہی کا ہو رہا تھا،

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

اور نہ تھا شرک کرنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں (جو مسلمانوں کے لئے حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لئے (بھی) حلال تھیں، سوائے اُس چیز کے جو اسرائیل (یعنی یعقوب علیہ السلام) نے اپنے اُوپر حرام کر لی تھی۔ (اے پیغمبر! یہودیوں سے) کہہ دو کہ: "اگر تم سچے ہو تو توراۃ لے کر آؤ اور اس کی تلاوت کرو۔" ﴿۹۳﴾ پھر ان باتوں کے (واضح ہونے کے) بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھیں، تو ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں ﴿۹۴﴾ آپ کہئے کہ اللہ نے سچ کہا ہے، لہٰذا تم ابراہیم کے دین کا اتباع کرو جو پوری طرح سیدھے راستے پر تھے، اور ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اللہ کی خدائی میں کسی کو شریک مانتے ہیں ﴿۹۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(جن کھانے کی چیزوں میں گفتگو ہے یہ) سب کھانے کی چیزیں (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ہرگز حرام نہیں چلی آرہی ہیں، بلکہ یہ چیزیں) نزولِ توراۃ کے قبل باستثناء اس کے (یعنی گوشت شتر کے) جس کو (حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے (ایک خاص وجہ سے) اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا (اور پھر وہ ان کی اولاد میں بھی حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود) بنی اسرائیل (تک) پر (بھی) حلال تھیں (تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ان کی تحریم کا دعویٰ کب صحیح ہوسکتا ہے؟ اور نزولِ توراۃ کے قبل اس واسطے فرمایا کہ نزولِ توراۃ کے بعد ان مذکورہ حلال چیزوں میں سے بھی بہت سی چیزیں حرام ہوگئی تھیں، جس کی کچھ تفصیل سورۂ انعام کی اس آیت میں ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ الی آخرھا (الانعام: ۱۴۶)، اور اگر اب بھی یہود کو تحریم کی قدامت مذکورہ کا دعویٰ ہے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) فرما دیجئے کہ (اچھا تو) پھر توراۃ لاؤ پھر اس کو (لا کر) پڑھو اگر تم (دعوئ مذکور میں) سچے ہو (تو اس میں کوئی آیت وغیرہ اس

مضمون کی نکال دو، کیونکہ اُمورِ منقولہ میں نص کی ضرورت ہے، اور دُوسری نصوص یقیناً منفی ہیں، صرف توراۃ باقی ہے، سواس میں دِکھلا دو، چنانچہ اس میں نہ دِکھلا سکے تو کذب ان کا اس دعوے میں ثابت ہو گیا، آگے اس پر مرتب کر کے فرماتے ہیں) سو جو شخص اس (ظہورِ کذب بالدلیل) کے بعد (بھی) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے (جاوے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے گوشت شتر وغیرہ کو حرام فرمایا ہے) تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا، سو (اب) تم (کو چاہئے کہ بعد ثبوتِ حقیت قرآن کے) ملتِ ابراہیم (یعنی اِسلام) کا اِتباع (اِختیار) کرو جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرک نہ تھے۔

معارف و مسائل

اُوپر کی آیتوں میں اہلِ کتاب سے بحث چلی آتی ہے، کہیں یہود سے، کہیں نصاریٰ سے، کہیں دونوں سے، ایک بحث کا آگے بیان آتا ہے، جس کا قصہ ''رُوح المعانی'' میں بروایت واحدی کلبی سے منقول ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ملتِ اِبراہیمی پر ہونا باعتبار تمام اُصولِ شرعیہ اور اکثر فروع کے بیان فرمایا، تو یہود نے اِعتراضاً کہا کہ آپ اُونٹ کا گوشت اور دُودھ کھاتے ہیں، حالانکہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام پر حرام تھا، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ نہیں، ان پر یہ حلال تھا۔ یہود نے کہا: جتنی چیزیں ہم حرام سمجھتے ہیں، یہ سب حضرت نوح وحضرت اِبراہیم علیہما السلام کے وقت سے حرام چلی آتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک وہ تحریم پہنچی۔ تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الٰخ تکذیبِ یہود کے لئے نازل فرمائی، جس میں اِرشاد فرمایا گیا ہے کہ نزولِ توراۃ کے قبل باستثناء اس کے یعنی گوشت شتر کے جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک خاص وجہ سے خود اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا اور پھر وہ ان کی اولاد میں حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود بنی اِسرائیل پر بھی حلال تھیں۔

دراصل اس میں قصہ یہ ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا مرض تھا، آپ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سے شفا دیں تو سب سے زیادہ جو کھانا مجھ کو محبوب ہے اس کو چھوڑ دُوں گا، اُن کو شفا ہوگئی، اور سب سے زیادہ محبوب آپ کو اُونٹ کا گوشت تھا، اس کو ترک فرما دیا (أخرجه الحاكم وغيره بسند صحيح عن ابن عباس، كذا في رُوح المعاني، وأخرجه الترمذي في سورة الرعد مرفوعًا)[1]۔ پھر یہی تحریم جو نذر سے ہوئی تھی بنی اِسرائیل میں بحکمِ وحی باقی رہ گئی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں نذر سے تحریم بھی ہو جاتی ہوگی، جس طرح ہماری شریعت میں مباح کا اِیجاب ہو جاتا ہے، مگر تحریم کی نذر جو درحقیقت یمین ہے، ہماری شریعت میں جائز نہیں بلکہ اس میں قسم توڑنا پھر اس کا کفارہ دینا

[1] مستدرك حاكم رقم الحديث: ۳۱۰۸، ومن سورة آل عمران وجامع الترمذي، ابواب التفسير ومن سورة الرعد ج: ۲ ص: ۱۴۴

واجب ہے، کما قال الله تعالی: لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (التحریم:۱) الآیۃ، اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے۔[1]

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرّر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لئے بنایا گیا یقینی طور پر وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے (اور) بنانے کے وقت ہی سے برکتوں والا اور دُنیا جہان کے لوگوں کے لئے ہدایت کا سامان ہے۔ ﴿۹۶﴾

خلاصۂ تفسیر

یقیناً وہ مکان جو سب (مکاناتِ عبادت) سے پہلے لوگوں (کی عبادت گاہ بننے) کے واسطے (منجانب اللہ) مقرّر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ (شہر) مکہ میں ہے (یعنی خانۂ کعبہ) جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے (کیونکہ اس میں دِینی نفع یعنی ثواب ہے) اور (عبادت خاص مثلاً نماز کا رُخ بتلانے میں) جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے (مطلب یہ ہے کہ حج وہاں ہوتا ہے اور مثلاً نماز کا ثواب بروئے تصریحِ حدیث وہاں بہت زیادہ ہوتا ہے، دِینی برکت تو یہ ہوئی، اور جو وہاں نہیں ہیں ان کو اس مکان کے ذریعے سے نماز کا رُخ معلوم ہوتا ہے، یہ رہنمائی ہوئی)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیت میں ساری دُنیا کے مکانات یہاں تک کہ تمام مساجد کے مقابلہ میں بیت اللہ یعنی کعبہ شریف کا شرف اور اَفضلیت کا بیان ہے، اور یہ شرف وفضیلت کئی وجہ سے ہے:-

فضائل بیت اللہ مع تاریخِ تعمیر

اوّل اس لئے کہ وہ دُنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔

دُوسرے یہ کہ وہ برکت والا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ پورے جہان کے لئے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ ہے۔

---

[1] التفسیر الکبیر ج:۴ ص:۳۰۲ سورۃ آل عمران۔

آیت کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، اس کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ دُنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو، نہ دولت خانہ، حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کی شان سے کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، سدیؒ وغیرہ صحابہ وتابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دُنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں مگر عبادت کے لئے یہ پہلا گھر بنا ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔ [1]

بیہقیؒ نے اپنی کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دُنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبریلِ امین کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں، ان حضرات نے حکم کی تعمیل کرلی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں، اوران سے کہا گیا کہ آپ اوّل الناس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں، اور یہ گھر اَوَّلُ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ہے، یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے (ابن کثیر) [2] ضعّفه ابن كثير بابن لهيعة ولا يخفى أنه ليس بمتروك الحديث مطلقًا ولا سيما في هذا المقام فإن الرّواية قد تأيّدت بإشارات الكتاب۔

بعض روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیرِ کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی، طوفانِ نوح میں منہدم ہوئی، اوراس کے نشانات مٹ گئے، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا، پھر ایک مرتبہ کسی حادثے میں اس کی تعمیر منہدم ہوئی تو قبیلہ جرہم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی، پھر ایک مرتبہ منہدم ہوئی تو عمالقہ نے تعمیر کی، اور پھر منہدم ہوئی تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں تعمیر کی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور حجرِ اَسوَد کو اپنے دستِ مبارک سے قائم فرمایا، لیکن قریش نے اس تعمیر میں بناءِ ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی کہ ایک حصہ بیت اللہ کا بیت اللہ سے الگ کردیا جس کو ''حطیم'' کہا جاتا ہے، اور خلیل اللہ علیہ السلام کی بناء میں کعبہ کے دو دروازے تھے، ایک داخل ہونے کے لئے، دُوسرا پشت کی جانب باہر نکلنے کے لئے، قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا، تیسرا تغیر یہ کیا کہ دروازہ بیت اللہ کا سطحِ زمین سے کافی بلند کردیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جاسکے، بلکہ جس کو وہ اجازت دیں وہی جاسکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ

[1] كنز العمال رقم الحديث:۳۲۹۷، حرف الهمزة ج:۲ ص:۱۰۳

[2] تفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۲ ص:۷۸

رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میرا دِل چاہتا ہے کہ موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اس کو بالکل بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنادُوں، قریش نے جو تصرفات بناءِ ابراہیمی کے خلاف کئے ہیں اُن کی اِصلاح کردوں، لیکن نومسلم ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اسی لئے سرِدست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں، اس اِرشاد کے بعد اس دُنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات زیادہ نہیں رہی۔ [۱]

لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد سنے ہوئے تھے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد جس وقت مکہ مکرمہ پر ان کی حکومت ہوئی تو انہوں نے بیت اللہ منہدم کر کے اِرشادِ نبوی اور بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنادیا، مگر عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت مکہ معظّمہ پر چند روزہ تھی، ظالم الامّۃ حجاج بن یوسف نے مکہ پر فوج کشی کر کے ان کو شہید کیا اور حکومت پر قبضہ کر کے اس کو گوارا نہ کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ کارنامہ رہتی دُنیا تک ان کی مدح وثنا کا ذریعہ بنا رہے، اس لئے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ فعل غلط تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جس حالت پر چھوڑا تھا ہمیں اسی حالت پر اس کو رکھنا چاہئے، اس بہانے سے بیت اللہ کو پھر منہدم کر کے اسی طرح کی تعمیر بنادی جو زمانۂ جاہلیت میں قریش نے بنائی تھی، حجاج بن یوسف کے بعد آنے والے بعض مسلم بادشاہوں نے پھر حدیثِ مذکور کی بنا پر یہ ارادہ کیا کہ بیت اللہ کو ازسرِنو حدیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بنادیں، لیکن اس زمانے کے اِمام حضرت اِمام مالک بن انسؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب بار بار بیت اللہ کو منہدم کرنا اور بنانا آگے آنے والے بادشاہوں کے لئے بیت اللہ کو ایک کھلونا بنادے گا، ہر آنے والا بادشاہ اپنی نام آوری کے لئے یہی کام کرے گا، اس لئے اب جس حالت میں بھی ہے اس حالت میں چھوڑ دینا مناسب ہے، تمام اُمت نے اس کو قبول کیا، اسی وجہ سے آج تک وہی حجاج بن یوسف ہی کی تعمیر باقی ہے، البتہ شکست وریخت اور مرمت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

ان روایات سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کعبہ دُنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، اور یا کم از کم سب سے پہلا عبادت خانہ ہے، قرآنِ کریم میں جہاں یہ ذِکر ہے کہ کعبہ کی تعمیر بامرِ خداوندی حضرت اِبراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کی ہے، وہیں اس کے اِشارات بھی موجود ہیں کہ ان بزرگوں نے اس کی ابتدائی تعمیر نہیں فرمائی بلکہ سابق بنیادوں پر اسی کے مطابق تعمیر فرمائی اور کعبہ کی اصل بنیاد پہلے ہی سے تھی، قرآنِ کریم کے اِرشاد: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (البقرۃ:۱۲۷) سے بھی ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے کہ قواعد بیت اللہ یعنی اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، سورۂ حج کی آیت میں ہے:-

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (الحج:۲۶)

[۱] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من ترك بعض الإختیار إلخ ج:۱ ص:۲۴

"یعنی جب ٹھیک کر دیا ہم نے ابراہیم کے لئے ٹھکانا اس گھر کا۔"

اس سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی جگہ پہلے سے متعین چلی آتی تھی، اور پہلی آیت سے اس کی بنیادوں کا ہونا بھی مفہوم ہوتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو تعمیرِ بیت اللہ کا حکم دیا گیا تو فرشتہ کے ذریعہ ان کو بیت اللہ کی جگہ سابق بنیادوں کی نشاندہی کی گئی جو ریت کے تودوں میں دبی ہوئی تھی۔

بہرحال آیتِ مذکورہ سے کعبہ کی ایک فضیلت یہ ثابت ہوئی کہ وہ دُنیا کا سب سے پہلا گھر یا پہلا عبادت خانہ ہے، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دُنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا: مسجدِ حرام، انہوں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسی مسجد ہے؟ آپ نے فرمایا: مسجد بیت المقدس ہے، پھر دریافت کیا کہ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدّت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: چالیس سال کا۔ [1]

اس حدیث میں بیت اللہ کی بناءِ جدید جو اِبراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اس کے اِعتبار سے بیت المقدس کی تعمیر کا فاصلہ بیان کیا گیا ہے، کیونکہ روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ بیت المقدس کی اِبتدائی تعمیر بھی حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے ذریعہ بیت اللہ کی تعمیر سے چالیس سال بعد میں ہوئی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو بیت المقدس کی تعمیر کی یہ بھی بیت اللہ کی طرح بالکل نئی اور اِبتدائی تعمیر نہ تھی، بلکہ سلیمان علیہ السلام نے بناءِ اِبراہیمی پر اس کی تجدید کی ہے، اس طرح روایات میں باہم کوئی تعارض نہیں رہتا۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیشہ سے دُنیا میں اس کی تعظیم و تکریم ہوتی چلی آئی ہے، اس میں لفظ وُضِعَ لِلنَّاسِ میں اس کی طرف بھی اِشارہ ہے کہ اس گھر کی تعظیم و تکریم کسی خاص قوم یا جماعت ہی کا حصہ نہیں، بلکہ عامۂ خلائق اور سب اِنسان اس کی تعظیم کریں گے، اس کی سرشت میں حق تعالیٰ نے ایک عظمت اور ہیبت کا داعیہ رکھا ہے کہ لوگوں کے قلوب اس کی طرف خود بخود مائل ہوتے ہیں، اس میں لفظ "بَكَّة" سے مراد مکہ معظّمہ ہے، خواہ یہ کہا جائے کہ میم کو باء سے بدل دیا گیا ہے، عرب کے کلام میں اس کی نظائر بکثرت ہیں کہ میم کو باء سے بدل دیا کرتے ہیں، اور یا یہ کہا جائے کہ مکہ کا دُوسرا نام "بَكَّة" ہے۔

بیت اللہ کی برکات

اس آیت میں بیت اللہ کی دُوسری فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مبارک ہے، لفظ "مبارك" برکت سے مشتق ہے، "برکت" کے معنی ہیں بڑھنا اور ثابت رہنا، پھر کسی چیز کا بڑھنا اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا وجود کھلے طور پر مقدار میں بڑھ جائے، اور اس طرح بھی کہ اگرچہ اس کی مقدار میں کوئی خاص اِضافہ نہ ہو لیکن اس سے کام اتنے نکلیں جتنے عادۃً

[1] صحیح البخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی ج:۱ ص:۴۷۷، وصحیح مسلم، کتاب المساجد ج:۱ ص:۱۹۹

اس سے زائد سے نکلا کرتے ہیں، اس کو بھی معنوی طور پر زیادتی کہا جاسکتا ہے۔

بیت اللہ کا بابرکت ہونا ظاہری طور پر بھی ہے، معنوی طور پر بھی۔ اس کے ظاہری برکات میں یہ مشاہدہ ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس ایک خشک ریگستان اور بنجر زمین ہونے کے باوجود اس میں ہمیشہ ہر موسم میں ہر طرح کے پھل اور ترکاریاں اور تمام ضروریات مہیا رہتی ہیں، کہ صرف اہلِ مکہ کے لئے نہیں، بلکہ اطرافِ عالم سے آنے والوں کے لئے بھی کافی ہوجاتی ہیں، اور آنے والوں کا حال دُنیا کو معلوم ہے کہ خاص موسمِ حج میں تو لاکھوں اِنسان اَطرافِ عالم سے جمع ہوتے ہیں جن کی مردم شماری اہلِ مکہ سے چوگنی پانچ گنی ہوتی ہے، یہ ہجومِ عظیم وہاں صرف دو چار روز نہیں، بلکہ مہینوں رہتا ہے، موسمِ حج کے علاوہ بھی کوئی وقت ایسا نہیں آتا جس میں باہر سے ہزاروں انسانوں کی آمد روفت نہ رہتی ہو، پھر خاص موسمِ حج میں جبکہ وہاں لاکھوں انسانوں کا زائد مجمع ہوتا ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ بازار میں کسی وقت بھی اشیائے ضرورت ختم ہوگئیں، ملتی نہیں، یہاں تک کہ قربانی کے بکرے جو وہاں پہنچ کر ایک ایک انسان سو سو بھی کرتا ہے اور اوسط فی کس ایک کا تو یقینی ہے، یہ لاکھوں بکرے وہاں ہمیشہ ملتے ہیں، یہ بھی نہیں کہ دُوسرے ملک سے منگانے کا اِہتمام کیا جاتا ہو، قرآنِ کریم میں يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (القصص:۵۷) یعنی ''اس میں باہر سے لائے جاتے ہیں ثمرات ہر چیز کے'' ان الفاظ میں اس کی طرف واضح اِشارہ بھی موجود ہے۔

یہ تو ظاہری برکات کا حال ہے جو مقصود کی حیثیت نہیں رکھتیں، اور معنوی و باطنی برکات تو اتنی ہیں کہ اس کا شمار نہیں ہوسکتا، بعض اہم عبادات تو بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں جو اَجرِ عظیم اور برکاتِ رُوحانی ہیں ان سب کا مدار بیت اللہ پر ہے، مثلاً حج وعمرہ، اور بعض دُوسری عبادات کا بھی مسجدِ حرام میں ثواب بدرجہا بڑھ جاتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ کوئی انسان گھر میں نماز پڑھے اس کو ایک نماز کا ثواب ملے گا، اور اگر اپنے محلّہ کی مسجد میں ادا کرے اس کو پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور جو جامع مسجد میں ادا کرے تو پانچ سو نمازوں کا ثواب پائے گا، اور اگر مسجدِ اقصیٰ میں نماز اَدا کی تو پچاس ہزار نمازوں کا اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور مسجدِ حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا، (یہ روایت ابنِ ماجہ وطحاوی وغیرہ نے نقل کی ہے)۔[۱] حج کے فضائل میں یہ حدیث عام مسلمان جانتے ہیں کہ حج کو صحیح طور پر اَدا کرنے والا مسلمان پچھلے گناہوں سے ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پاک وصاف پیدا ہوا ہے،[۲] ظاہر ہے کہ یہ سب بیت اللہ کی معنوی اور رُوحانی برکات ہیں، انہی برکات کو آیت کے آخر میں لفظ هُدًى سے تعبیر فرمایا گیا ہے مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

[۱] سنن ابن ماجة، كتاب إقامة الصلاة والسُّنَّة فيها باب ما جاء في الصلاة في المسجد الجامع ج:۱ ص:۱۰۲

[۲] صحيح البخاري، كتاب المناسك، باب فضل الحج المبرور ج:۱ ص:۲۰۶

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ

اس میں نشانیاں ہیں ظاہر جیسے مقامِ ابراہیم، اور جو اس کے اندر آیا اس کو اَمن ملا، اور اللہ کا حق ہے

عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ

لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور جو نہ مانے تو پھر اللہ

غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

پروانہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس میں روشن نشانیاں ہیں، مقامِ ابراہیم ہے، اور جو اس میں داخل ہوتا ہے امن پا جاتا ہے۔ اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی اِستطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے لئے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے۔ اور اگر کوئی اِنکار کرے تو اللہ دُنیا جہان کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے۔ ﴿۹۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اس میں (کچھ تشریعی کچھ تکوینی) کھلی نشانیاں (اس کی افضلیت کی موجود) ہیں (چنانچہ تشریعی نشانیوں میں اس کا مبارک اور ہدیٰ بتفسیر مذکور ہونا بیان ہو چکا اور کچھ مقامِ ابراہیم کے بعد مذکور ہیں، یعنی اس میں داخل ہونے والے کا مستحقِ امن ہو جانا اور اس کا حج بشرائطہٖ فرض ہونا جو کہ مطلق مشروعیت مذکورہ سابق پر زائد مفہوم ہے، یہ چار نشانیاں تو تشریعی اس جگہ مذکور ہیں، اب درمیان میں تکوینی کا ذِکر فرماتے ہیں کہ) من جملہ ان (نشانیوں) کے ایک مقامِ ابراہیم (نشانی) ہے، اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) جو شخص اس (کے حدودِ متعلقہ) میں داخل ہو جاوے وہ (شرعاً) امن والا ہو جاتا ہے اور (ایک تشریعی نشانی یہ ہے کہ) اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمے اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے (مگر سب کے ذمہ نہیں بلکہ خاص خاص کے) یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کے سبیل کی، اور جو شخص (اَحکامِ خداوندی کا) منکر ہو تو (خدا تعالیٰ کا کیا ضرر کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہیں (کسی کے ماننے پر ان کا

کوئی کام اٹکا نہیں پڑا بلکہ خود اس منکر ہی کا ضرر رہے)۔

معارف و مسائل

بیت اللہ کی تین خصوصیات

اس آیت میں بیت اللہ یعنی کعبہ کی خصوصیات اور فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں، من جملہ ان کے مقامِ ابراہیم ہے، دُوسرے یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا اور محفوظ ہو جاتا ہے، کوئی اس کو قتل نہیں کر سکتا، تیسرے یہ کہ ساری دُنیا کے مسلمانوں پر اس بیت اللہ کا حج فرض ہے، بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی اِستطاعت ہو، اور قدرت رکھتا ہو۔

پہلی بات کہ اس میں اللہ جل شانہٗ کی قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ جب سے بیت اللہ قائم ہوا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ مکہ کو مخالفین کے حملوں سے محفوظ فرما دیا، ابرہہ نے ہاتھیوں کا لشکر لے کر چڑھائی کی، تو اللہ جل شانہٗ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو پرندوں کے ذریعہ تباہ و ہلاک کر دیا۔ حرمِ مکہ میں داخل ہونے والا اِنسان بلکہ جانور تک محفوظ ہے، جانوروں میں بھی اس کا اِحساس ہے، حدودِ حرم کے اندر جانور بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں، وہاں وحشی شکاری جانور اِنسان سے نہیں بھاگتا، عام طور پر یہ بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بیت اللہ کی جس جانب بارش ہوتی ہے اس جانب کے ممالک زیادہ بارش سے سیراب ہوتے ہیں، ایک عجیب نشانی یہ ہے کہ جمرات جن پر ہر ایک حج کرنے والا سات سات کنکریاں روزانہ تین روز تک پھینکتا ہے، اور ہر سال لاکھوں حجاج وہاں جمع ہوتے ہیں، یہ ساری کنکریاں اگر وہاں جمع ہو کر باقی رہیں تو ایک ہی سال میں وہ جمرات کنکریوں کے ڈھیر میں دَب جائیں، اور چند سال میں تو وہاں ایک پہاڑ بن جائے، حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ حج کے تینوں دِن گزرنے کے بعد وہاں کنکریوں کا کوئی بہت بڑا انبار جمع نہیں ہوتا، کچھ کنکریاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں جس کی وجہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ یہ کنکریاں فرشتے اُٹھا لیتے ہیں اور صرف ایسے لوگوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج کسی وجہ سے قبول نہیں ہوا،[۱] اور یہی وجہ ہے کہ جمرات کے پاس کنکریاں اُٹھا کر رَمی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ وہ غیر مقبول ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اِرشاد کی تصدیق ہر دیکھنے والا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے کہ جمرات کے آس پاس بہت تھوڑی سی کنکریاں نظر آتی ہیں، حالانکہ وہاں سے اُٹھانے یا صاف کرنے کا نہ کوئی اِہتمام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے نہ عوام کی طرف سے۔[۲]

---

[۱] السُّنن الکبریٰ للبیهقی ج:۵ ص:۱۲۸، وسنن الدارقطنی، کتاب الحج، باب المواقیت رقم الحدیث:۲۸۲۲

[۲] اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے اُٹھوانے کا اِنتظام کیا ہے۔ محمد تقی عثمانی

اس وجہ سے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ''خصائصِ کبریٰ'' میں فرمایا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات ایسے بھی ہیں جو آپ کی وفات کے بعد بھی موجود اور قائم ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے، اور ہر شخص ان کا مشاہدہ کر سکے گا، ان میں سے ایک تو قرآن کا بے نظیر ہونا ہے کہ ساری دُنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہے، یہ عجز جیسے عہدِ نبوی میں تھا ایسے ہی آج بھی موجود ہے اور قیامت تک رہے گا، ہر زمانہ کا مسلمان پوری دُنیا کو چیلنج کر سکتا ہے کہ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ (البقرۃ: ۲۳) اسی طرح جمرات کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان پر پھینکی ہوئی کنکریاں نامعلوم طور پر فرشتے اُٹھا لیتے ہیں، صرف ان بدنصیب لوگوں کی کنکریاں رہ جاتی ہیں جن کے حج قبول نہیں ہوتے، آپ کے اس ارشاد کی تصدیق ہر زمانہ، ہر قرن میں ہوتی رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی، یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ اور بیت اللہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے۔

مقامِ ابراہیم

اُن نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی مقامِ ابراہیم ہے، اسی لئے قرآنِ کریم نے اس کو مستقل طور پر علیحدہ بیان فرمایا، مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر فرماتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہو جاتا تھا، اور نیچے اُترنے کے وقت نیچا ہو جاتا تھا، اس پتھر کے اُوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمِ مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے، ظاہر ہے کہ ایک بے حس و بے شعور پتھر میں یہ اِدراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہو جائے اور یہ تأثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قدمین کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے، یہ سب آیاتِ قدرت ہیں جو بیت اللہ کی اعلیٰ فضیلت ہی سے متعلق ہیں، یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھو وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ (البقرۃ: ۱۲۵) اُس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اُٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر مطاف سے باہر بیر زمزم کے قریب رکھ دیا گیا، اور آج کل اس کو اسی جگہ ایک محفوظ مکان میں مقفل کیا ہوا ہے، طواف کے بعد کی دو رکعتیں اسی مکان کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں، حال میں یہ ترمیم ہوئی کہ وہ مکان تو ہٹا دیا گیا اور مقامِ ابراہیم کو ایک بلّوری خول کے اندر محفوظ کر دیا گیا، مقامِ ابراہیم اصل میں اس خاص پتھر کا نام ہے، اور طواف کے بعد کی رکعتیں اس کے اُوپر یا اس کے پاس پڑھنا افضل ہے، لیکن مقامِ ابراہیم کے لفظی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ تمام مسجدِ حرام کو حاوی ہے، اسی لئے حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ مسجدِ حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

داخلِ بیت اللہ کا مامون ہونا

آیتِ مذکورہ میں بیت اللہ کی دُوسری خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ جو اس میں داخل ہوجائے وہ امن والا یعنی مامون ومحفوظ ہوجاتا ہے، اس میں داخل ہونے والے کا مامون ومحفوظ ہونا ایک تو تشریعی اِعتبار سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو یہ حکم ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہوجائے اس کو نہ ستاؤ، نہ قتل کرو، اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے اس کو بھی اس جگہ سزا نہ دی جائے، بلکہ اس کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکلے، حرم سے باہر آنے پر سزا جاری کی جائے گی، اس طرح حرم میں داخل ہونے والا شرعی طور پر مامون ومحفوظ ہوگیا۔

دُوسرے حرم میں داخل ہونے والے کا مامون ومحفوظ ہونا یوں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر ہر قوم وملت کے دِلوں میں بیت اللہ کی تعظیم وتکریم ڈال دی ہے، اور وہ سب عموماً ہزاروں اِختلافات کے باوجود اس عقیدے پر متفق ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا اگرچہ مجرم یا ہمارا دُشمن ہی ہو تو حرم کا اِحترام اس کا مقتضی ہے کہ وہاں اس کو کچھ نہ کہیں، حرم کو عام جھگڑوں لڑائیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب اور ان کے مختلف قبائل خواہ کتنی ہی عملی خرابیوں میں مبتلا تھے، مگر بیت اللہ اور حرمِ محترم کی عظمت پر سب جان دیتے تھے، ان کی جنگ جوئی اور تندخوئی ساری دُنیا میں مشہور ہے، لیکن حرم کے اِحترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اپنی آنکھیں نیچی کر کے گزر جاتا تھا، اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

فتح مکہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دِین کی اہم مصلحت اور بیت اللہ کی تطہیر کی خاطر صرف چند گھنٹوں کے لئے حرم میں قتال کی اِجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اور فتح کے بعد آپ نے بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اِعلان واِظہار فرمایا کہ یہ اجازت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تطہیرِ بیت اللہ کی غرض سے تھی، اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے تھی، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے پھر اس کی وہی حرمت ثابت ہے جو پہلے سے تھی، اور فرمایا کہ حرم کے اندر قتل وقتال نہ مجھ سے پہلے حلال تھا، نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے، اور میرے لئے بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے حلال ہوا تھا، پھر حرام کردیا گیا۔[1]

رہا یہ معاملہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف مکہ میں فوج کشی کی اور قتل وغارت کیا، یہ اس اَمنِ عام کے تشریعی طور پر اس لئے خلاف نہیں کہ باجماعِ اُمت اس کا یہ فعل حرام اور سخت گناہ تھا، تمام اُمت نے اس پر نفرین کی، اور تکوینی طور پر بھی اس کو اِحترامِ بیت اللہ کے منافی اس لئے نہیں

---

[1] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم ج:۱ ص:۲۲

کہہ سکتے کہ حجاج خود بھی اپنے اس عمل کے حلال ہونے کا معتقد نہ تھا، وہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک سنگین جرم کر رہا ہوں، لیکن سیاست وحکومت کی مصالح نے اس کو اندھا کیا ہوا تھا۔

بہر حال یہ بات پھر بھی محفوظ تھی کہ عامۂ خلائق بیت اللہ اور حرم کو اس درجہ واجب الاحترام سمجھتے رہے ہیں کہ اس میں قتل وقتال اور لڑائی جھگڑے کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں، اور یہ ساری دُنیا میں صرف بیت اللہ اور حرمِ محترم ہی کی خصوصیت ہے۔

حجِ بیت اللہ کا فرض ہونا

آیت میں بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم وواجب قرار دِیا ہے، بشرطیکہ وہ بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت واِستطاعت رکھتے ہوں، اس مقدرت واِستطاعت کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پاس ضروریاتِ اصلیہ سے فاضل اتنا مال ہو جس سے وہ بیت اللہ تک آنے جانے اور وہاں کے قیام کا خرچ برداشت کر سکے، اور اپنی واپسی تک ان اہل وعیال کا بھی اِنتظام کر سکے جن کا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے، نیز ہاتھ پاؤں اور آنکھوں سے معذور نہ ہو، کیونکہ ایسے معذور کو تو اپنے وطن میں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے، وہاں جانے اور اَرکانِ حج ادا کرنے پر کیسے قدرت ہوگی۔

اسی طرح عورت کے لئے چونکہ بغیر محرَم کے سفر کرنا شرعاً جائز نہیں، اس لئے وہ حج پر قادر اس وقت سمجھی جائے گی جبکہ اس کے ساتھ کوئی محرَم حج کرنے والا ہو، خواہ محرَم اپنے خرچ سے حج کر رہا ہو، یا یہ عورت اس کا خرچ بھی برداشت کرے۔ اسی طرح وہاں تک پہنچنے کے لئے راستے کا مامون ہونا بھی اِستطاعت کا ایک جزء ہے، اگر راستے میں بدامنی ہو، جان مال کا قوی خطرہ ہو تو حج کی اِستطاعت نہیں سمجھی جائے گی۔

لفظ ''حج'' کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور شرعی معنی کی ضروری تفصیل تو خود قرآنِ کریم نے بیان فرمائی کہ طوافِ کعبہ اور وقوفِ عرفہ ومزدلفہ وغیرہ ہیں، اور باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زبانی اِرشادات اور عملی بیانات کے ذریعے واضح فرمادی ہیں، اس آیت میں حج بیت اللہ کے فرض ہونے کا اِعلان فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا:

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ یعنی جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے۔

اس میں وہ شخص تو داخل ہے ہی جو صراحۃً فریضۂ حج کا منکر ہو، حج کو فرض نہ سمجھے، اس کا دائرۂ اِسلام سے خارج اور کافر ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے وَمَنْ كَفَرَ کا لفظ اس پر صراحۃً صادق ہے، اور جو شخص عقیدہ کے طور پر فرض سمجھتا ہے، لیکن باوجود اِستطاعت وقدرت کے حج نہیں کرتا، وہ بھی ایک حیثیت سے منکر ہی ہے، اس پر لفظ وَمَنْ كَفَرَ کا اِطلاق تہدید اور

تاکید کے لئے ہے، کہ یہ شخص کافروں جیسے عمل میں مبتلا ہے، جیسے کافر ومنکر حج نہیں کرتے یہ بھی ایسا ہی ہے، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ آیت کے اس جملے میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو باوجود قدرت واستطاعت کے حج نہیں کرتے کہ وہ اپنے اس عمل سے کافروں کی طرح ہوگئے، العیاذ باللہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ

تو کہہ: اے اہلِ کتاب! کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے اور اللہ کے رُوبرو ہے

عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو تم کرتے ہو۔ تو کہہ: اے اہلِ کتاب! کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے

مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

ایمان لانے والوں کو کہ ڈھونڈتے ہو اس میں عیب اور تم خود جانتے ہو، اور اللہ بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ

تمہارے کام سے۔ اے ایمان والو! اگر تم کہا مانوگے بعضے

اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ

اہلِ کتاب کا تو پھر کردیں گے وہ تم کو ایمان لائے پیچھے کافر۔ اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو

وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ

اور تم پر پڑھی جاتی ہیں آیتیں اللہ کی اور تم میں اس کا رسول ہے، اور جو کوئی مضبوط پکڑے اللہ کو

فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع

تو اس کو ہدایت ہوئی سیدھے راستے کی۔

ع ۱۰

آسان ترجمۂ قرآن

کہہ دو کہ: ''اے اہلِ کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں اِنکار کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب کا گواہ ہے'' ﴿۹۸﴾ کہہ دو کہ: ''اے اہلِ کتاب! اللہ کے راستے میں ٹیڑھ پیدا کرنے کی کوشش کر کے ایک مؤمن کے لئے اس میں کیوں رُکاوٹ ڈالتے ہو جبکہ تم خود حقیقتِ حال کے گواہ ہو؟ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔'' ﴿۹۹﴾ اے اِیمان والو! اگر تم اہلِ کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لو گے تو وہ تمہارے اِیمان لانے کے بعد تم کو دوبارہ کافر بنا کر چھوڑیں گے ﴿۱۰۰﴾ اور تم کیسے کفر اَپناؤ گے جبکہ اللہ کی آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں اور اس کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے؟ اور (اللہ کی سنت یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کا سہارا مضبوطی سے تھام لے، وہ سیدھے راستے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ﴿۱۰۱﴾

ربطِ آیات

اُوپر سے اہلِ کتاب کے عقائدِ فاسدہ اور ان کے شبہات پر کلام چل رہا تھا، درمیان میں بیت اللہ اور حج کا تذکرہ آیا، آگے پھر اہلِ کتاب ہی سے خطاب ہے جس کا تعلق ایک خاص واقعہ سے ہے، کہ ایک یہودی شماس بن قیس مسلمانوں سے بہت کینہ رکھتا تھا، اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو ایک جگہ مجتمع و متفق دیکھا تو حسد سے بے چین ہوگیا، اور ان میں تفریق ڈالنے کی فکر میں لگا، آخر یہ تجویز کی کہ ایک شخص سے کہا کہ ان دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک بڑی جنگ عرصۂ دراز تک رہ چکی ہے، اور اس کے متعلق فریقین کے فخریہ اَشعار ہیں، وہ اَشعار ان کی مجلس میں پڑھ دیئے جائیں، چنانچہ اَشعار کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اُٹھی، اور آپس میں چناں چنیں ہونے لگی، یہاں تک کہ موقع اور وقت لڑائی کا پھر مقرّر ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان کے پاس تشریف لائے، اور فرمایا: کیا اندھیر ہے، میرے ہوتے ہوئے پھر مسلمان ہونے اور باہم متفق و مانوس ہونے کے بعد یہ کیا جہالت ہے، کیا تم اسی حالت میں کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟ سب متنبہ ہوئے اور سمجھا کہ یہ شیطانی حرکت تھی، اور ایک دُوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی، اس واقعے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اس واقعے کو ''رُوح المعانی'' میں بروایت ابنِ اِسحاق اور ایک جماعت نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے، [1] یہ مضمون کئی آیتوں تک چلا گیا ہے، جس میں اوّل ملامت ہے ان اہلِ کتاب پر جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۱۴۸

بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر ملامت سے پہلے ان کے کفر پر بھی ملامت کی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ خود بھی مسلمان ہو جاتے نہ یہ کہ دُوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگے رہے، پھر خطاب وفہمائش مسلمانوں کو ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان اہلِ کتاب سے) فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! تم (بعد ظہور حجت حقانیتِ اسلام کے) کیوں اِنکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا (اُصول وفروع اس میں سب آگئے) حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی اِطلاع رکھتے ہیں (تم کو اس سے بھی ڈر نہیں لگتا، اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! کیوں (ہٹانے کی کوشش کرتے) ہو اللہ کی راہ (یعنی اس کے دِینِ حق) سے ایسے شخص کو جو (اس دِینِ حق کے ہونے پر) اِیمان لا چکا اس طور پر کہ کجی (کی باتیں) ڈھونڈتے ہو اس راہ کے (اندر پیدا کرنے کے) لئے (جیسا کہ قصۂ مذکورہ میں کوشش کی تھی کہ اس کارروائی سے ان کے دِین کے اندر بوجہ نااِتفاقی کہ گناہ بھی ہے اور اِجتماعی قوّت کی بربادی بھی، اور یہ کہ ان بکھیڑوں میں پڑ کر دِینِ حق سے ان کو بُعد ہو جاوے گا) حالانکہ تم خود بھی (اس حرکت کے قبیح ہونے کی) اِطلاع رکھتے ہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں (وقتِ معین پر اس کی سزا دیں گے) اے اِیمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقے کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دِی گئی ہے (یعنی اہلِ کتاب میں سے) تو وہ لوگ تمہارے اِیمان لائے پیچھے (اِعتقاداً یا عملاً) کافر بنا دیں گے اور (بھلا) تم کفر کیسے کر سکتے ہو (یعنی تمہارے لئے کب رَوا ہو سکتا ہے) حالانکہ (اسباب مانع کفر کے پورے جمع ہیں کیونکہ) تم کو اللہ تعالیٰ کے اَحکام (قرآن میں) پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں (اور دونوں قوی ذرائع ہیں اِیمان پر قائم رہنے کے، پس تم کو چاہئے کہ ان دونوں ذریعوں کی تعلیم تلقین کے موافق اِیمان پر اور اِیمان کی باتوں پر قائم رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے (یعنی اِیمان پر پورا قائم رہتا ہے، کیونکہ اللہ کو مضبوط پکڑنا یہی ہے کہ اس کی ذات وصفات کی تصدیق کرے، اس کے اَحکام کو مضبوط پکڑے، کسی دُوسرے مخالف کی موافقت نہ کرے) تو (ایسا شخص) ضرور راہِ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے (یعنی وہ راہِ راست پر ہوتا ہے، اور راہِ راست پر ہونا اصل ہے ہر صلاح وفلاح کی، پس اس میں ایسے شخص کے لئے ہر صلاح وفلاح کی بشارت ووعدہ ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہئے اس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا

مسلمان۔ اور مضبوط پکڑو رسّی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور یاد کرو

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ

احسان اللہ کا اپنے اُوپر جبکہ تھے تم آپس میں دُشمن پھر اُلفت دی تمہارے دِلوں میں اب ہوگئے

بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ

اس کے فضل سے بھائی، اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے، پھر تم کو اس سے نجات دی،

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اسی طرح کھولتا ہے اللہ تم پر آیتیں تا کہ تم راہ پاؤ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اِیمان والو! دِل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے، اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو ﴿۱۰۲﴾ اور اللہ کی رَسّی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ نے تم پر جو اِنعام کیا ہے اسے یاد رکھو کہ ایک وقت تھا جب تم ایک دُوسرے کے دُشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دِلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے تمہیں اس سے نجات عطا فرمائی۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں کھول کھول کر واضح کرتا ہے، تا کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔ ﴿۱۰۳﴾

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہلِ کتاب اور دُوسرے لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اِہتمام کریں، مذکورہ دو آیتوں میں مسلمانوں کی اِجتماعی قوّت کو مضبوط، ناقابلِ تسخیر بنانے کے دو اہم اُصول بتلائے گئے ہیں۔

اوّل تقویٰ، دُوسرے باہمی اِتفاق و اِتحاد، اور تفرق و اختلاف سے بچنا۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے (ایسا) ڈرا کرو (جیسا) ڈرنے کا حق ہے (کامل ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شرک و کفر سے بچے ہو، اسی طرح تمام گناہوں سے بھی بچا کرو، اور بلا وجہ شرعی لڑنا معصیت ہے تو اس سے بھی بچنا فرض ہے) اور بجز اِسلام (کامل) کے (جس کا حاصل وہی ہے جو کامل ڈرنے کا حق تھا) اور کسی حالت پر جان نہ دینا (یعنی اسی کامل تقویٰ اور کامل اسلام پر تا دَمِ مرگ قائم رہنا) اور مضبوط پکڑے رہو، اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ تعالیٰ کے دِین کو جس میں اُصول و فروع سب آگئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو (جس کی اسی دِین میں تعلیم بھی ہے) اور باہم نا اِتفاقی مت کرو (جس کی اسی دِین میں ممانعت بھی ہے) اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا اِنعام (ہوا) ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم (باہم) دُشمن تھے (یعنی قبل اسلام کے، چنانچہ اوس و خزرج کے دو قبیلوں میں طویل مدّت سے جنگ چلی آتی تھی، اور عام طور پر اکثر عرب کے لوگوں کی یہی حالت تھی) پس اللہ تعالیٰ نے (اب) تمہارے قلوب میں (ایک دُوسرے کی) اُلفت ڈال دی، سو تم خدا تعالیٰ کے (اس) اِنعام (تالیفِ قلوب) سے (اب) آپس میں بھائی بھائی (کی طرح) ہوگئے اور (ایک اِنعام جو کہ اِنعامِ مذکورہ کی بھی اصل ہے یہ فرمایا کہ) تم لوگ (بالکل) دوزخ کے گڑھے کے کنارے (ہی) پر کھڑے تھے (یعنی بوجہ کافر ہونے کے دوزخ سے اتنے قریب تھے کہ بس دوزخ میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی) سو اس (گڑھے) سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی (یعنی اسلام نصیب کیا جس نے جہنم سے نجات دِلائی، تو اَب تم ان اِنعاموں کی قدر پہچانو اور آپس کے جدال و قتال سے جو کہ معصیت ہے اللہ کی اُن نعمتوں کو زائل نہ کرو، کیونکہ باہمی جنگ و جدال سے پہلا اِنعام یعنی سب کے قلوب کا باہم مربوط اور مانوس ہونا تو خود ہی زائل ہوجائے گا، اور دُوسرا اِنعام یعنی دِینِ اسلام بھی اس سے مختل اور کمزور ہوجائے گا، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ اَحکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے (اور) اَحکام (بھی) بیان کر کے بتلاتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ (راست) پر قائم رہو۔

معارف و مسائل

مسلمانوں کی اِجتماعی قوّت کے دو اُصول: تقویٰ اور باہمی اِتفاق

مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں پہلا اُصول اور دُوسری میں دُوسرا بتلایا گیا ہے، پہلا اُصول جو مذکورہ

آیت نے بتلایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے مطابق ہو۔

لفظ ''تقویٰ'' اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں، یا کہ ان سے عذابِ الٰہی کا خطرہ ہے، وہ ڈرنے کی چیز، تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر وشرک سے بچنا ہے، اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لئے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دُوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل وبرکات جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا، مذکورہ آیت میں اِتَّقُوا اللّٰہَ کے بعد حَقَّ تُقٰتِہٖ کا کلمہ بڑھایا گیا ہے کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔

حقِ تقویٰ کیا ہے؟

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے:-

حَقَّ تُقَاتِہٖ هُوَ اَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَيُذْكَرُ فَلَا يُنْسٰى وَيُشْكَرُ فَلَا يُكْفَرُ۔ (بحر محیط) [1]

''حقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے، کوئی کام طاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔''

اسی مفہوم کو ائمۂ تفسیر نے دُوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے، مثلاً بعض نے فرمایا کہ حقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور بُرائی کی پروا نہ کرے، اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے، اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو، اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حقِ تقویٰ ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔

اور قرآنِ کریم کی ایک دُوسری آیت میں جو فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:۱۶) ہے یعنی ''اللہ سے ڈرو جتنا

---

[1] تفسیر البحر المحیط تحت الآیۃ المذکورۃ ج:۳ ص:۳۳۹

تمہاری قدرت میں ہے'' تو حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؒ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حَقَّ تُقٰتِهٖ کی ہی تفسیر و تشریح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صَرف کر دے تو حقِ تقویٰ ادا ہو گیا، اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صَرف کرنے کے بعد کسی ناجائز میں مبتلا ہو ہی گیا تو وہ حقوقِ تقویٰ کے خلاف نہیں۔

اگلے جملے میں جو اِرشاد فرمایا: وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درحقیقت پورا اِسلام ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اِطاعت اور اس کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کا ہی نام تقویٰ ہے، اور اسی کو ''اسلام'' کہا جاتا ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ آیت میں حکم یہ ہے کہ تمہاری موت اسلام ہی پر آنی چاہئے، اسلام کے سوا کسی حال پر موت نہ آنی چاہئے۔

تو یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موت تو آدمی کے اِختیار میں نہیں، کسی وقت، کسی حال میں آسکتی ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''كَمَا تُحْيُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَكَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ'' یعنی ''جس حالت پر تم اپنی زندگی گزاروگے اسی پر موت آئے گی، اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کئے جاؤگے۔'' [1] تو جو شخص اپنی پوری زندگی اسلام پر گزارنے کا پختہ عزم رکھتا ہے، اور مقدور بھر اس پر عمل کرتا ہے اس کی موت اِن شاء اللہ اسلام ہی پر آئے گی، بعض روایاتِ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمالِ صالحہ کرتے ہوئے گزر گئی، آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال حبط و برباد ہوگئے، یہ ایسے ہی لوگوں کو پیش آسکتا ہے جن کے عمل میں اوّل اِخلاص اور پختگی نہیں تھی، واللہ اعلم۔

مسلمانوں کی اِجتماعی قوّت کا دُوسرا اُصول: باہمی اِتفاق

دُوسری آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا میں اس کو نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے کہ سب سے پہلے وہ اُصول اور گُر بتلایا جو اِنسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخۂ اکسیر ہے، اس کے بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا، اس کے بعد آپس کے اِفتراق و اِنتشار سے منع فرمایا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ اِتفاق و اِتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دُنیا کے تمام اِنسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مذہب و مشرب سے تعلق رکھتے ہوں سب کا اِتفاق ہے، اس میں دو رائیں ہونے کا اِمکان ہی نہیں، دُنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہٖ مفید اور بہتر جانتا ہو، اس لئے دُنیا کی ہر

[1] مرقاة المفاتيح، كتاب الرؤيا، الفصل الأول ج:١٣ ص:٣٧٨

جماعت، ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں، لیکن دُنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اِتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اِتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ اِنسانیت فرقوں، گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹیوں کا لامحدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنی میں دو آدمیوں کا اِتحاد و اِتفاق بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے، وقتی اَغراض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اِتفاق کرتے ہیں، اَغراض پوری ہوجائیں یا ان میں ناکامی ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ اِتفاق ختم ہوجائے بلکہ اِفتراق اور عداوتوں کی نوبت آتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے، اور جبکہ دُوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ اُن سے متفق ہونے کی بجائے اُن کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اس لئے لازمی طور پر ہر دعوتِ اِتحاد کا نتیجہ ایک ہی جماعتوں اور اَفراد کا اِفتراق و اِنتشار نکلتا ہے، اور اِختلافات کی دَلدَل میں پھنسی ہوئی اِنسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس لئے قرآنِ حکیم نے صرف اِتحاد و اِتفاق اور تنظیم و اجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ و عادلانہ اُصول بھی بتلادیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اِختلاف نہیں ہونا چاہئے، وہ یہ ہے کہ کسی اِنسانی دِماغ یا چند اِنسانوں کے بنائے ہوئے نظام و پروگرام کو دُوسرے اِنسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ سب اس پر متفق ہوجائیں گے عقل و اِنصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، البتہ ربّ العالمین کا دِیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب اِنسانوں کو متفق ہونا ہی چاہئے، کوئی عقل مند اِنسان اس سے اُصولاً اِنکار نہیں کرسکتا، اب اگر اِختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہوسکتی ہے کہ اَحکام الحاکمین رَبّ العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کونسا ہے، یہودی نظامِ توراۃ کو، نصاریٰ نظامِ اِنجیل کو خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا واجب التعمیل بتلاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رُسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔

لیکن اوّل تو اگر اِنسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہوکر اپنی عقلِ خداداد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوکر اس کے سامنے آجاتی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیام قرآن کی صورت میں لائے ہیں، آج اس کے سوا کوئی نظام خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اس وقت مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر اِیمان ہے کہ آج قرآنِ کریم ہی ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف و تغییر کا بھی اِمکان نہیں، اس لئے سرِدست میں غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن پر اِیمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتا

ہوں کہ ان کے لئے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے، اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآنِ کریم کے نظام پر متفق ہوجائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی وطنی اِختلافات ایک لحظہ میں ختم ہوسکتے ہیں جو اِنسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اِختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تعبیرِ قرآن میں رہ سکتا ہے، اور اگر ایسا اِختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ اِنسان کی اِجتماعی زندگی کے لئے مضر بلکہ ایسا اِختلافِ رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری اَمر ہے، سواس پر قابو پانا اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دُشوار نہیں، بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہوکر ہماری پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلاف وجدال کا کوئی علاج نہیں رہتا، اور اسی اِختلاف واِنتشار کو قرآنِ کریم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور آج اسی قرآنی اُصول کو نظر اَنداز کردینے کی وجہ سے ہماری پوری ملت اِنتشار واِفتراق میں پھنس کر برباد ہورہی ہے، قرآنِ کریم کی آیتِ مذکورہ میں اس اِفتراق کو مٹانے کا نسخۂ اکسیر اس طرح بتلایا ہے:-

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا

''یعنی اللہ کی رَسّی کو سب مل کر مضبوط تھامو''

اللہ کی رَسّی سے مراد قرآن مجید ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُودُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ'' [۱] یعنی ''کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رَسّی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے'' (ابنِ کثیر)۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''حَبْلُ اللّٰهِ هُوَ الْقُرْآنُ'' [۲] کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابنِ کثیر)

محاورۂ عربی میں ''حبل'' سے مراد عہد بھی ہوتا ہے، اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعے یا وسیلے کا کام دے سکے، قرآن کو یا دِین کو رَسّی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رِشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دُوسری طرف تمام اِیمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے اس ایک جملے میں حکیمانہ اُصول بتلائے گئے، ایک یہ کہ ہر اِنسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات یعنی قرآن پر مضبوطی سے عامل ہو، دُوسری یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں، جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق ومتحد اور منظّم ہوجائیں، جیسے کوئی جماعت ایک رَسّی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جسمِ واحد بن جاتی ہے، قرآنِ کریم نے ایک دُوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح اس طرح بیان فرمایا ہے:-

---

[۱] كنز العمال حرف الهمزة رقم الحديث: ۹۲۳

[۲] ترجمہ:- اللہ کی رَسّی قرآن ہے۔ كنز العمال حرف الهمزة رقم الحديث: ۲۴۸۹

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (مریم)

''یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں دوستی ومحبت پیدا فرما دیتے ہیں۔''

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اِعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جو کسی بلندی پر چڑھتے وقت ایک مضبوط رسّی کو پکڑ لیں، اور ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ لہٰذا اشارہ فرمایا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوّت سے پکڑے رہو گے، کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اور اِنفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اِجتماعی قوّت بھی غیر متزلزل اور ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم سے تمسّک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیاتِ تازہ حاصل کر لیتی ہے، اور اس سے ہٹ کر ان کی قومی واجتماعی زندگی تو تباہ ہو ہی جائے گی اور اس کے بعد اِنفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

پوری مسلم قوم کا اِتفاق صرف اسلام ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہو سکتا

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے کہ وحدت واتفاق کے لئے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو، پھر مرکزِ وحدت کے بارے میں اقوامِ عالم کی راہیں مختلف ہیں، کہیں نسلی اور نسبی رِشتوں کو مرکزِ وحدت سمجھا گیا، جیسے قبائلِ عرب کی وحدت تھی کہ ''قریش'' ایک قوم اور ''بنوتمیم'' دُوسری قوم سمجھی جاتی تھی۔ اور کہیں رنگ کا اِمتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا، کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دُوسری قوم سمجھے جاتے، کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکزِ اتحاد بنایا ہوا تھا، کہ ہندی ایک قوم اور عربی دُوسری قوم، کہیں آبائی رُسوم ورِواج کو مرکزِ وحدت بنایا گیا تھا، کہ جو اُن رُسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جو اُن کے پابند نہیں وہ دُوسری قوم، جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج وغیرہ۔

قرآنِ کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکزِ وحدت ''حبل اللہ'' قرآنِ کریم یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ محکم کو قرار دِیا، اور دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ مؤمن ایک قوم ہے جو حبل اللہ سے وابستہ ہے، اور کافر دُوسری قوم جو اس حبلِ متین سے وابستہ نہیں، خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن:۲) کا یہی مطلب ہے۔ جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکزِ وحدت بنایا جائے، کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اِختیاری اُمور ہیں جن کو کوئی اِنسان اپنے سعی وعمل سے حاصل نہیں کر سکتا، جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا، جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا، جو ہندی ہے وہ عربی نہیں ہو سکتا، اس لئے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرے میں ہو سکتی ہیں، ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری اِنسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دُنیا کو

ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا، اس لئے قرآن کریم نے مرکزِ وحدت حبل اللہ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کو بنایا، جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے، کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا ہندی وانگریزی، کسی قبیلے کسی خاندان کا ہو، ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکزِ وحدت کو اختیار کر سکتا ہے، اور دُنیا بھر کے پورے انسان اس مرکزِ وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں، اور اگر وہ گروہ آبائی رسم ورواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی، کہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں، اور اس کا اتباع کر کے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں، جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت سے مربوط ہو جائے گی۔

دُوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دُنیوی اور دینی زندگی کو دُرست کرلے گا، یہ وہ حکیمانہ اُصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دُنیا کی اقوام کو للکار سکتا ہے، کہ یہی صحیح راستہ ہے، اس طرف آؤ، اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے صدیوں سے چل رہی ہے، وہ خود اسلام کے دعوے داروں میں کامیاب ہوگئی، اب اُمتِ اسلامیہ کی وحدت عربی، مصری، ہندی، سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی، قرآنِ کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو بآوازِ بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ اُن کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے، اس لئے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں، جس نے ان کو پہلے بھی ساری دُنیا میں غالب اور فائق اور سر بلند بنایا، اور اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستہ سے مل سکتی ہے۔

الغرض اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کے پابند ہو جائیں، دُوسرے یہ کہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ اس نظام کو تھام لیں تا کہ ملتِ اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظم ہو جائے، جیسا کہ اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔

مسلمانوں میں اتفاق کے ایجابی پہلو کی وضاحت کے بعد فرمایا: وَلَا تَفَرَّقُوْا ۠ باہم نااتفاقی نہ کرو، قرآنِ حکیم کا یہ حکیمانہ انداز ہے کہ وہ جہاں ایجابی پہلو واضح کرتا ہے وہیں سلبی پہلو سے مخالف چیزوں سے منع فرماتا ہے، چنانچہ ایک دُوسری آیت میں ارشاد فرمایا:-

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ (الانعام: ۱۵۳)

اس آیت میں بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی تلقین ہے اور اپنی خواہشات کے زیرِ اثر خودساختہ راستوں پر چلنے کی

ممانعت۔ نااِتفاقی کسی قوم کی ہلاکت کا سب سے پہلا اور آخری سبب ہے، اسی لئے قرآنِ حکیم نے بار بار مختلف اسالیب میں اس کی ممانعت فرمائی ہے:-

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (الانعام:۱۵۹)

''یعنی جن لوگوں نے اپنے دِین میں تفرقے ڈالے اور مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے کوئی تعلق اور کوئی واسطہ نہیں۔''

علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں کے واقعات کو نقل فرمایا کہ کس طرح وہ اُمتیں باہمی اِختلاف وشقاق کے باعث مقصدِ حیات سے منحرف ہوکر دُنیا وآخرت کی رُسوائیوں میں مبتلا ہوچکی ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے، اور تین چیزوں کو ناپسند، پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:-

اوّل یہ کہ تم عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو، اور نااِتفاقی سے بچو، سوم یہ کہ اپنے حکام اور اُولوا الامر کے حق میں خیرخواہی کا جذبہ رکھو۔

اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں یہ ہیں: ۱- بےضرورت قیل وقال اور بحث ومباحثہ، ۲- بلاضرورت کسی سے سوال کرنا، ۳- اِضاعتِ مال۔ (ابن کثیر عن ابی ہریرۃ)[1]

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہر اِختلاف مذموم ہے، یا کوئی اِختلاف غیرمذموم بھی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر اِختلاف مذموم نہیں ہے، بلکہ مذموم وہ اِختلاف ہے کہ جس میں اپنی اہواء اور خواہشات کی بنا پر قرآن سے دُور رہ کر سوچا جائے، لیکن اگر قرآن پر مجتمع رہتے ہوئے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح وتفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری اِستعداد اور دِماغی صلاحیتوں کی بنا پر فروع میں اِختلاف کیا جائے تو یہ اِختلاف فطری ہے، اور اِسلام اس سے منع نہیں کرتا، صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمہ فقہاءؒ کا اِختلاف اسی قسم کا اِختلاف تھا، اور اسی اِختلاف کو رحمت قرار دیا گیا، ہاں اگر انہی فروعی بحثوں کو اَصل دِین قرار دِیا جائے اور ان میں اِختلاف کو جنگ وجدل اور سب وشتم کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے، باہمی اِتحاد کے ان دونوں پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد اس حالت کی طرف اِشارہ کیا گیا جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے، قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب وروز کے کشت وخون کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست ونابود ہوجاتی، اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمتِ اِسلام تھی، چنانچہ فرمایا گیا:-

---

۱ تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۸۹، ومسند احمد، مسند ابی هریرة رضی الله عنه رقم الحدیث:۷۹۸۴

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ

''یعنی اللہ کا یہ انعام اپنے اُوپر یاد رکھو کہ جب تم باہم دُشمن تھے تو اس نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی، سوتم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، سو اس نے تمہیں اس سے بچالیا۔''

یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر خدا تعالیٰ نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بھائی بھائی بنادیا، جس سے تمہارے دِین ودُنیا دُرست ہوگئے، اور ایسی دوستی قائم ہوگئی جسے دیکھ کر تمہارے دُشمن مرعوب ہوئے، اور یہ برادرانہ اِتحاد خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو رُوئے زمین کا خزانہ خرچ کرکے بھی میسر نہ آسکتی تھی۔

واقعہ شانِ نزول میں شریر لوگوں نے جو اوس وخزرج کے قبیلوں کو پچھلی جنگ یاد دِلا کر فساد برپا کرنا چاہا تھا آیتِ مذکورہ میں اس کا مکمل علاج ہوگیا، نتائج اور بذریعہ اسلام ان سے رہائی کا بیان فرمادیا۔

مسلمانوں کا باہمی اِتحاد اللہ تعالیٰ کی اِطاعت پر موقوف ہے

قرآنِ حکیم کے اس اِرشاد سے ایک اور حقیقت کا اِنکشاف ہوا، وہ یہ کہ دِلوں کا مالک درحقیقت اللہ جل شانہ ہے، دِلوں کے اندر محبت یا نفرت پیدا کرنا اسی کا کام ہے، کسی جماعت کے قلوب میں باہمی محبت اور مودّت پیدا کرنا خالص اِنعامِ خداوندی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اِنعام صرف اس کی اِطاعت وفرمانبرداری ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، معصیت ونافرمانی کے ساتھ یہ اِنعام نہیں مل سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اگر مسلمان مستحکم تنظیم واِتحاد چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ فقط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اِطاعت وفرمانبرداری کو اپنا شعار بنالیں، اسی طرف اِشارہ کرنے کے لئے آیت کے آخر میں اِرشاد فرمایا ہے کہ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے حقائق واضح کرکے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم لوگ صحیح راہ پر رہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں

عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا

بُرائی سے، اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔ اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہو گئے

وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾

اور اِختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم صاف اور اُن کو بڑا عذاب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں، اور بُرائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں ﴿١٠٤﴾ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آچکے تھے، اس کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اِختلاف میں پڑ گئے۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا ہوگی۔ ﴿١٠٥﴾

ربطِ آیات

پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی اِجتماعی فلاح وصلاح کے دو اُصول بتلائے گئے تھے، جن میں ہر فرد کو ایک خاص انداز سے اپنی اِصلاح کرنے کی ہدایت تھی کہ ہر شخص تقویٰ اِختیار کرے، اور اللہ تعالیٰ کے سلسلۂ (اسلام) سے مربوط ہو جائے، اس طرح اِنفرادی اِصلاح کے ساتھ ساتھ خود بخود ایک اِجتماعی قوت بھی مسلمانوں کو حاصل ہو جائے گی، مذکورہ دو آیتوں میں اسی نظامِ صلاح وفلاح کا تکملہ اس طرح کیا گیا ہے کہ مسلمان صرف اپنے اعمال وافعال کی اِصلاح پر بس نہ کریں، بلکہ اپنے دُوسرے بھائیوں کی اِصلاح کی فکر بھی ساتھ ساتھ رکھیں، اسی صورت سے پوری قوم کی اِصلاح بھی ہوگی، اور ربط واِتحاد کو بقا وقیام بھی ہوگا۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے،

اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے (دِین میں) باہم تفریق کرلی، اور (نفسانیت سے) باہم اِختلاف کرلیا، ان کے پاس واضح اَحکام پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (یعنی قیامت کے روز)۔

معارف و مسائل

مسلمانوں کی قومی اور اِجتماعی فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے

پہلے تقویٰ اور اِعتصام بحبل اللہ کے ذریعے اپنی اِصلاح، دُوسرے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دُوسروں کی اِصلاح۔

آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ میں اسی دُوسری ہدایت کا بیان ہے، گویا ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ خود بھی اپنے اعمال و اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق دُرست کرو، اور اپنے دُوسرے بھائیوں کے اعمال کو دُرست کرنے کی بھی فکر رکھو، یہی مضمون ہے جو سورۂ والعصر میں اِرشاد فرمایا ہے:-

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۳

''یعنی آخرت کے خسارے سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عملِ صالح کے پابند ہیں اور دُوسروں کو بھی عقائدِ صحیحہ اور اَعمالِ صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔''

قومی اور اِجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی مضبوط و مستحکم رِشتۂ وحدت ہو، جس کو پہلی آیت میں اِعتصام بحبل اللہ کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے، اسی طرح رشتہ کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے یہ دُوسرا عمل بھی ضروری ہے جو اس آیت میں اِرشاد فرمایا گیا ہے، یعنی دُوسرے بھائیوں کو اَحکامِ قرآن و سنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور بُرے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے، تاکہ یہ حبل اللہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، کیونکہ بقول اُستادِ مرحوم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ''اللہ تعالیٰ کی یہ رَسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔'' اس لئے قرآنِ کریم نے اس رَسّی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیشِ نظر یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے، اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دُوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور بُرے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حبلِ متین کو تھامے رہیں گے، اور اس کے نتیجہ میں فلاحِ دُنیا و آخرت ان کے ساتھ ہوگی، اپنی اِصلاح کے ساتھ دُوسروں کی اِصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لئے قرآنِ کریم میں بہت سے واضح اِرشادات وارِد ہیں، سورۃ العصر کا مضمون ابھی آپ دیکھ چکے ہیں، اور اسی سورۂ آلِ عمران میں اِرشاد ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، کیونکہ تم نیک کاموں کا لوگوں کو حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔''

اس میں بھی پوری اُمت پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اور دُوسری اُمتوں پر اس کی فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا ہے، اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات اس بارے میں بے شمار ہیں، ترمذی اور ابنِ ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ فَلَا يَسْتَجِيْبُ لَكُمْ۔[1]

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! کہ تم ضرور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا عذاب بھیج دے، اس وقت تم خدا تعالیٰ سے دُعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔''

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

مَنْ رَّاٰی مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔[2]

''یعنی تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ اور قوت سے اس کو روک دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اور یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دِل میں اس فعل کو بُرا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجہ کا اِیمان ہے۔''

ان تمام آیات اور روایات سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام اَحکامِ شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت و اِستطاعت پر اَحکام دائر ہوں گے، جس کو جتنی قدرت ہو، اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا۔ ابھی جو حدیث آپ نے دیکھی ہے اس میں اِستطاعت پر ہی مدار رکھا گیا ہے۔

پھر اِستطاعت و قدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے، امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف و منکر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو، جس کو خود ہی معروف و منکر کی تمیز نہ ہو، یا اس مسئلے کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر

---

[1] جامع الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء في الامر بالمعروف إلخ ج:۲ ص:۴۰، ومسند احمد، حديث حذيفة بن اليمان رضى الله عنه رقم الحديث:۲۲۲۱۲

[2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان إلخ ج:۱ ص:۵۱

دُوسروں کو اَمر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اِصلاح ہونے کے فساد ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا منکر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف منکر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت پیدا کرے اور اَحکامِ شرعیہ کے معروف و منکر کا علم حاصل کرے، اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے۔

لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں اس کا اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں، جیسے اس زمانہ میں بہت سے جاہل وعظ کہنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ انہیں قرآن کا علم ہے نہ حدیث کا، یا بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو، ایسا نہ کرو، یہ طریقِ کار بجائے معاشرے کے دُرست کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ و جدل کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح امر بالمعروف کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی ناقابلِ برداشت ضرر پہنچے کا قوی خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں اِرشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دِل ہی سے بُرا سمجھے، ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کرسکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ قوی ہے کہ اس نے حق بات کی تلقین کی تو اس کی جان جائے گی، یا کوئی دُوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا، یہ دُوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پروا نہ کرے، اور نقصان برداشت کر کے بھی امر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، جیسے بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمۂ اِسلامؒ کے واقعات منقول ہیں، یہ ان کی اُولوا العزمی اور بڑی فضیلت ہے، جس سے ان کا مقام دُنیا و آخرت میں بلند ہوا، مگر ان کے ذمے ایسا کرنا فرض و واجب نہ تھا۔

سورۂ والعصر کی آیت اور كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران:۱۱۰) وغیرہ آیات سے، نیز اَحادیثِ مذکورہ سے اُمت کے ہر فرد پر اس کی قدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا جا رہا ہے، لیکن اس کے وجوب میں یہ تفصیل ہے کہ اُمورِ واجبہ میں معروف کا اَمر اور منکر سے نہی کرنا واجب اور اُمورِ مستحبہ میں مستحب ہے، مثلاً نمازِ پنج گانہ فرض ہے تو ہر شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے، اور نوافل مستحب ہیں، اس کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی سے اِظہار کرے، اور واجبات میں اوّلاً نرمی اور نہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، آج کل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں، لیکن اُمورِ واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

نیز ہر شخص پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہوگا جبکہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے، مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا کسی عورت سے مجرمانہ اِختلاط کر رہا ہے، تو اس کے ذمہ واجب ہوگا کہ اپنی اِستطاعت وقدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش وتحقیق کر کے اس کو سزا دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشاد: "مَنْ رَّاٰی مِنْكُمْ" میں اسی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس میں اِرشاد ہے کہ جو شخص تم میں سے کسی منکر کو دیکھے۔

امر بالمعروف کا دُوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت واِرشاد ہی کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ ہی یہی ہو کہ اپنے قول وعمل سے لوگوں کو قرآن وسنت کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا بُرائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور بُرائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے، اور چونکہ اس اہم فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کو مسائل کا پورا علم بھی ہو، اور اَمر بالمعروف کو مؤثر بنانے کے آداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اس کو معلوم ہوں، اس لئے مکمل طور پر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا، جو ہر طرح دعوت الی الخیر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو، چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو بتلاتے ہوئے فرمایا:-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ یعنی "تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں، وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ میں اِشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں، کیونکہ ان کی حیاتِ ملّی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور اِمتیازات کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے فرمایا: يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ یعنی اس جماعت کا پہلا اِمتیازِ خصوصی یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصدِ اعلیٰ ہوگا۔ خیر سے مراد کیا ہے؟ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں اِرشاد فرمایا کہ: "اَلْخَيْرُ هُوَ اتِّبَاعُ الْقُرْاٰنِ وَسُنَّتِيْ" [۱] یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اِتباع ہے۔ (ابن کثیر)

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۹۱

''خیر'' کی اس سے زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی، پورا دین شریعت اس میں آگیا۔ پھر یَدْعُوْنَ کو صیغۂ مضارع سے لاکر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ ہی دعوت الی الخیر ہوگا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص مواقع پر ہوگی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں، لیکن یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ کہہ کر بتلا دیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس وقت منکرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی، کہ وقتِ نماز آنے کے بعد نماز اَدا کرنا ضروری ہے، یا روزے کا وقت نہیں آیا، ابھی رمضان کا مہینہ دُور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اِسلام کی طرف دعوت دینا ہے، مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دُنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا، وہاں سچے مؤمنین کی اس طرح تعریف کی:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج: ۴۱) یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین وقدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظامِ اِطاعت قائم کرتے ہیں جس کا ایک مظہر نماز ہے، اور اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ کے اُصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصدِ حیات بناتے ہیں۔ اگر آج اُمتِ مسلمہ اپنا مقصد دیگر اَقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہوجائیں گی جو دُوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہوجائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اقوامِ عالم پر غالب آنا ہے اور اَقوام کی تربیت وتہذیب ہمارے ذمہ ہے، تو اس کی نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہوجائیں گی، اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے لگ جائے گی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامیابیوں کا راز اسی میں مضمر تھا، حدیث میں ہے کہ حضرت ضحاکؒ نے یہ آیت وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا: هُمْ خَاصَّةُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (ابنِ جریر)۔[1] یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوسِ قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

[1] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۷ ص:۹۲ رقم الحدیث:۷۵۹۷

دعوت الی الخیر کا دُوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوتِ خیر دینا ہے، کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعتِ خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے، اور فریضۂ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری اَحکام و اِسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دُوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی، یعنی اُمتِ مسلمہ میں علومِ قرآن وسنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دُوسری آیت میں رہنمائی کی گئی:-

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (التوبۃ: ۱۲۲)۔ آگے اس جماعتِ داعیہ کا دُوسرا وصف اور اِمتیازِ خصوصی یہ بتلایا: وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ یعنی وہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

''معروف'' میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اِسلام نے حکم دیا ہے، اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی، اور چونکہ یہ اُمورِ خیر جانے پہچانے ہوئے ہیں اس لئے ''معروف'' کہلاتے ہیں۔

اسی طرح ''منکر'' میں تمام وہ بُرائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے، اس مقام پر واجبات اور معاصی کے بجائے ''معروف ومنکر'' کا عنوان اِختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو اُمت میں مشہور ومعروف ہیں، اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اِجتہادی مسائل جن میں اُصولِ شرعیہ کے ماتحت رائیں ہوسکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے، اور اِجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سب سے بڑی نیکی قرار دِیا جاتا ہے، اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے۔ آیت کے اِختتام پر اس جماعت کے انجام اور عاقبتِ محمودہ کو ان لفظوں میں فرمایا: وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ یعنی درحقیقت یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح وسعادتِ دارین انہی کا حصہ ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا مصداق جماعتِ صحابہؓ ہے، جو دعوت الی الخیر اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عظیم مقصد کو لے کر اُٹھی اور قلیل عرصہ میں ساری دُنیا پر چھاگئی، رُوم واِیران کی عظیم سلطنتیں روند ڈالیں، اور دُنیا کو اَخلاق وپاکیزگی کا درس دیا، نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔

حق تعالیٰ نے اُمت داعیہ الی الخیر کی ضرورت اور اس کے اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مذکورۂ صدر دُوسری آیت میں مسلمانوں کو باہمی اِختلاف اور تفرق واِنتشار سے بچانے کی ہدایت فرمائی ہے، ارشاد ہے:-

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ یعنی ''ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد اِختلاف کیا۔''

مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو، جنہوں نے خدا تعالیٰ کے صاف اَحکام پہنچنے کے بعد محض اوہام واَہواء کی پیروی کر کے اُصولِ شرع میں متفرق ہوگئے، اور باہمی جنگ وجدال سے عذابِ اِلٰہی میں مبتلا ہوگئے۔ یہ آیت درحقیقت آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا تتمہ ہے، اسی آیت میں مرکزِ وحدت اِعتصام بحبل اللہ کی طرف دعوت دی گئی، اور اشارۃً بتلایا گیا کہ اِجتماع اور اِتحاد تمام اُمت اور قوم کو ایک شخصِ واحد میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر دعوت الی الخیر اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اسی وحدت واِجتماع کو غذا پہنچائی جاتی ہے، اور نشو ونما کیا جاتا ہے، پھر وَلَا تَفَرَّقُوْا اور آیت وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا سے اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ تفرق اور اِختلاف نے پچھلی قوموں کو تباہ کر دیا، ان سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے میں یہ مرض پیدا ہونے نہ دو۔

آیت میں جس تفرق واِختلاف کی مذمت ہے، اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اُصولِ دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید کہ ”اَحکامِ واضحہ آنے کے بعد“ اس اَمر پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اُصولِ دین سب واضح ہوتے ہیں، اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اِختلاف کی گنجائش نہ ہوتی، لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نصِ صریح نہ ہونے کی وجہ سے، یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے، ایسے فروع میں رائے واِجتہاد سے جو اِختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں، اور وہ حدیثِ صحیح اس کی اِجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری ومسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اِجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اَجر ملتے ہیں، اور جب اِجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اَجر ملتا ہے۔[1]

تو معلوم ہوا کہ جس اِختلافِ اِجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ اِجتہادی اِختلاف جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمۂ مجتہدینؒ میں ہوا ہے، اس کو اس آیتِ مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں، بقول حضرت قاسم بن محمدؒ وحضرت عمر بن عبدالعزیزؒ صحابہؓ کا اِختلاف لوگوں کے لئے موجبِ رحمت ورُخصت ہے۔ (کذا فی روح المعانی نقلًا عن البیہقی والمدخل)

اِجتہادی اِختلافات میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی، اس پر نکیر جائز نہیں

یہاں سے ایک بہت اہم اُصولی بات واضح ہوگئی کہ جو اِجتہادی اِختلاف شرعی اِجتہاد کی تعریف میں داخل ہے، اس میں اپنے اپنے اِجتہاد سے جس اِمام نے جو جانب اِختیار کرلی، اگرچہ عنداللہ اس میں سے صواب اور صحیح صرف ایک ہے، دُوسرا خطا ہے، لیکن یہ صواب وخطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اِجتہاد صواب پر پہنچے

[1] صحیح البخاری، کتاب الاعتصام، باب إذا اجتهد العامل أو الحاكم إلخ ج:۲ ص:۱۰۹۲ وصحیح مسلم، کتاب الأقضية، باب بيان اجر الحكام إذا اجتهد إلخ ج:۲ ص:۷۶

والے عالم کو دُہرا ثواب عطا فرمادیں گے، اور جس کے اِجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی اِختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دُوسرا غلط ہے۔ ہاں اپنی فہم وبصیرت کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اَقرب الی القرآن والسنۃ سمجھے اس کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر اِحتمال خطا کا بھی ہے، اور دُوسری جانب خطا ہے، مگر اِحتمال صواب کا بھی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو تمام اَئمہ فقہاءؒ میں مُسلّم ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اِجتہادی اِختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر نکیر کیا جائے، اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر نکیر خود اَمرِ منکر ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔ یہ وہ بات ہے جس میں آج کل بہت سے اہلِ علم بھی غفلت میں مبتلا ہیں، اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرّا اور سب وشتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ وجدل اور اِنتشار واِختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آرہا ہے۔

اِجتہادی اِختلاف بشرطیکہ اُصولِ اِجتہاد کے مطابق ہو، وہ تو ہرگز آیتِ مذکورہ وَلَا تَفَرَّقُوْا سے خلاف اور مذموم نہیں، البتہ اس اِجتہادی اِختلاف کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جارہا ہے کہ اسی کی بحث ومباحثہ کو دِین کی بنیاد بنالی گئی، اور اسی پر باہمی جنگ وجدل اور سب وشتم تک نوبت پہنچادی گئی، یہ طرزِ عمل بلاشبہ وَلَا تَفَرَّقُوْا کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنتِ سلف، صحابہؓ وتابعینؒ کے بالکل خلاف ہے، اسلافِ اُمت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اِجتہادی اِختلاف کی بنا پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو، مثلاً اِمام شافعیؒ اور دُوسرے اَئمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ اِمام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو اَدا نہیں کرے گا، اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوگی۔ اس کے بالمقابل اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کو اِمام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اسی لئے حنفیہ نہیں پڑھتے، لیکن پوری اُمت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارکِ نماز کہتے ہیں کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں، اس لئے تم بے نمازی ہو، یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکراتِ شرعیہ پر کی جاتی ہے۔

اِمام ابن عبدالبر اپنی کتاب ''جامع العلم'' میں اس معاملہ کے متعلق سنتِ سلف کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں:-

عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ قَالَ: مَا بَرِحَ اَهْلُ الْفَتْوٰی یُفْتُوْنَ فَیُحِلُّ هٰذَا وَیُحَرِّمُ هٰذَا فَلَا یَرَی الْمُحَرِّمُ اِنَّ الْمُحِلَّ هَلَكَ لِتَحْلِیْلِهٖ وَلَا یَرَی الْمُحِلُّ اَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكَ لِتَحْرِیْمِهٖ۔ [1]

''یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہلِ فتویٰ، فتویٰ دیتے رہے ہیں ایک شخص غیر منصوص اَحکام میں

[1] جامع بیان العلم، باب جامع بیان ما یلزم الناظر فی اختلاف العلماء ج:۲ ص:۱۲۲

ایک چیز کو اپنے اِجتہاد سے حلال قرار دیتا ہے، دُوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہوگیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک اور گمراہ ہوگیا۔“

تنبیہ ضروری

یہ تمام گفتگو اس اجتہاد میں ہے جو شریعت کے اُصولِ اجتہاد کے ماتحت ہو، جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں، یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہوسکتی ہیں، یا چند آیات وروایات سے ظاہراً دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ایسے مواقع میں صرف اُن لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائطِ اجتہاد موجود ہیں، مثلاً قرآن وحدیث کے متعلق تمام علوم وفنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال وآثار کی مکمل واقفیت وغیرہ، تو جو شخص کسی منصوص مسئلے میں اپنی رائے چلائے وہ اجتہادی اختلاف نہیں۔

اسی طرح شرائطِ اجتہاد جس شخص میں موجود نہیں اس کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف نہیں کہا جاسکتا، اس کے قول کا کوئی اثر مسئلہ پر نہیں پڑتا، جیسے آج کل بہت سے لکھے پڑھے لوگوں نے یہ سن لیا ہے کہ اسلام میں اجتہاد بھی ایک اُصول ہے، اور ان منصوصاتِ شرعیہ میں رائے زنی کرنے لگے جس میں کسی امامِ مجتہد کو بھی بولنے کا حق نہیں، اور یہاں تو شرائطِ اجتہاد کیا نفسِ علمِ دین سے بھی واقفیت نہیں ہوتی، العیاذ باللہ۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۚ قف

جس دن کہ سفید ہوں گے بعضے منہ اور سیاہ ہوں گے بعضے منہ، سو وہ لوگ کہ سیاہ ہوئے منہ ان کے، ان سے کہا جائے گا:

اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

کیا تم کافر ہوگئے ایمان لاکر، اب چکھو عذاب بدلہ اس کفر کرنے کا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور وہ لوگ کہ سفید ہوئے منہ اُن کے سو رحمت میں ہیں اللہ کی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا

یہ حکم ہیں اللہ کے ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک اور اللہ ظلم کرنا نہیں چاہتا

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ

خلقت پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں، اور اللہ ہی کی طرف

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾ ع ١١ ٨ ٢

رُجوع ہے ہر کام کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اُس دن جب کچھ چہرے چمکتے ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ پڑ جائیں گے! چنانچہ جن لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے اُن سے کہا جائے گا کہ: ''کیا تم نے اپنے اِیمان کے بعد کفر اختیار کرلیا؟ لو پھر اب مزہ چکھو اس عذاب کا، کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے۔'' ﴿١٠٦﴾ دُوسری طرف جن لوگوں کے چہرے چمکتے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں جگہ پائیں گے۔ وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿١٠٧﴾ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں، اور اللہ دُنیا جہان کے لوگوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا ﴿١٠٨﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کا ہے اور اسی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جائیں گے۔ ﴿١٠٩﴾

خلاصۂ تفسیر

اس روز (یعنی قیامت کے روز) کہ بعضے چہرے سفید (وروشن) ہو جاویں گے، اور بعضے چہرے سیاہ (اور تاریک) ہوں گے، سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم (ہی) لوگ کافر ہوئے تھے، اپنے ایمان لانے کے بعد تو (اب) سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے، اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (یعنی جنت) میں (داخل) ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ (جو اُوپر مذکور ہوئیں) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں (اس سے تو مضمونِ بالا کا صحیح ہونا معلوم ہوا) اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں

چاہتے (پس جو کچھ کسی کے لئے جزا وسزا تجویز کی ہے، وہ بالکل مناسب ہے اس سے تجویز مذکور کا مناسب ہونا معلوم ہوا) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے (پس جب سب ان کی ملک ہے تو ان سب کے ذمہ اطاعت واجب تھی، ان سے ان کا مملوک ہونا اور وجوبِ اطاعت ثابت ہوا) اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رُجوع کئے جاویں گے (کوئی دُوسرا صاحبِ اختیار نہ ہوگا)۔

معارف ومسائل

چہرے کی سفیدی اور سیاہی سے کیا مراد ہے؟

چہرے کی سفیدی اور سیاہی کا ذِکر قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں آیا ہے، مثلاً: وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (الزمر:۶۰)، وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ (عبس)، وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ (القیامۃ)

ان آیات میں ایک ہی مفہوم سے متعلق متعدّد الفاظ ذِکر کئے گئے ہیں، یعنی ''بیاض'' اور ''سواد''، ''غبرۃ''، ''قترۃ'' اور ''نضرۃ''، جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نورِ ایمان کی سفیدی ہے، یعنی مؤمنین کے چہرے نورِ ایمان سے رَوشن اور غایت مسرّت سے خنداں اور فرحاں ہوں گے۔ اور سیاہی سے مراد کفر کی سیاہی ہے، یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی، اور اُوپر سے فسق وفجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ وتاریک کردے گی۔

سیاہ چہرے والے اور سفید چہرے والے کون لوگ ہیں؟

ان لوگوں کی تعیین میں مفسرین کے متعدّد اَقوال مذکور ہیں، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہلِ سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہلِ بدعت کے سیاہ ہوں گے۔ حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور اَنصار کے چہرے سفید ہوں گے اور بنی قریظہ اور بنی نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (قرطبی)[1]

اِمام ترمذی نے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اس سے مراد خوارج ہیں، یعنی سیاہ چہرے خوارج کے ہوں گے، اور سفید چہرے اُن لوگوں کے ہوں گے جن کو وہ قتل کریں گے، ''فَقَالَ اَبُوْ اُمَامَةَ: كِلَابُ النَّارِ شَرُّ قَتْلٰى تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ وَخَيْرُ قَتْلٰى مَنْ قَتَلُوْهُ، ثُمَّ قَرَاَ: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ''۔[2] ابواُمامہؓ

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۱۶۷۔

[2] حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (یہ خوارج) دوزخ کے کتے ہیں، آسمان کے نیچے جتنے لوگ قتل کئے گئے یہ ان سب سے زیادہ بُرے ہیں، جس کو انہوں نے قتل کیا وہ سب سے اچھا شہید ہے۔ پھر حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ

سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ نے یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ تو آپ نے جواب میں شمار کر کے بتلا دیا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سات مرتبہ یہ حدیث سنی ہوئی نہ ہوتی تو میں بیان نہ کرتا۔ (ترمذی) [1]

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ سیاہ چہرے اہلِ کتاب کے ان لوگوں کے ہوں گے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تو آپ کی تصدیق کرتے تھے، لیکن جب آپ مبعوث ہوئے تو بجائے آپ کی تائید و نصرت کرنے کے اُلٹا تکذیب کرنی شروع کر دی۔ (تفسیر قرطبی) [2]

مذکورہ اقوال کے علاوہ اور بھی بہت سے اقوال ہیں، لیکن ان سب میں کوئی تعارض نہیں ہے، سب کا حاصل ایک ہی ہے، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں آیت "يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" کے متعلق فرمایا کہ مؤمنین مخلصین کے چہرے سفید ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ ان تمام لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جنہوں نے دِین میں تغیر و تبدل کیا ہو، خواہ وہ مرتد اور کافر ہو گئے ہوں، خواہ اپنے دِلوں میں نفاق کو چھپائے ہوئے ہوں، ان سب کے ساتھ یہی معاملہ کیا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی) [3]

چند اہم فوائد

اللہ تعالیٰ نے "يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ" میں بیاض کو سواد پر مقدم کیا، لیکن فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ میں سواد کو بیاض پر مقدم کیا، حالانکہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ بیاض کو یہاں بھی مقدم رکھا جاتا، اس ترتیب کو برعکس کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصدِ تخلیق کی طرف اِشارہ کیا ہے، وہ مقصد اپنی مخلوق پر رحمت کرنا ہے، نہ کہ عذاب، اس لئے سب سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیاض کو بیان کیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ثواب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اہلِ سواد کو ذِکر کیا گیا جو عذاب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت کے خاتمہ پر "فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ" سے اپنی رحمتِ عظمیٰ کا بھی اظہار فرمایا تو آیت کے شروع اور اس کے آخر دونوں جگہ اہلِ رحمت کو بیان کیا، درمیان میں اہلِ سواد کا، جس میں اپنی رحمتِ بے کراں کی طرف اِشارہ کر دیا کہ بنی نوعِ انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان کو اپنے عذاب کا مظہر بنایا جائے بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری رحمت سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

دُوسرا فائدہ یہ کہ اہلِ بیاض کے بارے میں اِشارہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں رہیں گے، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رحمت سے مراد اس جگہ جنت ہے، یہاں بھی بظاہر جنت کو رحمت سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت

---

۱ جامع الترمذی، ابواب التفسیر ومن سورة آل عمران ج:۲ ص:۱۲۹

۲ تفسیر القرطبی بحوالۂ بالا۔

۳ تفسیر القرطبی ج:۴ ص:۱۶۸

ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی عابد اور زاہد کیوں نہ ہو، وہ جنت میں محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی جائے گا، کیونکہ عبادت کرنا بھی انسان کا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اس کی قدرت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لئے عبادت کرنے سے دُخولِ جنت ضروری نہیں ہو جاتا، بلکہ جنت کا داخلہ تو اللہ کی رحمت ہی سے ہوگا۔ (تفسیر کبیر)[1]

تیسرا فائدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے "فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ" کے بعد "هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾" فرما کر بتادیا کہ مؤمنین اللہ کی جس رحمت میں ہوں گے وہ اُن کے لئے عارضی نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوگی، ان سے یہ نعمت کبھی سلب یا کم نہ کی جائے گی۔ اس کے بالمقابل اہلِ سواد کے لئے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ اس حال میں ہمیشہ رہیں گے۔

آدمی سزا اپنے ہی گناہوں کی پاتا ہے

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ میں اِشارہ فرمادیا کہ آج کا عذاب ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی کمائی سے ہے جو دُنیا میں کرتے رہے ہو، کیونکہ درحقیقت جنت و دوزخ کی نعمتیں اور مصائب درحقیقت ہمارے اعمال ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، اسی بات پر متنبہ کرنے کے لئے آخر میں یہ بھی فرمادیا: وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی اِرادہ نہیں رکھتے، عذاب و ثواب جو کچھ ہے عین اِنصاف و مقتضائے حکمت و رحمت ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ

تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ

بُرے کاموں سے اور اِیمان لاتے ہو اللہ پر، اور اگر اِیمان لاتے اہلِ کتاب تو ان کے لئے بہتر تھا،

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

کچھ تو ان میں سے ہیں اِیمان پر اور اکثر ان میں نافرمان ہیں۔

[1] تحت هذه الآية ج:۴ ص:۳۳۶

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مؤمن ہیں، مگر ان کی اکثریت نافرمان ہے ﴿۱۱۰﴾

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خاص اہتمام کرنے کی ہدایت تھی، اس آیت میں اس کی مزید تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جو حق تعالیٰ نے تمام اُمتوں سے افضل واعلیٰ اور خیر الامم قرار دیا ہے اس کی بڑی وجہ ان کی یہی صفات ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(اے اُمتِ محمدیہ) تم لوگ (سب اہلِ مذاہب سے) اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے (نفع ہدایت پہنچانے کے) لئے ظاہر کی گئی ہے (اور نفع پہنچانا جو اس اُمت کے خیر اور افضل ہونے کی وجہ ہے اس کی صورت یہ ہے کہ) تم لوگ (بمقتضائے شریعت زیادہ اہتمام کے ساتھ) نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو (یعنی ایمان پر قائم رہتے ہو، یہاں اللہ پر ایمان میں وہ تمام عقائد واعمال داخل ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں) اور اگر اہلِ کتاب (بھی جو تم سے مخالفت کر رہے ہیں، تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا (کہ وہ بھی اہلِ حق کی اسی بہتر جماعت میں داخل ہو جاتے، مگر افسوس کہ وہ سب مسلمان نہ ہوئے بلکہ) ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر داخلِ اسلام ہو گئے) اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں (کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، اور ان کی بہتر اُمت میں شامل نہیں ہوئے۔

معارف ومسائل

اُمتِ محمدیہ کا خیر الامم ہونا اور اس کی چند وجوہ

قرآنِ کریم نے اُمتِ محمدیہ کو خیر الامم قرار دینے کی وجوہ متعدّد آیتوں میں بیان فرمائی ہیں، اس سلسلہ کی سب

سے اہم آیت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرة: ۱۴۳) الآیۃ، وہیں اس آیت کی تفسیر اور اُمتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی بڑی وجہ اس کا اعتدال مزاج ہونا اور پھر ہر شعبۂ زندگی میں اُمتِ محمدیہ کے اعتدال کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ (معارف القرآن جلد اوّل ص: ۴۱۹ تا ص: ۴۲۸)

اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خلق اللہ کو نفع پہنچانے ہی کے لئے وجود میں آئی ہے، اور اس کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ خلق اللہ کی رُوحانی اور اَخلاقی اِصلاح کی فکر اس کا منصبی فریضہ ہے، اور پچھلی سب اُمتوں سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکمیل اس اُمت کے ذریعے ہوئی، اگرچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پچھلی اُمتوں پر عائد تھا، جس کی تفصیل احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے، مگر اوّل تو پچھلی بہت سی اُمتوں میں جہاد کا حکم نہیں تھا، اس لئے ان کا اَمر بالمعروف صرف دِل اور زبان سے ہوسکتا تھا، اُمتِ محمدیہ میں اس کا تیسرا درجہ ہاتھ کی قوّت سے امر بالمعروف کا بھی ہے جس میں جہاد کی تمام اقسام بھی داخل ہیں، اور بزورِ حکومت اسلامی قوانین کی تنفیذ بھی اس کا جزء ہے۔ اس کے علاوہ اُممِ سابقہ میں جس طرح دِین کے دُوسرے شعائر غفلت عام ہوکر محو ہوگئے تھے، اسی طرح فریضۂ اَمر بالمعروف بھی بالکل متروک ہوگیا تھا، اور اس اُمتِ محمدیہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی ہے کہ: ''اس اُمت میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم رہے گی۔''

دُوسری اِمتیازی صفت اس اُمت کی وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ بیان فرمائی ہے، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ایمان باللہ تو تمام انبیائے سابقین علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں کا مشترک وصف ہے، پھر اس کو وجہِ اِمتیازی کس بنا پر قرار دِیا؟

جواب واضح ہے کہ اصل اِیمان تو سب میں مشترک ہے، مگر کمالِ اِیمان کے درجات مختلف ہیں، ان میں اُمتِ محمدیہ کو جو درجہ حاصل ہے وہ سابقہ اُمتوں کے مقابلہ میں خاص اِمتیاز رکھتا ہے۔

اور آخرِ آیت میں جو اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے کچھ مسلمان ہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان لے آئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ قف

وہ کچھ نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا مگر ستانا زبان سے، اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ دیں گے،

ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ تھوڑا بہت ستانے کے سوا تمہیں کوئی بڑا نقصان ہرگز نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر وہ تم سے لڑیں گے بھی تو تمہیں پیٹھ دِکھا جائیں گے، پھر انہیں کوئی مدد بھی نہیں پہنچے گی ﴿۱۱۱﴾

ربطِ آیات

پچھلی آیتوں میں اہلِ کتاب کی مسلمانوں سے دُشمنی اور ان کو دِینی ضرر پہنچانے کی تدبیریں کرنا مذکور تھا، اس آیت میں مسلمانوں کے لئے دُنیوی ضرر کی تدبیریں کرنے کا ذِکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ (اہلِ کتاب) تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، مگر ذرا ہلکی سی اذیت (یعنی زبانی بُرا بھلا کہہ کر دِل دُکھانا) اور اگر وہ (اس سے زیادہ کی ہمت کریں اور) تم سے مقاتلہ کریں تو تم کو پیٹھ دِکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ) کسی طرف سے ان کی اِمداد بھی نہ ہوگی۔

معارف و مسائل

یہ قرآن کی پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اہلِ کتاب زمانۂ نبوّت میں کسی موقع پر بھی صحابہ کرامؓ پر جو کہ بقرینۂ مقام اس مضمون کے خاص مخاطب ہیں غالب نہ آسکے، خصوصاً یہود جن کے قبائل خصوصیت سے اس جگہ مذکور ہیں جس میں وہ حصہ صحابہ کرامؓ کے آپس میں تفرقہ ڈالنے کی کارروائی کا بھی ہے، انجام یہ ہوا کہ یہ لوگ ذلیل وخوار ہوئے، بعض پر جزیہ لگایا گیا، بعض مقتول ہوئے، بعض جلاوطن کئے گئے، آیتِ آئندہ میں اسی مضمون کا تکملہ ہے:-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ

ماری گئی اُن پر ذِلت جہاں دیکھے جائیں سوائے دست آویز اللہ کے اور دست آویز

مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ

لوگوں کے اور کمایا اُنہوں نے غصہ اللہ کا اور لازم کردی گئی اُن کے اُوپر حاجت مندی،

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ

یہ اس واسطے کہ وہ انکار کرتے رہے ہیں اللہ کی آیتوں سے اور قتل کرتے رہے ہیں پیغمبروں کو ناحق،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ق

یہ اس واسطے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور حد سے نکل گئے۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ جہاں کہیں پائے جائیں، ان پر ذلت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، اِلّا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی سبب پیدا ہوجائے یا اِنسانوں کی طرف سے کوئی ذریعہ نکل آئے جو اُن کو سہارا دیدے، انجامِ کار وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں، اور ان پر محتاجی مسلط کردی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا اِنکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ (نیز) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، اور ساری حدیں پھلانگ جایا کرتے تھے ﴿۱۱۲﴾

خلاصۂ تفسیر

چھاپ دی گئی ہے ان پر ذِلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے، مگر ہاں (دو ذریعوں سے وہ اس ذِلت سے نجات پاسکتے ہیں) ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے، اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے (اللہ کی طرف کا ذریعہ تو یہ ہے کہ کوئی کتابی غیر مسلم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنے طریق پر ایسا مشغول و مصروف ہو کہ مسلمانوں سے لڑتا بھڑتا نہ ہو، اُس کو جہاد میں قتل نہیں کیا جاتا، اگرچہ اس کی کافرانہ عبادت آخرت میں اس کے کام نہ آئے گی، اسی طرح اللہ کی طرف کے ذریعہ میں یہ بھی آگیا کہ وہ کتابی نابالغ یا عورت ہو، کہ شریعتِ اسلام کی رُو سے ان کو بھی جہاد میں قتل کرنے کی اِجازت نہیں ہے۔ اور آدمیوں کی طرف کے ذریعہ سے مراد معاہدہ اور صلح ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ ہوجاوے، کیونکہ شریعتِ اسلام میں جس شخص سے کوئی معاہدہ صلح کا ہوجائے وہ بھی مامون ہے، اس کا قتل جائز نہیں)

اور مستحق ہوگئے (یہ لوگ) غضبِ الٰہی کے، اور جمادی گئی ان پر پستی (کہ ان کے طبائع میں بھی اُولوالعزمی نہ رہی، نیز جزیہ وخراج مسلمانوں کو ادا کر کے رہنا بھی مسکنت اور پستی میں داخل ہے، یہ (ذِلت وغضب) اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے اَحکامِ اِلٰہیہ سے، اور قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کو (اس طرح سے کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور یہ ذِلت وغضب اس وجہ سے بھی ہوا کہ انہوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۂ اِطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

معارف ومسائل

یہود پر ذِلت وغضب کا مطلب، موجودہ اِسرائیلی حکومت سے شبہ اور جواب

یہ بحث سورۂ بقرہ کی آیت:۶۱ میں تفصیل سے گزرچکی ہے، جس میں کوئی اِستثنا نہیں ہے، آیتِ آلِ عمران میں اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے اِستثنا کی تحقیق وہاں گزرچکی ہے، اس کو معارف القرآن جلد اوّل ص:۲۶۷ تا ۲۷۱ میں دیکھ لیا جائے، اتنی بات یہاں مکرّر قابلِ ذِکر ہے کہ ''کشاف'' کی تفسیر کے مطابق اِستثنا کو متصل قرار دے کر معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہود پر ذِلت وخواری لگی ہی رہے گی، مگر صرف دو صورتوں میں وہ اس ذِلت سے بچ سکتے ہیں، ایک اللہ کا عہد مثلاً نابالغ بچہ یا عورت ہونے کی بنا پر بحکمِ خداوندی وہ قتل وغیرہ سے مامون ہیں، دُوسرے وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ یعنی لوگوں سے معاہدۂ صلح کی بنا پر ان کی ذِلت وخواری کا ظہور نہ ہو، اس جگہ الفاظِ قرآن وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ہیں، جو مؤمن وکافر سب کو شامل ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کر کے بےفکر ہوجائیں، اور یہ بھی محتمل ہے کہ دُوسری غیرمسلم طاقتوں سے معاہدۂ صلح کر کے محفوظ ہوجائیں، جیسا کہ حکومتِ اِسرائیل کی موجودہ صورت ہے کہ کسی صاحبِ بصیرت پر مخفی نہیں کہ اِسرائیل کی حکومت درحقیقت اہلِ یورپ کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ نہیں، اس کی جو کچھ قوّت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتہ پر ہے، اگر امریکا، برطانیہ، رُوس وغیرہ آج اس پر سے اپنا ہاتھ اُٹھالیں تو وہ ایک دِن اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا، واللہ اعلم۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ

وہ سب برابر نہیں، اہلِ کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر پڑھتے ہیں آیتیں اللہ کی راتوں کے وقت

وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ

اور وہ سجدے کرتے ہیں۔ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں

بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ

اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بُرے کاموں سے اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر،

وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ

اور وہی لوگ نیک بخت ہیں۔ اور جو کچھ کریں گے وہ لوگ نیک کام اس کی ہرگز ناقدری نہ ہوگی،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ

اور اللہ کو خبر ہے پرہیزگاروں کی۔ وہ لوگ جو کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال

وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

اور نہ اولاد اللہ کے آگے کچھ، اور وہی لوگ رہنے والے ہیں آگ میں دوزخ کی، وہ اس آگ میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ

ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دُنیا کی زندگی میں اس کی مثال جیسے ایک ہوا کہ

فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ

اس میں ہو پالا، جا لگی کھیتی کو اس قوم کی کہ انہوں نے اپنے حق میں بُرا کیا تھا پھر اس کو نابود کر گئی، اور اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا

وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

لیکن وہ اپنے اُوپر ظلم کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(لیکن) سارے اہلِ کتاب ایک جیسے نہیں ہیں۔ اہلِ کتاب ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (راہِ راست پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، اور جو (اللہ کے آگے) سجدہ ریز ہوتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دِن پر اِیمان رکھتے ہیں، اچھائی کی تلقین کرتے اور بُرائی سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار صالحین میں ہے ﴿۱۱۴﴾ وہ جو بھلائی بھی کریں گے، اس کی ہرگز ناقدری نہیں کی جائے گی، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے ﴿۱۱۵﴾ (اس کے برعکس) جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے، اللہ کے مقابلے میں نہ ان کے مال ان کے کچھ کام آئیں گے، نہ اولاد۔ وہ دوزخی لوگ ہیں، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۱۱۶﴾ جو کچھ یہ لوگ دُنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سخت سردی والی تیز ہوا ہو جو ان لوگوں کی کھیتی کو جا لگے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہو، اور وہ اس کھیتی کو برباد کر دے۔ ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ ﴿۱۱۷﴾

ربطِ آیات

اُوپر اہلِ کتاب کے متعلق بیان ہوا تھا کہ ان میں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں، اور زیادہ کافر ہیں، اسی مضمون کی مزید تفصیل ان آیات میں ہے:-

خلاصۂ تفسیر

یہ (اہلِ کتاب) سب برابر نہیں (بلکہ) ان (ہی) اہلِ کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے جو (دِینِ حق پر) قائم ہیں (اور) اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں (اور) اللہ پر اور قیامت والے دِن پر (پورا پورا) اِیمان رکھتے ہیں، اور (دُوسروں کو) نیک کام بتلاتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں، اور یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) شائستہ لوگوں میں (شمار کئے جاتے ہیں) اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس (کے ثواب) سے محروم نہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اہلِ تقویٰ کو خوب جانتے ہیں، (اور یہ لوگ چونکہ اہلِ تقویٰ ہیں تو حسبِ وعدہ جزا کے مستحق ہیں) بے شک جو لوگ کافر رہے ہرگز ان کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ اولاد اللہ تعالیٰ کے (عذاب کے) مقابلہ میں ذرا بھی اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ

ہمیشہ اسی میں رہیں گے (اور کبھی نجات نہ ہوگی) وہ (کفار) جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دُنیوی زندگانی میں اس کی حالت (برباد و ضائع ہونے میں) اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی (یعنی پالا) ہو (اور) وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے (بددینی سے) اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کر ڈالے (اسی طرح ان لوگوں کا خرچ کرنا آخرت میں سب ضائع ہے) اور (اس ضائع کرنے میں) اللہ تعالیٰ نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود (کفر کے اِرتکاب سے جو کہ مانع قبول ہے) اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے (نہ وہ کفر کرتے نہ ان کے سب نفقات ضائع ہوتے)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ط

اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا، وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں،

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ج قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ صلے وَمَا تُخْفِي

ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف میں رہو، نکلی پڑتی ہے دُشمنی ان کی زبان سے، اور جو کچھ مخفی ہے

صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ط قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۱۱۸

ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے، ہم نے بتادیئے تم کو پتے اگر تم کو عقل ہے۔

هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ ج وَإِذَا

سن لو! تم لوگ ان کے دوست ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں، اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو، اور جب

لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا صلے وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ط

تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ہم مسلمان ہیں، اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر اُنگلیاں غصہ سے،

قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۱۱۹ إِن تَمْسَسْكُمْ

تو کہہ: مرو تم اپنے غصہ میں، اللہ کو خوب معلوم ہیں دِلوں کی باتیں۔ اگر تم کو ملے

حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا

کچھ بھلائی تو بُری لگتی ہے ان کو، اور اگر تم پر پہنچے کوئی بُرائی تو خوش ہوں اس سے، اور اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۱۲۰ ع

تو کچھ نہ بگڑے گا تمہارا ان کے فریب سے، بے شک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اپنے سے باہر کے کسی شخص کو راز دار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہاری بدخواہی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی دِلی خواہش یہ ہے کہ تم تکلیف اُٹھاؤ۔ بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ (عداوت) ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے پتے کی باتیں تمہیں کھول کھول کر بتا دی ہیں، بشرطیکہ تم سمجھ سے کام لو۔ ۱۱۸ دیکھو! تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، اور تم تو تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، اور (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (قرآن پر) ایمان لے آئے، اور جب تنہائی میں جاتے ہیں تو تمہارے خلاف غصّے کے مارے اپنی اُنگلیاں چباتے ہیں۔ (ان سے) کہہ دو کہ ''اپنے غصّے میں خود مر رہو۔ اللہ سینوں میں چھپی ہوئی باتیں خوب جانتا ہے۔'' ۱۱۹ اگر تمہیں کوئی بھلائی مل جائے تو ان کو بُرا لگتا ہے، اور اگر تمہیں کوئی گزند پہنچے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لو تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کے (علم اور قدرت کے) اِحاطے میں ہے۔ ۱۲۰

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت کے برتاؤ میں) صاحبِ خصوصیت مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے (اور دِل سے بھی) تمہاری مضرّت (دُنیوی و دِینی) کی تمنا رکھتے ہیں، (دِلوں میں تمہاری طرف سے اس قدر بغض بھرا ہے کہ) واقعی (وہ) بغض (بعض اوقات) ان کے منہ سے (بے اِختیار بات چیت میں) ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جس قدر اُن کے دِلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے (چنانچہ) ہم (ان کی عداوت کے) علامات (اور قرائن) تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو

ان یقینی علامات سے دیکھ لو) ہاں (سمجھو) تم ایسے ہو ان لوگوں سے محبت (کا برتاؤ) رکھتے ہو، اور یہ لوگ تم سے اصلاً محبت نہیں رکھتے (نہ دِل سے نہ برتاؤ سے) حالانکہ تم تمام (آسمانی) کتابوں پر اِیمان رکھتے ہو (اس میں ان کی کتابیں بھی شامل ہیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن پر اِیمان نہیں رکھتے مگر وہ تو باوجود اس تمہارے اِیمان کے بھی تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم باوجود ان کے اس عدمِ اِیمان کے بھی ان سے محبت رکھتے ہو) اور (تم ان کے ظاہری دعویٰ اِیمان سے شبہ مت کرنا کہ وہ بھی تو ہماری کتاب پر اِیمان رکھتے ہیں، کیونکہ) یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں (صرف تمہارے دِکھانے کو منافقانہ طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ ہم اِیمان لے آئے، اور جب (تم سے) الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی اُنگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ (وغضب) کے (یہ کنایہ ہے شدّتِ غضب سے) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں (مراد یہ کہ اگر تم مر بھی جاؤ گے تب بھی تمہاری مراد پوری نہ ہوگی) بے شک خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں دِلوں کی باتوں کو (اسی لئے ان لوگوں کے دِلوں میں جو رنج وغبار اور عداوت تمہاری طرف سے بھری ہیں سب بتلا دی اور ان کا یہ حال ہے کہ) اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (مثلاً تم میں باہم اِتفاق ہو، غیروں پر غلبہ ہو جائے) تو ان کے لئے موجبِ رنج ہوتی ہے (جس کا سبب اشد درجے کا حسد ہے) اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے (بڑے) خوش ہوتے ہیں (جس سے ان کی شماتت ثابت ہے، سو ان کے جب یہ حالات ہیں تو وہ اس قابل کب ہیں کہ ان سے دوستی یا دوستی کا برتاؤ کیا جاوے، ان کے مذکورہ حالات سننے کے بعد دِلوں میں یہ خیال پیدا ہونا بعید نہیں تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو ضرر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں رکھیں گے، اس لئے اگلی آیت میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا) اور اگر تم اِستقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی (تم اس سے بے فکر رہو تو دُنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے دوزخ ہوگی کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر (علمی) احاطہ رکھتے ہیں (کوئی عمل ہم سے مخفی نہیں اس لئے وہاں سزا سے بچنے کے لئے کسی حیلہ حوالے کی گنجائش نہیں)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس اور خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی، اِنفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور یہود ایک دُوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے، جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ پُرانے تعلقات نبھاتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت وخلوص کے ساتھ ملتے رہے، لیکن یہودیوں کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے لائے ہوئے دِین

سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لئے تیار نہ تھے جو اس دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہو گیا ہو، انہوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، مگر دِل میں اب وہ ان کے دُشمن ہو چکے تھے، اور اسی ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ وفساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دُشمنوں تک پہنچائیں، اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اس منافقانہ رَوِش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت اہم ضابطہ بیان فرماتے ہیں کہ:-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ یعنی اے ایمان والو! اپنے (یعنی مسلمانوں کے) علاوہ کسی کو گہرا اور راز دار دوست نہ بناؤ، بطانة کے معنی ہیں ولی، دوست، راز دار اور بھیدی، کپڑے کا باطنی اَستر جو جسم سے ملا رہے وہ بھی ''بطانہ'' کہلاتا ہے، یہ ''بطن'' سے مشتق ہے، بطن کا اِستعمال ہر شے میں "ظَهْر" کے خلاف ہوتا ہے، اُوپر کی جانب کو "ظَهْر" اور اندر کی جانب کو "بطن" بولتے ہیں، اور کپڑے کے اُوپر کے حصے کو "ظَهارَة" اور اندرونی نیچے کے حصے کو جو جسم سے ملا رہے جیسے اَستر وغیرہ کو "بطانہ" کہتے ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہے، یعنی وہ اس کو نہایت مرغوب ومحبوب ہے، اسی طرح بطانة الثوب سے بطورِ اِستعارہ ولی، دوست اور معتمد جو باطنی اُمور کا راز دار ہو اس کے لئے بطانة کا لفظ اِستعمال ہوتا ہے۔ عربی لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں "بطانة" کے معنی اس طرح کئے: "بِطَانَةُ الرَّجُلِ صَاحِبُ سِرِّهٖ وَدَاخِلَةُ اَمْرِهٖ الَّذِیْ یُشَاوِرُهٗ فِیْ اَحْوَالِهٖ"،[1] یعنی بطانة الرجل کسی شخص کے ولی اور راز دار دوست اور اس کے معاملات میں دخیل کو کہا جاتا ہے، جس سے وہ اپنے معاملات میں مشورہ لے، اصفہانی نے ''مفردات القرآن''[2] میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی یہی معنی بیان کئے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوا کہ بطانہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو راز دار، ولی اور دوست سمجھا جائے، اور اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور مشیر بنایا جائے۔

تو اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت والوں کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی ملت وحکومت کے راز کھول دو۔ اسلام نے اپنی عالمگیر رحمت کے سایہ میں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی، نفع رسانی اور مروّت ورواداری کی غیر معمولی ہدایات فرمائیں اور نہ صرف زبانی ہدایات بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معاملات میں اس کو عملی طور پر رِواج دیا ہے، وہیں عین حکمت کے مطابق مسلمانوں کی اپنی تنظیم اور ان کے مخصوص شعائر کی حفاظت کے لئے یہ اَحکام بھی صادر فرمائے کہ قانونِ اسلام کے منکروں اور باغیوں

---

[1] لسان العرب ج:۱۳ ص:۵۲ (مادة بطن)

[2] مفردات القرآن ج:۱ ص:۵۱

سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اِجازت مسلمانوں کو نہیں دی جاسکتی، کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کے لئے ضرر اور خطرے کھلے ہوئے ہیں، اور یہ ایسا صریح، معقول، مناسب اور ضروری اِنتظام ہے جس سے فرد اور ملت دونوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے باشندے ہیں، یا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ کئے ہوئے ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ان کی حفاظت کے لئے انتہائی تاکیدات اسلامی قانون کا جزء ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

مَنْ آذٰی ذِمِّیًا فَاَنَا خَصَمُهٗ وَمَنْ كُنْتُ خَصَمُهٗ خَصَمْتُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (عن ابن مسعود) [1]

''جس شخص نے کسی ذمی کو ستایا تو قیامت کے روز اس کی طرف سے میں دعوے دار بنوں گا، اور جس مقدمے میں، میں دعوے دار ہوں تو میں ہی غالب رہوں گا۔''

ایک دُوسری حدیث میں فرمایا:-

مَنَعَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَلَا غَیْرَهٗ۔ (عن علی) [2]

''مجھے میرے پروردگار نے منع فرمایا ہے کہ میں کسی معاہد یا کسی دُوسرے پر ظلم کروں۔''

ایک اور حدیث میں فرمایا:-

اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِ انْتَقَصَهٗ اَوْ كَلَّفَهٗ فَوْقَ طَاقَتِهٖ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَیْئًا بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ فَاَنَا حَجِیْجُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ [3]

''خبردار! جو کسی غیر مسلم معاہد پر ظلم کرے یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے، یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دِلی رضامندی کے حاصل کرے تو قیامت کے روز میں اس کا وکیل ہوں گا۔''

لیکن ان تمام مراعات کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی جماعت اور ملت کی حفاظت کے لئے یہ ہدایات بھی دی گئیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دُشمنوں کو اپنا گہرا دوست اور راز دار معتمد نہ بنایا جائے۔

ابنِ ابی حاتمؒ نے نقل کیا ہے کہ فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے، اگر اس کو آپ اپنا میر منشی بنالیں تو بہتر ہو، اس پر فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا:-

---

۱ فیض القدیر رقم الحدیث: ۸۲۷۰ ج: ۶ ص: ۲۶

۲ المستدرك للحاكم، كتاب التواريخ المتقدمين إلخ باب ومن كتاب آيات إلخ رقم الحديث: ۴۲۱۱

۳ سنن أبی داوٗد، كتاب الخراج والفیء إلخ باب فی تعشير اهل الذمة إلخ ج: ۲ ص: ۴۳۳

قَدِ اتَّخَذْتُ إِذًا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔[1]

''یعنی اس کو میں ایسا کروں تو مسلمانوں کو چھوڑ کر دُوسرے ملت والے کو رازدار بنالوں گا جو نصِ قرآن کے خلاف ہے۔''

اِمام قرطبیؒ جو پانچویں صدی کے مشہور عالم اور مفسر ہیں بڑی حسرت اور درد کے ساتھ مسلمانوں میں اس تعلیم کی خلاف ورزی اور اس کے نتائج بد کا بیان اس طرح فرماتے ہیں:-

وَقَدِ انْقَلَبَتِ الْاَحْوَالُ فِيْ هٰذِهِ الْاَزْمَانِ بِاتِّخَاذِ اَهْلِ الْكِتَابِ كَتَبَةً وَّاُمَنَاءَ وَتَسَوَّدُوْا بِذٰلِكَ عِنْدَ جَهَلَةِ الْاَغْنِيَاءِ مِنَ الْوُلَاةِ وَالْاُمَرَاءِ۔

''یعنی اس زمانے میں حالات میں ایسا اِنقلاب آیا کہ یہود و نصاریٰ کو رازدار و امین بنایا گیا، اور اس ذریعہ سے وہ جاہل اغنیاء واُمراء پر مسلط ہوگئے۔''

آج بھی کسی ایسی مملکت میں جس کا قیام کسی خاص نظریہ پر ہو وہاں اس نئی رَوِش کے زمانے میں بھی کسی ایسے شخص کو جو اُس نظریہ کو قبول نہیں کرتا، مشیر اور معتمد نہیں بنایا جاسکتا۔

رُوس اور چین میں کسی ایسے شخص کو جو کمیونزم پر اِیمان نہیں رکھتا ہو، کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز نہیں کیا جاتا، اور اس کو مملکت کا رازدار اور مشیر نہیں بنایا جاتا۔ اسلامی مملکتوں کے زوال کی داستانیں پڑھیے تو زوال کے دُوسرے اسباب کے ساتھ بکثرت یہ بھی ملے گا کہ مسلمانوں نے اپنے اُمور کا رازدار و معتمد غیر مسلموں کو بنالیا تھا، سلطنتِ عثمانی کے زوال میں بھی اس کو کافی دخل تھا۔

آیتِ مذکورہ میں اس حکم کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے: لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا الآیۃ، یعنی وہ لوگ تمہیں وبال وفساد میں مبتلا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے، اور تمہارے دُکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بعض تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے دِل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اور بھی بڑھ کر ہے، ہم تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کرچکے ہیں، اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور مشیر نہ بنائیں، کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ، منافقین ہوں یا مشرکین، کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیرخواہ نہیں ہوسکتی، بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ تمہیں بیوقوف بنا کر نقصان پہنچائیں، اور دِینی و دُنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں، ان کی آرزو یہ ہے کہ تم تکلیف میں رہو، اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دِینی یا دُنیوی ضرر پہنچے، جو دُشمنی یا ضرر اُن کے دِلوں میں ہے وہ تو

[1] تفسیر ابن ابی حاتم تحت هٰذه الآیة رقم الحدیث:۴۰۸۵ ج:۱۴ ص:۳۵۸

بہت ہی زیادہ ہے، لیکن بسا اوقات عداوتِ غیظ وغضب سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا بھی ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو اُن کی گہری دُشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں، مارے دُشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی، پس عقل مند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے دُشمنوں کو رازدار بنائے، خدائے تعالیٰ نے دوست دُشمن کے پتے اور موالات کے اَحکام بتلا دیئے ہیں، جس میں عقل ہوگی اس سے کام لے گا۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ یہ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے، اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی آگئی کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلمانوں کا حقیقی دوست اور خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا: هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ الآیۃ، یعنی تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور یہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے، اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو، اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر اُنگلیاں غصّے سے، کہہ دیجئے کہ تم غیظ میں مر رہو، بے شک اللہ دِلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے، یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دَم بھرتے رہو اور وہ تمہارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دُشمن ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو، خواہ وہ کسی قوم کی ہوں، اور کسی زمانے میں کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں، اس کے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے، بلکہ اپنی کتابوں پر بھی خود ان کا اِیمان صحیح نہیں، اس لحاظ سے چاہئے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور اور بیزار رہتے، مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔

اس کافرانہ ذہنیت کی مزید توضیح یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ یعنی ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آجائے تو یہ ان لوگوں کو دُکھ پہنچاتی ہے اور اگر تم پر کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

پھر منافقوں کے کید ومکر اور شدید مخالفین کے عناد اور مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا آسان اور سہل الاصول نسخہ یہ بیان کیا گیا کہ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿١٢٠﴾ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

مسلمانوں کی فتح وکامیابی اور تمام مشکلات میں آسانی کا راز صبر اور تقویٰ کی دو صفتوں میں مضمر ہے

قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو ہر قسم کے مصائب اور پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے صبر وتقویٰ کو صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ دُوسری آیات میں بھی ایک مؤثر علاج کی حیثیت سے بیان فرمایا، اسی رُکوع کے بعد دُوسرے رُکوع میں ہے:

بَلٰٓی ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ (آلِ عمران) اس میں اِمدادِ غیبی کا وعدہ انہی دو شرطوں یعنی صبر وتقویٰ پر موقوف رکھا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں فرمایا: اِنَّہٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ (یوسف: ۹۰) اس میں بھی فلاح وکامیابی صبر وتقویٰ کے ساتھ وابستہ بتلائی گئی ہے۔ اسی سورۃ کے ختم پر صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جارہی ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ (آل عمران) اس میں بھی فلاح وکامیابی کو صبر وتقویٰ پر معلق کیا گیا ہے۔

صبر وتقویٰ مختصر عنوان کے اندر اِنفرادی اور اِجتماعی زندگی کے ہر شعبہ، عوامی اور فوجی نظم ونسق کا ایک کامیاب ضابطہ بڑی جامعیت کے ساتھ آگیا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشادِ گرامی ہے:-

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنِّیْ لَاَعْلَمُ آیَۃً لَوْ اَخَذَ النَّاسُ بِھَا لَکَفَتْھُمْ: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾ الآیۃ۔ (الطلاق) (رواہ احمد)[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل اختیار کرلیں تو ان کے دِین ودُنیا کے لئے وہی کافی ہے، وہ آیت یہ ہے: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں۔"

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِکَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰہُ

اور جب صبح کو نکلا تو اپنے گھر سے بٹھلانے لگا مسلمانوں کو لڑائی کے ٹھکانوں پر اور اللہ

سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا ؕ

سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ جب قصد کیا دو فرقوں نے تم میں سے کہ نامردی کریں اور اللہ مددگار تھا ان کا،

وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ

اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ کریں مسلمان۔ اور تمہاری مدد کرچکا ہے اللہ بدر کی لڑائی میں اور تم

[1] مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاری رقم الحدیث: ۲۰۵۷۱

اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

کمزور تھے، سو ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم احسان مانو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر! جنگِ اُحد کا وہ وقت یاد کرو) جب تم صبح کے وقت اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو جنگ کے ٹھکانوں پر جمارہے تھے، ـــــ اور اللہ سب کچھ سننے جاننے والا ہے ـــــ ﴿۱۲۱﴾ جب تمہی میں کے دو گروہوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں، حالانکہ اللہ ان کا حامی و ناصر تھا، اور مؤمنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ﴿۱۲۲﴾ اللہ نے تو (جنگِ) بدر کے موقع پر ایسی حالت میں تمہاری مدد کی تھی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔ لہٰذا (صرف) اللہ کا خوف دِل میں رکھو، تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔ ﴿۱۲۳﴾

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ اگر مسلمان صبر وتقویٰ پر قائم رہیں تو کوئی طاقت ان کو ضرر نہیں پہنچاسکتی، اور یہ کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جو عارضی شکست اور تکلیف مسلمانوں کو پہنچی، وہ انہی دو چیزوں میں بعض حضرات کی طرف سے کوتاہی کی بنا پر تھی، مذکورہ آیات میں اسی غزوۂ اُحد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور غزوہ بدر میں فتح کا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ آپ صبح کے وقت (تاریخ قتال سے پہلے) اپنے گھر سے (اس غرض سے) نکلے (کہ) مسلمانوں کو (کفار سے) مقاتلہ کرنے کے لئے (مناسب) مقامات پر جما(نے کے لئے آمادہ کر) رہے تھے (پھر اسی تجویز کے مطابق سب کو ان مقامات پر جمادیا) اور اللہ تعالیٰ (اس وقت کی باتیں) سب سن رہے تھے (اور اس وقت کے حالات) سب جان رہے تھے (اسی کے ساتھ یہ قصہ بھی ہوا کہ) تم (مسلمانوں) میں سے دو جماعتوں نے (کہ وہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ ہیں) دِل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں (اور ہم بھی عبداللہ بن اُبیّ منافق کی طرح اپنے گھر جابیٹھیں) اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا، (بھلا ان کو کب ہمت ہارنے دیتا، چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان کو اس خیال پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا) اور (ہم آئندہ کے لئے ان جماعتوں اور سب کو نصیحت کرتے

ہیں کہ جب تم مسلمان ہو) پس مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہئے (اور ایسی کم ہمتی کبھی نہ کرنا چاہئے) اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو (غزوۂ) بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم (محض) بے سروسامان تھے (کیونکہ مجمع بھی کفار کے مقابلہ میں کم تھا، وہ ایک ہزار تھے، اور مسلمان تین سو تیرہ تھے اور ہتھیار وغیرہ بھی بہت کم تھے) سو (چونکہ یہ منصور ہونا بدولت تقویٰ کے تھا جس میں استقلال وصبر بھی داخل ہے تو تم پر لازم ہے کہ آئندہ بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) تاکہ تم (اس نعمتِ نصرت کے) شکر گزار رہو (کیونکہ شکر گزاری صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورا شکر یہ ہے کہ زبان اور قلب بھی مشغول ہو، اور طاعت کی بھی پابندی ہو بالخصوص جبکہ اس طاعت کا اس نعمت میں دخیل ہونا بھی ثابت ہو جائے)۔

معارف ومسائل

غزوۂ اُحد کا پس منظر

آیتِ مذکورہ کی تفسیر سے قبل ضروری ہے کہ غزوۂ اُحد کے واقعاتی پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔

رمضان المبارک ۲ھ میں بدر کے مقام پر قریشی فوج اور مسلمان مجاہدین میں جنگ ہوئی، جس میں کفارِ مکہ کے ستر نامور اشخاص مارے گئے، اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اس تباہ کن اور ذِلت آمیز شکست سے جو حقیقۃً عذابِ الٰہی کی پہلی قسط تھی قریش کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا، جو سردار مارے گئے تھے ان کے اقارب نے تمام عرب کو غیرت دِلائی، اور یہ معاہدہ کیا کہ جب تک ہم اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لے لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے، اور اہلِ مکہ سے اپیل کی کہ ان کا تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے وہ سب اسی مہم پر خرچ کیا جائے، تاکہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں، سب نے منظور کیا، اور ۳ھ میں قریش کے ساتھ بہت سے دُوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے نکل پڑے، حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں تاکہ موقع آنے پر مردوں کو غیرت دِلا کر پسپائی سے روک سکیں، جس وقت یہ تین ہزار کا لشکر اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل جبلِ اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ لیا، آپ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دُشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھا، اس سے بھی رائے لی گئی، جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی، مگر بعض پُر جوش مسلمان جنہیں بدر کی شرکت نصیب نہ ہوئی تھی اور شوقِ شہادت بے چین کر رہا تھا مصر ہوئے کہ ہم کو باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے، تاکہ دُشمن

ہمارے بارے میں بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ کرے، کثرتِ رائے اسی طرف ہوگئی۔

اس عرصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکان کے اندر تشریف لے گئے اور زِرہ پہن کر باہر آئے، تو اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہم نے آپ کو آپ کی رائے خلاف مدینہ سے باہر جنگ کرنے پر مجبور کیا، یہ غلط ہوا، اس لئے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ کا منشا نہ ہو تو یہیں تشریف رکھئے، فرمایا: ''ایک پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ جب وہ زِرہ پہن لے اور ہتھیار لگالے پھر بدون قتال کئے ہوئے بدن سے اُتارے۔'' اس جملہ میں نبی اور غیر نبی کا فرق واضح ہو رہا ہے کہ نبی کی ذات سے کبھی کمزوری کا اِظہار نہیں ہوسکتا، اور اس میں اُمت کے لئے بھی ایک بڑا سبق ہے۔

جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، تقریباً ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ تھے، مگر منافق عبداللہ بن اُبیّ تقریباً تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر راستہ سے یہ کہتا ہوا واپس ہوگیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا اور دُوسروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں، کیوں ہم خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں۔ اس کے ساتھیوں میں زیادہ تو منافقین ہی تھے، مگر بعض مسلمان بھی ان کے فریب میں آکر ساتھ لگ گئے تھے۔

آخر آپ کل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے، آپ نے بہ نفسِ نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں، صف آرائی اس طرح کی کہ اُحد کو پشت کی جانب رکھا، اور دُوسرے اِنتظامات اس طرح کئے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو علَم (جھنڈا) عنایت کیا، حضرت زُبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ کو رسالہ کا افسر مقرّر کیا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اُس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف اِحتمال تھا کہ دُشمن اِدھر سے آئے، اس لئے پچاس تیراندازوں کا دستہ متعین کیا، اور حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب ٹیلہ پر حفاظت کا کام سرانجام دیں، لڑنے والوں کی فتح وشکست سے تعلق نہ رکھیں، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان تیراندازوں کے افسر مقرّر ہوئے۔ قریش کو بدر میں تجربہ ہوچکا تھا اس لئے انہوں نے بھی ترتیب سے صف آرائی کی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صف آرائی اور فوجی قواعد کے لحاظ سے نظم وضبط کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے رہبرِ کامل، مقدس نبی ہونے کے ساتھ سپہ سالارِ اعظم کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہیں، آپ نے جس انداز میں مورچے قائم کئے اور لڑائی کا نظم قائم کیا، اس وقت کی دُنیا اس سے ناآشنا تھی، اور آج جبکہ فنِ حرب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اِختیار کرگیا ہے، وہ بھی آپ کے فوجی قواعد اور نظم وضبط کو سراہتا ہے، اسی حقیقت کو دیکھ کر ایک مسیحی مؤرّخ بول اُٹھا:-

"برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہنا چاہئے کہ فنِ حرب کی بھی نئی راہ نکالی، مکہ والوں کی بے دھڑک اور اندھا دُھند لڑائی کے مقابلہ میں خوب دُور اندیشی اور سخت قسم کے نظم وضبط سے کام لیا۔"

یہ الفاظ بیسویں صدی کے ایک مؤرّخ "ٹام انڈر" کے ہیں جو اس نے "لائف آف محمد" میں بیان کئے۔

جنگ کا آغاز

اس کے بعد جنگ شروع ہوئی، اِبتداءً مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی، مسلمان سمجھے کہ فتح ہوگئی، مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے، اُدھر جن تیراندازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پشت کی جانب حفاظت کے لئے بٹھایا تھا انہوں نے جب دیکھا کہ دُشمن بھاگ نکلا ہے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن کی طرف آنے لگے، حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دِلا کر روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا دُوسروں نے کہا کہ حضور کے حکم کی تعمیل تو مؤقت تھی، اب ہمیں سب کے ساتھ مل جانا چاہئے۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے جو اَبھی تک مسلمان نہ تھے اور اس وقت لشکرِ کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اُٹھایا، اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درّے سے حملہ کر دیا، عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے قلیل ساتھیوں نے اس حملے کو ہمت وشجاعت سے روکنا چاہا، مگر مدافعت نہ کر سکے، اور یہ سیلاب یکا یک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، دُوسری طرف جو دُشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہوگئے، اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دَم پلٹ گیا، اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہوکر میدان سے چلا گیا، تاہم کچھ صحابہؓ اَبھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے، اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے، اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش وحواس بھی گم کر دیئے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے، اور آپ خود بھی زخمی ہوگئے تھے، شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی کہ عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسلامت تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپ کے گرد جمع ہوگئے، اور آپ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے، اس شکست کے بعد مسلمان حد درجہ پریشان رہے، اور یہ عارضی شکست چند اَسباب کا نتیجہ تھی، قرآن مجید نے ہر سبب پر جچے تلے الفاظ میں تبصرہ کیا اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔

اس واقعہ کی تفصیل میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر عظیم سبق لئے ہوئے ہیں، اور اس میں تمام مسلمانوں

کے لئے موعظت ونصیحت کے جواہر پارے مخفی ہیں۔

اُحد کے واقعے سے چند سبق

۱- پہلی بات جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کفارِ قریش اس جنگ میں عورتوں کو بھی لائے تھے، تا کہ وہ مردوں کو پسپائی سے روک سکیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ عورتیں ہندہ زوجۂ ابی سفیان کی سربراہی میں اَشعار گا کر مردوں کو جوش دِلا رہی ہیں۔

اِنْ تَقْبَلُوْا نُعَانِقْ وَنَفْرِشُ النَّمَارِقْ
اَوْ تُدْبِرُوْا نُفَارِقْ فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقْ [1]

''مطلب یہ تھا کہ اگر مقابلے پر ڈٹے رہے اور فتح پائی تو ہم تم کو گلے لگائیں گے، اور تمہارے لئے نرم بستر بچھائیں گے، لیکن اگر تم نے پیٹھ موڑی تو ہم تم کو بالکل چھوڑ دیں گے۔''

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظِ دُعائیہ جاری تھے:-

اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔

''اے اللہ! میں تجھ ہی سے قوت حاصل کرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی دِین کے لئے قتال کرتا ہوں، اللہ ہی کافی ہے اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے۔''

اِس دُعا کا ایک ایک لفظ تعلق مع اللہ کی تاکید اور مسلمانوں کے تمام افعال واعمال حتیٰ کہ جنگ وقتال کو بھی دیگر اَقوام کے جنگ وقتال سے ممتاز کر رہا ہے۔

۲- دُوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ اس غزوہ میں بعض صحابہؓ نے بہادری وشجاعت، وجاں نثاری اور فدائیت کے وہ نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے جسم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنالیا تھا کہ ہر آنے والا تیر اپنے سینے پر کھاتے تھے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح اپنے بدن کو چھلنی کرالیا تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کو نہیں چھوڑا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ جنگِ بدر سے غیر حاضر رہے تھے اس لئے ان کو اس کا افسوس تھا، آرزو کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں اگر کوئی موقع ہاتھ آیا تو اپنے دِل کی حسرت پوری کروں گا۔

جب کچھ دن کے بعد جنگِ اُحد کا واقعہ پیش آیا تو اَنس بن النضر رضی اللہ عنہ شریک ہوئے، مسلمان جب

[1] دلائل النبوة للبيهقي رقم الحديث: ۱۰۸۲، باب تحريض النبي صلى الله عليه وسلم أصحابه على القتال۔

منتشر ہوگئے تھے اور کفارِ قریش کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا تو یہ اپنی تلوار لے کر آگے بڑھے، اِتفاقاً حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، سعدؓ بھی منتشر ہونے والوں میں جارہے تھے، پکار کر کہا: ''سعد! کہاں چلے جارہے ہو؟ میں تو اُحد کے اس دامن میں جنت کی خوشبو محسوس کررہا ہوں۔'' یہ کہہ کر آگے بڑھے اور شدید قتال کے بعد اپنی جان جہان آفرین کے سپرد کردی۔ (ابن کثیر) [۱]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان منتشر ہوگئے اس وقت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف گیارہ حضرات رہ گئے تھے، جن میں حضرت طلحہؓ بھی تھے، کفارِ قریش کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون ان کی خبر لے گا؟ حضرت طلحہؓ بول اُٹھے: ''میں یارسول اللہ!'' ایک دُوسرے انصاری صحابی نے کہا: ''میں حاضر ہوں!'' انصاری کو آپ نے جانے کا حکم دیا، وہ قتال کے بعد شہید ہوگئے، پھر ایک ریلہ آیا، آپ نے پھر وہی سوال کیا، حضرت طلحہؓ نے وہی جواب دیا اور بے تاب ہورہے تھے کہ حضور حکم دیں تو میں آگے بڑھوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر کسی دُوسرے انصاری صحابی کو بھیج دیا، اور حضرت طلحہؓ کی تمنا پوری نہیں ہوئی، اسی طرح سات بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اور ہر مرتبہ حضرت طلحہؓ کو اِجازت نہیں دی گئی، اور دُوسرے صحابہؓ کو اِجازت دی جاتی تھی وہ شہید ہوجاتے تھے۔

جنگِ بدر میں باوجود قلّتِ تعداد کے مسلمانوں کو فتح ہوئی، غزوۂ اُحد میں بدر کی بہ نسبت کثرت تھی، پھر بھی شکست ہوئی، اس میں بھی مسلمانوں کے لئے عبرت ہے کہ مسلمان کو کبھی کثرتِ ساز و سامان پر نہیں جانا چاہئے، بلکہ فتح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھے، اور اسی سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھے۔

جنگِ یرموک کے موقع پر جب محاذِ جنگ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مزید فوجی کمک بھیجنے کے لئے لکھا گیا اور قلّتِ تعداد کی شکایت کی گئی تو تحریر فرمایا:-

قَدْ جَاءَنِیْ کِتَابُکُمْ تَسْتَمِدُّوْنَنِیْ وَاِنِّیْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ هُوَ اَعَزُّ نَصْرًا وَاَحْصَنُ جُنْدًا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فَاسْتَنْصِرُوْهُ فَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ نُصِرَ فِیْ يَوْمِ بَدْرٍ فِیْ اَقَلَّ مِنْ عِدَّتِكُمْ فَاِذَا جَاءَكُمْ كِتَابِیْ هٰذَا فَقَاتِلُوْهُمْ وَلَا تُرَاجِعُوْنِیْ (بحواله مسند احمد) [۲] (ابن کثیر)

''میرے پاس تمہارا خط آیا جس میں تم نے زیادہ فوجی مدد طلب کی ہے لیکن میں تم کو ایک ایسی ذات کا پتہ دیتا ہوں جو نصرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ غالب اور فوج کے لحاظ سے زیادہ محفوظ ہے، وہ اللہ رَبّ العالمین کی ذات ہے، لہٰذا تم اسی سے مدد طلب کرو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں باوجود

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۳۶

[۲] مسند احمد، مسند عمر بن الخطاب رضی الله عنه رقم الحديث:۳۲۶

قلّتِ عدد کے مدد دی گئی، جب میرا یہ خط تم کو پہنچے تو ان پر ٹوٹ پڑو اور مجھ سے اس سلسلے میں کوئی مراجعت نہ کرو۔"

اس واقعے کے راوی بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کو یہ خط ملا، ہم نے اللہ کا نام لے کر کفار کے لشکرِ کثیر پر یکبارگی حملہ کیا جس میں ان کو شکستِ فاش ہوئی، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کی فتح و شکست، قلّت و کثرت پر دائر نہیں ہوتی، بلکہ اللہ پر توکل اور اس کی مدد پر موقوف ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے غزوۂ حنین کے بارے میں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا، اِرشاد ہے:-

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا (التوبۃ:۲۵)

"یعنی غزوۂ حنین کو یاد کرو جبکہ تم کو اپنی کثرت پر ناز ہوگیا تھا، تو یہ کثرت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی۔"

اب آیات کی تفسیر پر غور فرمائیے:-

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ الآیۃ، یعنی جبکہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے، جنگ کے لئے مختلف مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے۔

قرآن مجید کا نقلِ واقعات میں ایک خاص معجزانہ اُسلوب ہے، کہ وہ عام طور پر کوئی واقعہ پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان نہیں کیا کرتا، مگر جن واقعات اور جزئیات میں خاص ہدایات مضمر ہوتی ہیں وہ بیان کی جاتی ہیں، مذکورہ آیت میں جو خاص جزوی اُمور کی تصریح ہے، مثلاً گھر سے نکلنے کا وقت کیا تھا، اس کو لفظ "غَدَوْتَ" سے بیان فرمادیا، اور روایاتِ حدیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ صبح ساتویں تاریخ شوال کی ۳ھ کی تھی۔

اس کے بعد یہ بھی بتلایا کہ اس سفر کی اِبتدا کس جگہ سے ہوئی مِنْ أَهْلِكَ کے لفظ سے اِشارہ ہوا کہ آپ اُس وقت اپنے اہل و عیال میں تھے، ان کو وہیں چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، حالانکہ یہ حملہ مدینہ ہی پر ہونے والا تھا، ان جزوی حالات میں یہ ہدایت مضمر ہے کہ جب اللہ کا حکم آجائے تو اس کی تعمیل میں اہل و عیال کی محبت سنگِ راہ نہیں ہونی چاہئے، اس کے بعد گھر سے نکل کر محاذِ جنگ تک پہنچنے کے جزئی واقعات کو چھوڑ کر محاذِ جنگ کا پہلا کام یہ بیان کیا گیا کہ:-

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ یعنی آپ مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات پر جما رہے تھے۔

پھر اس آیت کو اس طرح ختم کیا گیا کہ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۱﴾ یعنی "اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔ سَمِيعٌ عَلِيمٌ کی صفات کو یاد دِلا کر اس طرف اِشارہ کردیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین دونوں جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ سن رہے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آچکا، اور اس موقع پر مخالفین و موافقین کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شے اس سے مخفی نہیں رہی، اور اسی طرح اس جنگ کا انجام بھی اس سے مخفی نہیں۔

اس کے بعد دُوسری آیت ہے اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا الخ، یعنی جب تم میں سے دو جماعتیں اس کا خیال کر بیٹھیں کہ ہمت ہار دیں، درآنحالیکہ اللہ دونوں کا مددگار تھا، ان دونوں جماعتوں سے مراد قبیلۂ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلۂ خزرج کے بنی سلمہ ہیں، ان دونوں جماعتوں نے عبداللہ بن اُبیّ کی مثال دیکھ کر اپنے میں کمزوری اور کم ہمتی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور اس وسوسہ کو وسوسہ کے درجے سے آگے نہ بڑھنے دیا اور یہ خیال بھی جو انہیں پیدا ہوا، اپنی قلتِ تعداد، قلتِ سامان اور مادّی کمزوری کی بنا پر تھا، نہ کہ ضعفِ ایمان کی بنا پر۔ مغازی کے مشہور امام مؤرّخ ابنِ ہشامؒ نے اس کو واضح فرمادیا ہے۔[1] اور وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کا جملہ خود ان کے ایمانِ کامل کی شہادت دے رہا ہے۔ اس لئے ان دونوں قبیلوں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ: ''اگرچہ اس آیت میں ہم پر کچھ عتاب بھی ہے، لیکن وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کی بشارت بھی ہمارے لئے آئی ہے۔''

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ ''مسلمانوں کو اللہ پر اعتماد رکھنا چاہئے'' اس میں واضح کردیا کہ کثرتِ عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ بقدرِ استطاعت مادّی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک پر ہونا چاہئے۔ بنو حارثہ اور بنو سلمہ کو کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ اسی مادّی ضعف کی بنا پر تھا اس لئے ان کے وسوسہ کا علاج توکل سے بتلایا گیا کہ توکل و اعتماد ان وساوس کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ہے، محققین صوفیا نے اس کی حقیقت پر مفصل بحثیں کی ہیں، یہاں اس قدر سمجھئے کہ توکل کے معنی یہ نہیں کہ تمام اسبابِ ظاہری سے بالکل قطع تعلق کرکے اللہ پر اعتماد کیا جائے، بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام اسبابِ ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور اختیار کرے، اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے، اور ان ظاہری اسباب پر فخر و ناز نہ کرے، بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے، خود اسی جہاد میں مسلمانوں کے لشکر کو جنگ کے لئے منظّم کرنا، اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامانِ حرب فراہم کرنا، محاذِ جنگ پر پہنچ کر مناسبِ حال و مقام نقشۂ جنگ تیار کرنا، مختلف مورچے بنا کر صحابہ کرامؓ کو ان پر بٹھانا وغیرہ، یہ سب مادّی انتظامات ہی تو تھے جن کو سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے استعمال فرما کر بتلادیا کہ مادّی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، اُن سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں، یہاں مؤمن اور غیر مؤمن میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مؤمن سب سامان اور مادّی طاقتیں حسبِ قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ و توکل صرف اللہ پر کرتا ہے، غیر مؤمن کو یہ رُوحانیت نصیب نہیں، اس کو صرف اپنی مادّی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے، اور اسی فرق کا ظہور تمام اسلامی غزوات میں ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔

---

[1] سیرة ابن هشام، ذکر ما انزل الله فی احد من القرآن ج:۲ ص:۱۰۶

اب اس کے بعد اس غزوہ کی طرف ذہن کو منتقل کیا جارہا ہے، جس میں مسلمانوں نے کامل توکل کا مظاہرہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی ونصرت سے سرفراز کیا تھا، ارشاد ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ الخ، یعنی اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری امداد فرمائی، جبکہ تم تعداد میں بھی صرف تین سو تیرہ تھے، اور وہ بھی سب بے سروسامان۔

بدر کی اہمیت اور اس کا محلِ وقوع

بدر، مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی اَسّی میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے۔

اُس وقت اُس کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پانی کی اِفراط تھی، اور یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان یہیں سب سے پہلا معرکہ بروز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۱۱ مارچ ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا، یہ غزوہ بظاہر تو ایک مقامی جنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دُنیا کی تاریخ میں ایک عظیم اِنقلاب پیدا کردیا، اسی لئے قرآن کی زبان میں اس کو ''یوم الفرقان'' کہا گیا ہے، فرنگی مؤرّخوں نے بھی اس کی اہمیت کا اِقرار کیا ہے۔

امریکی پروفیسر ہٹی اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربین میں کہتا ہے:-

''یہ اسلام کی سب سے پہلی فتحِ مبین تھی۔''

وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ یعنی تم اس وقت تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر تھے، مسلمان تعداد میں قوی روایات کے مطابق ۳۱۳ تھے، اس فوج کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے، اور اُونٹ ستر کی تعداد میں تھے، انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔

آخری آیت میں فرمایا گیا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ یعنی ''اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار رہو۔''

قرآن نے جگہ جگہ منافقین کے کید اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کے لئے تقویٰ اور صبر کو علاج بتلایا ہے، انہی دو چیزوں کے اندر ساری تنظیمی جدوجہد اور فتحِ مبین کا راز مضمر ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، اور یہاں صبر وتقویٰ کے بجائے صرف تقویٰ پر اِکتفا کیا گیا ہے، کیونکہ درحقیقت تقویٰ ایسی صفت جامع ہے کہ صبر بھی اس میں شامل ہے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ

جب تو کہنے لگا مسلمانوں کو: کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہاری مدد کو بھیجے رَبّ تمہارا تین ہزار

الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا

فرشتے آسمان سے اُترنے والے۔ البتہ اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو اور وہ آئیں تم پر اسی دم

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ الربع

تو مدد بھیجے تمہارا ربّ پانچ ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا

اور یہ تو اللہ نے تمہارے دِل کی خوشی کی اور تاکہ تسکین ہو تمہارے دِلوں کو اس سے، اور مدد ہے صرف

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اللہ ہی کی طرف سے جو کہ زبردست ہے حکمت والا۔ تاکہ ہلاک کرے بعضے کافروں کو

اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ

یا ان کو ذلیل کرے تو پھر جاویں محروم ہوکر۔ تیرا اِختیار کچھ نہیں،

اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

یا ان کو توبہ دیوے خدائے تعالیٰ یا ان کو عذاب کرے کہ وہ ناحق پر ہیں۔ اور اللہ ہی کا مال ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ

اور جو کچھ کہ زمین میں ہے، بخش دے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے، اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۳ ۹ ۴

بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جب (بدر کی جنگ میں) تم مؤمنوں سے کہہ رہے تھے کہ: ''کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے اُتار کر تمہاری مدد کو بھیج دے؟ ﴿۱۲۴﴾ ہاں! بلکہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ لوگ اپنے اسی ریلے میں اچانک تم تک پہنچ جائیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیج دے گا جنہوں نے اپنی پہچان نمایاں کی ہوئی ہوگی۔'' ﴿۱۲۵﴾ اللہ نے یہ انتظام صرف اس لئے کیا تھا تاکہ تمہیں خوشخبری ملے، اور اس سے تمہارے دِلوں کو اطمینان نصیب ہو، ورنہ فتح تو کسی اور کی طرف سے نہیں، صرف اللہ کے پاس سے آتی ہے جو مکمل اقتدار کا بھی مالک ہے، تمام تر حکمت کا بھی مالک ﴿۱۲۶﴾ (اور جنگِ بدر میں یہ مدد اللہ نے اس لئے کی) تاکہ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے ان کا ایک حصہ کاٹ کر رکھ دے، یا ان کو ایسی ذِلت آمیز شکست دے کہ وہ نامراد ہو کر واپس چلے جائیں۔ ﴿۱۲۷﴾ (اے پیغمبر!) تمہیں اس فیصلے کا کوئی اختیار نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے کیونکہ یہ ظالم لوگ ہیں ﴿۱۲۸﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۱۲۹﴾

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں بضمن قصۂ اُحد غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امدادِ غیبی ہونے کا ذِکر تھا، آگے اس امداد کی کچھ تفصیل اور فرشتوں کے بھیجنے کی حکمت کا بیان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (الیٰ) فَیَنْقَلِبُوْا خَآئِبِیْنَ ﴿۱۲۷﴾ (غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ کی یہ امداد اس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں سے یوں فرمارہے تھے کہ کیا تم کو (تقویتِ قلب کے لئے) یہ اَمر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا ربّ تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ (جو اسی کام کے لئے آسمان سے) اُتارے جاویں گے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجے کے فرشتے ہوں گے، ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا (رُوح) پھر اُوپر کے اِستفہام کا خود جواب اس طرح اِرشاد فرمایا) ہاں! کیوں نہیں (کافی ہوگا، اس کے بعد اس

اِمداد میں مزید زیادتی کا وعدہ اس طرح فرمایا کہ مقابلے کے وقت) اگر مستقل رہو گے اور تقوے پر قائم رہو گے (یعنی کوئی اَمر خلافِ اِطاعت نہ کرو گے) اور وہ لوگ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں گے (جس میں عادۃً کسی مخلوق سے مدد پہنچنا مشکل ہوتا ہے) تو تمہارا رَبّ تمہاری اِمداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع کے بنائے ہوں گے (جیسے عام جنگوں میں اپنی اپنی فوج کی پہچان کے لئے کوئی خاص وردی ہوتی ہے، آگے اس اِمداد و نصرت کی حکمت کا بیان ہے کہ) اور اللہ تعالیٰ نے یہ اِمداد (مذکور جو فرشتوں سے ہوئی) محض اس لئے کی کہ تمہارے لئے (غلبہ اور فتح کی) بشارت ہو، اور تمہارے دِلوں کو اس سے قرار آئے اور نصرت (و غلبہ) تو صرف اللہ کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں (کہ ویسے بھی غالب کر سکتے ہیں لیکن) حکیم (بھی) ہیں (تو جب مقتضائے حکمت یہ ہوتا ہے کہ اسباب کے ذریعہ غلبہ دیا جائے تو ویسے ہی اسباب پیدا فرما دیتے ہیں، یہ تو اِمداد بالملائکہ کی حکمت تھی، آگے اس کی حکمت کا بیان ہے کہ یہ فتح و غلبہ تمہیں کیوں عطا کیا گیا، اس کے لئے اِرشاد فرمایا گیا) تا کہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے (چنانچہ کافروں کے ستر سردار رئیس مارے گئے) یا اُن (میں سے بعض) کو ذلیل و خوار کر دے پھر وہ ناکام لوٹ جاویں (یعنی اِن میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو جائے اور اگر دونوں ہو جاویں تو اور بھی بہتر ہے، چنانچہ دونوں باتیں ہوئیں کہ ستر سردار مارے گئے، ستر قید ہو کر ذلیل ہوئے، باقی ذلیل و خوار ہو کر بھاگ گئے)۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (الیٰ قولہ) غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۹﴾ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو (کسی کے مسلمان ہونے یا کافر رہنے کے متعلق خود) کوئی دخل نہیں (خواہ علم کا دخل ہو یا قدرت کا بلکہ یہ سب خدا تعالیٰ کے علم اور قبضے میں ہے آپ کو صبر کرنا چاہئے) یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو (رحمت سے) متوجہ ہو جاویں (یعنی ان کو اِسلام کی توفیق دے دیں، تو اس وقت صبر فرح اور سرور سے بدل جائے گا) اور یا ان کو (دُنیا ہی میں) کوئی سزا دیں (تو اس وقت صبر تسکینِ قلبی میں بدل جائے گا، اور سزا دینا کچھ بے جا بھی نہیں) کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں (مراد اس سے کفر و شرک ہے، جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) آگے اس مضمون کی تاکید ہے) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے، وہ جس کو چاہیں بخش دیں (یعنی اسلام نصیب کر دیں جس سے مغفرت ہوتی ہے) اور جس کو چاہیں عذاب دیں (یعنی اسلام نصیب نہ ہو اور اس وجہ سے عذابِ دائمی ہو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے (اور) بڑے رحمت کرنے والے ہیں (تو بخشنے کا تو ذرا بھی تعجب نہیں، کیونکہ رحمت تو ان کی سابق ہی ہے، اس لئے عذاب دینے کی وجہ اُوپر بیان فرمائی: فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾)۔

معارف و مسائل

فرشتوں کی اِمداد بھیجنے کی حکمت اور اصل مقصد اور تعدادِ ملائکہ میں مختلف عدد بیان کرنے کی حکمت

یہاں طبعی طور پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو وہ طاقت بخشی ہے کہ ایک ہی فرشتہ پوری بستی کا تختہ اُلٹ سکتا ہے، جیسا کہ قومِ لوط کی زمین تنہا جبریلِ امین نے اُلٹ دی تھی، تو پھر فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

نیز یہ کہ جب فرشتے میدان میں آئے ہی تھے تو ایک کافر بھی بچنا نہیں چاہئے تھا۔ اس کا جواب خود قرآنِ کریم نے آیت وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى میں دے دیا کہ فرشتوں کے بھیجنے میں درحقیقت ان سے کوئی میدانِ جنگ فتح کرانا مقصود نہ تھا، بلکہ مجاہدینِ مسلمین کی تسلی اور تقویتِ قلب اور بشارتِ فتح دینا مقصود تھا، جیسا کہ اس آیت کے الفاظ اِلَّا بُشْرٰى اور وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ سے واضح ہے، اور اس سے زیادہ صریح سورۂ اَنفال میں اسی واقعے کے متعلق آئے ہوئے الفاظ ہیں فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الانفال:۱۲) جس میں فرشتوں کو خطاب کر کے ان کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو جمائے رکھیں، پریشان نہ ہونے دیں، اس تثبیتِ قلوب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ اپنے تصرف کے ذریعے ان کے قلوب کو مضبوط کردیں، جیسا کہ مشائخِ صوفیہ اہلِ تصرف کا معمول ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے یہ واضح کردیں کہ اللہ کے فرشتے ان کی مدد پر کھڑے ہیں، کبھی سامنے ظاہر ہوکر، کبھی آواز سے، کبھی کسی اور طریق سے، جیسا کہ میدانِ بدر میں یہ سب طریقے اِستعمال کے گئے، آیت فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (الانفال:۱۲) کی ایک تفسیر میں یہ خطاب فرشتوں کو ہے۔ اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ مسلمان نے کسی مشرک پر حملہ کرنے کا اِرادہ کیا تو اس کا سر خود ہی بدن سے جدا ہوگیا (كما روى عن سهل بن حنيف برواية الحاكم وتصحيح البيهقي)۔ اور بعض صحابہ کرامؓ نے جبریلِ امین کی آواز بھی سنی کہ "اَقْدِمْ حَيْزُوْمُ" فرما رہے ہیں، اور بعض نے خود بھی بعض ملائکہ کو دیکھا بھی (رواہ مسلم)[1]۔ یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ ملائکۃ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دِلانے کے لئے کچھ کچھ کام ایسے بھی کئے ہیں کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں، اور دراصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویتِ قلب تھا، فرشتوں کے ذریعہ میدانِ جنگ فتح کرانا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے

[1] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر ج:۲ ص:۹۳

کہ اس دُنیا میں جنگ و جہاد کے فرائض اِنسانوں پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کرائے جائیں تو دُنیا میں کفر و کافر کا نام ہی نہ رہتا، حکومت و سلطنت کی تو کیا گنجائش تھی، مگر اس کارخانۂ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں، یہاں تو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت ملے جلے ہی چلتے رہیں گے، ان کے نکھار کے لئے حشر کا دِن ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ غزوۂ بدر میں ملائکۃ اللہ کو مدد کے لئے بھیجنے میں جو وعدے آئے ہیں ان میں سورۂ اَنفال کی آیت میں تو ایک ہزار کا وعدہ ہے، اور آلِ عمران کی مذکورہ آیت میں پہلے تین ہزار کا پھر پانچ ہزار کا وعدہ ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ سورۂ اَنفال میں مذکور یہ ہے کہ جب میدانِ بدر میں مسلمانوں نے مخالف کی تعداد ایک ہزار دیکھی، اور ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی تو بارگاہِ ربّ العزّت میں اِستغاثہ کیا، اس پر یہ وعدہ ایک ہزار فرشتوں کی اِمداد کا کیا گیا کہ جو عدد تمہارے دُشمن کا ہے اتنا ہی عدد فرشتوں کا بھیج دیا جائے گا، آیت کے الفاظ یہ ہیں: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾ (الانفال) اور اس آیت کے بعد بھی فرشتوں کی مدد بھیجنے کا یہی مقصد ظاہر فرمادیا کہ مسلمانوں کے قلوب جمے رہیں اور ان کو فتح کی بشارت ملے، چنانچہ اس کے بعد کی آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔

اور سورۂ آلِ عمران کی آیت زیرِ نظر میں تین ہزار فرشتوں کا وعدہ شاید اس بنا پر کیا گیا کہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر محاربی اپنے قبیلے کا لشکر لے کر مشرکینِ مکہ کی اِمداد کو آ رہا ہے (کذا فی الروح)[1]، یہاں دُشمن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ پہلے ہی سے تھی، مسلمان اس خبر سے کچھ پریشان ہوئے تو تین ہزار فرشتوں کا وعدہ کیا گیا تاکہ معاملہ برعکس ہو کر مسلمانوں کی تعداد دُشمن سے تین گنا ہو جائے گی۔

پھر اسی آیت کے آخر میں اس تعداد کو چند شرطوں کے ساتھ بڑھا کر پانچ ہزار کر دیا، وہ شرطیں دو تھیں: ایک یہ کہ مسلمان صبر و تقویٰ کے مقامِ اعلیٰ پر قائم رہیں، دُوسرے یہ کہ دُشمن ان پر یکبارگی حملہ کر دے، مگر ان دو شرطوں میں سے دُوسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی، اس لئے پانچ ہزار کی تعداد کا وعدہ نہ رہا، پھر اس میں اَئمۂ تفسیر و تاریخ کے اقوال مختلف ہیں کہ اگرچہ وعدے کی یہ شرط متحقق نہیں ہوئی پھر بھی یہ وعدہ پانچ ہزار کی صورت میں پورا ہوا یا صرف تین ہزار کی صورت میں، یہ اقوالِ مختلفہ ''رُوح المعانی'' میں مذکور ہیں۔[2]

آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ یہاں سے پھر اصل قصۂ اُحد کی طرف عود ہے، درمیان میں مجملاً قصۂ بدر کا

[1] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۳ ص:۱۹۶

[2] روح المعانی بحوالۂ بالا۔

ذکر آ گیا تھا، اور سببِ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ اس غزوۂ اُحد میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک جو کہ سامنے کے دو اُوپر کے دو نیچے کے دانتوں کی کروٹوں میں چار دانت ہوتے ہیں دو اُوپر داہنے بائیں، دو نیچے داہنے بائیں، ان چاروں میں نیچے داہنی طرف کا دانت شہید ہوگیا، اور چہرۂ مبارک مجروح ہوگیا تو آپ کی زبانِ مبارک پر یہ کلمات آ گئے کہ ایسی قوم کو کیسے فلاح ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالانکہ وہ نبی ان کو خدا کی طرف بلا رہا ہے، اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاری سے ایک قصہ اور بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض کفار کے لئے بددُعا بھی فرمائی تھی، اس پر یہ آیت نازل فرمائی، [1] جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ (از بیان القرآن ملخصاً)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دونے پر دُونا اور ڈرو اللہ سے

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ اور بچو اس آگ سے جو تیاری ہوئی کافروں کے واسطے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سُود مت کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو ﴿۱۳۰﴾ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! سود مت کھاؤ (یعنی مت لو اَصل سے) کئی حصے زائد (کرکے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو (یعنی جنت نصیب ہو اور دوزخ سے نجات ہو) اور اس آگ سے بچو جو (دراصل) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (اور آگ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ سود وغیرہ حرام کاموں سے بچو)۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ إلخ ج:۲ ص:۵۸۲

معارف و مسائل

اس آیت میں سود کھانے کی حرمت و ممانعت کے ساتھ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا ذِکر حرمت کی قید نہیں، بلکہ سود کی قباحت کو واضح کرنے کے لئے ہے، کیونکہ دُوسری آیات میں مطلقاً رِبا کی حرمت کا بیان نہایت تشدید و تاکید کے ساتھ آیا ہے، جس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آچکی ہے، اور اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے ذِکر میں اس طرف بھی اِشارہ ہوسکتا ہے کہ جس کو سود کھانے کی عادت ہوجائے تو خواہ وہ اِصطلاحی سود مرکب یعنی سود دَر سود کے معاملے سے پرہیز بھی کرلے تو سود سے حاصل شدہ کمائی کو جب دوبارہ سود پر چلائے گا تو وہ لامحالہ اضعاف مضاعف ہوتا چلا جائے گا، اگرچہ سود خوروں کی اِصطلاح میں اس کو سودِ مرکب یعنی سود دَر سود نہ کہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر ایک سود کا اَنجامِ کار اَضعاف مضاعف ہی ہوتا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ

اور حکم مانو اللہ کا اور رسول کا تاکہ تم پر رحم ہو۔ اور دوڑو بخشش کی طرف

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اپنے رَبّ کی اور جنت کی طرف جس کا عرض ہے آسمان اور زمین تیار ہوئی واسطے پرہیزگاروں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ اور رسول کی بات مانو، تاکہ تم سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے ﴿۱۳۲﴾ اور اپنے رَبّ کی طرف سے مغفرت اور وہ جنت حاصل کرنے کے لئے ایک دُوسرے سے بڑھ کر تیزی دِکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام آسمان اور زمین سما جائیں۔ وہ اُن پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور خوشی سے کہا مانو اللہ کا اور (اس کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا، اُمید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے (یعنی قیامت میں) اور دوڑ و طرف مغفرت کے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے (نصیب) ہو اور (دوڑو) طرف جنت کے (مطلب یہ ہے کہ ایسے نیک کام اِختیار کرو جس سے پروردگار تمہاری مغفرت کردیں اور تم کو جنت عنایت ہو اور وہ جنت

ایسی ہے) جس کی وسعت ایسی (تو) ہے (ہی) جیسے سب آسمان اور زمین (اور زیادہ کی نفی نہیں چنانچہ واقع میں زائد ہونا ثابت ہے) اور وہ تیاری کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ میں دو مسئلے زیادہ اہم ہیں۔ اوّل پہلی آیت کا مضمون جس میں اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کے ساتھ رسول کی اِطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر رسول کی اِطاعت بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب ''قرآن'' کی اِطاعت کا نام ہے تو پھر اس کے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اور اگر ان دونوں میں کچھ فرق ہے تو کیا ہے؟

دُوسری بات جو ہمیشہ یاد رکھنے اور اپنی عملی زندگی کا قبلہ بنانے کے قابل ہے، وہ وہ صفات اور علامات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول اور پرہیزگار بندوں کے لئے ان آیات میں بتلا کر یہ واضح فرمادیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتی بلکہ اِطاعت گزاروں کے کچھ صفات اور حالات ہوتے ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔

رسول کی اِطاعت کو اللہ تعالیٰ سے الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت

پہلا مسئلہ:- پہلی مختصر آیت میں اس طرح بیان فرمایا: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ یعنی ''اللہ اور رسول کی اِطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اس میں رحمتِ خداوندی کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِطاعت کو بھی اسی طرح لازم اور ضروری قرار دیا ہے، اور یہ پھر صرف اسی آیت میں نہیں، پورے قرآن میں بار بار اس کا تکرار اسی طرح ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کا حکم ہوتا ہے وہیں اِطاعتِ رسول کا بھی ذِکر مستقلاً ہے۔ قرآنِ حکیم کے یہ متواتر اور مسلسل اِرشادات ایک اِنسان کو اِسلام اور اِیمان کے بنیادی اُصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ اِیمان کا پہلا جزء خدائے تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کا اِقرار کرنا ہے، تو دُوسرا جزء ''رسول'' کی تصدیق اور اس کی اِطاعت ہے۔

اب یہاں غور طلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم ہی کے اِرشادات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ''رسولِ کریم'' صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب باذنِ خداوندی ہوتا ہے، اپنی طرف سے کچھ نہیں ہوتا، قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (النجم) یعنی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بولتے ہیں وہ کسی اپنی خواہش سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''وحی'' ہوتی ہے، اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ ''رسول'' کی اِطاعت بعینہٖ

خداتعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے، اس سے الگ کوئی چیز نہیں، سورۂ نساء آیت: ۸۰ میں خود قرآن نے بھی ان الفاظ میں اس کوواضح فرمادیا:-

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۸۰)

''یعنی جس نے اطاعت کی رسول کی اس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

تو اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھران دونوں اِطاعتوں کوالگ الگ بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ خصوصاً اس اِلتزام اور اِہتمام کے ساتھ کہ پورے قرآنِ کریم میں یہی عادتِ مستمرّہ ہے کہ دونوں اِطاعتوں کا ساتھ ساتھ حکم دیا جاتا ہے۔

رازاس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہدایت کے لئے ایک کتاب بھیجی، اور ایک رسول، رسول کے ذمہ یہ کام لگائے گئے، اوّل یہ کہ وہ قرآنِ کریم کی آیات ٹھیک اسی صورت اور لب ولہجہ کے ساتھ لوگوں کو پہنچادیں جس صورت سے وہ نازل ہوئیں۔

دُوسرے یہ کہ وہ لوگوں کوظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک کریں۔

تیسرے یہ کہ وہ اس کتاب کے مضامین کی اُمت کوتعلیم دیں، اوراس کے مقاصد کو بیان فرمائیں، نیز یہ کہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیں، یہ مضمون قرآنِ کریم کی متعدّد آیتوں میں تقریباً ایک ہی عنوان سے آیا ہے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)

معلوم ہوا کہ رسول کے فرائضِ منصبی میں صرف اتنا ہی داخل نہیں کہ وہ قرآن لوگوں تک پہنچادیں، بلکہ اس کی تعلیم اور تبیین بھی رسول کے ذمہ ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عرب کے فصحاء و بلغاء تھے، ان کے لئے قرآنِ کریم کی تعلیم کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ محض الفاظِ قرآنی کے لغوی معنی اُن کو سمجھائے جائیں، کیونکہ وہ سب خود بخود ان کو بخوبی سمجھتے تھے، بلکہ اس تعلیم وتبیین کا مقصد صرف یہی تھا کہ اور یہی ہوسکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے ایک حکم مجمل یا مبہم الفاظ میں بیان فرمایا، اس کی تشریح اور تفصیل رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وحی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچائی جو قرآن کے الفاظ میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلبِ مبارک میں ڈالی، جس کی طرف آیتِ قرآن اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (النجم) میں اِشارہ کیا گیا ہے، مثلاً قرآن نے بے شمار مواقع میں صرف وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فرمانے پر اِکتفا کیا ہے، کہیں نماز کے معاملے میں قیام، رُکوع اور سجدے کا ذِکر بھی آیا تو وہ بھی بالکل مبہم ہے، ان کی کیفیات کا ذِکر نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلِ امین نے خود آکر اللہ کے حکم سے ان تمام اعمال اور ارکان کی تفصیلی صورت عمل کرکے بتلائی، اور آپ نے اسی طرح قول وعمل کے ذریعے اُمت کو پہنچادیا۔

زکوٰۃ کے مختلف نصاب اور ہر نصاب پر زکوٰۃ کی مقدار کا تعین، پھر یہ بات کہ کس مال پر زکوٰۃ ہے اور کس مال پر

نہیں، اور مقادیر نصاب میں کتنا حصہ معاف ہے، یہ سب تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں، اور ان کے فرامین لکھوا کر متعدّد صحابہ کرامؓ کے سپرد فرمائے۔

یا مثلاً قرآنِ حکیم نے حکم دیا کہ:-

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرۃ:۱۸۸)

''یعنی آپس میں ایک دُوسرے کا مال باطل طریقے پر ناحق نہ کھاؤ۔''

اب اس کی یہ تفصیل کہ رائج الوقت معاملات، بیع وشراء اور اِجارہ میں کیا کیا صورتیں ناحق اور بے اِنصافی یا ضررِعوام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے باطل ہیں، یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باذنِ خداوندی اُمت کو بتلائی، اسی طرح تمام شرعی اَحکام کا بھی یہی حال ہے۔

تو یہ تمام تفصیلات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے بہ وحیِ الٰہی اُمت کو پہنچائیں، چونکہ یہ تفصیلات قرآنِ کریم میں مذکور نہیں اس لئے یہ اِحتمال تھا کہ کسی وقت کسی ناواقف کو یہ دھوکا ہو کہ یہ تفصیلی اَحکام خداتعالیٰ کے دیئے ہوئے اَحکام نہیں، اس لئے خداتعالیٰ کی اِطاعت میں اُن کی تعمیل ضروری نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے سارے قرآن میں بار بار اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اِطاعت کو لازم قرار دِیا ہے، جو حقیقت میں تو خداتعالیٰ ہی کی اِطاعت ہے، مگر ظاہری صورت اور تفصیل بیان کے اِعتبار سے اس سے کچھ مختلف بھی ہے، اس لئے بار بار تاکیدات کے ساتھ بتلادیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ دیں اس کو بھی خداتعالیٰ ہی کی اِطاعت سمجھ کر مانو، خواہ وہ قرآن میں صراحتہً موجود ہو یا نہ ہو، یہ مسئلہ چونکہ اہم تھا اور کسی ناواقف کو دھوکا لگ جانے کے علاوہ دُشمنانِ اسلام کے لئے اسلامی اُصول میں گڑبڑ پھیلانے اور مسلمانوں کو اِسلام کے صحیح راستہ سے بہکانے کا بھی ایک موقع تھا، اس لئے قرآنِ کریم نے اس مضمون کو صرف لفظِ اِطاعتِ رسول کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ مختلف عنوانات سے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بتلایا ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں تعلیمِ کتاب کے ساتھ تعلیمِ حکمت کا اِضافہ کرکے اس طرف اِشارہ کردیا کہ علاوہ کتاب کے کچھ اور بھی آپ کی تعلیمات میں داخل ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے، جس کو لفظ ''حکمت'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ کہیں اِرشاد فرمایا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل:۴۴) یعنی ''رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے آپ پر نازل شدہ آیات کے مطالب ومقاصد اور تشریحات کو بیان فرمائیں۔''

اور کہیں یہ اِرشاد ہے کہ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷) یعنی ''رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لو، اور جس سے روکیں اس سے باز آجاؤ۔'' یہ سب اِنتظام اس کا کیا گیا کہ کل کو کوئی شخص یہ نہ کہنے لگے کہ ہم تو صرف اُن اَحکام کے مکلّف ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، جو اَحکام ہمیں قرآن میں نہ ملیں اُن کے ہم مکلّف نہیں،

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو رسول کی تعلیمات اور تشریحات سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لئے یہی دعویٰ کریں گے کہ ہمیں کتابُ اللہ کافی ہے، اس لئے ایک حدیث میں صراحۃً بھی اس کا ذِکر فرمایا، جس کو ترمذی، ابوداوٗد، ابنِ ماجہ، بیہقی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی اپنی کتابوں میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:-

لَا اَلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَاْتِيْهِ الْاَمْرُ مِنْ اَمْرِيْ مِمَّا اَمَرْتُ بِهٖ اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِيْ مَا وَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِتَّبَعْنَاهُ۔ [1]

"یعنی ایسا نہ ہو کہ میں تم سے کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے ہوئے بےفکری سے بیٹھے ہوئے میرے امر و نہی کے متعلق یہ کہہ دے کہ ہم اس کو نہیں جانتے، ہمارے لئے تو کتابُ اللہ کافی ہے، جو کچھ اس میں پاتے ہیں اس کا اِتباع کر لیتے ہیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کے ساتھ جگہ جگہ رسول کی اِطاعت کا بار بار اِرشاد اور پھر مختلف عنوانات سے رسول کے دیئے ہوئے اَحکام کو ماننے کی ہدایات یہ سب اسی خطرے کے پیشِ نظر ہیں کہ کوئی شخص ذخیرۂ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفصیلاتِ اَحکام کو قرآن سے الگ اور اِطاعتِ خدا تعالیٰ سے جدا سمجھ کر اِنکار نہ کر بیٹھے، کہ وہ درحقیقت الگ نہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود [2]

دُوسری آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مسارعت کا حکم دیا گیا ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اِطاعت کے بعد یہ دُوسرا حکم دیا گیا، یہاں مغفرت سے مراد اسبابِ مغفرت ہیں، یعنی وہ اعمالِ صالحہ جو باعثِ مغفرتِ اِلٰہی ہیں، صحابہؓ و تابعینؒ سے اس کی تفسیریں مختلف عنوانات سے منقول ہیں، مگر معنون اور مضمون سب کا ایک ہی ہے، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے اس کی تفسیر "ادائیگی فرائض" سے فرمائی، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے "اسلام" سے، ابوالعالیہؒ نے "ہجرت" سے، انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے "تکبیرِ اُولیٰ" سے، سعید بن جبیرؒ نے "ادائے طاعت" سے، ضحاکؒ نے "جہاد" سے، عکرمہؒ نے "توبہ" سے کی ہے، ان تمام اقوال کا حاصل یہی ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمالِ صالحہ ہیں جو

---

[1] جامع الترمذی، ابواب العلم، باب ما نهی عنه ان یقال إلخ ج:۲ ص:۹۵ وسنن ابی داوٗد، کتاب السُّنَّة، باب لزوم السُّنَّة ج:۲ ص:۶۳۵، وابن ماجة مقدمة باب تعظیم حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم ج:۱ ص:۳، والسُّنن الکبریٰ للبیهقی ج:۷ ص:۷۶ ومسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۷۴۱ حدیث ابی رافع۔

[2] ترجمہ:- اس کا کہا ہوا اللہ کا کہا ہوا ہے، اگرچہ اللہ کے بندے کے حلق سے ادا ہوا ہے۔

مغفرتِ الٰہی کا باعث اور سبب ہوتے ہیں۔

اس مقام پر دو باتیں قابلِ غور ہیں، پہلی بات تو یہ ہے اس آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مسارعت کا حکم دیا جار ہا ہے، حالانکہ دُوسری آیت میں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النساء: ۳۲) فرما کر دُوسرے فضائل حاصل کرنے کی تمنا کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں، ایک فضائل تو وہ ہیں جن کا حاصل کرنا اِنسان کے اِختیار اور بس سے باہر ہو، جن کو فضائل غیر اختیاریہ کہتے ہیں، جیسے کسی کا سفید رنگ یا حسین ہونا یا کسی بزرگ خاندان سے ہونا وغیرہ، دُوسرے وہ فضائل جن کو اِنسان اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کرسکتا ہے، ان کو فضائل اختیاریہ کہتے ہیں، فضائل غیر اختیاریہ میں دُوسرے کی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش بلکہ اس کی تمنا کرنے سے بھی اس لئے روکا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق مخلوق میں تقسیم کئے ہیں، کسی کی کوشش کا اس میں دخل نہیں، اس لئے وہ فضائل جو کوشش اور تمنا سے حاصل تو ہوں گے نہیں، اب سوائے اس کے کہ اس کے دِل میں حسد اور بغض کی آگ بھڑکتی رہے اور کوئی فائدہ نہیں، مثلاً ایک شخص کالا ہے وہ گورا ہونے کی تمنا کرتا رہے تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا، البتہ جو فضائل اختیاریہ ہیں ان میں مسابقت اور مقابلہ کا حکم دیا گیا، صرف ایک آیت میں نہیں، بلکہ متعدّد آیتوں میں آیا ہے، ایک جگہ اِرشاد ہے: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (البقرۃ: ۱۴۸) دُوسری جگہ اِرشاد ہے: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ (المطففین)

ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر کسی اِنسان میں کوئی فطری اور طبعی کوتاہی ہو جس کا دُور ہونا اس کے بس سے باہر ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنی اس کوتاہی پر قانع رہ کر دُوسروں کے کمال کو دیکھے بغیر اپنا کام کرتا رہے، کیونکہ اگر وہ اپنی کوتاہی پر تأسف اور دُوسروں کے کمال پر حسد کرتا رہا تو جتنا کام کرسکتا ہے اس قدر بھی نہیں کرسکے گا، اور بالکل ناکارہ ہوکر رہ جائے گا۔

دُوسری چیز جو اس جگہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت کو جنت سے مقدم کیا، اس میں ممکن ہے کہ اس اَمر کی طرف اِشارہ ہو کہ جنت حاصل کرلینا مغفرتِ الٰہی کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ اِنسان اگر تمام عمر بھی نیکیاں کرتا رہے اور معصیت سے کنارہ کش رہے تب بھی اس کے تمام اعمال جنت کی قیمت نہیں ہوسکتے، جنت میں لے جانے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ مغفرتِ باری تعالیٰ ہے اور اس کا فضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا فَإِنَّهٗ لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا الْجَنَّةَ عَمَلُهٗ، قَالُوْا: وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَلَا اَنَا إِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ۔ (ترغیب وترہیب بحوالہ بخاری ومسلم) [1]

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة فی العمل ج:۲ ص:۹۵۷، وصحیح مسلم باب لن یدخل احد الجنة إلخ ج:۲ ص:۳۷۶ والترغیب والترهیب رقم الحدیث: ۳۱۷۴ الترغیب فی التوبة۔

''راستی اور حق کو اختیار کرو، درمیانی راہ اختیار کرو اور (اللہ کے فضل) کی بشارت حاصل کرو، کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچائے گا۔ لوگوں نے کہا: نہ آپ کا یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: نہ میرا عمل جنت میں پہنچائے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔''

حاصل یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں، لیکن عادۃ اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو اعمالِ صالحہ کرتا ہے، بلکہ جس کو اعمالِ صالحہ کی توفیق ہوگی، وہی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہیں، لہٰذا اعمال کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرنا چاہئے، معلوم ہوا کہ دُخولِ جنت کا اصلی باعث اور سبب مغفرتِ الٰہی ہے، اسی لئے مغفرت کی اہمیت کے پیشِ نظر مطلق مغفرت نہیں فرمایا گیا بلکہ مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فرمایا گیا، صفتِ رُبوبیت کے بیان کرنے میں مزید لطف اور اِمتنان کا اِظہار مقصود ہے۔

دُوسری چیز جس کی طرف دوڑنے کا حکم دیا جارہا ہے وہ جنت ہے، اور جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی وسعت اس قدر ہے جتنا سارا آسمان وزمین ہے، انسان کے دِماغ میں آسمان وزمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت آ ہی نہیں سکتی، اس لئے سمجھانے کے لئے جنت کے عرض کو اس سے تشبیہ دی، گویا بتلادیا کہ جنت بہت وسیع ہے اس کے عرض میں سارے زمین وآسمان سما سکتے ہیں، پھر جب اس کے عرض کا یہ حال ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا ہوگا، یہ معنی تو اس وقت ہیں جب عرض کو طول کے مقابل لیا جائے، لیکن اگر عرض کو ثمن یعنی قیمت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنت کوئی معمولی شے نہیں ہے، اس کی قیمت سارا آسمان وزمین ہیں، لہٰذا ایسی قیمتی اور عظیم الشان چیز کے لئے مسابقت اور مسارعت کرو۔

تفسیر کبیر میں ہے:-

قَالَ اَبُوْ مُسْلِمٍ اِنَّ الْعَرْضَ هُنَا مَا يُعْرَضُ مِنَ الثَّمَنِ فِیْ مُقَابَلَةِ الْمَبِيْعِ اَیْ ثَمَنُهَا لَوْ بِيْعَتْ كَثَمَنِ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالْمُرَادُ بِذَالِكَ عَظْمُ مِقْدَارِهَا وَجَلَالَةُ خَطْرِهَا وَاِنَّهٗ لَا يُسَاوِيْهَا شَیْءٌ وَّاِنْ عَظُمَ۔[1]

''ابو مسلم کہتے ہیں کہ عرض سے مراد آیت میں وہ چیز ہے جو مبیع کے مقابلے میں بطورِ قیمت پیش کی جائے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض جنت کی قیمت لگائی جائے تو سارا آسمان وزمین اور ان کی کائنات اس کی قیمت ہوگی، مقصود اس سے جنت کی عظمت اور جلالتِ قدر کا بیان کرنا ہے۔''

جنت کا دُوسرا وصف بتلایا: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ یعنی جنت پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، اس سے یہ بھی

---

۱ التفسیر الکبیر تحت ھٰذہ الآیة ج:۴ ص:۳۸۶

معلوم ہوا کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے، قرآن و حدیث کے واضح اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اُوپر ہے، اس طرح کہ ساتواں آسمان اس کی زمین ہے۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ

جو خرچ کئے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں

عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ۚ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً

لوگوں کو، اور اللہ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔ اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ

اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۗ وَمَنْ

یا بُرا کام کریں اپنے حق میں تو یاد کریں اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی، اور کون ہے

يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ۗ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

گناہ بخشنے والا سوا اللہ کے، اور اڑتے نہیں اپنے کئے پر اور وہ جانتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

انہی کی جزا ہے بخشش اُن کے ربّ کی اور باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ؕ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ

ہمیشہ رہیں گے وہ لوگ ان باغوں میں، اور کیا خوب مزدوری ہے کام کرنے والوں کی۔ ہو چکے ہیں تم سے پہلے واقعات

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ

سو پھرو زمین میں اور دیکھو کہ کیا ہوا انجام جھٹلانے والوں کا۔ یہ بیان ہے

لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو خوشحالی میں بھی اور بدحالی میں بھی (اللہ کے لئے) مال خرچ کرتے ہیں، اور جو غصّے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کردینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۳۴﴾ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بھی بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گزرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ــــ اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کی معافی دے؟ ــــ اور یہ اپنے کئے پر جانتے بوجھتے اِصرار نہیں کرتے ﴿۱۳۵﴾ یہ ہیں وہ لوگ جن کا صلہ ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت ہے، اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے، جن میں انہیں دائمی زندگی حاصل ہوگی۔ کتنا بہترین بدلہ ہے جو کام کرنے والوں کو ملنا ہے! ﴿۱۳۶﴾ تم سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔ اب تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جنہوں نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا ان کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۱۳۷﴾ یہ تمام لوگوں کے لئے واضح اعلان ہے اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور نصیحت! ﴿۱۳۸﴾

خلاصۂ تفسیر

ایسے لوگ (ہیں) جو کہ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں (ہر حال میں) فراغت میں (بھی) اور تنگی میں (بھی) اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نکوکاروں کو (جن میں یہ خصال ہوں بوجہ اکمل) محبوب رکھتا ہے۔ اور (ایک ان مذکورین کے اِعتبار سے دُوسرے درجے کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں (دُوسروں پر) زیادتی ہو یا (کوئی گناہ کرکے خاص) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ (کی عظمت اور عذاب) کو یاد کرلیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، (یعنی اس طریقہ سے جو معافی کے لئے مقرّر ہے کہ دُوسروں پر زیادتی کرنے میں ان اہلِ حقوق سے بھی معاف کرائے اور خاص اپنی ذات کے متعلق گناہ میں اس کی حاجت نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرانا دونوں میں مشترک ہے) اور (واقعی) اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو (رہا اہلِ حقوق کا معاف کرنا سو وہ لوگ اس کا اِختیار تو نہیں رکھتے کہ عذاب سے بھی بچالیں اور حقیقی بخشش اسی کا نام ہے) اور وہ لوگ اپنے فعل (بد) پر اِصرار (اور ہٹ) نہیں کرتے اور وہ (ان باتوں

کو) جانتے بھی ہیں (فلاں کام ہم نے گناہ کا کیا اور یہ کہ توبہ ضرور ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ غفار ہے، مطلب یہ کہ اعمال کی بھی دُرستی کر لیتے ہیں اور عقائد بھی دُرست رکھتے ہیں) ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رَبّ کی طرف سے، اور (بہشت کے) ایسے باغ ہیں کہ ان کے (درختوں اور مکانوں کے) نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (اور اسی مغفرت اور جنت کی تحصیل کا شروع آیتوں میں حکم تھا، بیچ میں اس کا طریقہ بتلایا، ختم پر اس کا وعدہ فرمایا) اور (یہ) اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا (وہ کام اِستغفار اور حسنِ اِعتقاد ہے، اور اِستغفار کا نتیجہ آئندہ اِطاعت کی پابندی ہے، جس پر عدمِ اِصرار دلالت کرتا ہے) بالتحقیق تم سے قبل (زمانوں میں) مختلف طرق (کے لوگ) گزر چکے ہیں (ان میں مسلمان بھی تھے اور کفار بھی، اور ان میں اِختلاف ومقابلہ ومقاتلہ بھی ہوا، لیکن انجامِ کار کفار ہی ہلاک ہوئے، چنانچہ اگر تم آثار کا مشاہدہ کرنا چاہو) تو تم رُوئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھ لو کہ اخیر انجام تکذیب کرنے والوں کا (یعنی کفار کا) کیسا ہوا (یعنی ہلاک وبرباد ہوئے، چنانچہ ان کی ہلاکت کے آثار اس وقت تک بھی باقی تھے، جس کو دُوسری آیت میں فرمایا: فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً اِلخ (النمل:۵۲)، فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ اِلخ (القصص:۵۸)، وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾ (الحجر)) یہ (مضمون مذکور) بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے (کہ اگر اس میں غور کریں تو عبرت حاصل کر سکتے ہیں) اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لئے (یعنی ہدایت اور نصیحت بھی یہی لوگ حاصل کرتے ہیں، ہدایت یہ کہ اس کے موافق عمل کریں)۔

معارف ومسائل

ان آیات میں حق تعالیٰ نے مؤمنینِ متقین کی خاص صفات اور علامات بتلائی ہیں، جن سے بہت سے فوائد متعلق ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآنِ حکیم نے جگہ جگہ نیک بندوں کی صحبت اور ان کی تعلیم سے فائدہ اُٹھانے کی تاکید فرمائی ہے، کہیں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ فرما کر دِین کی سیدھی اور صحیح راہ انہی مقبول بندوں سے سیکھنے کی طرف اشارہ فرمایا، کہیں وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (التوبۃ) فرما کر ان کی صحبت اور معیت کی خاص افادیت کی تلقین فرمائی، اور دُنیا میں ہر گروہ کے اندر اچھے بُرے لوگ ہوا کرتے ہیں، اچھوں کے لباس میں بُرے بھی ان کی جگہ لے لیتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ مقبول بندوں کی خاص علامات وصفات بتلا کر یہ سمجھا دیا جائے کہ لوگ غلط رہنماؤں اور مقتداؤں سے پرہیز کریں، اور صادقین کی علامتیں پہچان کر ان کا اِتباع کریں، مؤمنینِ متقین کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد اُن کی دائمی کامیابی اور جنت کے اعلیٰ مقامات بتلا کر نیک بندوں کو خوشخبری اور بُری راہوں پر چلنے والوں کے لئے نصیحت وترغیب کا راستہ کھولا گیا ہے، ان آیات کے اخیر میں هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ میں اسی کی طرف اِشارہ ہے، مقبولین کی جو صفات

وعلامات یہاں ذِکر کی گئی ہیں، اِس میں اِبتدائی آیات میں ان صفات کا بیان ہے جن کا تعلق اِنسانی حقوق اور باہمی معاشرت سے ہے، اور بعد کی آیات میں وہ صفات ہیں جن کا تعلق حق تعالیٰ کی عبادت وطاعت سے ہے، جن کو دُوسرے لفظوں میں حقوق العباد اور حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا آیات میں حقوقِ اِنسانی سے متعلقہ صفات کو پہلے اور حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کو بعد میں بیان فرما کر اس طرف اِشارہ فرمایا کہ اگرچہ اصل کے اِعتبار سے حقوق اللہ سارے حقوق پر مقدم ہیں، لیکن دونوں میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے حقوق بندوں پر لازم کئے ہیں اُن سے نہ خدا تعالیٰ کا اپنا کوئی فائدہ متعلق ہے، نہ خدائے تعالیٰ کو ان کی حاجت ہے، اور نہ اُن کے ادا نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہے، اُس کی ذات سب سے بے نیاز ہے، اس کی عبادت سے فائدہ خود عبادت کرنے والے کا ہے، پھر وہ رحیم الرحماء اور کریم الکرماء بھی ہے، اس کے حقوق میں بڑی سے بڑی کوتاہی اور غلطی کرنے والا اِنسان جس وقت بھی اپنے کئے ہوئے پر نادِم ہوکر اس کی طرف متوجہ ہوجائے اور توبہ کرلے تو بارگاہِ رحم وکرم سے اس کے سارے گناہ ایک دَم میں معاف ہوسکتے ہیں، بخلاف حقوق العباد کے کہ اِنسان ان کا محتاج ہے، اور جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ لازم ہیں اگر وہ ادا نہ کرے تو اس کا نقصان بھی ہے اور اپنے نقصان کو معاف کرنا بھی اِنسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے حقوق العباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ نظامِ عالم کی دُرستی اور اِنسانی معاشرے کی اِصلاح کا سب سے بڑا دارومدار باہمی حقوق کی ادائیگی پر ہے، اس میں ذرا سی کوتاہی جنگ وجدال اور فساد کی راہیں کھول دیتی ہے، اور اَخلاقِ فاضلہ اگر پیدا کرلئے جائیں تو دُشمن بھی دوست بن جاتے ہیں، صدیوں کی لڑائیاں صلح وآشتی میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اس لئے بھی ان صفات وعلامات کو مقدم کیا گیا جن کا تعلق اِنسانی حقوق سے ہے، ان صفات میں سب سے پہلی صفت یہ بتلائی گئی ہے:-

اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ یعنی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کے ایسے عادی اور خوگر ہیں کہ ان پر فراخی ہو یا تنگی ہر حال میں مقدور بھر خرچ کرتے رہتے ہیں، زیادہ میں سے زیادہ اور کم میں سے کم، اس میں ایک طرف تو یہ ہدایت ہے کہ غریب فقیر آدمی بھی اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بالکل فارغ نہ سمجھیں، اور اس کی راہ میں خرچ کرنے کی سعادت سے محروم نہ ہوں، کیونکہ ہزار روپے میں سے ایک روپیہ خرچ کرنے کا جو درجہ ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہزار پیسے میں سے ایک پیسہ خرچ کرنے کا بھی ہے، اور عملی طور پر جس طرح ہزار روپے کے مالک کو ایک روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کردینا کچھ مشکل نہیں اسی طرح ہزار پیسوں کے مالک کو ایک پیسہ خرچ کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی۔

دُوسری طرف یہ ہدایت بھی ہے کہ تنگی کی حالت میں بھی بقدرِ حیثیت خرچ کرتے رہنے سے خرچ کرنے کی مبارک خصلت وعادت فنا نہیں ہوگی، اور شاید اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے فراغت اور فراخی بھی عطا فرما دیں۔

تیسری اہم چیز اس میں یہ ہے کہ جو شخص اس کا خوگر ہو کہ دُوسرے اِنسانوں پر اپنا مال خرچ کر کے ان کو فائدہ پہنچا سکے، غریبوں، فقیروں کی اِمداد کرے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی دُوسروں کے حقوق غصب کرنے اور ان کی مرضی کے خلاف ہضم کرنے کے پاس بھی نہ جائے گا، اس لئے اس پہلی صفت کا حاصل یہ ہوا کہ مؤمنینِ متقین اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے دُوسرے اِنسانوں کو نفع پہنچانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں، خواہ ان پر فراخی ہو یا تنگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک وقت صرف ایک انگور کا دانہ خیرات میں دیا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا۔[1] بعض سلف سے منقول ہے کہ کسی وقت انہوں نے صرف ایک پیاز کا صدقہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَرُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفٍ شَاةٍ۔[2]

''یعنی تم جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا صدقے میں دے کر ہی ہو، اور سائل کو خالی واپس نہ کرو، اور کچھ نہ ہو تو بکری کے پاؤں کی کھری ہی دے دو۔''

تفسیر کبیر میں اِمام رازیؒ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی، تو جن کے پاس سونا چاندی تھا انہوں نے وہ صدقے میں دے دیا، ایک شخص کھجور کے چھلکے لایا کہ میرے پاس اور کچھ نہیں، وہ ہی صدقہ کر دیئے گئے، ایک اور شخص آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے پاس کوئی چیز صدقہ کرنے کے لئے نہیں ہے، البتہ میں اپنی قوم میں عزّت دار سمجھا جاتا ہوں، میں اپنی عزّت کی خیرات کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی آدمی مجھے کتنا ہی بُرا بھلا کہے میں اس سے ناراض نہیں ہوں گا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اِنفاق فی سبیل اللہ صرف مال داروں اور اَغنیاء ہی کا حصہ نہیں ہے، غریب، فقیر بھی اس صفت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ اپنی اپنی مقدرت کے موافق اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے اس عظیم صفت کو حاصل کر لیں۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کے لئے ضروری نہیں کہ مال ہی خرچ کیا جائے

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے اس جگہ یُنْفِقُوْنَ کا تو ذِکر فرمایا کہ وہ لوگ تنگی اور فراخی ہر حال میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں، یہ متعین نہیں فرمایا کہ کیا خرچ کرتے ہیں، اس کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں

[1] التفسیر الکبیر تحت الآیة فمن یعمل مثقال ذرة الآیة ج:۱۷ ص:۱۶۴

[2] صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب اتقوا النار إلخ ج:۱ ص:۱۹۰ ومسند احمد، حدیث ام بجید رضی اللہ عنہا رقم الحدیث:۲۵۹۰۰

صرف مال ودولت ہی نہیں بلکہ ہر خرچ کرنے کی چیز داخل ہے، مثلاً جو شخص اپنا وقت، اپنی محنت اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ بھی اس اِنفاق کی صفت سے موصوف کیا جائے گا، جو حدیث بحوالہ تفسیر کبیر اُوپر گزری ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

تنگی اور فراخی کے ذِکر میں ایک اور حکمت

یہ بھی ہے کہ یہی وہ حالتیں ہیں جن میں عادۃً اِنسان خدا کو بھولتا ہے، جب مال ودولت کی فراوانی ہو تو عیش میں خدا کو بھول جاتا ہے، اور جب تنگی اور مصیبت ہو تو بسا اوقات اسی کی فکر میں رہ کر خدا سے غافل ہوجاتا ہے، اس آیت میں اس طرف بھی اِشارہ کردیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو نہ عیش میں خدا کو بھولتے ہیں نہ مصیبت وتکلیف میں، ظفر شاہ دہلوی کا کلام اس معنی میں خوب ہے ؎

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے گا خواہ ہو کتنا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اس کے بعد ان کی ایک خاص صفت اور علامت یہ بتلائی گئی کہ اگر ان کو کسی ایسے شخص سے سابقہ پڑے جو اُن کو اَذیت اور تکلیف پہنچائے، تو وہ غصہ میں مشتعل اور مغلوب نہیں ہوجاتے، اور غصہ کے مقتضی پر عمل کرکے اِنتقام نہیں لیتے، پھر صرف یہی نہیں کہ اِنتقام نہ لیں، بلکہ دِل سے بھی معاف کردیتے ہیں، اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ تکلیف دینے والے کے ساتھ اِحسان کا معاملہ فرماتے ہیں، اسی ایک صفت میں گویا تین صفتیں شامل ہیں، اپنے غصہ پر قابو پانا، تکلیف دینے والے کو معاف کرنا، پھر اس کے ساتھ اِحسان کا سلوک کرنا، ان تینوں چیزوں کو اس آیت میں بیان فرمایا:-

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣٤﴾ۚ

''یعنی وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبالیتے ہیں اور لوگوں کا قصور معاف کردیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اِحسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اِمام بیہقیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت سیّدنا علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کا ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ آپ کی ایک کنیز آپ کو وضو کرارہی تھی کہ اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کے اُوپر گرا، تمام کپڑے بھیگ گئے، غصہ آنا طبعی اَمر تھا، کنیز کو خطرہ ہوا، تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ یہ سنتے ہی خاندانِ نبوّت کے اس بزرگ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، بالکل خاموش ہوگئے، اس کے بعد کنیز نے آیت کا دُوسرا جملہ

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ' پڑھ دیا، تو فرمایا کہ میں نے تجھے دِل سے بھی معاف کر دیا، کنیز بھی ہوشیار تھی، اس کے بعد اس نے تیسرا جملہ بھی سنا دیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ جس میں اِحسان اور حسنِ سلوک کی ہدایت ہے، حضرت علی ابن حسین رضی اللہ عنہما نے یہ سن کر فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ (رُوح المعانی بحوالہ بیہقی)[1]

لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کر دینا اِنسانی اَخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے، اور اس کا ثوابِ آخرت نہایت اعلیٰ ہے، حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ ''قیامت کے روز حق تعالیٰ کی طرف سے منادی ہوگی کہ جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق ہے وہ کھڑا ہو جائے، تو اس وقت وہ لوگ کھڑے ہوں گے جنہوں نے لوگوں کے ظلم و جور کو دُنیا میں معاف کیا ہوگا۔''

ایک حدیث میں اِرشاد ہے:-

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّشْرَفَ لَهُ الْبُنْيَانُ وَتُرْفَعَ لَهُ الدَّرَجَاتُ فَلْيَعْفُ عَنْ مَّنْ ظَلَمَهٗ وَيُعْطِ مَنْ حَرَمَهٗ وَيَصِلْ مَنْ قَطَعَهٗ۔[2]

''جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اُونچے ہوں اور اس کے درجات بلند ہوں اس کو چاہئے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس کو معاف کر دے، اور جس نے اس کو کبھی کچھ نہ دیا ہو اس کو بخشش و ہدیہ دیا کرے، اور جس نے اس سے ترکِ تعلقات کیا ہو یہ اس سے ملنے میں پرہیز نہ کرے۔''

قرآنِ کریم نے دُوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت سے بُرائی کرنے والوں کے ساتھ اِحسان کرنے کا خلقِ عظیم سکھلایا، اور یہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعے دُشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں، اِرشاد فرمایا:-

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ (حٰمٓ السجدة)

''یعنی بُرائی کی مدافعت بھلائی اور اِحسان کے ساتھ کرو، تو جس کے ساتھ دُشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن جائے گا۔''

حق تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تربیت بھی اسی اعلیٰ پیمانے پر فرمائی ہے کہ آپ نے اپنی اُمت کو بھی یہ ہدایت دی کہ:-

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَآءَ اِلَيْكَ۔[3]

---

[1] شعب الإيمان للبيهقي رقم الحديث:۸۰۸۲، باب في حسن الخلق فصل في ترك الغضب إلخ۔

[2] المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۵۳۵ ج:۱ ص:۲۲۴

[3] الترغيب والترهيب باب الترغيب في الأمر بالمعروف إلخ رقم الحديث:۲۴۶۷

''یعنی جو شخص آپ سے قطع تعلق کرے آپ اُن سے ملیں، اور جو آپ پر ظلم کرے آپ اُس کو معاف کریں، اور جو آپ کے ساتھ بُرائی کرے آپ اُس پر اِحسان کریں۔''

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے، آپ کی تعلیمات کی برکت سے یہی اخلاق واوصاف آپ کے خدام میں بھی حق تعالیٰ نے پیدا فرمادیئے تھے، جو اِسلامی معاشرے کا طرۂ اِمتیاز ہے، صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اور اَسلافِ اُمت کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔

اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھرے بازار میں اِمامِ اعظمؒ کی شان میں گستاخی کی اور گالیاں دیں، حضرت اِمامِ اعظمؒ نے غصہ کو ضبط فرمایا، اور اس کو کچھ نہیں کہا، اور گھر پر واپس آنے کے بعد ایک خوان میں کافی دِرہم ودِینار رکھ کر اس شخص کے گھر تشریف لے گئے، دروازے پر دستک دی، یہ شخص باہر آیا تو اَشرفیوں کا یہ خوان اس کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش فرمایا کہ آج تم نے مجھ پر بڑا اِحسان کیا، اپنی نیکیاں مجھے دے دیں، میں اس اِحسان کا بدلہ کرنے کے لئے یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں۔ اِمامؒ کے اس معاملے کا اس کے قلب پر اثر ہونا ہی تھا، آئندہ کو اس بُری خصلت سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوگیا، حضرتِ اِمامؒ سے معافی مانگی، اور آپ کی خدمت اور صحبت میں علم حاصل کرنے لگا یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں میں ایک بڑے عالم کی حیثیت اِختیار کرلی۔

یہاں تک ان اوصاف کا بیان تھا جو اِنسانی حقوق سے متعلق ہیں، اس کے بعد حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کا بیان اس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور کبھی بمقتضائے بشریت ان سے گناہ ہوجاتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر اِستغفار کرتے ہیں، اور آئندہ اس گناہ سے باز آنے کا اِرادہ پختہ کرلیتے ہیں، اِرشاد ہے:-

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵ جس میں ایک تو یہ ہدایت کی گئی کہ گناہوں میں مبتلا ہونا اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذِکر سے غفلت کے سبب ہوتا ہے، اس لئے جب کوئی گناہ سرزد ہو اللہ تعالیٰ کی یاد کو فوراً تازہ کرنا چاہئے، اور ذِکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔

دُوسری یہ ہدایت ہے کہ گناہوں کی معافی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک پچھلے گناہوں پر ندامت اور اس سے معافی مانگنا اور مغفرت کی دُعا کرنا، دُوسرے آئندہ کے لئے اس کے پاس نہ جانے کا عزمِ مکمل کرنا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآنِ کریم کے بتلائے ہوئے اخلاقِ فاضلہ نصیب فرمادے، اللّٰھم آمین۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور سست نہ ہو اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ

اگر پہنچا تم کو زخم تو پہنچ چکا ہے ان کو بھی زخم ایسا ہی، اور یہ دن

نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ

باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں، اور اس لئے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے اور کرے

مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ۙ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ

تم میں سے شہید، اور اللہ کو محبت نہیں ظلم کرنے والوں سے۔ اور اس واسطے کہ پاک صاف کرے اللہ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

ایمان والوں کو اور مٹا دیوے کافروں کو۔ کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہوجاؤ گے جنت میں

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ

اور تم تو آرزو کرتے تھے مرنے کی اس کی ملاقات سے پہلے سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو

ع ۱۴ ۵ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع

آنکھوں کے سامنے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) تم نہ تو کمزور پڑو، اور نہ غمگین رہو۔ اگر تم واقعی مؤمن رہو تو تم ہی سر بلند ہو گے۔ ﴿۱۳۹﴾ اگر تمہیں ایک زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی اسی جیسا زخم پہلے لگ چکا ہے۔ یہ تو آتے جاتے دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، اور مقصد یہ تھا کہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے، اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید قرار دے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ﴿۱۴۰﴾ اور مقصد یہ (بھی) تھا کہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے نکھار کر رکھ دے اور کافروں کو ملیا میٹ کر ڈالے ﴿۱۴۱﴾ بھلا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (یونہی) جنت کے اندر جا پہنچو گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانچ کر نہیں دیکھا جو جہاد کریں، اور نہ ان کو جانچ کر دیکھا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں ﴿۱۴۲﴾ اور تم تو خود موت کا سامنا کرنے سے پہلے (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اب تم نے کھلی آنکھوں اسے دیکھ لیا ہے ﴿۱۴۳﴾

ربطِ آیات

ان آیات میں پھر قصۂ اُحد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دینے کا مضمون ہے، کہ ہمیشہ سے یہی طریقِ الٰہی چلا آیا کہ انجامِ کار کفار ہی خائب و خاسر ہوتے ہیں، اگرچہ تم اس وقت اپنی بے عنوانی سے مغلوب ہو گئے، لیکن اگر اپنے مقتضیاتِ ایمان یعنی ثبات و تقویٰ پر قائم رہے تو اخیر میں کفار ہی مغلوب ہوں گے۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم (اگر اس وقت مغلوب ہو گئے تو کیا ہوا) ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور آخر تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے مؤمن رہے (یعنی اس کے مقتضیات پر ثابت رہے) اگر تم کو زخم (صدمہ) پہنچ جاوے (جیسا اُحد میں ہوا) تو (کوئی گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ اس میں چند حکمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ) اس قوم کو بھی (جو کہ تمہارے مقابل تھی یعنی کفار) ایسے ہی زخم (صدمہ) پہنچ چکا ہے (چنانچہ گزشتہ سال بدر میں وہ صدمہ اُٹھا چکے ہیں) اور (ہمارا معمول ہے کہ) ان اَیام کو (یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانے کو) لوگوں کے درمیان اَدلتے بدلتے رہتے ہیں (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب اور دُوسری کو مغلوب کر دیا، کبھی اس کا عکس کر دیا، سو اسی معمول کے مطابق پار سال وہ مغلوب ہوئے تھے، اب کے تم ہو گئے، ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (دُوسری حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر) جان لیویں (کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور نیک کا اِمتحان ہو جاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ ہے کہ) تم میں سے بعضوں کو شہید

بنانا تھا (بقیہ حکمتیں آگے آتی ہیں، درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ظلم (کفر و شرک) کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (پس اس کا احتمال نہ کیا جاوے کہ شاید ان کو محبوب ہونے کی وجہ سے غالب فرما دیا ہو، ہرگز نہیں) اور (چوتھی حکمت یہ ہے) تاکہ (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کردے ایمان والوں کو (کیونکہ مصیبت سے اَخلاق و اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (پانچویں حکمت یہ ہے کہ) مٹادیوے کافروں کو (یہ اس لئے کہ غالب آجانے سے ان کی ہمت بڑھے گی، پھر مقابلہ میں آئیں گے اور ہلاک ہوں گے، دُوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے قہرِ خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے) ہاں اور سنو! کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں (خصوصیت کے ساتھ) جا داخل ہوگے، حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے (خوب) جہاد کیا ہو اور جو جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہوں، اور تم تو (شہید ہو کر) مرنے کی (بڑی) تمنا کیا کرتے تھے، موت کے سامنے آنے سے پہلے سو (تمنا کے مطابق) اس (کے سامان) کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا (پھر اس کو دیکھ کر کیوں بھاگنے لگے اور وہ تمنا کہاں بھول گئے)۔

معارف ومسائل

غزوۂ اُحد کا واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ اسی سورت میں بیان کیا جاچکا ہے، جس میں یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ اس جہاد میں مسلمانوں کی بعض کوتاہیوں کے سبب ابتدائی فتح کے بعد پھر مسلمانوں کو شکست ہوئی، ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم آئے، مگر ان سب اُمور کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے جنگ کا پانسہ پلٹا اور دُشمن پسپا ہوگئے۔

اس عارضی شکست کے تین سبب تھے، پہلا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیراندازوں کو دیا تھا وہ بعض اسباب سے ان پر قائم نہ رہے، کیونکہ اس بارے میں اختلافِ رائے ہوگیا، کوئی کہتا تھا کہ ہم کو یہیں جمے رہنا چاہئے، اکثر نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، چل کر سب کے ساتھ غنیمت حاصل کرنے میں لگنا چاہئے، تو پہلا سبب آپس کا جھگڑا تھا، دُوسرا سبب یہ ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر مشہور ہوگئی تو مسلمانوں کے قلوب میں کمزوری پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ بزدلی اور کم ہمتی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تیسرا سبب جو ان دونوں سببوں سے زیادہ اہم تھا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اختلاف پیش آیا، یہ تین لغزشیں مسلمانوں سے ہوگئی تھیں، جن کی بنا پر ان کو عارضی شکست ہوئی، یہ عارضی شکست اگرچہ انجامِ کار فتح میں تبدیل ہوچکی تھی، لیکن مسلمان مجاہدین زخموں سے چور چور تھے، اُن کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے پڑی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اشقیاء نے مجروح کر دیا تھا، شدائد و یاس کا ہجوم تھا، اور اپنی ان لغزشوں کا بھی

شدید صدمہ تھا، اب یہاں دو چیزیں پیدا ہو چکی تھیں، ایک تو گزشتہ باتوں کا رنج وغم، دُوسری چیز جس کا خطرہ تھا وہ یہ کہ مسلمان آئندہ کے لئے کہیں کمزور نہ ہو جائیں، اور اَقوامِ عالم کی اِمامت کا جو فریضہ ان پر عائد ہے، اس میں ضعف نہ پیدا ہو جائے، اس لئے ان دونوں رخنوں کو بند کرنے کے لئے قرآنِ کریم کا یہ اِرشاد آیا:-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ یعنی "تم آئندہ کے لئے کمزوری اور سستی اپنے پاس نہ آنے دو، اور گزشتہ پر رنج وملال نہ کرو، اور اَنجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے، بشرطیکہ ایمان واِیقان کے راستہ پر مستقیم رہو، اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوئے اِطاعتِ رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔

مطلب یہ تھا کہ گزشتہ باتیں اور لغزشیں جو ہو چکی ہیں اُن پر رنج وغم میں اپنا وقت اور توانائی صَرف کرنے کے بجائے مستقبل میں اپنے کام کی دُرستی کی فکر کرو، اور اسے کامیاب بناؤ، اِیمان واِیقان، اِطاعتِ رسول درخشاں مستقبل کا ضامن ہے، ان کو ہاتھ سے نہ جانے دو، انجامِ کار تم ہی غالب رہو گے۔

اس قرآنی آواز نے ٹوٹے ہوئے دِلوں کو جوڑ دیا، اور پژمردہ جسموں میں تازہ رُوح پھونک دی۔ غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن حضرات کی کس طرح تربیت واِصلاح فرمائی اور ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ایک ضابطہ اور اُصول دے دیا، کہ گزشتہ فوت شدہ اُمور پر رنج وملال میں وقت صَرف کرنے کے بجائے آئندہ کے لئے قوّت وشوکت کے اسباب بہم پہنچانے چاہئیں، پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ غلبہ اور بلندی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی چیز اصل ہے یعنی اِیمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا، اِیمان کے تقاضہ میں وہ تیاریاں بھی داخل ہیں جو جنگ کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں، یعنی اپنی فوجی قوت کا اِستحکام، سامانِ جنگ کی بہم رسانی اور ظاہری اسباب سے بقدرِ وسعت آراستہ ومسلح ہونا، غزوۂ اُحد کے واقعات اوّل سے آخر تک ان تمام اُمور کے شاہد ہیں۔

اس آیت کے بعد ایک دُوسرے انداز میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے اِرشاد ہے کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اُٹھانی پڑی تو اسی طرح کے حوادث فریقِ مقابل کو بھی تو پیش آچکے ہیں، اگر اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے ان کے ستر آدمی جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں، اور خود اس لڑائی میں بھی اِبتداءً ان کے بہت سے آدمی مقتول ومجروح ہوئے، لہٰذا فرمایا:-

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ یعنی اگر تم کو زخم پہنچا تو ان کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے، اور ہم ان ایام کو باری باری بدلتے رہتے ہیں، جس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اس آیت میں ایک اہم ضابطہ اور اُصول کی طرف رہنمائی فرمائی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اس عالم میں یہی ہے کہ وہ سختی، نرمی، دُکھ، سکھ، تکلیف وراحت کے دِنوں کو لوگوں میں اَدَل بدَل کرتے ہیں، اگر کسی وجہ سے کسی باطل قوت کو

عارضی فتح وکامرانی حاصل ہوجائے تو جماعت حقہ کو اس سے بد دل نہیں ہونا چاہئے، اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم کو اب ہمیشہ شکست ہی ہوا کرے گی، بلکہ اس شکست کے اسباب کا پتہ لگا کر ان اسباب کا تدارک کرنا چاہئے، انجام کار فتح جماعت حقہ ہی کو نصیب ہوگی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ

اور محمد تو ایک رسول ہے، ہوچکے اس سے پہلے بہت رسول، پھر کیا اگر وہ مرگیا

اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ

یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے اُلٹے پاؤں؟ اور جو کوئی پھر جائے گا اُلٹے پاؤں تو ہرگز نہ بگاڑے گا

اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ

اللہ کا کچھ، اور اللہ ثواب دے گا شکرگزاروں کو۔ اور کوئی مر نہیں سکتا

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ

بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا ہے ایک وقتِ مقرر، اور جو کوئی چاہے گا بدلہ دُنیا کا دیویں گے ہم اس کو دُنیا ہی سے،

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور جو کوئی چاہے گا بدلہ آخرت میں، اس میں سے دیویں گے ہم اس کو، اور ہم ثواب دیں گے احسان ماننے والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ بھلا اگر ان کا اِنتقال ہوجائے یا انہیں قتل کردیا جائے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور جو شکر گزار بندے ہیں اللہ ان کو ثواب دے گا ﴿۱۴۴﴾ اور یہ کسی بھی شخص کے اِختیار میں نہیں ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے بغیر موت آجائے، جس کا ایک معین وقت پر آنا لکھا ہوا ہے۔ اور جو شخص دُنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اسے اس

کا حصہ دے دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا ہم اسے اس کا حصہ عطا کر دیں گے، اور جو لوگ شکر گزار ہیں ان کو ہم جلد ہی ان کا اجر عطا کریں گے۔ ﴿۱۴۵﴾

خلاصہ تفسیر

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں جس پر قتل یا موت ممکن نہ ہو) آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں (اسی طرح آپ بھی ایک روز گزر ہی جائیں گے) سو اگر آپ کا اِنتقال ہو جاوے یا آپ شہید ہو جاویں تو کیا تم لوگ (جہاد یا اِسلام سے) اُلٹے پھر جاؤ گے (جیسا کہ اس واقعہ میں بعض مسلمان میدانِ جنگ سے بھاگ پڑے تھے اور منافقین ترغیب اِرتداد کی دے رہے تھے) اور جو شخص (جہاد یا اِسلام سے) اُلٹا پھر جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا (بلکہ اپنا ہی کچھ کھو دے گا) اور خدا تعالیٰ جلد ہی (نیک) عوض دے گا حق شناس لوگوں کو (جو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے اِنعامات کو یاد رکھ کر اس کی اِطاعت پر قائم و مستقل رہتے ہیں، اور قیامت کو ملنا جلد ہی ملنا ہے، کیونکہ قیامت روزانہ قریب ہی ہو رہی ہے) اور (نیز کسی کے مرنے سے اتنا گھبرانا بھی فضول ہے کیونکہ اوّل تو) کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں (خواہ طبعاً خواہ عقلاً) بدون حکمِ خدا کے (پھر جب خدا کے حکم سے ہے تو اس پر راضی رہنا ضرور ہے، دُوسرے یہ کہ جس کی موت آتی بھی ہے تو) اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے (جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، تو پھر ارمان اور حسرت محض بیکار ہے، تو وہ وقت پر ضرور ہوگی، اور وقت سے پہلے ہرگز نہ ہوگی) اور (پھر یہ کہ اس توحش پر بھاگنے کا آخر نتیجہ کیا، بجز اس کے کہ دُنیا میں اور چند روز زِندہ رہیں، سو ایسی تدبیر کا اثر سن لو کہ) جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) دُنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دُنیا کا حصہ (بشرطِ اپنی مشیت کے) دے دیتے ہیں (اور آخرت میں اس کے لئے کچھ حصہ نہیں) اور جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) اُخروی نتیجہ چاہتا ہے (مثلاً جہاد میں اس لئے ثابت قدم رہا کہ یہ تدبیر ہے ثوابِ آخرت کی) تو ہم اس کو آخرت کا (حصہ اور ذمہ کر کے) دیں گے، اور بہت جلد (نیک) عوض دیں گے (ایسے) حق شناسوں کو (جو اپنے اعمال میں آخرت کی نعمت چاہیں)۔

معارف و مسائل

یہ آیات بھی غزوۂ اُحد کے واقعات سے متعلق ہیں، کیونکہ ان واقعات کو کئی وجوہ سے خاص اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۂ آلِ عمران کے چار پانچ رُکوع تک غزوۂ اُحد میں پیش آنے والی فتح و شکست اور ان دونوں میں جو قدرتی ہدایات پوشیدہ تھیں ان کا بیان مسلسل فرمایا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بعض صحابہ کرامؓ کی ایک لغزش پر تہدید آمیز تنبیہ کر کے ایک ایسے اُصولی مسئلے کی طرف ہدایت کی گئی ہے کہ سوچنے والوں کو اس سے یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس عارضی شکست اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پھیل جانے کی اور اس پر بعض صحابہؓ کی ہمت پست ہو جانے میں یہ راز بھی تھا کہ مسلمان اس اُصولی مسئلے پر عملی طور پر پختہ ہو جائیں، وہ مسئلہ یہ تھا کہ جہاں اُصولِ اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا گیا ہے، اس میں ادنیٰ کمزوری کو کفر کے مرادف بتلایا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی اتنی ہی اہم تھی کہ کہیں مسلمان اُس مرض کا شکار نہ ہو جائیں جس میں نصاریٰ اور عیسائی مبتلا ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کو پرستش اور عبادت کی حد تک پہنچا دیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریکِ خدائی ٹھہرالیا۔

غزوۂ اُحد کی عارضی شکست کے وقت جب کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو صحابہ کرامؓ پر جو کچھ گزری اور گزرنی چاہئے تھی اس کا ادنیٰ سا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتا ہے جس کو صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری اور عشقِ رسول کا کچھ اندازہ ہو، جس کو یہ پوری طرح معلوم ہو کہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مال، اولاد اور اپنی جانیں اور سب کچھ گنوا دینے کو دُنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھی اور عمل سے اس کا ثبوت دیا ہے۔

ان عشاقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی ہوگی ان کے ہوش وحواس کا کیا عالم ہوگا، خصوصاً جبکہ میدانِ جنگ گرم ہے، اور فتح کے بعد شکست کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے، مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں، اس عالم میں وہ ہستی جو ساری کوششوں کا محور اور ساری اُمیدوں کا مظہر تھی وہ بھی ان سے رُخصت ہوتی ہے، اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی ایک بھاری جماعت سراسیمہ ہو کر میدانِ جنگ سے ہٹنے لگی، یہ میدانِ جہاد سے ہٹ جانا اگرچہ ہنگامی اور سرسری اور وقتی سراسیمگی کا نتیجہ تھا، خدانخواستہ اسلام سے پھر جانے کا کوئی شبہ یا وسوسہ بھی نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو ایک ایسی پاکباز فرشتہ خصلت جماعت بنانا چاہتا ہے جو دُنیا کے لئے نمونۂ عمل بنے، اس لئے اُن کی ادنیٰ لغزش بھی سخت قرار دی گئی۔

نزدیکاں رابیش بود حیرانی [1]

ان کے میدانِ جنگ چھوڑنے پر ایسا خطاب کیا گیا جیسے اسلام چھوڑنے پر کیا جاتا ہے، اور سخت عتاب کے ساتھ اس بنیادی مسئلے پر تنبیہ کی گئی کہ دِین و عبادت اللہ کے لئے اور جہاد اسی کے لئے ہیں، جو ہمیشہ زندہ اور قائم ہے، اگر بالفرض

---

[1] ترجمہ:- قریب رہنے والوں کو پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔

یہ خبر صحیح بھی ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو بہر حال یہ تو ایک دِن ہونا ہی ہے، اس پر ہمت ہار بیٹھنا اور دِین کا کام چھوڑ دینا ان حضرات کے شایانِ شان نہیں، اس لئے اِرشاد فرمایا:-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ الآیۃ، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں) آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اگر آپ کی وفات ہو جائے یا آپ کو شہید کر دیا جائے تو کیا تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکر گزاروں کو۔

اس میں تنبیہ فرمادی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک نہ ایک دن اس دُنیا سے رُخصت ہونے والے ہیں، آپ کے بعد بھی مسلمانوں کو دِین پر ثابت قدم رہنا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس عارضی شکست کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجروح ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز تھا کہ آپ کے بعد جو حالات صحابہ کرامؓ پر پیش آسکتے تھے وہ آپ کی دُنیوی حیات ہی میں ظاہر کر دیئے گئے، تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اِصلاح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ہو جائے، اور آئندہ جب یہ واقعۂ وفات سچ مچ پیش آئے تو یہ عشاقِ رسول از جارفتہ نہ ہو جائیں، چنانچہ یہی ہوا آپ کی وفات کے وقت جب بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے ہوش و حواس بجا نہ تھے، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی آیاتِ قرآنیہ کی سند لے کر ان کو سمجھایا، اور وہ سب سنبھل گئے۔

اس کے بعد دُوسری آیت میں بھی حوادث اور مصائب کے وقت ثابت قدم رہنے کی تعلیم دینے کے لئے یہ اِرشاد فرمایا کہ ہر اِنسان کی موت اللہ تعالیٰ کے نزدیک لکھی ہوئی ہے، اس کی تاریخ، دِن اور وقت معین ہے، نہ اُس سے پہلے کسی کو موت آسکتی ہے، نہ اس کے بعد وہ زِندہ رہ سکتا ہے، پھر کسی کی موت سے ایسے سراسیمہ ہو جانے کے کوئی معنی نہیں۔

آخر میں اس پر تنبیہ فرمائی کہ اس حادثے کے ظاہری اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جن حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی جانب پہاڑی پر نگراں بنا کر بٹھایا تھا، اِبتدائی فتح کے وقت عام مسلمانوں کو مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول دیکھ کر ان میں بھی چند حضرات کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اب تو فتح ہوگئی، اس جگہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ رہی، پھر ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں کیوں حصہ نہ لیں؟ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے فرمایا:-

وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ؕ وَسَنَجۡزِي الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۴۵﴾ یعنی جو شخص اپنے عمل سے دُنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو دُنیا میں کچھ حصہ دے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو آخرت کا ثواب ملتا ہے، اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دیں گے۔

اس میں اِشارہ فرمایا کہ مالِ غنیمت جمع کرنے کی فکر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرّر کردہ کام کو چھوڑ بیٹھنے میں ان سے غلطی ہوئی، یاد رہے کہ حقیقت کے اِعتبار سے مالِ غنیمت جمع کرنا بھی نری دُنیا طلبی نہیں جو شرعاً مذموم ہے،

بلکہ مالِ غنیمت جمع کر کے محفوظ کرنا اور پھر اس کو اس کے مصرف میں صَرف کرنا یہ بھی ایک جزوِ جہاد ہے، اور عبادت ہی ہے، ان حضراتِ صحابہؓ کا اس میں شریک ہونا صرف طمعِ دُنیوی کی وجہ سے نہ تھا، کیونکہ شرعی ضابطہ سے اگر وہ اس مال کے جمع کرنے میں شریک نہ ہوتے جب بھی ان کو مالِ غنیمت میں وہ حصہ ملتا جو اَب ملا، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان حضرات نے طمعِ دُنیا کے لئے اپنے مقام کو چھوڑا، لیکن جیسا کہ پہلی آیت کی تفسیر میں بتلایا گیا ہے کہ بڑوں کی تھوڑی لغزش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے، ان کے معمولی جرم کو بڑا سخت جرم قرار دے کر عتاب وخطاب کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی ہے کہ مالِ غنیمت جمع کرنے میں کچھ نہ کچھ دُنیوی منفعت کا تعلق ضرور تھا، اور اس تعلق کا طبعی اثر قلوب میں ہونا بھی مستبعد نہ تھا، صحابہ کرامؓ کے معیارِ اَخلاق کو بلند سے بلند کرنے کے لئے ان کے اس عمل کو بھی اِرادۂ دُنیا سے تعبیر کر دیا کہ طمعِ دُنیا کا ادنیٰ غبار بھی اُن کے قلوب تک نہ جا سکے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ

اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خدا کے طالب، پھر نہ ہارے ہیں کچھ تکلیف پہنچنے سے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

اللہ کی راہ میں اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دَب گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا

اور کچھ نہیں بولے مگر یہی کہا: اے ربّ ہمارے! بخش ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمارے کام میں،

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ

اور ثابت رکھ قدم ہمارے اور مدد دے ہم کو قومِ کفار پر۔ پھر دِیا اللہ نے ان کو ثواب

الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

دُنیا کا اور خوب ثواب آخرت کا، اور اللہ محبت رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی! نتیجتاً انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہنچیں ان کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری، نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا۔ اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے (۱۴۶) ان کے منہ سے جو بات نکلی وہ اس کے سوا نہیں تھی کہ وہ کہہ رہے تھے: ''ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بھی اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہو اس کو بھی معاف فرمادے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرمادے'' (۱۴۷) چنانچہ اللہ نے انہیں دُنیا کا اِنعام بھی دیا اور آخرت کا بہترین ثواب بھی۔ اور اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے (۱۴۸)

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں غزوۂ اُحد میں پیش آنے والی بعض کوتاہیوں پر مسلمانوں کو تنبیہ اور ملامت تھی، ان آیات میں بھی اس کا تکملہ پچھلی اُمتوں کے بعض حالات و واقعات کی طرف اِشارہ کرکے کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح میدانِ جنگ میں ثابت قدم اِستقلال کے ساتھ رہے، تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

بعض لغات کی تشریح

رِبِّيُّوْنَ بکسر راء وتشدید باء مکسورہ وضم یاء، رَبّ کی طرف منسوب ہے، جیسے رَبَّانِیٌّ معنی ہیں رَبّ والے، اس میں حرف راء مفتوح کی بجائے مکسور خلافِ قیاس اِستعمال ہوا ہے (رُوح)۔ بعض حضرات نے رِبِّيُّوْنَ کے معنی بہت سی جماعتوں کے کئے ہیں، اُن کے نزدیک یہ رِبَّۃٌ بکسر راء بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے، رِبِّيُّوْنَ (اللہ والے) سے مراد یہاں کون لوگ ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اس سے مراد علماء وفقہاء ہیں۔ (رُوح المعانی) [1]

اسْتَكَانُوْا اِسْتَكَانَۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی دَب جانے اور عاجز ہوکر رُک جانے کے ہیں۔ (بیضاوی) [2]

وَهَنُوْا وَهْن سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ضعف و کمزوری۔

---

۱ روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۳۱

۲ تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۳۹۴

خلاصہ تفسیر

اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ بہت بہت اللہ والے (کفار کے ساتھ) لڑے ہیں، نہ انہوں نے ہمت ہاری ان مصائب کی وجہ سے جو اُن پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کے (قلب یا بدن) کا زور گھٹا اور نہ وہ (دُشمن کے سامنے) دبے (کہ ان سے عاجزی اور خوشامد کی باتیں کرنے لگیں) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے (اور افعال میں تو ان سے کیا لغزش ہوتی) اُن کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں کو حد سے آگے نکل جانے کو بخش دیجئے، اور ہم کو (کفار کے مقابلہ میں) ثابت قدم رکھئے، اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے تو (اس اِستقلال اور دُعا کی برکت سے) ان کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کا بدلہ بھی دیا (یعنی فتح وظفر) اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ دیا (یعنی رضا اور جنت) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکوکاروں سے محبت ہے۔

معارف ومسائل

آیاتِ مذکورہ میں سابق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جہاد میں شریک اللہ والوں کی جنگ میں ثابت قدمی اور مصائب وشدائد سے نہ گھبرانا نہ کمزور ہونا بیان فرمانے کے بعد ان کی ایک اور عظیم الشان صفت کا بیان بھی اس طرح فرمایا کہ وہ اپنی اس بے مثال قربانی کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چند دُعائیں کرتے رہے تھے:-

اوّل یہ کہ ہمارے پچھلے گناہ معاف فرمادے۔

دُوسرے یہ کہ حالیہ عملِ جہاد میں ہم سے جو کوتاہی ہوگئی ہو اس کو معاف فرمادے۔

تیسرے یہ کہ ہمیں ثابت قدمی پر قائم رکھے۔

چوتھے یہ کہ ہمیں دُشمنوں پر غالب کرے۔

ان دُعاؤں کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اہم ہدایات ہیں:-

اپنے کسی نیک عمل پر ناز نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ہر حال میں اللہ سے مغفرت اور عمل پر قائم رہنے کی دُعا کرتے رہنا چاہئے

اوّل یہ کہ حقیقت شناس مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جد وجہد اللہ کی راہ میں کر رہا ہو،

اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر ناز وفخر کرے، کیونکہ درحقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس کے بغیر کوئی نیک عمل ہو ہی نہیں سکتا، حدیث میں مذکور ہے:-

فَوَاللهِ لَوْ لَا اللهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا۔ [۱]

''یعنی اگر اللہ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو ہمیں نہ سیدھے راستے کی ہدایت ملتی اور نہ ہم سے زکوٰۃ ونماز ادا ہوسکتی۔''

اس کے علاوہ جو نیک عمل کوئی اِنسان کرتا ہے وہ کتنا ہی دُرست کر کے کرے لیکن مالک الملک والملکوت کی شانِ جلالی کے مطابق کرلینا اس کے بس میں نہیں، اس لئے اس کے ادائے حق میں کوتاہی ناگزیر ہے، اس سے حالتِ عمل میں بھی اِستغفار کی ضرورت ہے۔

نیز یہ بھی کسی کو اِطمینان نہیں ہوسکتا کہ جو نیک عمل وہ اس وقت کر رہا ہے آگے بھی اسے اس کی توفیق ہوگی، اس لئے موجودہ عمل میں کوتاہی پر ندامت اور آئندہ کے لئے اس پر قائم رہنے کی دُعا، مؤمن کا وظیفہ ہونا چاہئے۔

مذکورہ دُعاؤں میں سب سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دُنیا میں اِنسان کو جو رنج وغم یا کوئی تکلیف یا دُشمن کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے وہ اکثر اس کے سابقہ گناہوں کا اثر ہوتا ہے، جس کا علاج اِستغفار وتوبہ ہے، مولانا رُومیؒ نے فرمایا۔

غم چو بینی زود اِستغفار کن
غم بامرِ خالق آمد کارکن [۲]

آخری آیت میں اللہ والوں کو دُنیا وآخرت دونوں میں اچھا بدلہ دینے کا ذِکر ہے کہ دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انجام کار دُشمنوں پر غالب اور اپنے مقصد میں کامیاب فرماتے ہیں، پھر آخرت کا بدلہ تو اصل بدلہ اور دائمی راحت ہے، جس کو کبھی فنا نہیں، اس کی طرف اِشارہ کرنے کے لئے ثوابِ آخرت کے ساتھ لفظ ''حُسْن'' بڑھا دیا گیا، وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ

اے اِیمان والو! اگر تم کہا مانوگے کافروں کا تو وہ تم کو پھیر دیں گے اُلٹے پاؤں

[۱] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق الخ ج:۲ ص:۵۸۹

[۲] ترجمہ:- جونہی غم نظر آئے تو فوراً اِستغفار کرو، غم خالق کے حکم سے کام کرتا ہے۔

فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰٮكُمۡ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾

پھر جا پڑو گے تم نقصان میں۔ بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اگر تم ان کی بات مانو گے تو وہ تمہیں اُلٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا دیں گے، اور تم پلٹ کر سخت نقصان اُٹھاؤ گے ﴿۱۴۹﴾ (یہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں) بلکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے، اور وہ بہترین مددگار ہے ﴿۱۵۰﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی عارضی شکست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی افواہ گرم ہونے پر منافقین نے جب جنگ کا پانسہ پلٹتے ہوئے دیکھا تو شرارت کا موقع مل گیا، مسلمانوں سے کہنے لگے کہ جب آپ ہی نہ رہے تو ہم اپنا ہی دین کیوں نہ اختیار کرلیں، جس سے سارے جھگڑے مٹ جائیں۔ اس سے منافقین کی خباثت اور مسلمانوں کا بدخواہ دُشمن ہونا ظاہر ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان دُشمنوں کی بات پر کان نہ لگائیں، ان کو اپنے کسی مشورہ میں شریک نہ کریں، نہ ان کے کسی مشورہ کا اِتباع کریں، تو جیسے پچھلی آیات میں اللہ والوں کا اِتباع کرنے کی ہدایت تھی اس میں منافقین اور مخالفینِ اسلام کے مشورہ پر عمل نہ کرنے اور ان سے بچتے رہنے کی ہدایت ہے، خلاصۂ تفسیر یہ ہے:-

اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو (کفر کی طرف) اُلٹا پھیر دیں گے (مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو ان کے دِین سے ہٹانا اور بدگمان کرنا ہے، جس کو کبھی صراحۃً بھی کہہ دیتے ہیں، اور کبھی صاف نہیں کہتے، مگر انداز ایسا ڈالتے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان کے دِل سے اِسلام کی عظمت و محبت کم ہوتی چلی جائے) پھر تم (ہر طرح) ناکام ہو جاؤ گے (خلاصہ یہ کہ وہ تمہارے دوست ہرگز نہیں اگر اِظہارِ دوستی کا کریں) بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے (اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر اِعتماد کریں، اسی کی

مدد پر بھروسہ کریں، مخالفین اگر تمہاری نصرت و امداد کی کچھ تدبیریں بھی بتلائیں تو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ان پر عمل نہ کرو)۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ

اب ڈالیں گے ہم کافروں کے دِل میں ہیبت اس واسطے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

جس کی اس نے کوئی سند نہیں اُتاری، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ظالموں کا۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ

اور اللہ تو سچا کر چکا تم سے اپنا وعدہ جب تم قتل کرنے لگے ان کو اس کے حکم سے، یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی

وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ

اور کام میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دِکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز،

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ

کوئی تم میں سے چاہتا تھا دُنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت، پھر تم کو اُلٹ دیا اُن پر سے

لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

تاکہ تم کو آزماوے، اور وہ تو تم کو معاف کر چکا، اور اللہ کا فضل ہے ایمان والوں پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے، ہم عنقریب ان کے دِلوں میں رُعب ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ کی خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ ظالموں کا

بدترین ٹھکانا ہے۔ ⑮ اور اللہ نے یقیناً اس وقت اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم دُشمنوں کو اسی کے حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دِکھائی اور حکم کے بارے میں باہم اِختلاف کیا اور جب اللہ نے تمہاری پسندیدہ چیز تمہیں دِکھائی تو تم نے (اپنے امیر کا) کہنا نہیں مانا ـــــ تم میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو دُنیا چاہتے تھے، اور کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے ـــــ پھر اللہ نے ان سے تمہارا رُخ پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائے۔ البتہ اب وہ تمہیں معاف کر چکا ہے، اور اللہ مؤمنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے ⑯

ربطِ آیات

سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا ناصر و مددگار ہونا مذکور تھا، ان آیات میں نصرتِ الٰہی کے کچھ واقعات کا ذِکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں رُعب (ہیبت) کافروں کے دِلوں میں، بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس (کے قابلِ شرکت ہونے) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (نہ لفظاً اور صراحۃً اور نہ معنیً یعنی ایسی دلیل جس کا شرع میں اِعتبار ہو، اس میں تمام دلائلِ عقلیّہ قطعیہ داخل ہوگئے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر جاہل اپنی کوئی دلیل پیش کیا ہی کرتا ہے، مگر کوئی قابلِ اِعتبار دلیل ان کے پاس نہیں) اور ان کی جگہ جہنم ہے، اور وہ بُری جگہ ہے ظالموں کی (اس آیت میں کفار پر رُعب و ہیبت طاری کرنے کا جو وعدہ ہے اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ اوّل تو باوجود اس کے کہ شکست مسلمانوں کو ہو رہی تھی، مشرکینِ عرب بلا کسی ظاہری سبب کے مکہ کی طرف لوٹ گئے (بیضاوی)،[1] پھر جب کچھ راستہ طے کر چکے تو اپنی حماقت پر افسوس کرنے لگے کہ جب مسلمان دَم توڑ چکے تھے تو اس وقت وہاں سے واپس آنا کوئی دانش مندی نہیں تھی، اور پھر مدینہ کی طرف واپسی کا کچھ اِرادہ کیا، تو اللہ نے ان کے دِلوں پر ایسا رُعب ڈالا کہ مدینہ کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

کسی راہ چلتے گاؤں والے سے کہہ دیا کہ ہم تجھے اتنا مال دیں گے، تم مدینہ جا کر مسلمانوں کو ڈرا دو کہ وہ پھر لوٹ کر آ رہے ہیں، یہاں یہ سارا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے تعاقب کے لئے مقامِ حمراء الاسد تک پہنچے، مگر وہ بھاگ چکے تھے، یہ آیت اسی واقعے کے متعلق نازل ہوئی۔

[1] تفسیر البیضاوی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱ ص:۳۹۹

اگلی آیتوں میں غزوۂ اُحد کے اندر مسلمانوں کی عارضی شکست اور مغلوبیت کے اسباب کا بیان ہے، اِرشاد ہے) اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنا وعدہ (نصرت کو) سچا کر دِکھایا، جس وقت کہ تم (ابتدائے قتال میں) ان کفار کو بحکمِ خداوندی قتل کر رہے تھے، (اور یہ تمہارا غلبہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا) یہاں تک کہ تم خود ہی (رائے میں) کمزور ہو گئے، (اس طرح کہ جو تجویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کے مورچہ پر پچاس سپاہی اور ایک افسر کو بٹھا کر فرمائی تھی اس میں بعض کو غلط فہمی ہوگئی کہ مسلمان فتح پا چکے ہیں، اب یہاں بیٹھے رہنے کی ضرورت ختم ہوگئی، اس لئے ہمیں بھی دُشمن کے مقابلہ میں شریک ہو جانا چاہئے) اور باہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) حکم میں اِختلاف کرنے لگے (کہ بعض تو اسی جگہ جمے رہنے کی ہدایت پر قائم رہے، مگر بعض دُوسروں نے دُوسری تجویز پیش کردی، انکار و ملامت اسی دُوسری تجویز پر ہے کہ) اور تم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دِل خواہ بات (آنکھوں سے) دِکھادی تھی (یعنی مسلمانوں کا غلبہ دِکھلایا تھا، اور اس وقت تمہاری یہ حالت تھی کہ) تم میں سے بعض تو وہ تھے جو دُنیا (کا لینا) چاہتے تھے (یعنی کفار کا تعاقب کر کے مالِ غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے) اور بعض تم میں وہ تھے جو (صرف) آخرت کے طلب گار تھے (اب چونکہ بعض سے رائے کی کمزوری اور خلافِ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُوسری تجویز پیش کرنا اور آپ کے کہنے پر نہ چلنا اور طلبِ دُنیا جیسے بعض اُمور سرزد ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کرلیا) اور پھر تم کو ان کفار (پر غالب آنے) سے ہٹادیا (باوجودیکہ یہ عارضی شکست تمہارے فعل کا نتیجہ تھی مگر پھر بھی من جانب اللہ یہ عمل بطور سزا کے نہیں بلکہ اس مصلحت سے ہوا) تاکہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمائش (ایمان کی) فرمادے (چنانچہ اس وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور مخلصین کی قدر بڑھ گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کردیا (اب آخرت میں مؤاخذہ نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں (کے حال) پر۔

معارف و مسائل

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقامِ بلند اور اس کی رعایتیں

یہ ظاہر ہے کہ غزوۂ اُحد میں بعض صحابہ کرامؓ کی رائے کی غلطی ہوئی تھی س پر سابقہ متعدّد آیات میں تنبیہ اور آئندہ کے لئے اِصلاحِ حال کی ہدایات کا سلسلہ چلا آتا ہے، مگر اس عتاب اور تنبیہات کے اندر بھی صحابہ کرامؓ کے ساتھ حق جل شانہٗ کی عنایات قابلِ دِید ہیں۔ اوّل تو لِيَبْتَلِيَكُمْ فرما کر یہ ظاہر فرمادیا کہ عارضی شکست کی جو صورت پیش آئی یہ بطور سزا کے نہیں، بلکہ آزمائش کے لئے ہے، پھر صاف لفظوں میں خطا کی معافی کا اِعلان فرمادیا وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ارادۂ دُنیا کا مطلب

آیاتِ مذکورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُس وقت صحابہ کرامؓ کے دو گروہ ہو گئے تھے، بعض دُنیا چاہتے تھے، بعض صرف آخرت کے طلب گار تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جن حضرات کے متعلق طالبِ دُنیا ہونے کا ذِکر ہے، یہ ان کے کس عمل کی بنا پر ہے، ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت جمع کرنے کے ارادے کو طلبِ دُنیا سے تعبیر کیا گیا ہے، اب غور کرو کہ اگر یہ حضرات اپنے مورچے پر جمے رہتے اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں شریک نہ ہوتے تو کیا ان کے حصۂ غنیمت میں کوئی کمی آ جاتی، اور شریک ہو گئے تو کوئی زیادہ حصہ مل گیا؟ قرآن و حدیث سے ثابت شدہ قانونِ غنیمت کو جو شخص جانتا ہے اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ مالِ غنیمت سے جو حصہ ان کو ملے گا اس میں کسی حال میں کوئی فرق کمی بیشی کا نہ تھا، مالِ غنیمت جمع کرنے کی صورت میں بھی اُن کا حصہ وہی رہے گا جو اپنی جگہ مورچے پر جمے رہنے کے وقت ملتا۔

تو اب ظاہر ہے کہ اُن کا یہ عمل خالص طلبِ دُنیا تو ہو نہیں سکتا، بلکہ مجاہدین کے کام میں شرکت ہے، ہاں طبعی طور پر اس وقت مالِ غنیمت کا خیال دِل میں آ جانا مستبعد نہیں، مگر حق تعالیٰ اپنے رسول کے ساتھیوں کے قلوب کو اس سے بھی پاک وصاف دیکھنا چاہتے ہیں کہ مال کا تصور ہی کیوں آوے؟ اس لئے اس تصرف کو طلبِ دُنیا سے تعبیر کر کے ناپسندیدگی کا اِظہار فرما دیا، واللہ اعلم۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَّالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِيٓ أُخْرَىٰكُمْ

تم چڑھے چلے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے،

فَأَثَٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَٰبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ

پھر پہنچا تم کو غم عوض میں غم کے تاکہ تم غم نہ کیا کرو اس پر جو ہاتھ سے نکل جاوے اور نہ اس پر کہ جو کچھ پیش آ جاوے اور اللہ کو

خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنۢ بَعْدِ ٱلْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا

خبر ہے تمہارے کام کی۔ پھر تم پر اُتارا تنگی کے بعد امن کو جو اونگھ تھی

يَغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ

کہ ڈھانک لیا اس اونگھ نے بعضوں کو تم میں سے اور بعضوں کو فکر پڑ رہا تھا اپنی جان کا، خیال کرتے تھے اللہ پر

غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ

جھوٹے خیال جاہلوں جیسے، کہتے تھے: کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں، تو کہہ:

اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ

سب کام ہے اللہ کے ہاتھ، وہ اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے، کہتے ہیں:

لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ

اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ، تو کہہ: اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں

لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ

البتہ باہر نکلتے جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا اپنے پڑاؤ پر، اور اللہ کو آزمانا تھا

مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور صاف کرنا تھا اس کا جو تمہارے دل میں ہے اور اللہ جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ

دلوں کے بھید۔ جو لوگ تم میں سے ہٹ گئے جس دن لڑیں دو فوجیں

اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ

سو ان کو بہکادیا شیطان نے ان کے گناہ کی شامت سے، اور ان کو بخش چکا اللہ،

ع ۷
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٥٥﴾

اللہ بخشنے والا ہے تحمل کرنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

(وہ وقت یاد کرو) جب تم منہ اُٹھائے چلے جارہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اور رسول تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے، چنانچہ اللہ نے تمہیں (رسول کو) غم (دینے) کے بدلے (شکست کا) غم دیا، تا کہ آئندہ تم زیادہ صدمہ نہ کیا کرو، نہ اُس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے، اور نہ کسی اور مصیبت پر جو تمہیں پہنچ جائے۔ اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۵۳﴾ پھر اس غم کے بعد اللہ نے تم پر طمانینت نازل کی، ایک اُونگھ جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی! اور ایک گروہ وہ تھا جسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق ایسے گمان کر رہے تھے جو جہالت کے خیالات تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: ''کیا ہمیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے؟'' کہہ دو کہ: ''اختیار تو تمام تر اللہ کا ہے۔'' یہ لوگ اپنے دِلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ: ''اگر ہمیں بھی کچھ اِختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔'' کہہ دو کہ: ''اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا مقدر میں لکھا جا چکا تھا وہ خود باہر نکل کر اپنی اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔ اور یہ سب اس لئے ہوا تا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے، اور جو کچھ تمہارے دِلوں میں ہے اس کا میل کچیل دُور کر دے۔ اللہ دِلوں کے بھید کو خوب جانتا ہے ﴿۱۵۴﴾ تم میں سے جن لوگوں نے اُس دن پیٹھ پھیری جب دونوں لشکر ایک دُوسرے سے ٹکرائے، درحقیقت ان کے بعض اعمال کے نتیجے میں شیطان نے ان کو لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور یقین رکھو کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا بردبار ہے۔ ﴿۱۵۵﴾

ربطِ آیات

یہ آیات بھی غزوۂ اُحد کے واقعۂ مذکورہ سے متعلق ہیں، پہلی آیت میں اس واقعہ پر صحابہ کرامؓ کے حزن وغم کا ذِکر ہے، اور دُوسری طویل آیت میں اس غم کے اِزالہ کا بیان ہے، تیسری آیت میں مکرّر اس کا اِظہار ہے کہ اس میں جو صورتِ شکست پیش آئی وہ بھی کوئی سزا نہیں، بلکہ مؤمنینِ مخلصین اور منافقین میں تفرقہ کرنے کے لئے ایک آزمائش تھی، اور پھر مکرّر صحابہ کرامؓ کی لغزش کی معافی کا اِعلان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

وہ وقت یاد کرو جب تم (بھاگتے ہوئے جنگل کو) چڑھے چلے جارہے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے (کہ اِدھر آؤ اِدھر آؤ، مگر تم نے سنا ہی نہیں) سو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے کے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) تاکہ (اس پاداش اور مصیبت سے تم میں پختگی پیدا ہوجائے جس سے پھر) تم مغموم ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جاوے اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے، اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی (اس لئے تم جیسا کام کرتے ہو اس کے مناسب پاداش تجویز فرماتے ہیں، آگے اِزالۂ غم کا بیان ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین (اور راحت) بھیج دی یعنی اونگھ (جبکہ کفار میدان سے واپس ہوگئے اس وقت غیب سے مسلمانوں پر اونگھ غالب ہوئی جس سے سب غم غلط ہوگیا) کہ تم میں سے ایک جماعت (یعنی مسلمانوں) پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی (یعنی منافقین کی) کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی (کہ دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جاتے ہیں) وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلافِ واقع گمان کر رہے تھے جو محض حماقت کا خیال تھا (وہ خیال آگے ان کے قول سے اور اس کا حماقت و جہالت ہونا اس کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، ان کا قول یہ تھا کہ) وہ یوں کہہ رہے تھے: کیا ہمارا اِختیار کچھ چلتا ہے (مطلب یہ تھا کہ ہماری رائے کسی نے نہ سنی جو جنگ سے پہلے ہم نے دی تھی خواہ مخواہ سب کو مصیبت میں پھنسا دیا) آپ فرما دیجئے کہ اِختیار تو سب اللہ ہی کا (چلتا) ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر عمل بھی ہوتا جب بھی قضاءِ اِلٰہی غالب رہتی اور جو اُفتاد آنے والی تھی آکر رہتی، چنانچہ ان کے قول اور اس کے جواب کا مطلب آگے مفصل آتا ہے) وہ لوگ اپنے دِلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے (صراحۃً) ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ ظاہر میں اُن کے اس قول کا کہ ہمارا کیا اِختیار ہے یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ تقدیرِ اِلٰہی کے سامنے بندے کی تدبیر نہیں چلتی جو کہ عین ایمان کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جو لطیف جواب دیا گیا اس میں اس معنی کی تصدیق بھی ہے کہ واقعی اِختیار اللہ ہی کا غالب ہے، مگر درحقیقت ان کا مطلب اس قول سے یہ نہیں تھا، بلکہ وہ یہ بات اس معنے سے) کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا (یعنی ہماری رائے پر عمل ہوتا) تو ہم (میں جو لوگ یہاں قتل ہوئے وہ) یہاں مقتول نہ ہوتے (جس کا حاصل یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اسی لئے آگے ان کے اس قول کی تکذیب اس طرح کی گئی کہ) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدّر ہو چکا تھا وہ لوگ اُن مقامات کی طرف (آنے کے لئے) نکل پڑتے جہاں وہ (قتل ہو کر) گرے ہیں (غرض یہ ہے کہ یہ ظاہری مضرّت جس قدر ہوئی وہ تو ٹلنے والی نہ تھی) اور (اس کے فوائد و منافع بہت عظیم تھے

کیونکہ) جو کچھ ہوا اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات (یعنی ایمان) کی آزمائش کرے (کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور مؤمنین کا ایمان اور زیادہ مؤکد اور محقق ہو گیا) اور تا کہ تمہارے دِلوں کی بات (یعنی اسی ایمان) کو (شوائب اور وساوس سے) صاف کر دے (کیونکہ مصیبت سے مؤمن کی توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاتی ہے جس سے ایمان کو جلا اور قوت پہنچتی ہے) اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (ان کو آزمائش کی حاجت نہیں، مگر اس لئے کہ عدالتی طریقے سے مجرم کا جرم کھل کر سامنے آجائے ایسے اُمورِ واقع کئے جاتے ہیں) یقیناً تم میں جن لوگوں نے (میدانِ جنگ سے) پشت پھیر دی تھی جس روز کہ وہ دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور کفار کی) باہم مقابل ہوئیں (یعنی اُحد کے روز اس کی وجہ) اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال (گزشتہ) کے سبب سے (یعنی ان سے کچھ خطا و قصور ایسے ہو گئے تھے جس سے شیطان کو ان سے اور بھی معصیت کرا دینے کی طمع ہو گئی، اور اتفاق سے وہ طمع پوری بھی ہو گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف فرما دیا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے حلم والے ہیں (کہ صدورِ خطا کے وقت بھی کوئی سزا نہیں دی)۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر پہلی آیت میں کچھ صحابہ کرامؓ کا میدانِ جنگ چھوڑ کر چلا جانا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آواز دینے پر بھی ان کا نہ آنا، اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم ہونا اور اس غم کے بدلے میں انجامِ کار صحابہؓ کو غم ہونا مذکور ہے، اور روایاتِ حدیث میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے پکارا تو مسلمان جمع ہو گئے۔

اس کی توجیہ و تطبیق صاحبِ رُوح المعانی نے اس طرح کی ہے کہ اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا جو صحابہ کرامؓ نے سنا نہیں، اور دُور نکلے چلے گئے، اُس وقت حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا وہ سب نے سن لیا تو جمع ہو گئے۔ [1]

''بیان القرآن'' میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اصل وجہ گھبراہٹ کی یہ خبر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، آپ کے پکارنے میں اس خبر کی کوئی تردید تو تھی نہیں اور آواز اگر پہنچی بھی ہو تو پہچانی نہیں گئی، پھر جب حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا تو اس میں اس خبر کی تردید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حیات ہونا مذکور تھا، یہ سن کر سب کی تسلی ہوئی اور سب جمع ہو گئے، باقی رہا یہ کہ پھر اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر مستقل مزاج رہتے تو آواز کو پہچان سکتے تھے۔ [2]

---

[1] روح المعانی تحت ھذہ الآیۃ ج:۳ ص:۲۶۹

[2] تفسیر بیان القرآن تحت ھذہ الآیۃ ج:۲ ص:۶۴

اُحد کے مصائب سزا نہیں بلکہ آزمائش تھے اور جو لغزش بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوئی وہ معاف کردی گئی

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ الآیۃ سے معلوم ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جو مصائب اور تکالیف صحابہ کرامؓ کو پیش آئیں وہ بطورِ سزا نہیں بلکہ بطورِ آزمائش تھیں، اس اِمتحان کے ذریعے مؤمنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اِظہار کرنا تھا، اور فَاَثَابَكُمْ غَمًّا کے الفاظ سے جو اس کا سزا ہونا معلوم ہوتا ہے اس کی تطبیق یہ ہے کہ صورت تو سزا ہی کی تھی مگر یہ سزا مربیانہ اِصلاح کے لئے تھی، جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو، اُستاذ اپنے شاگرد کو کچھ سزا دیتا ہے تو عرف میں اس کو سزا بھی کہہ سکتے ہیں، مگر درحقیقت یہ تربیت اور اِصلاح کی ایک صورت ہوتی ہے، حاکمانہ سزا اس سے مختلف ہے۔

واقعۂ اُحد میں مسلمانوں پر مصائب کے اسباب کیا تھے؟

جملۂ مذکور وَلِيَبْتَلِيَ سے آخر تک جو اِرشاد ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقوعِ مصائب کا سبب یہ ربانی حکمتیں تھیں، لیکن اگلی آیت میں اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کوئی سابقہ لغزش اس شیطانی اثر کا سبب ہے۔

جواب یہ ہے کہ ظاہری سبب تو وہ لغزش ہی ہوئی کہ اس کی وجہ سے شیطان کو ان سے اور معصیت کرادینے کی بھی طمع ہوگئی، اور اِتفاق سے اس کی وہ طمع پوری بھی ہوگئی، مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں یہ تکوینی حکمتیں مستور تھیں، جن کو لِيَبْتَلِيَكُمْ میں بیان فرمایا ہے۔ ''رُوح المعانی'' میں ''زجاج'' سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعضے وہ گناہ یاد دِلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، اس لئے جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کو دُرست کرکے پھر پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور شہید ہوکر اللہ سے ملیں۔[1]

ایک گناہ دُوسرے گناہ کا بھی سبب ہوجاتا ہے

آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ایک گناہ دُوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، جیسے ایک نیکی دُوسری کو کھینچتی ہے، یعنی اعمالِ حسنہ اور سیئہ میں تجاذب ہے، جب اِنسان کوئی ایک نیک کام کرلیتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کے لئے دُوسری نیکیاں بھی آسان ہوجاتی ہیں، اس کے دِل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی طرح اِنسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے دُوسرے گناہوں کا راستہ ہموار کردیتا ہے، دِل میں گناہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا:-

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۲۷۸

اِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةَ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ بَعْدَهَا۔

''یعنی نیک کام کی ایک نقد جزا وہ دُوسری نیکی ہے جس کی توفیق اس کو ہو جاتی ہے، اور بُرے عمل کی ایک سزا وہ دُوسرا گناہ ہے جس کے لئے پہلے گناہ نے راستہ ہموار کر دیا ہے۔''

حضرت حکیم الامتؒ نے ''مسائل السلوک'' میں فرمایا کہ حدیث کی تصریح کے مطابق گناہ سے قلب میں ایک ظلمت اور تاریکی پیدا ہو جاتی ہے، اور جب قلب میں ظلمت آجاتی ہے تو شیطان قابو پا لیتا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام بلند اور ان کی خطاؤں پر عفو و درگزر کا بے مثال معاملہ

واقعۂ اُحد میں جو لغزشیں اور خطائیں بعض اَصحابِ کرامؓ سے صادر ہوئیں وہ اپنی ذات میں بڑی شدید اور سخت تھیں، جس مورچہ پر پچاس صحابہؓ کو یہ حکم دے کر بٹھایا تھا کہ ہم پر کچھ بھی حال گزرے تم یہاں سے نہ ہٹنا، ان کی بڑی تعداد یہاں سے ہٹ گئی، اگرچہ ہٹنے کا سبب ان کی یہ اِجتہادی غلطی سہی کہ اب فتح ہو چکی ہے اس حکم کی تعمیل پوری ہو چکی ہے، یہاں سے نیچے آکر سب مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہئے، مگر درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات کے خلاف تھا، اِسی خطا و قصور کے نتیجہ میں میدانِ جنگ سے بھاگنے کی غلطی سرزد ہوئی، چاہے اس میں بھی کسی تأویل ہی کا سہارا لیا گیا ہو، جیسا کہ ''زجاج'' سے اُوپر نقل کیا جا چکا ہے، پھر یہ میدانِ جنگ سے بھاگنا ایسی حالت میں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہیں، اور پیچھے سے اُن کو آواز دے رہے ہیں، یہ چیزیں اگر شخصیات اور گرد و پیش کے حالات سے الگ کر کے دیکھی جائیں تو بلاشبہ سخت ترین اور ایسے سنگین جرم تھے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے سلسلے میں مختلف صحابہؓ پر جتنے اِلزامات مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے ہیں یہ اُن سب سے زیادہ شدید جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر غور کیجئے کہ حق تعالیٰ نے ان تمام خطاؤں اور لغزشوں کے بعد بھی ان حضرات کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، وہ مذکورہ آیات میں بڑی وضاحت سے آگیا، کہ اوّل ظاہری اِنعام اونگھ کا بھیج کر ان کی تکلیف اور تکان و پریشانی دُور کی گئی، پھر یہ بتلایا گیا کہ جو مصائب اور غم مسلمانوں کو اُس وقت پہنچا ہے وہ نری سزا و عقوبت نہیں بلکہ اس میں کچھ مربیانہ حکمتیں مستور ہیں، پھر صاف لفظوں میں معافی کا اِعلان فرمایا، یہ سب چیزیں ایک مرتبہ اس سے پہلے آچکی ہیں، اس جگہ پھر ان کا اِعادہ فرمایا، اس تکرار کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ تو خود صحابہ کرامؓ کی تسلی کے لئے یہ اِرشاد فرمایا گیا، اور اس جگہ

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۶۵

منافقین کے اس قول کا رَدّ بھی مقصود ہے جو وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم نے ہماری رائے پر عمل نہ کیا اس لئے مصائب وتکالیف کا سامنا ہوا۔

بہرحال ان تمام آیات میں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آگئی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہے کہ اتنی بڑی عظیم خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ صرف عفوودرگزر کا ہی نہیں، بلکہ لطف وکرم کا فرمایا گیا، یہ معاملہ تو خود حق تعالیٰ کا اور نصوصِ قرآنی کا بیان کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا، انہوں نے مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے حالات کے متعلق ایک خط لکھ دیا تھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی اس کی حقیقت کھلی اور خط پکڑا گیا تو صحابہ کرامؓ میں حاطب بن ابی بلتعہؓ کے خلاف سخت غیظ وغضب تھا، فاروقِ اعظمؓ نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن ماردوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ وہ منافق نہیں، مؤمنِ مخلص ہیں، مگر یہ غلطی ان سے سرزد ہوگئی، اس لئے اس کو معاف فرمایا، اور فرمایا کہ "یہ اہلِ بدر میں سے ہیں، اور شاید اللہ تعالیٰ نے تمام حاضرینِ بدر کے متعلق مغفرت اور معافی کا حکم نافذ کردیا ہے۔" (یہ روایت حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے)[1]

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق عام مسلمانوں کے لئے ایک سبق

یہیں سے اہلِ سنت والجماعت کے اس عقیدے اور عمل کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں، ان سے بڑے گناہ بھی ہوسکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود اُمت کے لئے یہ جائز نہیں کہ ان کی طرف کسی بُرائی اور عیب کو منسوب کرے، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کرکے ان کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا اور ان کو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا مقام عطا فرمایا، تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ کرامؓ پر غزوۂ اُحد کے اسی واقعہ کا ذِکر کرکے طعن کیا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز کی معافی کا اللہ تعالیٰ نے اِعلان فرمادیا اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ (صحیح بخاری)[2]

اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ کی تعظیم اور ان پر طعن

[1] صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الجاسوس ج:۱ ص:۴۲۲ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة واهل بدر رضی الله عنهم الخ ج:۲ ص:۳۰۲

[2] صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان الخ ج:۱ ص:۵۲۲

واعتراض سے پرہیز واجب ہے، عقائد نسفیہ میں ہے:-

وَيَكُفُّ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ اِلَّا بِخَيْرٍ۔

''یعنی واجب ہے کہ صحابہؓ کا ذکر بغیر خیر کے اور بھلائی کے نہ کرے۔''

اور شرح مسامرہ ابن ہمامؒ میں ہے:-

اِعْتِقَادُ اَهْلِ السُّنَّةِ تَزْكِيَةُ جَمِيْعِ الصَّحَابَةِ وَالثَّنَاءُ عَلَيْهِمْ۔

''یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ کو عدول وثقات سمجھیں، ان کا ذکر مدح وثنا کے ساتھ کریں۔''

شرح مواقف میں ہے:-

يَجِبُ تَعْظِيْمُ الصَّحَابَةِ كُلِّهِمْ وَالْكَفُّ عَنِ الْقَدْحِ فِيْهِمْ۔

''یعنی تمام صحابہؓ کی تعظیم واجب ہے، اور ان پر طعن واعتراض سے باز رہنا واجب ہے۔''

حافظ ابنِ تیمیہؒ نے عقیدۂ واسطیہ میں فرمایا ہے کہ:-

اہلِ سنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو اختلافات اور قتل وقتال ہوئے ہیں ان میں کسی پر الزام واعتراض کرنے سے باز رہیں، وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں جو روایات اُن کے عیوب کے متعلق آئی ہیں ان میں بکثرت تو جھوٹی اور غلط ہیں جو دُشمنوں نے اُڑائی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن میں کمی بیشی کرکے اپنی اصلیت کے خلاف کردی گئی ہیں، اور جو بات صحیح بھی ہے تو صحابہ کرامؓ اس میں اجتہادی رائے کی بنا پر معذور ہیں، اور بالفرض جہاں وہ معذور بھی نہ ہوں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ یعنی اعمالِ صالحہ سے بُرے اعمال کا بھی کفارہ ہوجاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اعمالِ صالحہ کے برابر کسی دُوسرے کے اعمال نہیں ہوسکتے، اور اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم کے جتنے وہ مستحق ہیں کوئی دُوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے اعمال پر مؤاخذہ کرے، اور ان میں سے کسی پر طعن واعتراض کی زبان کھولے۔ (عقیدۂ واسطیہ ملخصاً) [1]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ

اے ایمان والو! تم نہ ہو اُن کی طرح جو کافر ہوئے اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو

[1] شرح العقیدة الواسطیة ج:۱ ص:۳۴۵ تا ۳۴۷

اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا

جب وہ سفر کو نکلیں ملک میں یا ہوں جہاد میں: اگر رہتے ہمارے پاس تو نہ مرتے

وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ يُحْیٖ

اور نہ مارے جاتے، تاکہ اللہ ڈالے اُس گمان سے افسوس ان کے دِلوں میں اور اللہ ہی جلاتا ہے

وَ يُمِيْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور مارتا ہے اور اللہ تمہارے سب کام دیکھتا ہے۔ اور اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں

اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ

یا مر گئے تو بخشش اللہ کی اور مہربانی اس کی بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے

اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

یا مارے گئے تو البتہ اللہ ہی کے آگے اِکٹھے ہو گے تم سب۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے، اور جب ان کے بھائی کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا جنگ میں شامل ہوتے ہیں تو یہ اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ: "اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، اور نہ مارے جاتے۔" (ان کی اس بات کا) نتیجہ تو (صرف) یہ ہے کہ اللہ ایسی باتوں کو ان کے دِلوں میں حسرت کا سبب بنا دیتا ہے، (ورنہ) زندگی اور موت تو اللہ دیتا ہے۔ اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ﴿۱۵۶﴾ اور اگر تم اللہ کے راستے میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ، تب بھی اللہ کی طرف سے ملنے والی مغفرت اور رحمت اُن چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں ﴿۱۵۷﴾ اور اگر تم مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ تو اللہ ہی کے پاس تو لے جا کر اِکٹھے کئے جاؤ گے! ﴿۱۵۸﴾

ربطِ آیات

پچھلی آیتوں میں منافقین کا یہ قول بیان کیا گیا تھا کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (آل عمران: ۱۵۴) یعنی اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا اور ہماری رائے مانی جاتی تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے، جس کو آگے بھی نقل کیا گیا ہے، ایسے اقوال کے سننے سے یہ احتمال تھا کہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شکوک وشبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس لئے مذکورہ بالا آیات میں مسلمانوں کو ایسے اقوال واحوال سے پرہیز کرنے کی اور موت وحیات کو صرف تابع تقدیر ہونے کی ہدایات دی گئی ہیں:-

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو (حقیقت میں) کافر ہیں (گو ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے ہوں) اور کہتے ہیں اپنے (ہم نسب یا ہم مشرب) بھائیوں کی نسبت جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں (اور وہاں اتفاقاً مر جاتے ہیں) یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں (اور اس میں تقدیر سے قتل ہو جاتے ہیں تو وہ منافق کہتے ہیں) کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے (سفر اور غزوہ میں نہ جاتے) تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (یہ بات ان کے دل اور زبان پر اس لئے آتی ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب کے لئے موجبِ حسرت کر دیں (یعنی نتیجہ اس طرح کی باتوں کا حسرت کے سوا کچھ نہیں) اور مارتا جلاتا تو اللہ ہی ہے (خواہ سفر ہو یا حضر اور جنگ ہو یا امن) اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں، (تو اگر تم بھی ایسی باتیں کرو یا ایسے خیالات میں مبتلا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا) اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ (اللہ کی راہ میں) مر جاؤ (تو یہ کوئی خسارہ نہیں نفع ہی نفع ہے کیونکہ) بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت (دُنیا کی) ان چیزوں سے (بدرجہا) بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں (اور اسی کے لالچ میں زندگی کو محبوب رکھتے ہیں اور) اگر تم (ویسے بھی) مر گئے یا مارے گئے (تب بھی) بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (پس اوّل تو قضا ٹلتی نہیں، دُوسرے اللہ کے پاس جانے سے کسی حال بچ نہیں سکتے اور دین کی راہ میں مرنا یا مارا جانا تو موجبِ مغفرت ورحمت ہے تو پھر ویسے مرنے سے دین ہی کی راہ میں جان دینا بہتر ہے اس لئے ایسے اقوال دُنیا میں موجبِ حسرت اور آخرت میں موجبِ نارِ جہنم ہے، ان سے پرہیز لازم ہے)۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا

سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دِل مل گیا اُن کو، اور اگر تو ہوتا تند خو سخت دِل تو متفرق ہو جاتے

مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا

تیرے پاس سے، سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں، پھر جب

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾

قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر (اے پیغمبر!) تم نے اِن لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر تم سخت مزاج اور سخت دِل والے ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔ لہٰذا اِن کو معاف کر دو، اِن کے لئے مغفرت کی دُعا کرو، اور اِن سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۵۹﴾

ربطِ آیات

غزوۂ اُحد میں بعض مسلمانوں کی لغزش اور میدان چھوڑنے سے جو صدمہ اور غم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تھا، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طبعی اخلاق اور عاداتِ عفو وکرم کی بنا پر ان کو اس پر کوئی ملامت نہیں کی، اور کوئی معاملہ سختی کا بھی نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کے ساتھیوں کی دِلجوئی اور ان کے دِلوں میں اس غلطی پر جو صدمہ اور اپنے قصور پر جو ندامت تھی اُن سب کو دھو دینا منظور ہوا تو اس آیت میں آپ کو مزید لطف وکرم کی ہدایت اور صحابہ کرامؓ سے معاملات میں مشورہ لینے کا حکم دیا۔

خلاصۂ تفسیر

بعد اس کے (کہ صحابہ کرامؓ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپ کو ملامت اور مؤاخذہ کرنے کا حق تھا) خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپ پر ہے) آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ (خدانخواستہ) تندخو، سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض و برکات کہاں نصیب ہوتے) سو (جب آپ نے

برتاؤ میں ایسی نرمی فرمائی تو ان سے جو غلطی آپ کی تعمیلِ حکم میں ہوگئی ہے اس کو دِل سے بھی) ان کو معاف کر دیجئے (اور ان سے جو غلطی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی سے ہوئی اس کے لئے) آپ ان کے لئے اِستغفار کیجئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی معافی اور مغفرت کا اِعلان پہلے ہی فرما دیا تھا، مگر آپ کا ان کے لئے دُعائے مغفرت کرنا مزید ان کے لئے مفید اور موجبِ تسلی ہوگا) اور ان سے خاص خاص باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے (تاکہ اس خصوصی لطف سے ان کے دِلوں سے غم دُھل جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپ (کسی ایک جانب) رائے پختہ کرلیں (خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف) تو خدا تعالیٰ پر اِعتماد (کرکے اس کام کو کر ڈالا) کریں، بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اِعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

مرشد و مربی کی خاص صفات

صحابہ کرامؓ جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اپنی جان و مال سے زیادہ آپ کو عزیز رکھنے والے تھے، ان سے جب آپ کے حکم کے خلاف ایک لغزش صادر ہوگئی تو یہاں ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ ان حضرات کو جب اپنی لغزش اور خلاف ورزیٔ حکم پر تنبہ ہو تو ان کا صدمہ حد سے بڑھ جائے، جو اُن کے قلب و دِماغ کو معطل کردے، یا رحمت سے مایوس بنادے، اس کا علاج تو پچھلی آیت میں بتلا دیا گیا کہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (آل عمران: ۱۵۳) اس لغزش کی سزا دُنیا میں دی جاچکی ہے، آخرت کا کھاتہ بے باق ہوگیا۔

دُوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غلطی اور لغزش کے نتیجے میں زخمی ہوئے، جس سے جسمانی تکلیف بھی پہنچی، اور رُوحانی تکلیف تو پہلے ہی سے تھی، تو اس جسمانی و رُوحانی تکلیف سے یہ اِحتمال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں صحابہ کرامؓ کی طرف سے تکدّر پیدا ہوجائے جو اُن کی ہدایت و تلقین میں مخل ہوجائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینا تھی کہ آپ ان کی خطا سے درگزر فرمائیں، ان کی لغزش دِل سے معاف کردیں، اور آئندہ کے لئے بھی لطف و مہربانی کا معاملہ جاری رکھیں۔

اس مضمون کو حق تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب اُسلوبِ بیان کے ساتھ اِرشاد فرمایا، جس میں ضمنی طور پر چند اہم فوائد بھی آگئے:-

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا حکم ایسے انداز سے دِیا گیا ہے جس میں آپ کی ثنا و تعریف اور

عظمتِ شان کا اظہار بھی ہے کہ یہ صفات آپ کے اندر پہلے سے موجود ہیں، اور دُوسرے اس سے پہلے فَبِمَا رَحْمَةٍ کا لفظ بڑھا کر یہ بھی بتلا دیا کہ ان صفاتِ کمال کا آپ کے اندر ہونا یہ ہماری رحمت سے ہے، کسی کا ذاتی کمال نہیں، پھر لفظِ رحمت کو بصورتِ نکرہ لاکر رحمت کے عظیم اور وسیع ہونے کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ رحمت صرف صحابہ کرامؓ پر ہی نہیں، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے کہ آپ کو ان صفاتِ کمال کے ساتھ متصف فرما دیا۔

اس کے بعد ایک تیسرا اہم فائدہ بعد کے جملوں سے ظاہر فرما دیا کہ یہ نرم خوئی، خوش اخلاقی، عفو و درگزر اور لطف و مہربانی کی صفات اگر آپ کے اندر نہ ہوتیں تو اِصلاح خلائق کا جو کام آپ کے سپرد ہے وہ حسبِ منشا انجام نہ پاتا، لوگ آپ کے ذریعے اپنی اِصلاح اور تزکیۂ اخلاق کا فائدہ حاصل کرنے کے بجائے آپ سے بھاگ جاتے۔

اور اس سب مجموعے سے ایک اور اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اِرشاد و اِصلاح اور تبلیغ کے آداب اس سے معلوم ہوگئے کہ جو شخص رُشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اِصلاحِ خلق کے کام کا اِرادہ کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کی سختی برداشت نہیں ہوسکتی تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدّد اور کج خلقی کے ساتھ خلق اللہ کو اپنے گرد جمع کر سکے، اور ان کی اِصلاح کا فرض انجام دے سکے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا کہ اگر آپ تندخو، سخت طبیعت ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوجاتے، اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لئے تندخوئی، سخت کلامی زہر اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

اس کے بعد اِرشاد فرمایا: فَاعْفُ عَنْهُمْ یعنی ان سے جو خطا ہوگئی ہے اس کو آپ معاف فرما دیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا اِنتقام نہ لے، بلکہ عفو و درگزر سے کام لے، بُرا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو، ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد اِرشاد فرمایا: وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ یعنی آپ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں، جس میں یہ ہدایت ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں، بلکہ دِل سے اُن کی خیرخواہی نہ چھوڑیں، اور چونکہ سب سے بڑی خیرخواہی ان کی آخرت کی دُرستی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے بخشش کی دُعا مانگیں۔

اس کے بعد اِرشاد ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی حسبِ سابق اپنے فیصلوں اور کاموں میں ان حضرات سے مشورہ بھی لیا کریں تاکہ ان کی پوری تسلی ہوجائے، اس میں اس کی طرف ہدایت فرمائی کہ جو خیرخواہی کا داعیہ ان کے لئے قلب میں ہے عمل سے بھی اس کا اِظہار کریں کہ اپنی مشاورت سے ان کو مشرف فرماویں۔

اس پوری آیت میں مصلح و مبلغ کے لئے چند صفات کا ہونا ضروری قرار دِیا گیا، اوّل سخت کلامی اور کج خلقی سے بچنا، دُوسرے ان لوگوں سے کوئی غلطی یا ان کے متعلق ایذا کی کوئی چیز صادر ہوجائے تو اِنتقام کے درپے نہ ہونا بلکہ عفو و درگزر کا

معاملہ کرنا، تیسرے یہ کہ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑنا، ان کے لئے دُعا و اِستغفار بھی کرتے رہنا اور ظاہری معاملات میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ نہ چھوڑنا۔ مذکورہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا حکم اور پھر مشورہ کے بعد طریقِ عمل کی ہدایت کی گئی ہے، مشورہ کے بارے میں قرآنِ کریم نے دو جگہ صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیتِ مذکورہ، دُوسرے سورۂ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸) یعنی ''اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے۔'' اور بعض جگہ ضمنی طور پر مشورہ کی ہدایت فرمائی ہے جیسے رضاعت کے اَحکام میں اِرشاد فرمایا: عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (البقرة:۲۳۳) یعنی ''بچے کا دُودھ چھڑانا ماں اور باپ دونوں کی رضامندی اور مشورہ سے ہونا چاہئے۔'' مشورہ سے متعلق چند اہم مسائل قابلِ غور ہیں:-

پہلا مسئلہ: لفظ ''اَمر'' اور ''مشورہ'' کے معنی، دُوسرا مسئلہ: مشورہ کی شرعی حیثیت، تیسرا مسئلہ: رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ، چوتھا مسئلہ: حکومتِ اسلامی میں مشورہ کا درجہ، پانچواں مسئلہ: مشورہ میں اِختلافِ رائے ہو تو فیصلے کی صورت، چھٹا مسئلہ: ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل۔

پہلا مسئلہ:- لفظ ''اَمر'' اور ''شوریٰ'' کی تحقیق

لفظ ''اَمر'' کا اِطلاق عربی زبان میں کئی معنی کے لئے ہوتا ہے، ایک عام معنی میں آتا ہے جو ہر مہتم بالشان قول وفعل کو شامل ہے۔ دُوسرا اِطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے، جس پر قرآنِ کریم میں لفظ ''اولی الامر'' محمول ہے۔ تیسرا اِطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لئے ہے جس کا ذِکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے، مثلاً: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف:۵۴)، وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (ہود:۱۲۳)، اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران:۱۵۴)، وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (البقرة:۲۷۵)، اور محققین کے نزدیک قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (بنی اسرائیل:۸۵) میں بھی یہی اَمر مراد ہے۔ اب قرآن کے ارشاد: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران:۱۵۹) اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸) میں دونوں معنی کا اِحتمال ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں اور دُوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات سبھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے اَمر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ حکومت سے متعلق ہو، خواہ معاملات سے۔ اور لفظ ''شوریٰ'' مشورہ، مشاورت کے معنی ہیں کسی قابلِ غور معاملے میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا، اس لئے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے معنی یہ ہوئے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ قابلِ غور معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں،

صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کریں، یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت: ۳۸ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قابلِ غور معاملے میں جس میں کوئی اہمیت ہو، خواہ حکم وحکومت سے متعلق ہو یا دُوسرے معاملات سے، ان میں سچے مسلمانوں کی عادتِ مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔

دُوسرا مسئلہ:- مشورہ کی شرعی حیثیت

اس بارے میں قرآنِ کریم کے ارشاداتِ مذکورہ اور اَحادیثِ نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسے معاملہ میں جس میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں خواہ وہ حکم وحکومت سے متعلق ہو یا کسی دُوسرے معاملہ سے باہمی مشورہ لینا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت اور دُنیا وآخرت میں باعثِ برکات ہے، قرآن وحدیث میں اس کی تائید آئی ہے، اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے جیسے معاملاتِ حکومت ان میں مشورہ لینا واجب ہے۔ (ابن کثیر)

بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کام کا اِرادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔[1]

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مال دار سخی ہوں، اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں، تو زمین کے اُوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے، اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمہارے مال دار بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہوجانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔[2]

مطلب یہ ہے کہ جب تم پر خواہش پرستی غالب آجائے کہ بھلے بُرے اور نافع ومضر سے قطع نظر کرکے محض عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے معاملات اس کے سپرد کردو تو اس وقت کی زندگی سے تمہارے لئے موت بہتر ہے، ورنہ مشورہ میں کسی عورت کی بھی رائے لینا کوئی ممنوع نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے ثابت ہے اور قرآنِ کریم میں سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۳۳ جو اَبھی بیان کی گئی ہے اس میں ارشاد ہے: عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ یعنی بچے کا دُودھ چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے، اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے، اس لئے خاص طور سے عورت کے مشورے کا پابند کیا گیا ہے۔

۱ شعب الإیمان للبیهقی، باب الحادی والخمسون من شعب الإیمان وهو باب فی الحکم إلخ رقم الحدیث: ۷۲۷۹

۲ جامع الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی النهی عن سب الریاح ج:۲ ص:۵۲

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:-

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ اِذَا اسْتُشِیْرَ فَلْیُشِرْہُ بِمَا هُوَ صَانِعٌ لِنَفْسِهٖ۔ [1]

''یعنی جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے، اس پر لازم ہے کہ اس معاملے میں جو کام وہ خود اپنے لئے تجویز کرتا ہے، وہی رائے دُوسرے کو دے، اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔''

یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں بسندِ حسن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ (مظہری)

البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں مسنون ہے جن کے بارے میں قرآن وحدیث کا کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو، ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہو اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں بلکہ جائز بھی نہیں، مثلاً کوئی شخص اس میں مشورہ کرے کہ نماز پڑھے یا نہیں، زکوٰۃ دے یا نہیں، حج کرے یا نہیں، یہ مشورہ کی چیزیں نہیں، شرعی طور پر فرضِ قطعی ہیں، البتہ اس میں مشورہ کیا جاسکتا ہے کہ حج کو اس سال جائے یا آئندہ، اور پانی کے جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے، اور خشکی راستے سے جائے یا دُوسرے طریق سے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے معاملے میں یہ مشورہ لیا جاسکتا ہے کہ اس کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کیا جائے، کیونکہ یہ سب اُمور شرعاً اِختیاری ہیں۔

ایک حدیث میں خود اس کی تشریح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحۃً قرآن میں نازل نہیں ہوا، اور آپ سے بھی اس کے متعلق کوئی اِرشاد ہم نے نہ سنا ہو، تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار فقہاء کو جمع کرو، اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔ [2]

اس حدیث شریف سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مشورہ صرف دُنیوی معاملات میں نہیں، بلکہ جن اَحکامِ شرعیہ میں قرآن وحدیث کی صریح نصوص نہ ہوں، ان اَحکام میں بھی باہمی مشورہ مسنون ہے، اور دُوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ ایسے لوگوں سے لینا چاہئے جو موجودہ لوگوں میں تفقّہ اور عبادت گزاری میں معروف ہوں۔ (اخرجہ الخطیب کذا فی الروح)

نیز خطیب بغدادیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد بھی نقل کیا ہے:-

---

(۱) المعجم الأوسط للطبرانی رقم الحدیث: ۲۲۸۵ باب الألف من اسمہ احمد۔

(۲) کنز العمال، باب حرف الھمزۃ رقم الحدیث: ۴۱۸۸

اِسْتَرْشِدُوا الْعَاقِلَ وَلَا تَعْصُوْهُ فَتَنْدَمُوْا۔ [1]

"یعنی عقل مند آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو، ورنہ ندامت اُٹھانی ہوگی۔"

ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان میں دو وصف ضروری ہیں، ایک صاحبِ عقل ورائے ہونا، دُوسرے عبادت گزار ہونا، جس کا حاصل ہے ذی رائے اور متقی ہونا، اور اگر مسئلہ شرعی ہے تو فقیہ ہونا بھی لازم ہے۔

تیسرا مسئلہ: - رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا درجہ

آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیں، اس میں یہ اِشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور صاحبِ وحی ہیں، آپ کو کسی سے مشورہ کی کیا حاجت ہے؟ آپ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہوسکتی ہے۔ اس لئے بعض علماء نے اس حکمِ مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی، نہ اس مشورہ پر آپ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرامؓ کے اِعزاز اور دِل جوئی کے لئے مشورہ کا حکم آپ کو دیا گیا ہے۔ لیکن اِمام ابوبکر جصّاصؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا، اور نہ مشورہ کا کسی کام پر کوئی اثر ہے تو پھر اس مشورہ پر کوئی دِل جوئی اور اِعزاز بھی نہیں رہتا، بلکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام اُمور میں تو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے، مگر بمقتضائے حکمت ورحمت بعض اُمور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ایسے ہی اُمور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی قسم کے اُمور میں مشورہ لینے کا آپ کو حکم دیا گیا، [2] رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالسِ مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے لئے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اگر آپ ہمیں دریا میں کود پڑنے کا حکم دیں تو ہم اس میں کود پڑیں گے، اور اگر آپ ہمیں برک الغماد جیسے دُور دراز مقام کی طرف چلنے کا اِرشاد فرمائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے، ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا ربّ کفار سے مقابلہ کریں، بلکہ ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ آپ سے آگے اور پیچھے اور دائیں بائیں دُشمن کا مقابلہ کریں گے۔

اسی طرح غزوۂ اُحد میں اس بارے میں مشورہ کیا کہ کیا مدینہ شہر کے اندر رہ کر مدافعت کریں یا شہر سے باہر نکل کر،

---

1. کنز العمال رقم الحدیث: ٧١٨٠
2. احکام القرآن للجصاص، باب الإستعانة بأهل الذمة ج:٣ ص:٢٩٦، ٢٩٧

عام طور سے صحابہ کرامؓ کی رائے باہر نکلنے کی ہوئی، تو آپ نے اسی کو قبول فرمایا۔ غزوۂ خندق میں ایک خاص معاہدہ پر صلح کرنے کا معاملہ درپیش آیا، تو سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے اس معاہدہ کو مناسب نہ سمجھ کر اختلاف کیا، آپ نے انہی دونوں کی رائیں قبول فرمائیں۔ حدیبیہ کے ایک معاملے میں مشورہ لیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے پر فیصلہ فرما دیا۔ قصۂ اِفک میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا، یہ سب معاملات وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص جانب متعین نہیں کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبوّت و رِسالت اور صاحبِ وحی ہونا کچھ مشورہ کے منافی نہیں، اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشورہ محض نمائشی دِل جوئی کے لئے ہو، اس کا اثر معاملات پر نہ ہو، بلکہ بہت مرتبہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو آپ نے اپنی رائے کے خلاف بھی قبول فرمالیا، بلکہ بعض اُمور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص صورت متعین نہ فرمانے اور مشورہ لے کر کام کرنے میں حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ آئندہ اُمت کے لئے ایک سنت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جاری ہوجائے کہ جب آپ کو بھی مشورہ سے اِستغناء نہیں تو پھر ایسا کون ہے جو اِستغناء کا دعویٰ کرسکے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ میں ایسے مسائل میں مشاورت کا طریق ہمیشہ جاری رہا جن میں کوئی نصِ شرعی نہ تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی یہی معمول رہا، بلکہ بعد میں تو ایسے اَحکامِ شرعیہ کی دریافت کے لئے بھی مشورہ کا معمول رہا جن میں قرآن وحدیث کا کوئی صریح فیصلہ نہ تھا، کیونکہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریق کار بتلایا تھا۔

چوتھا مسئلہ: -حکومتِ اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے؟

جیسا کہ اُوپر ذِکر کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم نے دو جگہ مشورہ کا صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیت مذکورہ اور دُوسرے سورۂ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ (الشوریٰ: ۳۸) یعنی اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے۔ ان دونوں جگہ پر مشورہ کے ساتھ لفظ ''اَمر'' مذکور ہے، اور لفظ ''اَمر'' کی مفصل تحقیق اُوپر بیان ہوچکی ہے کہ ہر مہتم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے، اور حکم اور حکومت کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ ''اَمر'' کے خواہ معنیٰ اوّل مراد لیں یا دُوسرے معنی، حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا بہرصورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے، حکم یا حکومت مراد لینے کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے، اور اگر معنی عام لئے جائیں جب بھی حکم اور حکومت کے معاملات مہتم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابلِ مشورہ ٹھہریں گے، اس لئے اَمیرِ اِسلام کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت کے اہم معاملات میں اہلِ حل وعقد سے مشورہ لیا کرے، قرآن کی

آیاتِ مذکورہ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مسلسل تعامل اس کی روشن سند ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جس طرح معاملاتِ حکومت میں مشورہ کی ضرورت واضح ہوئی اسی طرح ان سے اِسلام کے طرزِ حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اُصول بھی سامنے آ گئے کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، جس میں اُمیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں، آج تو اِسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دُنیا میں اس اُصول کا لوہا مانا جا چکا ہے، شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً وکرہاً اسی طرف آ رہی ہیں، لیکن اب سے چودہ سو برس پہلے زمانے کی طرف مڑ کر دیکھئے جبکہ پوری دُنیا پر آج کے تین بڑوں کی جگہ دو بڑوں کی حکومت تھی، ایک کسریٰ، دُوسرا قیصر، اور ان دونوں کے آئین حکومتِ شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں مشترک تھے، جس میں ایک شخصِ واحد لاکھوں کروڑوں اِنسانوں پر اپنی قابلیت وصلاحیت سے نہیں، بلکہ وراثت کے ظالمانہ اُصولوں کی بنا پر حکومت کرتا تھا، اور اِنسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی بادشاہی اِنعام سمجھا جاتا تھا، یہی نظریۂ حکومت دُنیا کے بیشتر حصے پر مسلط تھا، صرف یونان میں جمہوریت کے چند دُھندلے اور ناتمام نقوش پائے جاتے تھے، لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مدہم تھے کہ ان پر کسی مملکت کی بنیاد رکھنا مشکل تھا، اسی وجہ سے جمہوریت کے ان یونانی اُصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہیں بن سکی، بلکہ وہ اُصول ارسطو کے فلسفے کی ایک شاخ بن کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اُصول باطل کر کے اَمیرِ مملکت کا عزل ونصب جمہور کے اِختیار میں دے دیا، جس کو وہ اپنے نمائندوں اہلِ حل وعقد کے ذریعے اِستعمال کر سکیں، بادشاہ پرستی کی دَلدَل میں پھنسی ہوئی دُنیا اِسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ اور فطری نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی رُوح ہے اسی طرزِ حکومت کی، جس کو آج ''جمہوریت'' کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم وستم کے رَدِّعمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اِعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق العنان بنا کر پورے آئینِ حکومت اور قانونِ مملکت کا ایسا آزاد مالک بنا دیا کہ ان کے قلب ودِماغ زمین وآسمان اور تمام اِنسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصلی مالکیت وحکومت کے تصوّر سے بھی بیگانہ ہو گئے، اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے عوامی اِختیار پر خدا تعالیٰ کی عائدہ کردہ پابندیوں کو بھی بارِ خاطر خلافِ اِنصاف تصوّر کرنے لگیں۔

اسلامی آئین نے جس طرح خلقِ خدا کو کسریٰ وقیصر اور دُوسری شخصی بادشاہتوں کے جبر واستبداد کے پنجے سے نجات دِلائی، اسی طرح ناخدا آشنا مغربی جمہوریتوں کو بھی خداشناسی اور خداپرستی کا راستہ دکھلایا، اور بتلایا کہ ملک کے حکام ہوں یا عوام، خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں، ان کے عوام اور عوامی اسمبلی کے اِختیارات، قانون سازی، عزل ونصب خدا تعالیٰ کے مقرّر کردہ حدود کے اندر ہیں، اُن پر لازم ہے کہ امیر کے اِنتخاب میں اور پھر عہدوں اور

منصبوں کی تقسیم میں ایک طرف قابلیت اور صلاحیت کی پوری رعایت کریں تو دُوسری طرف اُن کی دیانت وامانت کو پرکھیں، اپنا اَمیر ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم، تقویٰ، دیانت، امانت، صلاحیت اور سیاسی تجربے میں سب سے بہتر ہو، پھر یہ اَمیر منتخب بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں، بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے، قرآنِ کریم کی آیت مذکورہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا تعامل اس پر شاہد عدل ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اِرشاد ہے:-

لَا خِلَافَةَ اِلَّا عَنْ مَشُوْرَةٍ۔ (کنز العمال بحواله ابن ابی شیبة) [۱]

''یعنی شورائیت کے بغیر خلافت نہیں ہے۔''

شورائیت اور مشورہ کو اِسلامی حکومت کے لئے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے حتیٰ کہ اگر اَمیرِ مملکت مشورہ سے آزاد ہوجائے، یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطۂ نظر سے مشورہ کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا ضروری ہے۔

ذَکَرَ ابْنُ عَطِیَّةَ اَنَّ الشُّوْرٰی مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِیْعَةِ وَعَزَائِمِ الْاَحْکَامِ وَمَنْ لَّا یَسْتَشِیْرُ اَهْلَ الْعِلْمِ وَالدِّیْنِ فَعَزْلُهٗ وَاجِبٌ، هٰذَا مَا لَا خِلَافَ لَهٗ۔ (البحر المحیط لأبی حیان) [۲]

''ابنِ عطیہؒ نے فرمایا کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اُصولوں میں سے ہے، جو اَمیر کہ اہلِ علم اور اہلِ دِین سے مشورہ نہ لے، اس کا عزل کرنا واجب ہے، اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اِختلاف نہیں۔''

مشورہ کے ضروری ہونے سے اِسلامی حکومت اور اس کے باشندوں پر جو ثمرات اور برکات حاصل ہوں گے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا، ابنِ عدی اور بیہقی نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کو اس مشورہ کی حاجت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری اُمت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے۔ (بیان القرآن) [۳]

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسول کو ہر کام بذریعہ وحی بتلا دیتا، کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا، لیکن اُمت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے، اس لئے بہت سے اُمور

---

[۱] مصنّف ابن ابی شیبة، باب ما جاء فی خلافة ابی بکر الخ ج:۸ ص:۵۷۰ والسُّنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۷۱۵۱ ج:۴ ص:۲۷۲

[۲] البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۴۴۲

[۳] بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۶۸

ایسے چھوڑ دیئے جن میں صراحۃً کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، ان میں آپ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔

پانچواں مسئلہ:- مشورہ میں اختلافِ رائے ہو جائے تو فیصلے کی کیا صورت ہوگی؟

مشورہ میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے تو کیا آج کل کے پارلیمانی اُصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر اُمیر مجبور ہوگا، یا اس کو اختیار ہوگا کہ اکثریت ہو یا اقلیت جس طرف دلائل کی قوت اور مملکت کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے؟ قرآن وحدیث اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلافِ رائے کی صورت میں اُمیر اَکثریتِ رائے کے فیصلہ کا پابند و مجبور ہے، بلکہ قرآنِ کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعاملِ صحابہؓ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلافِ رائے کی صورت میں اُمیر اپنی صواب دِید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے، خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے، البتہ اُمیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے جس طرح دُوسرے دلائل پر نظر کرے گا اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لئے سببِ اطمینان بن سکتا ہے۔

آیتِ مذکورہ میں غور فرمایئے، اس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے: فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ یعنی مشورہ کے بعد آپ جب کسی جانب کو طے کر کے عزم کرلیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے، اس میں عَزَمْتَ کے لفظ میں عزم یعنی نفاذِ حکم کا پختہ ارادہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا، "عَزَمْتُمْ" نہیں فرمایا جس سے عزم وتنفیذ میں صحابہؓ کی شرکت معلوم ہوتی، اس کے اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد نفاذ اور عزم صرف اُمیر کا معتبر ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بعض وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے، حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہؓ موجود ہوتے تھے جو ابنِ عباسؓ سے عمر اور علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مرتبہ حضراتِ شیخین صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کی رائے کو جمہور صحابہؓ کے مقابلے میں ترجیح دی ہے، حتیٰ کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیتِ مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ لینے کے لئے نازل ہوئی۔ حاکم نے "مستدرک" [۱] میں اپنی سند کے ساتھ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:-

[۲] عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ) قَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ۔ (ابن کثیر)

"ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شَاوِرْهُمْ کی ضمیر سے مراد حضراتِ شیخینؓ ہیں۔"

[۱] مستدرك حاكم رقم الحديث: ۴۴۱۰، كتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم۔

[۲] تفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۴۹، والمستدرك للحاكم رقم الحديث: ۴۴۱۰

کلبی کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: نَزَلَتْ فِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَكَانَا حَوَارِيَّيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَزِيْرَيْهِ وَاَبَوَيِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (ابن كثير) [۱]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے مشورہ لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ دونوں حضرات جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی اور وزیر تھے، اور مسلمانوں کے مربی تھے۔''

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِيْ مَشْوَرَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا۔ (ابن كثير بحواله مسند احمد) [۲]

''جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا۔''

ایک اِشکال اور اُس کا جواب

یہاں یہ اِشکال کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی ہے، اور شخصی حکومت کا طرز ہے، اور اس سے جمہور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلے کر لی ہے، کیونکہ عوام کو یہ اِختیار ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں اَمیر بنادیں، بلکہ ان پر لازم قرار دِیا ہے کہ علم وعمل اور صلاحیتِ کار اور خدا ترسی اور دیانت کی رُو سے جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں، صرف اس کو اَمیر منتخب کریں۔ تو جس شخص کو ان اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ صفات کے تحت منتخب کیا گیا ہو، اس پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو بددیانت اور فساق، فجار پر عائد کی جاتی ہیں، عقل وانصاف کا خون کرنا، اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور ملک وملت کے کام میں رُکاوٹ ڈالنے کے مرادف ہوگا۔

چھٹا مسئلہ:- ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا

اس جگہ یہ بات بہت ہی قابلِ غور ہے کہ نظامِ حکومت اور دُوسرے اہم اُمور میں تدبیر اور مشورہ کے اَحکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل ورائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرو، کیونکہ یہ سب تدبیر مدبر الامور کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اِنسان کیا اور اس کی

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية، ج:۲ ص:۱۴۹

[۲] مسند احمد، حديث عبدالرحمٰن بن غنم الأشعري رضي الله عنه رقم الحديث: ۱۷۳۰۹

رائے وتدبیر کیا، ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رُسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، مولانا رُومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

خویش را دیدیم ورسوائیِ خویش
امتحانِ ما مکن اے شاہ بیش [۱]

اس جملہ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ توکل ترکِ اسباب اور ترکِ تدبیر کا نام نہیں، بلکہ اسبابِ قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنتِ انبیاء اور تعلیمِ قرآن کے خلاف ہے، ہاں اسبابِ بعیدہ اور دُور اَز کار فکروں میں پڑے رہنا یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو مؤثر سمجھ کر مسبّب الاسباب اور مدبر الامور سے غافل ہوجانا بے شک خلافِ توکل ہے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوسکے گا، اور اگر مدد نہ کرے تمہاری تو پھر ایسا کون ہے جو مدد کرسکے تمہاری

مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ

اس کے بعد؟ اور اللہ ہی پر بھروسہ چاہئے مسلمانوں کو۔ اور نبی کا کام نہیں کہ

يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ

چھپا رکھے اور جو کوئی چھپاوے گا وہ لائے گا اپنی چھپائی چیز دِن قیامت کے، پھر پورا پاوے گا ہر کوئی

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ

جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ کیا ایک شخص جو تابع ہے اللہ کی مرضی کا برابر ہوسکتا ہے اس کے جس نے

بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ

کمایا غصہ اللہ کا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور کیا ہی بُری جگہ پہنچا ہے۔ لوگوں کے مختلف درجے ہیں

---

[۱] ترجمہ:- میں اپنے آپ کو اور اپنی رُسوائی کو دیکھ چکا ہوں، اے بادشاہ! میرا مزید امتحان نہ لیجئے۔

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

اللہ کے ہاں، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ کرتے ہیں۔ اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر

اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

جو بھیجا ان میں رسول انہی میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

النصف

اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات، اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ

کیا جس وقت پہنچی تم کو ایک تکلیف کہ تم پہنچا چکے ہو اس سے دوچند، تو کہتے ہو: یہ کہاں سے آئی؟ تو کہہ دے:

هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ

یہ تکلیف تم کو پہنچی تمہاری ہی طرف سے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جو کچھ تم کو پیش آیا

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ لا وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

اس دن کہ ملیں دو فوجیں سو اللہ کے حکم سے اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو، اور تاکہ معلوم کرے اُن کو

نَافَقُوْا ۖۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا

جو منافق تھے، اور کہا گیا ان کو کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا دفع کرو دُشمن کو، بولے:

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ

اگر ہم کو معلوم ہو لڑائی تو البتہ تمہارے ساتھ رہیں، وہ لوگ اس دن کفر کے قریب ہیں بہ نسبت ایمان کے،

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ ج

کہتے ہیں اپنے منہ سے جو نہیں اُن کے دِل میں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں۔

الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ

وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو اور آپ بیٹھ رہے ہیں: اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے، تو کہہ دے:

فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ

اب ہٹا دیجیو اپنے اُوپر سے موت کو اگر تم سچے ہو۔ اور تو نہ سمجھ

الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ

ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رَبّ کے پاس

يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ ۙ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۙ وَيَسْتَبْشِرُونَ

کھاتے پیتے۔ خوشی کرتے ہیں اس پر جو دِیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے اور خوش وقت ہوتے ہیں

بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

ان کی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے اُن کے پاس اُن کے پیچھے سے، اس واسطے کہ نہ ڈر ہے اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ ۘ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ وقف لازم

اور نہ اُن کو غم۔ خوش وقت ہوتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ

لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾ ع ۱۷ ۸

ضائع نہیں کرتا مزدوری ایمان والوں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے؟ اور مؤمنوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں (۱۶۰) اور کسی نبی سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے، اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن وہ چیز لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کر کے لی ہوگی، پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا (۱۶۱) بھلا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف سے ناراضی لے کر لوٹا ہو، اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو؟ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے! (۱۶۲) اللہ کے نزدیک اِن لوگوں کے درجات مختلف ہیں، اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس کو خوب دیکھتا ہے۔ (۱۶۳) حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن کے درمیان اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، اُنہیں پاک صاف بنائے اور اُنہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ یہ لوگ اِس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے (۱۶۴) جب تمہیں ایک ایسی مصیبت پہنچی جس سے دُگنی تم (دُشمن کو) پہنچا چکے تھے، تو کیا تم ایسے موقع پر یہ کہتے ہو کہ "یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟" کہہ دو کہ "یہ خود تمہاری طرف سے آئی ہے۔" بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۶۵) اور تمہیں جو مصیبت اُس دن پہنچی جب دونوں لشکر ٹکرائے تھے، وہ اللہ کے حکم سے پہنچی، تاکہ وہ مؤمنوں کو بھی پرکھ کر دیکھ لے (۱۶۶) اور منافقین کو بھی دیکھ لے۔ اور اِن (منافقوں) سے کہا گیا تھا کہ "آؤ اللہ کے راستے میں جنگ کرو یا دِفاع کرو" تو انہوں نے کہا تھا کہ: "اگر ہم دیکھتے کہ (جنگ کی طرح) جنگ ہوگی تو ہم ضرور آپ کے پیچھے چلتے۔" اُس دن (جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے) وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو اُن کے دِلوں میں نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے (۱۶۷) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے (شہید) بھائیوں کے بارے میں بیٹھے بیٹھے یہ باتیں بناتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو کہ: "اگر تم سچے ہو تو خود اپنے آپ ہی سے موت کو ٹال دینا" (۱۶۸) اور (اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں، انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا، بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں اپنے ربّ کے پاس رزق ملتا ہے (۱۶۹) اللہ نے ان کو اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے، وہ اس پر مگن ہیں، اور ان کے پیچھے جو لوگ ابھی ان کے ساتھ (شہادت میں) شامل نہیں ہوئے، اُن کے بارے میں اِس بات پر بھی خوشی مناتے ہیں کہ (جب وہ ان سے آکر ملیں گے تو) نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۱۷۰) وہ اللہ کی نعمت اور فضل پر بھی خوشی مناتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مؤمنوں کا اَجر ضائع نہیں کرتا (۱۷۱)

ربطِ آیات

واقعۂ اُحد میں عارضی شکست اور مسلمانوں کی پریشانی پر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تسلی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چند اُمور کا حکم ہوا تھا، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا خطرہ تو زائل ہو گیا، لیکن ان حضرات کو اس واقعۂ مغلوبیت سے حسرت بھی تھی، اس لئے متذکرہ بالا بارہ آیات میں سے پہلی آیت میں ان کی حسرتِ مغلوبیت کو دِل سے اُتارتے ہیں، نیز بدر کے روز مالِ غنیمت میں ایک چادر گم ہوگئی، بعض (کم سمجھ یا منافق) لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، اور یہ امر حقیقۃً یا صورۃً خیانت ہے، نبی کی شان اس سے منزّہ ہے، لہٰذا دُوسری، تیسری اور چوتھی آیات کے اندر جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان صفتِ امانت اور اس خیال کی غلطی کو بیان کرکے پانچویں آیت کے اندر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود کا نعمتِ عظمیٰ ہونا اور آپ کی بعثت کا اِنسانیت کے لئے احسانِ عظیم ہونا واضح فرمایا گیا ہے۔

چونکہ مؤمنین کو اس شکست کی سخت کلفت تھی کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ مصیبت کیوں اور کدھر سے آگئی، اس پر صحابہ کرامؓ کو تعجب اور افسوس تھا، نیز منافقین کہا کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تو ہلاک نہ ہوتے، اور ان شہداء کی موت کو بدنصیبی اور محرومی قرار دیتے تھے، اس لئے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں آیات کے اندر دُوسرے عنوان سے اس عارضی مصیبت و تکلیف کی علت و حکمت واضح فرمائی گئی، اور اس کے ضمن میں منافقین کی تردید بھی۔

اور نویں آیت میں ان کے غلط عقیدہ کہ گھروں میں بیٹھے رہنا ہلاکت سے نجات کا سبب ہے، تردید کی گئی، اور دسویں، گیارہویں اور بارہویں آیات میں حضراتِ شہدائے کرام کی اعلیٰ درجہ کی کامیابی اور حیاتِ حقیقیہ اور دائمی نعمتوں کا اِثبات فرمادیا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے (اور تم کو غالب کردے) اور صرف اللہ تعالیٰ پر اِیمان والوں کو اِعتماد رکھنا چاہئے، اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) خیانت کرے حالانکہ (خائن کی تو قیامت میں رُسوائی اور فضیحت ہوگی، کیونکہ) جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دِن (میدانِ حشر میں) حاضر کرے گا (تاکہ سب خلائق مطلع ہوں اور سب کے رُوبرو فضیحت اور رُسوائی ہو) پھر (میدانِ قیامت کے بعد) ہر شخص کو (ان خائنوں میں سے) اس کے

کئے کا (دوزخ میں) پورا عوض ملے گا، اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا (کہ جرم سے زائد سزا ہونے لگے، غرض خائن تو مغضوب اور مستحقِ جہنم ہوا، اور انبیاء علیہم السلام بوجہ رضا جوئی حق کے قیامت میں سر بلند ہوں گے، پس دونوں اَمر جمع نہیں ہو سکتے، جیسا آگے اِرشاد ہے) سو ایسا شخص جو رضائے حق کا تابع ہو (جیسے نبی) کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جائے گا جو کہ غضب اِلٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو (جیسے خائن) اور وہ جانے کی بُری جگہ ہے (ہرگز دونوں برابر نہیں ہوں گے بلکہ) یہ مذکورین (یعنی متبعانِ رضائے حق اور مغضوبین) درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کہ متبع محبوب جنتی ہے اور مغضوب دوزخی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں اُن کے اعمال کو (اس لئے ہر ایک کے مناسب معاملہ فرماویں گے)۔

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا) اِحسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے (عظیم الشان) پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں (اور اَحکام) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (ظاہری اور باطنی گندگیوں سے) ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتابِ (الٰہی) اور سمجھ کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) قبل سے صریح غلطی (یعنی شرک وکفر) میں (مبتلا) تھے۔ اور جب (اُحد میں) تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دوگنا تم (بدر میں) جیت چکے تھے (کیونکہ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہوئے اور بدر میں ستر کافروں کو قید اور ستر کو قتل کیا تھا) تو کیا ایسے وقت میں تم (بطورِ اعتراض نہ سہی بطور تعجب کے) یوں کہتے ہو کہ (باوجود ہمارے مسلمان ہونے کے) یہ (ہار) کدھر سے ہوئی (یعنی کیوں ہوئی) آپ فرما دیجئے کہ یہ ہار تمہاری طرف سے ہوئی (اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف نہ کرتے تو نہ ہارتے، کیونکہ اس قید کے ساتھ وعدۂ نصرت ہو چکا تھا) بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (جب تم نے اِطاعت کی اپنی قدرت سے تم کو غالب کر دیا اور جب خلاف کیا اپنی قدرت سے تم کو مغلوب کر دیا) اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ دونوں گروہ (مسلمانوں اور کفار کے) باہم (مقاتلہ کے لئے) مقابل ہوئے (یعنی اُحد کے دن) سو (وہ مصیبت) خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوئی (کیونکہ چند در چند حکمتیں تھیں جن کا بیان اُوپر بھی آچکا ہے) اور (ان میں سے ایک حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بھی دیکھ لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت اِخلاص وغیر اِخلاص ظاہر ہو جاتا ہے جیسا گزر بھی چکا ہے) اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے (شروع جنگ کے وقت جبکہ تین سو آدمیوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جیسا کہ پہلے آچکا ہے) یوں کہا گیا کہ (میدانِ جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر) دُشمنوں کی مدافعت کرنا (کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو اُن پر رُعب ہوگا اور اس سے شاید ہٹ جاویں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنا زیادہ، پھر اُن کے پاس سامان بھی زیادہ ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا

ہے، لڑائی اس کونہیں کہتے، حق تعالیٰ اس پر اِرشاد فرماتے ہیں کہ) یہ منافقین اس روز (جبکہ ایسا خشک جواب دیا تھا) کفر سے (ظاہراً بھی) نزدیک تر ہوگئے، بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ (پہلے سے ظاہراً) اِیمان سے (کسی قدر) نزدیک تھے (کیونکہ پہلے سے گو وہ دِل سے مؤمن نہ تھے مگر مسلمانوں کے سامنے موافقت کی باتیں بناتے رہتے تھے، اس روز ایسی طوطا چشمی غالب ہوئی کہ کھلم کھلا مخالفت کی باتیں منہ سے نکلنے لگیں، اس لئے پہلے سے جو ظاہری قرب ایمان کے ساتھ تھا وہ کفر کے قرب میں تبدیل ہوگیا، اور یہ قرب اس قرب سے زیادہ اس لئے ہے کہ موافقت کی باتیں دِل سے نہ تھیں، اس لئے زوردار نہ تھیں، اور یہ مخالفت کی باتیں دِل سے تھیں اس لئے عبارت بھی زوردار تھی) یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دِل میں نہیں (یعنی دِل میں تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیں گے گو لڑائی ڈھنگ ہی کی کیوں نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دِل میں رکھتے ہیں (اس لئے ان کے اس قول کا غلط ہونا اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے) یہ ایسے لوگ ہیں کہ (خود تو جہاد میں شریک نہ ہوئے اور) اپنے (ہم نسب) بھائیوں کی نسبت (جو کہ مقتول ہوگئے، گھروں میں) بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے (یعنی ہمارے منع کرنے پر نہ جاتے) تو (بے فائدہ) قتل نہ کئے جاتے، آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو اپنے اُوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم (اس خیال میں) سچے ہو (کہ میدان میں جانے سے ہی ہلاکت ہوتی ہے، کیونکہ قتل سے بچنا تو موت ہی سے بچنے کے لئے مقصود ہے، جب وقتِ مقرّر پر موت گھر بیٹھے بھی آجاتی ہے تو قتل بھی وقتِ مقرّر پر نہیں ٹل سکتا) اور (اے مخاطب!) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دِین کے واسطے) قتل کئے گئے ان کو (اور مردوں کی طرح) مردہ مت خیال کر بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں (اور) اپنے پروردگار کے مقرّب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رِزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے عطا فرمائی (مثلاً درجاتِ قرب وغیرہ یعنی رزقِ ظاہری بھی ملتا ہے اور رِزقِ معنوی یعنی مسرّت بھی) اور (جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں اسی طرح) جو لوگ (ابھی دُنیا میں زندہ ہیں اور) ان کے پاس نہیں پہنچے (بلکہ) ان سے پیچھے رہ گئے ہیں اُن کی بھی اس حالت پر وہ (شہداء) خوش ہوتے ہیں کہ (اگر وہ بھی شہید ہوجاویں تو ہماری طرح) ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ (کسی طرح) مغموم ہوں گے (غرض ان کو دو خوشیاں حاصل ہوں گی، ایک اپنے متعلق، دُوسرے اپنے متعلقین کے متعلق، آگے ان دونوں خوشیوں کا سبب یہ بتلایا کہ) وہ (اپنی حالت پر تو) خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت وفضلِ خداوندی کے (جس کا اُنہوں نے مشاہدہ کرلیا) اور (دُوسروں کی حالت پر خوش ہوتے ہیں) اس وجہ سے کہ (وہاں جاکر مشاہدہ کرلیا کہ) اللہ تعالیٰ اہلِ اِیمان (کے اعمال) کا اَجر ضائع نہیں کرتے (تو جو لوگ ان کے متعلقین پیچھے رہ گئے ہیں اور نیک اعمال جہاد وغیرہ میں لگے ہیں ان کو بھی ایسے ہی اِنعامات ملیں گے)۔

معارف ومسائل

مالِ غنیمت میں چوری گناہِ عظیم ہے، کسی نبی سے ایسے گناہ کا اِحتمال نہیں

آیت: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ایک خاص واقعہ کے متعلق آئی ہے، اس کے ضمن میں غلول، یعنی مالِ غنیمت کی چوری کا مسئلہ بھی آ گیا۔

واقعہ حسبِ روایت ترمذیؒ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں مالِ غنیمت میں ایک چادر گم ہوگئی، بعض لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، یہ کہنے والے اگر منافق تھے تو کوئی بعید بات نہیں، اور ممکن ہے کہ کوئی ناسمجھ مسلمان ہی ہو تو اس نے یہ سمجھا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا اِختیار ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، [1] جس میں غلول کا گناہِ عظیم ہونا اور قیامت کے روز اس کی سزائے شدید کا ذِکر ہے، اور یہ کہ کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہوگا نہایت بیہودہ جسارت ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام ہر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔

لفظ ''غلول'' مطلق خیانت کے معنی میں بھی اِستعمال ہوتا ہے، اور خاص کر مالِ غنیمت کی خیانت کے لئے بھی، اور مالِ غنیمت میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور خیانتوں سے زیادہ اَشد ہے، کیونکہ مالِ غنیمت میں پورے لشکرِ اِسلام کا حق ہوتا ہے، تو جس نے اس میں چوری کی اس نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی چوری کی، اگر کسی وقت اس کو تلافی کا خیال بھی آوے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے یا معاف کرائے، بخلاف دُوسری چوریوں کے کہ مال کا مالک معلوم ومتعین ہے، کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کر بَری ہوسکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اُون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا، مالِ غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا، آپ نے باوجود رحمۃ للعالمین ہونے اور اُمت پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب میں اس کو کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں، اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہوگے۔ [2]

اسی لئے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادہ اشد ہے کہ میدانِ حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رُسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لدا ہوا ہوگا۔ صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر ومن سورة آل عمران ج:۲ ص:۱۳۰

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الغلول إلخ ج:۲ ص:۳۷۱

طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اُونٹ لدا ہوا ہو (اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مالِ غنیمت کا اُونٹ چرایا تھا)، وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دُوں گا کہ میں نے حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا، اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ [1]

اللہ بچائے یہ میدانِ حشر کی رُسوائی ایسی ہوگی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رُسوائی سے بچ جائیں۔

اموالِ اوقاف اور سرکاری خزانہ میں چوری بحکم غلول ہے

یہی حال مساجد، مدارس، خانقاہوں اور اوقاف کے اموال کا ہے جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے، اگر معاف بھی کرائے تو کس کس سے معاف کرائے؟ اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے، کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی، مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اس لئے آج کل دُنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے، اور لوگ اس کے انجامِ بد اور وبالِ عظیم سے غافل ہیں، کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذابِ جہنم کے میدانِ حشر کی رُسوائی بھی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محرومی بھی (نعوذ باللہ منہ)۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ باوجود پوری اِنسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے

آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الآیۃ، اسی مضمون کی ایک آیت نمبر ۱۲۹ تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، جس کی تفسیر و تشریح تفصیل کے ساتھ معارف القرآن جلد اوّل ص: ۳۸۰ میں آچکی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔ یہاں آیت میں ایک لفظ زائد ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا میں مبعوث فرما کر حق تعالیٰ نے مؤمنین پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

اس کے متعلق پہلی بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، اور پورے عالم کے لئے آپ کا وجود نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہے، اس جگہ اس کو صرف مؤمنین کے لئے فرمانا ایسا ہی ہے جیسے قرآنِ کریم کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمانا کہ قرآن کا سارے عالم کے لئے ہدایت ہونا دُوسری آیات سے ثابت ہے، مگر بعض جگہ اس کو متقین کے ساتھ مخصوص کر کے بیان فرمایا، اس کی وجہ دونوں جگہ مشترک طور پر ایک ہی ہے

[1] صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب الغلول ج:۱ ص:۴۳۲ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب غلظ تحریم الغلول ج:۲ ص:۱۲۲، ۱۲۳

کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود سارے عالم اور ہر مؤمن و کافر کے لئے نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہے اسی طرح قرآن کریم سارے عالمِ اِنسانیت کے لئے صحیفۂ ہدایت ہے، مگر چونکہ اس نعمت و ہدایت کا نفع صرف مؤمنین اور متقین نے حاصل کیا اس لئے کسی جگہ اس کو ان کے ساتھ مخصوص کر کے بھی بیان کر دیا گیا۔

دُوسری بات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مؤمنین کے لئے یا پورے عالم کے لئے نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہونے کی تشریح وتوضیح ہے۔

یہ بات ایسی ہے کہ اگر آج کل کا اِنسان رُوحانیت فراموش اور مادّیت کا پرستار نہ ہوتا تو یہ مضمون کسی توضیح وتشریح کا محتاج نہیں تھا، عقل سے کام لینے والا ہر اِنسان اِس احسانِ عظیم کی حقیقت سے خود واقف ہوتا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج کا اِنسان دُنیا کے جانوروں میں ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا، اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے، اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی رُوح ہے، اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر غافل ہو گیا ہے، اس لئے اس تشریح کی ضرورت ہوئی کہ اِنسان کو پہلے تو یہ بتلایا جائے کہ اس کی حقیقت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقیقتِ اِنسان وہ رُوح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے، جب تک یہ رُوح اس کے بدن میں ہے اس وقت تک اِنسان، اِنسان ہے، اس کے حقوقِ اِنسانیت قائم ہیں، خواہ وہ کتنا ہی ضعیف و کمزور، لبِ دَم کیوں نہ ہو، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی جائیداد اور اَموال پر قبضہ کر سکے، یا اس کے حقوق سلب کر سکے، لیکن جس وقت یہ رُوح اس کے بدن سے الگ ہوگئی، تو خواہ وہ کتنا ہی قوی اور پہلوان ہو، اور اس کے اعضاء سب اپنی اصلی ہیئت میں ہوں، وہ اِنسان نہیں رہا، اس کا کوئی حق خود اپنی جائیداد و اَموال میں باقی نہیں رہا۔

انبیاء علیہم السلام دُنیا میں آتے ہیں اس لئے کہ وہ اِنسانی رُوح کی صحیح تربیت کر کے اِنسان کو حقیقی اِنسان بنائیں، تا کہ اس کے بدن سے جو اَعمال و افعال صادر ہوں وہ اِنسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں، وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دُوسرے اِنسانوں کو اِیذا اور تکلیف دیتا نہ پھرے، اور خود اپنے بھی انجام کو سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے، ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے زُمرۂ انبیاء میں اِمامت و سیادت کا منصب حاصل ہے، اِنسان کو صحیح اِنسان بنانے میں بھی آپ کی شان تمام انبیاء علیہم السلام سے بہت ممتاز ہے۔ آپ نے اپنی مکی زندگی میں صرف یہی کام اَفراد سازی کا انجام دیا، اور اِنسانوں کا ایسا معاشرہ تیار کر دیا جس کا مقام فرشتوں کی صفوف سے آگے ہے، اور زمین و آسمان نے اس سے پہلے ایسے اِنسان نہیں دیکھے، ان میں سے ایک ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زِندہ معجزہ نظر آتا ہے، ان کے بعد کے لئے بھی آپ نے جو تعلیمات اور ان کے رِواج دینے کے طریقے چھوڑے ہیں اس پر پورا عمل کرنے والے اسی مقام کو پا سکتے ہیں جو صحابہ کرامؓ نے پایا ہے، یہ تعلیمات سارے عالم کے لئے ہیں، اس لئے آپ کا وجود باوجود

پورے عالمِ انسان کے لئے اِحسانِ عظیم ہے، گو اس سے پورا نفع مؤمنین ہی نے اُٹھایا ہے۔

واقعۂ اُحد میں مسلمانوں کو عارضی شکست اور زخم و قتل کے مصائب پیش آنے کے بعض اسباب اور حکمتیں

آیت: اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ الآیۃ، سابقہ آیات میں کئی جگہ اس مضمون کا ذِکر آچکا ہے، یہاں پھر اس کی تاکید مزید توضیح کے ساتھ بیان کی گئی ہے، کیونکہ مسلمانوں کو اس واقعہ سے سخت کلفت تھی یہاں تک کہ بعض حضرات کی زبان پر یہ بھی آیا: اَنّٰى هٰذَا ؕ کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آپڑی جبکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں اوّل تو یہ بات یاد دِلائی کہ جتنی مصیبت تم پر آج پڑی ہے تم اس سے دُگنی اپنے مخالف پر اس سے پہلے غزوۂ بدر میں ڈال چکے ہو، کیونکہ غزوۂ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے، اور غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر سردار مارے گئے تھے اور ستر گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آئے تھے، اس بات کے یاد دِلانے سے ایک تو یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ تکلیف و پریشانی کا اِحساس گھٹ جائے کہ جس شخص کی دُگنی جیت ہو چکی ہو اگر ایک دفعہ آدھی ہار وشکست بھی ہو جائے تو زیادہ غم اور تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

دُوسرا اصل مقصد آیت کے آخری جملے قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ میں بتلایا کہ یہ تکلیف ومصیبت درحقیقت دُشمن کی قوت وکثرت کے سبب سے نہیں، بلکہ تمہاری اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب سے ہے کہ اَمرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں تم سے کوتاہی ہوگئی۔

اس کے بعد کی آیت فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ میں اس طرف اِشارہ کیا گیا کہ یہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کے اِذن ومشیت سے ہوا، جس میں بہت سی حکمتیں مستور ہیں، جن میں سے بعض کا بیان پہلے آچکا ہے، اور ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنینِ مخلصین کو بھی دیکھ لیں اور منافقین کو بھی، یعنی مؤمنین کا اِخلاص اور منافقین کی منافقت ایسی واضح ہو جائے کہ ہر دیکھنے والا دیکھ سکے، یہاں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے مراد یہی ہے کہ دُنیا میں جو دیکھنے کی صورت متعارف ہے اس صورت میں دیکھ لیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں، چنانچہ یہ حکمت اس طرح واضح ہوگئی کہ اس شدّت کے وقت منافقین الگ ہو کر کھڑے ہوئے، اور مخلص مؤمن معرکے میں ڈٹے رہے۔

اور ایک وجہ تسلی یہ بھی ہے کہ جو مسلمان اس معرکہ میں شہید ہوگئے ہیں ان کو حق تعالیٰ نے وہ اِنعامات دیئے ہیں کہ دُوسروں کو اُن پر رشک آنا چاہئے، اس مناسبت سے اس کے بعد کی آیت وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ میں شہداء کے خاص فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خاص فضائل اور درجات

اس آیت میں شہداء کے خاص فضائل کا بیان ہے، اور اَحادیثِ صحیحہ میں اس کی بڑی تفصیل وارِد ہوئی ہے، اِمام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ شہداء کے بھی درجات اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے روایاتِ حدیث میں جو مختلف صورتیں آئی ہیں، وہ مختلف حالات کے اِعتبار سے ہیں۔

یہاں شہداء کی پہلی فضیلت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مُرے نہیں، بلکہ دائمی زندگی کے مالک ہوگئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بظاہر ان کا مرنا اور قبر میں دفن ہونا تو مشاہد اور محسوس ہے، پھر قرآن کی متعدّد آیات میں ان کو مردہ نہ کہنے اور نہ سمجھنے کی جو ہدایت آئی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کہا جائے کہ حیاتِ برزخی مراد ہے، تو وہ ہر شخص مؤمن وکافر کو حاصل ہے کہ مرنے کے بعد اس کی رُوح زندہ رہتی ہے، اور قبر کے سوال وجواب کے بعد مؤمنینِ صالحین کے لئے سامانِ راحت اور کفار فجار کے لئے قبر کا عذاب قرآن وسنت سے ثابت ہے، تو یہ حیاتِ برزخی جب سب کے لئے عام ہے تو شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی اسی آیت نے یہ بتلایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے جنت کا رِزق ملتا ہے، اور رِزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس دُنیا سے منتقل ہوتے ہی شہید کے لئے رزقِ جنت جاری ہوجاتا ہے، اور ایک خاص قسم کی زندگی اسی وقت سے اس کو مل جاتی ہے، جو عام مردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے۔ (قرطبی)

اب رہا کہ وہ اِمتیاز کیا ہے؟ اور وہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی حقیقت سوائے خالقِ کائنات کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ جاننے کی ضرورت ہے، البتہ بسا اوقات ان کی حیاتِ خاص کا اثر اس دُنیا میں بھی ان کے ابدان پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی، وہ صحیح سالم باقی رہتے ہیں (قرطبی) جس کے بہت سے واقعات مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

شہداء کی پہلی فضیلت اس آیت میں ان کی ممتاز دائمی حیات ہے، دُوسری یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رِزق ملتا ہے، تیسری فضیلت فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ میں یہ بیان کی گئی کہ وہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے، ان نعمتوں میں جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔ چوتھی فضیلت یہ ہے وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ یعنی وہ اپنے جن متعلقین کو دُنیا میں چھوڑ گئے تھے ان کے متعلق بھی اُن کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دُنیا میں رہ کر نیک عمل اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آکر یہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے۔

اور سدیؒ نے بیان فرمایا کہ شہید کا جو کوئی عزیز دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اِطلاع کردی جاتی ہے کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آرہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے جیسے دُنیا میں کسی دُور افتادہ دوست سے بعد مدّت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول جو ابوداؤدؒ [1] نے باسنادِ صحیح حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ جب واقعۂ اُحد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا، وہ جنت کی نہروں اور باغات کے پھلوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، اور پھر اُن قندیلوں میں آ جاتے ہیں جو اُن کے لئے عرشِ رحمٰن کے نیچے معلق ہیں، جب ان لوگوں نے اپنی راحت و عیش کی یہ زندگی دیکھی تو کہنے لگے کہ (ہمارے متعلقین دُنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں) کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر ان کو پہنچا سکتا ہے، تاکہ وہ ہم پر غم نہ کریں، اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری یہ خبر اُن کو پہنچائے دیتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔ (قرطبی) [2]

عند المتقدمین ۱۲ ع

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الْقَرْحُ ۛؕ

جن لوگوں نے حکم مانا اللہ کا اور رسول کا بعد اس کے پہنچ چکے تھے ان کو زخم،

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْہُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ

جو اُن میں نیک ہیں اور پرہیزگار ان کو ثواب بڑا ہے۔ جن کو کہا لوگوں نے کہ

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْہُمْ فَزَادَہُمْ اِیْمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوْا

مکہ والے آدمیوں نے جمع کیا ہے سامان تمہارے مقابلہ کو، سو تم ان سے ڈرو، تو اور زیادہ ہوا اُن کا ایمان اور بولے:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضْلٍ

کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے۔ پھر چلے آئے مسلمان اللہ کے احسان اور فضل کے ساتھ

لَّمْ یَمْسَسْہُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۷۴﴾

کچھ نہ پہنچی اِن کو بُرائی اور تابع ہوئے اللہ کی مرضی کے اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

۱ سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی فضل الشهادة ج:۱ ص:۳۴۱

۲ تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۲۶۸

إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُۥ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن

یہ جو ہے سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے، سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر

كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧٥﴾

تم ایمان رکھتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار کا فرمانبرداری سے جواب دیا، ایسے نیک اور متقی لوگوں کے لئے زبردست اَجر ہے ﴿۱۷۲﴾ وہ لوگ جن سے کہنے والوں نے کہا تھا کہ: ''یہ (مکہ کے کافر) لوگ تمہارے (مقابلے) کے لئے (پھر سے) جمع ہوگئے ہیں، لہٰذا ان سے ڈرتے رہنا۔ تو اس (خبر) نے ان کے ایمان میں اور اِضافہ کر دیا اور وہ بول اُٹھے کہ: ''ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔'' ﴿۱۷۳﴾ نتیجہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل لے کر اس طرح واپس آئے کہ انہیں ذرا بھی گزند نہیں پہنچی، اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے۔ اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے ﴿۱۷۴﴾ درحقیقت یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، لہٰذا اگر تم مؤمن ہو تو ان سے خوف نہ کھاؤ، اور بس میرا خوف رکھو۔ ﴿۱۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

جن لوگوں نے اللہ و رسول کے کہنے کو (جبکہ ان کو تعاقبِ کفار کے لئے بلایا گیا) قبول کرلیا بعد اس کے کہ ان کو (ابھی تازہ) زخم (لڑائی میں) لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں (اور واقع میں سب ہی ایسے ہیں) ان کے لئے (آخرت میں) ثوابِ عظیم ہے، یہ ایسے (مخلص) لوگ ہیں کہ (بعض) لوگوں نے (یعنی عبدالقیس والوں نے جو) ان سے (آکر) کہا کہ ان لوگوں (یعنی اہلِ مکہ نے) تمہارے (مقابلہ کے) لئے (بڑا) سامان جمع کیا ہے، سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس (خبر) نے ان کے (جوشِ) اِیمان کو اور زیادہ کر دیا اور (نہایت استقلال سے یہ) کہہ (کر بات کو ختم کر) دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ (مشکلات کے لئے) کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے (اسی سپرد کرنے کو توکل کہتے ہیں) پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے (یعنی ثواب اور نفع تجارت سے) بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان

کو کوئی ناگواری پیش نہیں آئی، اور وہ لوگ (اس واقعہ میں) رضائے حق کے تابع رہے (اس کی بدولت اپنی دُنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے (مسلمانو!) اس سے زیادہ کوئی (قابلِ اندیشہ) بات نہیں کہ یہ مخبر (فعلاً) شیطان ہے کہ اپنے (ہم مذہب) دوستوں سے (تم کو) ڈرا (نا چاہ) تا ہے، سوتم ان سے کبھی مت ڈرنا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات اور شانِ نزول

اُوپر غزوۂ اُحد کے قصہ کا ذِکر تھا، مذکورہ آیات میں اسی غزوہ سے متعلق ایک دُوسرے غزوہ کا ذِکر ہے جو ''غزوۂ حمراء الاسد'' کے نام سے مشہور ہے، حمراء الاسد مدینہ طیبہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔

واقعہ اس غزوہ کا یہ ہے کہ جب کفارِ مکہ اُحد کے میدان سے واپس ہوگئے تو راستے میں جا کر اس پر افسوس ہوا کہ ہم غالب آجانے کے باوجود خواہ مخواہ واپس لوٹ آئے، ہمیں چاہئے تھا کہ ایک ہلہ کر کے سب مسلمانوں کو ختم کر دیتے، اور اس خیال نے کچھ ایسا اثر کیا کہ پھر واپس مدینہ کی طرف لوٹنے کا اِرادہ ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں پر رُعب ڈال دیا، اور سیدھے مکہ مکرمہ کو ہولئے، لیکن بعض مسافروں سے جو مدینہ کی طرف جارہے تھے یہ کہہ گئے کہ تم جا کر کسی طرح مسلمانوں کے دِل میں ہمارا رُعب جماؤ کہ وہ پھر لوٹ کر آرہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بات معلوم ہوگئی، اس لئے آپ ان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہنچے۔ (ابن جریر، کذا فی الروح) [1]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اُحد کے دُوسرے دِن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مجاہدین میں اِعلان فرمایا کہ ہمیں مشرکین کا تعاقب کرنا ہے، مگر اس میں صرف وہی لوگ جاسکیں گے جو کل کے معرکہ میں ہمارے ساتھ تھے، اس اِعلان پر دو سو مجاہدین کھڑے ہوگئے۔ [2]

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِعلان فرمایا کہ کون ہے جو مشرکین کے تعاقب میں جائے، تو ستر حضرات کھڑے ہوگئے، [3] جن میں ایسے لوگ بھی تھے جو گزشتہ کل کے معرکہ میں شدید زخمی ہو چکے تھے، دُوسروں کے سہارے چلتے تھے، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین کے تعاقب میں روانہ ہوئے،

---

[1] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة رقم الحدیث:۸۰۰۳

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۲۷۷

[3] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب الذین استجابوا إلخ ج:۲ ص:۵۸۴

مقام حمراء الاسد پر پہنچے تو وہاں نعیم بن مسعود ملا، اس نے خبر دی کہ ابوسفیان نے اپنے ساتھ مزید لشکر جمع کر کے پھر یہ طے کیا ہے کہ پھر مدینہ پر چڑھائی کریں اور اہلِ مدینہ کا اِستیصال کریں، زخم خوردہ ضعیف صحابہؓ اس خبرِ وحشت اثر کو سن کر یک زبان ہو کر بولے کہ ہم اس کو نہیں جانتے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے، اور وہی بہتر مددگار ہے۔

اس طرف تو مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے یہ خبر دِی گئی، اور مسلمان اس سے متأثر نہیں ہوئے، دُوسری طرف معبد خزاعی بنی خزاعہ کا ایک آدمی مدینہ سے مکہ کی طرف جارہا تھا، یہ اگرچہ مسلمان نہ تھا مگر مسلمانوں کا خیر خواہ تھا، اس کا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف تھا، اس لئے جب راستہ میں مدینہ سے لوٹے ہوئے ابوسفیان کو دیکھا کہ وہ اپنے لوٹنے پر پچھتا رہا ہے اور پھر واپسی کی فکر میں ہے تو اس نے ابوسفیان کو بتایا کہ تم دھوکے میں ہو کہ مسلمان کمزور ہو گئے، میں ان کے بڑے لشکر کو حمراء الاسد میں چھوڑ کر آیا ہوں، جو پورے ساز و سامان سے تمہارے تعاقب میں نکلا ہے، ابوسفیان پر اس کی خبر نے رُعب ڈال دیا۔

اس واقعہ کا بیان مذکورہ تین آیتوں میں فرمایا گیا ہے، پہلی آیت میں اِرشاد ہے کہ غزوۂ اُحد میں زخم خوردہ ہونے اور مشقتیں برداشت کرنے کے باوجود جب اُن کو دُوسرے جہاد کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو وہ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے، اِس مقام پر ایک اَمر قابلِ غور ہے وہ یہ کہ یہاں جن مسلمانوں کی تعریف بیان کی جارہی ہے ان کے دو وصف بیان کئے گئے، ایک تو مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر تیار ہونے والے وہ لوگ ہیں جن کو اُحد میں زخم پہنچ چکے تھے، اور اُن کے ستر نامور بہادر شہید ہو چکے تھے، اور ان کے جسم بھی زخموں سے چور تھے، لیکن جب اُن کو دُوسری دفعہ بلایا گیا تو وہ فوراً جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔

دُوسرا وصف لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا میں بیان کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ عملی جد و جہد اور جاں نثاری کے عظیم کارناموں کے ساتھ یہ حضرات اِحسان وتقویٰ کی صفاتِ کمال سے بھی آراستہ تھے، اور یہ مجموعہ ہی ان کے اَجرِ عظیم کا سبب ہے۔

اس آیت میں لفظ مِنْهُمْ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ سب لوگ اِحسان وتقویٰ کے حامل نہیں، بلکہ ان میں سے بعض تھے، اس لئے کہ یہاں حرف "مِنْ" تبعیض کے لئے نہیں بلکہ بیانیہ ہے، جس پر خود اسی آیت کے اِبتدائی الفاظ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا شاہد ہیں، کیونکہ یہ اِستجابت واِطاعت بغیر اِحسان وتقویٰ کے ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اکثر مفسرین نے اس جگہ "مِنْ" کو بیانیہ قرار دِیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب لوگ جو اِحسان وتقویٰ کی صفات سے آراستہ تھے ان کے لئے اَجرِ عظیم ہے۔

کسی کام کے لئے صرف جدوجہد اور جاں نثاری کافی نہیں جب تک اِخلاص نہ ہو

البتہ اس خاص عنوان سے ایک اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کوئی کام کتنا ہی نیک ہو، اور اس کے لئے کوئی شخص کتنی ہی جاں نثاری دِکھلائے اللہ کے نزدیک وہ موجبِ اَجر اُسی وقت ہوگی جبکہ اس کے ساتھ اِحسان وتقویٰ بھی ہو، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو، ورنہ محض جاں نثاری اور بہادری کے واقعات تو کفار میں بھی کچھ کم نہیں۔

حکمِ رسول درحقیقت حکمِ خدا ہے

اس واقعہ میں مشرکین کے تعاقب میں جانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، قرآن کی کسی آیت میں مذکور نہیں، مگر اس آیت میں جب ان لوگوں کی اِطاعت شعاری کی مدح فرمائی تو اس حکم کو اللہ اور رسول دونوں کی طرف منسوب کر کے اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فرمایا گیا، جس نے واضح طور پر ثابت کردیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیتے ہیں وہ اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے، اگرچہ اللہ کی کتاب میں مذکور نہ ہو۔

جو بے دِین حدیث کا اِنکار کرتے ہیں، اور رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد کی بتلاتے ہیں (معاذ اللہ) ان کے سمجھنے کے لئے یہ جملہ بھی کافی ہے کہ رسول کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہی حکم قرار دِیا، جس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ رسول خود بھی اپنی صواب دِید پر مصلحت کے مطابق کچھ اَحکام دے سکتے ہیں، اور ان کا وہی درجہ ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے دیئے ہوئے اَحکام کا ہے۔

اِحسان کی تعریف

اِحسان کی تعریف حدیثِ جبریل کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:-

[1] اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔

"یعنی تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہو تو کم از کم یہ حالت تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔"

تقویٰ کی تعریف

تقویٰ کی تعریف متعدّد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی، حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت اُبیّ بن کعبؓ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل إلخ ج: ١ ص: ١٢

نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گزر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کئی بار ہوا ہے، حضرت اُبیّ بن کعبؓ نے فرمایا: ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لئے اور نہایت اِحتیاط سے چلا، حضرت اُبیّ بن کعبؓ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے، یہ دُنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لئے دُنیا میں اس طرح چلنا اور زِندگی گزارنا چاہئے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ اُلجھے، اسی کا نام تقویٰ ہے، جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے ۔

يَقُوْلُ الْمَرْءُ فَائِدَتِيْ وَمَالِيْ
وَتَقْوَى اللّٰهِ اَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

''یعنی لوگ اپنے دُنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ تقویٰ سب سے بہتر سرمایہ ہے۔''

دُوسری آیت میں اس جہاد کے لئے بڑھنے والے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مزید توصیف وتعریف اس طرح کی گئی:-

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا یعنی یہ وہ حضرات ہیں کہ جب ان لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف دُشمنوں نے بڑا سامان اِکٹھا کیا ہے، ان سے ڈرو، جنگ کا اِرادہ نہ کرو، تو اس خبر نے ان کا جوشِ اِیمان اور بڑھا دیا۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اِطاعت جب ان حضرات نے قبول کی تھی تو پہلے ہی دن سے محسوس کرلیا تھا کہ ہم نے جس راستہ پر سفر شروع کیا ہے وہ خطرات سے پُر ہے، قدم قدم پر مشکلات وموانع پیش آئیں گے، ہمارا راستہ روکا جائے گا، اور ہماری اِنقلابی تحریک کو مٹانے کے لئے مسلح کوششیں کی جائیں گی، اس لئے جب یہ حضرات اس قسم کی مشکلات کو دیکھتے تھے تو اِیمان کی قوّت پہلے سے زیادہ ہوجاتی تھی، اور پہلے سے زیادہ جانفشانی اور فداکاری کے ساتھ کام کرنے لگتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان حضرات کا اِیمان تو اِسلام لانے کے اوّل روز ہی سے کامل تھا، لہٰذا ان دونوں آیتوں میں اِیمان کی زیادتی سے اِیمان کی صفات اور اِیمان کے ثمرات کی زیادتی مراد ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر تیار ہوجانے والے صحابہؓ کی اس حالت کو بھی اس جگہ خصوصیت کے ساتھ بیان کیا کہ اس جہاد کے سفر میں تمام راستہ یہ جملہ اُن کے وردِ زبان رہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے زیادہ تو دُنیا

میں کسی کا توکل و اعتماد اللہ تعالیٰ پر نہیں ہوسکتا، لیکن آپ کی صورتِ توکل یہ نہ تھی کہ اسبابِ ظاہرہ کو چھوڑ کر بیٹھے رہتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے، وہ بیٹھے بٹھائے ہمیں غلبہ عطا فرماوے گا، نہیں، بلکہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا، زخم خوردہ لوگوں کے دِلوں میں نئی رُوح پیدا فرمائی، جہاد کے لئے تیار کیا اور نکل کھڑے ہوئے، جتنے اسباب و ذرائع اپنے اِختیار میں تھے وہ سب مہیا اور اِستعمال کرنے کے بعد فرمایا کہ ہمیں اللہ کافی ہے، یہی وہ صحیح توکل ہے جس کی تعلیم قرآن میں دی گئی، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا اور کرایا، اسبابِ ظاہرہ دُنیویہ بھی خدا تعالیٰ کا اِنعام ہیں، ان کو ترک کر دینا اس کی ناشکری ہے، ترکِ اسباب کر کے توکل کرنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، کوئی مغلوبُ الحال ہو تو وہ معذور سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ صحیح بات یہی ہے کہ ؎

برتوکل زانوئے اُشتر بہ بند [۱]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک واقعہ میں اسی آیت حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:-

عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخصوں کا مقدمہ آیا، آپ نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا، یہ فیصلہ جس شخص کے خلاف تھا اس نے فیصلہ نہایت سکون سے سنا، اور یہ کہتے ہوئے چلنے لگا کہ "حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ"، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کو میرے پاس لاؤ، اور فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ يَلُوْمُ عَلَى الْعِجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَإِذَا غَلَبَكَ اَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ [۲]

"یعنی اللہ تعالیٰ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے کو ناپسند کرتا ہے، بلکہ تم کو چاہئے کہ تمام ذرائع اِختیار کرو پھر بھی عاجز ہو جاؤ اس وقت کہو حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔"

تیسری آیت میں ان حضراتِ صحابہؓ کے اِقدامِ جہاد اور حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ کہنے کے فوائد و ثمرات اور برکات کا بیان ہے، فرمایا ہے:-

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ یعنی یہ لوگ اللہ کے اِنعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری ذرا نہ پیش آئی اور یہ لوگ رضائے اِلٰہی کے تابع رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو تین نعمتیں عطا کیں، پہلی نعمت تو یہ کہ کافروں کے قلوب میں رُعب و ہیبت ڈال دی،

---

[۱] ترجمہ:- توکل کے ساتھ اُونٹ کے گھٹنے باندھ دو۔

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب الرجل یحلف علی حقہ ج:۲ ص:۵۱۱

اور وہ لوگ بھاگ گئے جس کی وجہ سے یہ حضرات قتل وقتال سے محفوظ رہے، اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نے ''نعمت'' ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور دُوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ ان حضرات کو حمراء الاسد کے بازار میں تجارت کا موقع ملا اور اس مال سے منافع حاصل ہوئے اس کو لفظِ ''فضل'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تیسری نعمت جو اِن تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے وہ رضائے اِلٰہی کا حصول ہے، جو اس جہاد میں ان حضرات کو خاص انداز میں حاصل ہوئی۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کے جو فوائد و برکات قرآنِ کریم نے بیان فرمائے وہ کچھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ جو شخص بھی جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس کا وِرد کرے وہ یہ برکات حاصل کرے گا۔

مشائخ و علماء نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ پڑھنے کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس آیت کو ایک ہزار مرتبہ جذبۂ ایمان و انقیاد کے ساتھ پڑھا جائے اور دُعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ رَدّ نہیں فرماتا، ہجومِ اَفکار و مصائب کے وقت حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا پڑھنا مجرّب ہے۔

چوتھی آیت میں یہ اِرشاد فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے مشرکین کے دوبارہ لوٹنے کی خبر دینے والا اصل میں شیطان ہے، جو تم کو اپنے اولیاء یعنی ہم مذہب کفار سے ڈرانا چاہتا ہے، تو گویا اصل عبارت میں يُخَوِّفُ کا ایک مفعول محذوف ہے، یعنی ''يُخَوِّفُكُمْ'' اور دُوسرا مفعول اَوْلِيَآءَهٗ مذکور ہے۔

پھر اِرشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو ایسی خبروں سے ہرگز ڈرنا نہیں چاہئے، البتہ مجھ سے ڈرتے رہنا ضروری ہے، یعنی میری اِطاعت کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے ہر مؤمن کو ڈرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ ہو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

خوفِ خدا سے مراد کیا ہے؟

اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں، اور دُوسری آیت میں ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (النحل:۵۰) مگر بعض اکابر نے فرمایا کہ خوفِ خدا رونے اور آنسو پونچھنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ سے ڈرنے والا وہ ہے جو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جس پر اللہ کی طرف سے عذاب کا خطرہ ہو۔

ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر بن فواک بیمار تھے، میں اُن کی عیادت کو گیا، مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے کہا کہ گھبرائیے نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا و عافیت دیں گے، وہ فرمانے لگے کہ کیا تم یہ سمجھے

کہ میں موت کے خوف سے روتا ہوں، بات یہ نہیں، مجھے مابعد الموت کا خوف ہے کہ وہاں کوئی عذاب نہ ہو۔ (قرطبی) [1]

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ

اور غم میں نہ ڈالیں تجھ کو وہ لوگ جو دوڑتے ہیں کفر کی طرف، وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ،

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اللہ چاہتا ہے کہ ان کو فائدہ نہ دے آخرت میں، اور ان کے لئے عذاب ہے بڑا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

جنہوں نے مول لیا کفر کو ایمان کے بدلے وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ، اور ان کے لئے عذاب ہے

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ

دردناک۔ اور یہ نہ سمجھیں کافر کہ ہم جو مہلت دیتے ہیں ان کو کچھ بھلا ہے ان کے حق میں،

اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

ہم تو مہلت دیتے ہیں ان کو تاکہ ترقی کریں وہ گناہ میں، اور ان کے لئے عذاب ہے رُسوا کرنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) جو لوگ کفر میں ایک دُوسرے سے بڑھ کر تیزی دِکھا رہے ہیں، وہ تمہیں صدمے میں نہ ڈالیں۔ یقین رکھو وہ اللہ کا ذرا بھی نقصان نہیں کر سکتے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے، اور ان کے لئے زبردست عذاب (تیار) ہے ﴿۱۷۶﴾ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو مول لے لیا ہے وہ اللہ کو ہرگز ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اُن کے لئے ایک دُکھ دینے والا عذاب (تیار) ہے ﴿۱۷۷﴾ اور جن لوگوں نے کفر اَپنا لیا ہے وہ ہرگز

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۸۳

یہ نہ سمجھیں کہ ہم اُنہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ اُن کے لئے کوئی اچھی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تو انہیں صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہ میں اور آگے بڑھ جائیں، اور (آخرکار) ان کے لئے ایسا عذاب ہوگا جو انہیں ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ ﴿۱۷۸﴾

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں منافقین کی بے وفائی، بدخواہی کا ذِکر تھا، مذکورہ آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور شکستہ خاطر نہ ہوں، وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آخری آیت میں اس خیال کا جواب ہے کہ بظاہر تو دُنیا میں یہ کفار پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں تو ان کو مقہور و مغضوب کیسے سمجھا جائے؟

خلاصۂ تفسیر

اور آپ کے لئے وہ لوگ موجبِ غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر (کی باتوں) میں جا پڑتے ہیں (جیسے منافقین کہ ذرا مسلمانوں کا پلہ ہلکا دیکھا تو کھلم کھلا کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ واقعاتِ مذکورہ میں معلوم ہو چکا ہے) یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے دِین) کو ذرّہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے (اس لئے آپ کو یہ غم تو ہونا نہیں چاہئے کہ ان کی حرکتوں سے اللہ کے دِین کو ضرر پہنچ جائے گا، اور اگر آپ کو خود ان کافروں کا غم ہو کہ یہ بدنصیب کیوں جہنم کی طرف جا رہے ہیں تو بھی آپ غم نہ کریں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو (تکوینی طور پر) یہ منظور ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہ دے (اس لئے ان سے موافقت کی اُمید رکھنا صحیح نہیں، اور رَنج وہیں ہوتا ہے جہاں اُمید ہو) اور (ان کے لئے صرف آخرت کی نعمتوں سے محرومی ہی نہیں بلکہ) ان لوگوں کو سزائے عظیم بھی ہوگی (اور جس طرح یہ لوگ دِینِ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح) یقیناً جتنے لوگوں نے اِیمان (کو چھوڑ کر اس) کی جگہ کفر کو اِختیار کر رکھا ہے (خواہ منافق ہوں یا کھلے کافر اور خواہ پاس کے ہوں یا دُور کے) یہ لوگ (بھی) اللہ تعالیٰ (کے دِین) کو ذرّہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور ان کو (بھی پہلے لوگوں کی طرح) دردناک سزا ہوگی، اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو (عذاب سے) مہلت دینا (کچھ) ان کے لئے بہتر (اور مفید) ہے (ہرگز نہیں، بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دے رہے ہیں (جس میں زیادتِ عمر کی وجہ سے) ان کو جرم میں اور ترقی ہو جائے (تا کہ یکبارگی پوری سزا ملے) اور (دُنیا میں اگر سزا نہ ہوئی تو کیا ہے، آخرت میں تو) ان کو توہین آمیز سزا ہوگی۔

معارف و مسائل

کفار کی دُنیوی عیش و عشرت بھی درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے

یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مہلت اور عمرِ دراز اور عافیت و راحت کے سامان اس لئے دیئے ہیں کہ وہ اپنے جرم میں اور بڑھتے جائیں تو پھر کفار بے قصور ہوئے، کیونکہ مقصود آیت کا یہ ہے کہ کفار کی اس چندروزہ مہلت اور عیش و عشرت سے مسلمان پریشان نہ ہوں، کیونکہ باوجود کفر و عصیان کے ان کو دُنیوی قوت، طاقت، سامانِ دُنیا یہ بھی اُن کے عذاب ہی کی ایک صورت ہے، جس کا اِحساس آج نہیں اس دُنیا سے جانے کے بعد ہوگا کہ یہ دُنیا کا سامانِ راحت جو انہوں نے گناہوں میں خرچ کیا، درحقیقت جہنم کے انگارے تھے، جیسا کئی آیتوں میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا (التوبۃ:۵۵) یعنی کفار کے اموال اور عیش و عشرت ان کے لئے کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے عذاب ہی کی ایک قسط ہے، جو ان کے عذابِ آخرت بڑھانے کا سبب ہے۔

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ حَتّٰی یَمِیۡزَ الۡخَبِیۡثَ

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو جب تک کہ جدا نہ کردے ناپاک کو

مِنَ الطَّیِّبِ ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطۡلِعَکُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ

پاک سے، اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے غیب کی لیکن اللہ چھانٹ لیتا ہے

مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا

اپنے رسولوں میں جس کو چاہے، سو تم یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری پر

فَلَکُمۡ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

تو تم کو بڑا ثواب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ ایسا نہیں کرسکتا کہ مؤمنوں کو اُس حالت پر چھوڑے رکھے جس پر تم لوگ اِس وقت ہو، جب تک وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کردے۔ اور (دُوسری طرف) وہ ایسا بھی نہیں کرسکتا کہ تم کو (براہِ راست) غیب کی باتیں بتادے۔ ہاں! وہ (جتنا بتانا مناسب سمجھتا ہے اس کے لئے) اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر اِیمان رکھو۔ اور اگر اِیمان رکھو گے اور تقویٰ اِختیار کرو گے تو زبردست ثواب کے مستحق ہوگے۔ ﴿۱۷۹﴾

ربطِ آیات

پچھلی آیت میں اس شبہ کا جواب تھا کہ جب کفار اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض اور مردُود ہیں تو دُنیا میں ان کو اَموال وجائیداد اور عیش وعشرت کے سامان کیوں حاصل ہیں، مذکورہ آیت میں اس کے بالمقابل اس شبہ کا اِزالہ ہے کہ مؤمن مسلمان جو اللہ کے مقبول بندے ہیں اُن پر تکالیف ومصائب کیوں آتے ہیں، مقبولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ راحتیں اور سامانِ راحت اُن کو ملتا۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو (کہ کفر وایمان اور حق وباطل اور مؤمن ومنافق میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اِنعاماتِ دُنیوی کے اِعتبار سے کوئی اِمتیاز اور فرق نہیں، بلکہ مسلمانوں پر شدائد ومصائب کا نازل ہوتے رہنا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مؤمنِ مخلص) سے ممتاز نہ کردیا جائے (اور یہ تمیز وتبیین مصائب ومشکلات ہی کے پیش آنے پر پوری طرح ہوسکتی ہے، اور اگر کسی کے دِل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مؤمن وکافر اور حق وباطل میں اِمتیاز پیدا کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ حوادث ومصائب ڈال کر ہی یہ اِمتیاز حاصل کیا جائے، اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس کا اِعلان فرماسکتے ہیں کہ فلاں مؤمنِ مخلص ہے اور فلاں منافق، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں حرام، تو اس کا جواب یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (بمقتضائے حکمت) ایسے اُمورِ غیبیہ پر تم کو (بلاواسطہ اِبتلاء واِمتحان کے) مطلع نہیں کر (نا چاہ) تے، لیکن ہاں جس کو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں اور (ایسے حضرات) وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (بلاواسطہ حوادث بھی غیبی خبروں پر مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرمالیتے ہیں (اور تم پیغمبر ہو نہیں، اس لئے ایسے اُمور کی تمہیں اِطلاع نہیں دی جاسکتی، البتہ ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے

مخلص ومنافق کا فرق خود بخود واضح ہوجائے، اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ دُنیا میں کافروں پر عذاب نازل نہ ہونا بلکہ عیش وعشرت ملنا اور مسلمانوں پر بعض مصائب وشدائد نازل ہونا عین تقاضائے حکمت ہے، یہ باتیں کسی کے مقبول یا مردُود ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتیں) پس اب تم (ایمان کے پسندیدہ اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ کرو، بلکہ) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر ومعاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تم کو اَجرِ عظیم ملے۔

معارف ومسائل

مؤمن ومنافق میں اِمتیاز وحی کے بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت

اس آیت میں یہ اِرشاد ہے کہ مؤمنِ مخلص اور منافق میں اِمتیاز کے لئے حق تعالیٰ ایسے حالات حوادث ومشکلات کے پیدا فرماتے ہیں جن سے عملی طور پر منافقین کا نفاق کھل جائے، اور یہ اِمتیاز اگرچہ یوں بھی ہوسکتا تھا کہ بذریعہ وحی منافقین کے نام متعین کرکے بتلادیا جائے، مگر بمقتضائے حکمت ایسا نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کے افعال کی پوری حکمتیں تو اسی کو معلوم ہیں، یہاں ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلادیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں اِحتیاط کے لئے کوئی ایسی واضح حجت نہ ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کرلیں، وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو، ہم تو پکے سچے مسلمان ہیں۔

بخلاف اس پر عملی اِمتیاز کے جو مصائب کے اِبتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق بھاگ کھڑے ہوئے، عملی طور پر ان کا نفاق کھل گیا، اب اُن کا یہ منہ نہیں رہا کہ مؤمن ومخلص ہونے کا دعویٰ کریں۔

اور اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری اِختلاط بھی قطع ہو ورنہ دِل میں اِختلاف کے باوجود ظاہری اِختلاط رہتا تو وہ بھی مضر ہی ہوتا۔

اُمورِ غیب پر کسی کو مطلع کردیا جائے تو وہ علمِ غیب نہیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اُمورِ غیب پر بذریعہ وحی اِطلاع ہر شخص کو نہیں دیتے، البتہ اپنے انبیاء کا اِنتخاب کرکے ان کو دیتے ہیں۔

اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو اَنبیاء علیہم السلام بھی علمِ غیب کے شریک اور عالم الغیب ہوگئے کیونکہ وہ علمِ غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو، کسی دُوسرے کا دِیا ہوا نہ ہو، دُوسرے تمام کائنات ماضی ومستقبل کا علمِ محیط ہو، جس سے کسی ذرّے کا

علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء علیہم السلام کو جو اُمورِ غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علمِ غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو دِی گئی ہیں جن کو خود قرآنِ کریم نے کئی جگہ انباء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا: مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ (ہود:۴۹)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ

اور نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ نے ان کو دی ہے اپنے فضل سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے حق میں،

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

بلکہ یہ بہت بُرا ہے ان کے حق میں، طوق بنا کر ڈالا جائے گا ان کے گلوں میں وہ مال جس میں بخل کیا تھا قیامت کے دن،

ع ۱۸ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ۱۸۰ ع

اور اللہ وارث ہے آسمان اور زمین کا، اور اللہ جو تم کرتے ہو سو جانتا ہے۔

وقف لازم لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ

بے شک اللہ نے سنی ان کی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مال دار،

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا

اب لکھ رکھیں گے ہم ان کی بات اور جو خون کئے ہیں انہوں نے انبیاء کے ناحق اور کہیں گے کہ چکھو

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ۱۸۱ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ

عذاب جلتی آگ کا۔ یہ بدلہ اس کا ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا، اور اللہ ظلم نہیں کرتا

لِّلْعَبِيْدِ ۚ ۝ ۱۸۲ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ

بندوں پر۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا

حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ

جب تک نہ لاوے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے اس کو آگ، تو کہہ: تم میں آچکے کتنے رسول مجھ سے پہلے

بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

نشانیاں لے کر اور یہ بھی جو تم نے کہا، پھر اُن کو کیوں قتل کیا تم نے اگر تم سچے ہو؟

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ

پھر اگر یہ تجھ کو جھٹلاویں تو پہلے تجھ سے جھٹلائے گئے بہت رسول جو لائے نشانیاں اور صحیفے

وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ

اور کتاب روشن۔ ہر جی کو چکھنی ہے موت، اور تم کو پورے بدلے ملیں گے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ

قیامت کے دن، پھر جو کوئی دُور کیا گیا دوزخ سے اور داخل کیا گیا جنت میں اس کا کام تو بن گیا،

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ

اور نہیں زندگانی دُنیا کی مگر پونجی دھوکہ کی۔ البتہ تمہاری آزمائش ہوگی مالوں میں

وَاَنْفُسِكُمْ ۣ قف وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور جانوں میں، اور البتہ سنوگے تم اگلی کتاب والوں سے

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ

اور مشرکوں سے بدگوئی بہت، اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ

مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

ہمت کے کام ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ اس (مال) میں بخل سے کام لیتے ہیں جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات ہے۔ اس کے برعکس یہ ان کے حق میں بہت بُری بات ہے۔ جس مال میں انہوں نے بخل سے کام لیا ہوگا، قیامت کے دن وہ ان کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ اور سارے آسمان اور زمین کی میراث صرف اللہ ہی کے لئے ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۸۰﴾ اللہ نے اُن لوگوں کی بات سن لی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔" ہم اُن کی یہ بات بھی (ان کے اعمال نامے میں) لکھے لیتے ہیں، اور انہوں نے انبیاء کو جو ناحق قتل کیا ہے، اس کو بھی، اور (پھر) کہیں گے کہ: "دہکتی آگ کا مزہ چکھو ﴿۱۸۱﴾ یہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے جو تم نے آگے بھیج رکھا تھا، ورنہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" ﴿۱۸۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ: "اللہ نے ہم سے یہ وعدہ لیا ہے کہ کسی پیغمبر پر اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لے کر نہ آئے جسے آگ کھا جائے۔" تم کہو کہ: "مجھ سے پہلے تمہارے پاس بہت سے پیغمبر کھلی نشانیاں بھی لے کر آئے اور وہ چیز بھی جس کے بارے میں تم نے (مجھ سے) کہا ہے۔ پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم واقعی سچے ہو؟" ﴿۱۸۳﴾ (اے پیغمبر!) اگر پھر بھی یہ لوگ تمہیں جھٹلائیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سے اُن رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے جو کھلی کھلی نشانیاں بھی لائے تھے، لکھے ہوئے صحیفے بھی اور ایسی کتاب بھی جو (حق کو) روشن کر دینے والی تھی ﴿۱۸۴﴾ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تم سب کو (تمہارے اعمال کے) پورے پورے بدلے قیامت ہی کے دن ملیں گے۔ پھر جس کسی کو دوزخ سے دُور ہٹا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ صحیح معنی میں کامیاب ہو گیا، اور یہ دُنیوی زندگی تو (جنت کے مقابلے میں) دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں ﴿۱۸۵﴾ (مسلمانو!) تمہیں اپنے مال و دولت اور جانوں کے معاملے میں (اور) آزمایا جائے گا، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین دونوں سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اور اگر تم نے صبر اور تقوی سے کام لیا تو یقیناً یہی کام بڑی ہمت کے ہیں (جو تمہیں اختیار کرنے ہیں) ﴿۱۸۶﴾

ربطِ آیات

سورۂ آلِ عمران کے شروع میں یہودیوں کی بُری خصلتوں اور شرارتوں کا ذِکر تھا، یہاں سے پھر اسی کی طرف عود کیا گیا، آیاتِ مذکورہ سب اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں، درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور مسلمانوں کے لئے نصائح کا ذِکر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہرگز نہ خیال کریں ایسے لوگ جو (ضروری مواقع میں) ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات اُن کے لئے کچھ اچھی ہوگی، (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بُری ہے (کیونکہ انجام اس کا یہ ہوگا کہ) وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنائے جائیں گے اس (مال) کا (سانپ بنا کر) جس میں انہوں نے بخل کیا تھا اور (بخل کرنا یوں بھی حماقت ہے کہ) اخیر میں (جب سب مرجاویں گے) سب آسمان وزمین (اور جو کائنات اُن کے اندر ہیں سب) اللہ ہی کا رہ جاوے گا (لیکن اس وقت یہ مال اللہ کے لئے ہوجانے سے تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا، کیونکہ تم نے اپنے اِختیار سے نہیں دیئے، اور جب انجامِ کار سب اللہ ہی کا ہونا ہے تو عقل کی بات یہ ہے کہ ابھی اپنے اِختیار سے دے دو تاکہ ثواب کے مستحق بنو) اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لے جو کچھ خرچ کرو اِخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کرو)۔

بے شک اللہ نے سن لیا ہے اُن (گستاخ) لوگوں کا قول جنہوں نے (اِستہزاءً) یوں کہا کہ (نعوذ باللہ منہ) اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مال دار ہیں (اور صرف اس سننے پر اِکتفا نہیں کیا جاوے گا بلکہ) ہم ان کے کہے ہوئے کو (ان کے نامۂ اَعمال میں) لکھ کر رہیں گے اور (اسی طرح) ان کا انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنا بھی (ان کے نامۂ اَعمال میں لکھا جاوے گا) اور ہم (اُن پر سزا جاری کرنے کے وقت جتلانے کے لئے) کہیں گے کہ (لو) چکھو آگ کا عذاب (اور ان کو رُوحانی رنج دینے کے لئے اس وقت یہ بھی کہا جاوے گا کہ) یہ (عذاب) اُن اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔ وہ (یہود) ایسے لوگ ہیں کہ (بالکل جھوٹ تراش کر) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو (بواسطۂ انبیائے سابقین) حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر (ی کے مدعی) پر اِعتقاد (ان کے پیغمبر ہونے کا) نہ لاویں جب تک ہمارے سامنے معجزہ (خاص) نذر ونیاز خداوندی کا ظاہر نہ کرے کہ اس کو (آسمانی) آگ کھا جاوے (پہلے بعض انبیاء علیہم السلام کا یہ معجزہ ہوا ہے کہ کوئی چیز جاندار یا بے جان اللہ

کے نام کی نکال کر کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دی، غیب سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اس چیز کو جلا دیا، یہ علامت قبولِ صدقات کی ہوتی تھی، مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ خاص معجزہ ظاہر نہیں فرمایا، اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، حق تعالیٰ اس کا جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ فرما دیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل (معجزات وغیرہ) لے کر آئے، اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو، سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا اگر تم (اس امر میں) سچے ہو، سو اگر یہ (کفار) لوگ آپ کی تکذیب کریں تو (غم نہ کیجئے کیونکہ) بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں، تکذیب کی جا چکی ہے، جو معجزات لے کر آئے تھے اور (چھوٹے چھوٹے) صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر (جب کفار کی یہ عادت ہی ہے کہ انبیاء کی تکذیب کیا کرتے ہیں تو پھر آپ کو کیا غم ہے)۔

(تم میں) ہر جان (دار) کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور (مرنے کے بعد) تم کو پوری پاداش تمہاری (بھلائی بُرائی کی) قیامت ہی کے روز ملے گی (اگر دُنیا میں کافروں پر کسی سزا کا ظہور نہ ہو تو اس سے تکذیب کرنے والوں کو خوشی کا اور تصدیق کرنے والوں کو غم کا کوئی موقع نہیں، آگے اس پاداش کی تفصیل ہے) تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، سو پورا کامیاب وہ ہوا (اسی طرح جو جنت سے جدا رہا اور دوزخ میں بھیجا گیا پورا ناکام وہ ہوا) اور دُنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف (ایسی چیز ہے جیسے) دھوکہ کا سودا (ہوتا) ہے (جس کی ظاہری آب و تاب کو دیکھ کر خریدار پھنس جاتا ہے، بعد میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے تو اَفسوس کرتا ہے، اسی طرح دُنیا کی ظاہری چمک دمک سے دھوکا کھا کر آخرت سے غافل نہ ہونا چاہئے)۔

(ابھی کیا ہے) البتہ آگے (آگے) اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں (کے نقصان) میں اور اپنی جانوں (کے نقصان) میں اور البتہ آگے اور سنو گے بہت سی باتیں دِل آزاری کی ان لوگوں سے (بھی) جو تم سے پہلے (آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی اہلِ کتاب سے) اور ان لوگوں سے (بھی) جو کہ مشرک ہیں اور اگر (ان مواقع پر) صبر کرو گے اور (خلافِ شرع اُمور سے) پرہیز رکھو گے تو (تمہارے لئے اچھا ہوگا کیونکہ) یہ (صبر و تقویٰ) تاکیدی اَحکام میں سے ہے۔

معارف و مسائل

مذکورہ سات آیتوں میں سے پہلی آیت میں بخل کی مذمت اور اس پر وعید مذکور ہے۔

بخل کی تعریف اور اس پر سزا کی تفصیل

''بخل'' کے معنیٰ شرعی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو، اس کو خرچ نہ کرے، اسی لئے بخل

حرام ہے اور اس پر جہنم کی وعیدِ شدید ہے۔ اور جن مواقع میں خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، وہ اس بخلِ حرام میں داخل نہیں، البتہ معنیٔ عام کے اِعتبار سے اس کو بھی بخل کہہ دیا جاتا ہے، اس قسم کا بخل حرام نہیں، مگر خلافِ اَولیٰ ہے۔

بخل ہی کے معنی میں ایک دُوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے یعنی "شُحّ" اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے، اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا رہے، تو وہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا يَجْتَمِعُ شُحٌّ وَّاِيْمَانٌ فِيْ قَلْبِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ اَبَدًا۔ [1] (رواه النسائی عن ابی هريرة)

"یعنی شح وایمان کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہوسکتے۔" (قرطبی)

بخل کی جو سزا اس آیت میں ذِکر کی گئی ہے کہ قیامت کے روز جس چیز کے دینے میں بخل کیا اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا، اس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:-

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی مال عطا فرمایا، پھر اس نے اس کی زکوٰۃ اَدا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا، وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔" [2] (نسائی از تفسیر قرطبی)

دُوسری آیت میں یہود کی ایک سخت گستاخی پر تنبیہ اور سزا کا ذِکر ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصدقات کے اَحکام قرآن سے بتلائے تو گستاخ یہود یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ فقیر ومحتاج ہوگیا اور ہم مال دار ہیں جب ہی تو ہم سے مانگتا ہے (نعوذ باللہ منہ) ظاہر یہ ہے کہ اس بیہودہ قول کے موافق ان کا اِعتقاد تو نہ ہوگا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے کہا ہوگا کہ اگر قرآن کی یہ آیات صحیح ہیں تو ان سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ فقیر ومحتاج ہو، ان کا یہ لغو اِستدلال تو بداہۃً باطل ہونے کی وجہ سے قابلِ جواب نہ تھا، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم صدقات کا اپنے نفع کے لئے نہیں، خود اَصحابِ مال کے نفعِ دِینی اور دُنیوی کے لئے ہے، مگر اس کو کہیں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا عنوان اس لئے دے دیا گیا کہ جس طرح قرض کی ادائیگی ہر شریف آدمی کے لئے ضروری اور یقینی ہوتی ہے، اسی طرح جو صدقہ اِنسان دیتا ہے اس کی جزا اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ ایسی قرار دیتے ہیں جیسے کسی کا قرض دینا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق اور مالک

---

[1] سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب فضل من عمل فی سبیل الله إلخ ج:۱ ص:۵۴

[2] سنن النسائی، کتاب الزکوٰة، باب مانع زکوٰة ماله ج:۱ ص:۳۴۳

جانتا ہے، اس کو ان الفاظ سے کبھی وہ شبہ نہیں ہوسکتا جو گستاخ یہودیوں کے اس قول میں ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے اس شبہ کا جواب تو دِیا نہیں، صرف اُن کی گستاخی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ کا اِستہزاء کرنے کے متعدّد شدید جرائم کی سزا میں یہ فرمایا کہ ہم ان کے گستاخانہ کلمات کو لکھ کر رہیں گے تاکہ قیامت کے روز اُن پر حجت تمام کر کے عذاب دیا جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پھر یہود کی اس گستاخی کے ذِکر کے ساتھ ان کا ایک دُوسرا جرم یہ بھی ذِکر کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کی صرف تکذیب و اِستہزاء ہی نہیں کیا، بلکہ قتل کر ڈالنے سے بھی باز نہیں رہے، تو ایسے لوگوں سے کسی نبی و رسول کی تکذیب یا اِستہزاء پر کیا تعجب ہوسکتا ہے۔

کفر و معصیت پر دِل سے راضی ہونا بھی ایسا ہی عظیم گناہ ہے

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے مخاطب یہودِ مدینہ ہیں، اور قتلِ انبیاء کا واقعہ ان سے بہت پہلے حضرت یحییٰ اور زکریا علیہ السلام کے زمانے کا ہے، تو اس آیت میں قتلِ انبیاء کا جرم ان مخاطبین کی طرف کیسے منسوب کیا گیا؟ وجہ یہ ہے کہ یہودِ مدینہ اپنے سابق یہودیوں کے اس فعل پر راضی اور خوش تھے، اس لئے یہ خود بھی قاتلین کے حکم میں شمار کئے گئے۔

[۱] اِمام قرطبیؒ نے فرمایا اپنی تفسیر میں کہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر اور معصیت میں داخل ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اِرشاد اس کی مزید توضیح کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جب زمین پر کوئی گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص وہاں موجود ہو مگر اس گناہ کی مخالفت کرے اور اس کو بُرا سمجھے تو وہ ایسا ہے گویا یہاں موجود نہیں، یعنی وہ ان کے گناہ کا شریک نہیں، اور جو شخص اگرچہ اس مجلس میں موجود نہیں مگر ان کے اس فعل سے راضی ہے وہ باوجود غائب ہونے کے ان کا شریکِ گناہ سمجھا جائے گا، انتہیٰ۔ [۲]

اس آیت کے اَخیر اور تیسری آیت میں ان گستاخوں کی سزا یہ بتلائی ہے کہ ان کو دوزخ میں ڈال کر کہا جائے گا کہ اب آگ میں جلنے کا مزہ چکھو، جو تمہارے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہے، اللہ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں۔

چوتھی آیت میں انہی یہود کا ایک اِفترا و بہتان کا ذِکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے یہ حیلہ پیش کیا کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ صدقات کے مال کسی میدان یا پہاڑ پر

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۹۵

[۲] سنن ابی داوٗد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنھی ج:۲ ص:۵۹۷

رکھ دیئے جاتے تھے اور آسمانی آگ ان کو آ کر جلا دیتی تھی، یہی علامت صدقات کی قبولیت کی ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو حق تعالیٰ نے یہ خاص اِمتیاز عطا فرمایا تھا کہ اموالِ صدقات آسمانی آگ کی نذر کرنے کے بجائے مسلمان فقیروں ومحتاجوں کو دیئے جاتے ہیں، چونکہ پچھلے انبیاء کے طرزِ مذکور کے یہ طرز خلاف تھا، اس لئے اس کو مشرکین نے بہانہ بنایا کہ اگر آپ نبی ہوتے تو آپ کو بھی یہ معجزہ عطا ہوتا کہ آسمانی آگ اموالِ صدقات کو کھا جاتی، اس پر مزید یہ جرأت کی کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بہتان باندھا کہ اس نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ ہم اس شخص پر ایمان نہ لائیں جس سے یہ معجزۂ آسمانی آگ کے آنے اور مالِ صدقہ کو جلانے کا صادر نہ ہو۔

چونکہ یہود کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل اور باطل تھا کہ اللہ نے ان سے یہ عہد لیا ہے، اس کا جواب دینے کی تو ضرورت نہ تھی، ان کو انہی کے مُسلّمہ قول سے مغلوب کرنے کے یہ اِرشاد فرمایا کہ اگر اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایسا عہد لیا ہے، تو پھر جن انبیائے سابقین نے تمہارے کہنے کے مطابق یہ معجزہ بھی دِکھلایا تھا کہ آسمانی آگ مالِ صدقہ کو کھا گئی، تو تم ان پر تو اِیمان لاتے، مگر ہوا یہ کہ تم نے ان کی بھی تکذیب ہی کی، بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگرچہ یہود کا یہ دعویٰ اور مطالبہ قطعاً غلط تھا، لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ہو جاتا تو شاید اِیمان لے آتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ محض عناد اور ہٹ دھرمی سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں، اگر ان کے کہنے کے مطابق معجزہ ہو بھی جاتا، جب بھی اِیمان نہ لاتے۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کی تکذیب پر آپ غمگین نہ ہوں، کیونکہ یہ معاملہ تو سبھی انبیاء کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔

فکرِ آخرت سارے غموں کا علاج اور شبہات کا جواب ہے

چھٹی آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اگر کبھی کسی جگہ کافروں کو غلبہ ہی ہو جائے اور دُنیا کی عیش وعشرت پوری پوری مل جائے اور مسلمانوں کو اس کے برعکس کچھ مصائب ومشکلات اور اسبابِ دُنیا کی تنگی بھی پیش آ جائے، تو یہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ غمگین ہونے کی، کیونکہ اس حقیقت سے کسی مذہب ومشرب والے کو اور کسی فلسفہ والے کو اِنکار نہیں ہو سکتا کہ دُنیا کی رنج وراحت دونوں چند روزہ ہیں، کوئی جاندار موت سے نہیں بچ سکتا، اور دُنیا کی راحت ومصیبت اکثر تو دُنیا ہی میں حالات بدل کر ختم ہو جاتی ہے، اور بالفرض دُنیا میں نہ بدلی تو موت پر سب کا خاتمہ ہو جانا یقینی ہے، عقل مند کا کام اس چند روزہ راحت ورنج کی فکر میں پڑے رہنا نہیں، بلکہ مابعد الموت کی فکر کرنا ہے کہ وہاں کیا ہوگا؟۔

دورانِ بقاء چو بادِ صحرا بگذشت
تلخی وخوشی وزشت وزیبا بگذشت [1]

اسی لئے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا، اور پھر آخرت میں اپنے عمل کی جزا وسزا پائے گا، جو شدید بھی ہوگی اور مدید بھی، تو عقل مند کو فکر اس کی کرنی چاہئے، اس کی رُو سے کامیاب صرف وہ شخص ہے جس کو دوزخ سے چھٹکارا مل جائے اور جنت میں داخل ہو جائے، خواہ ابتداءً ہی، جیسا کہ صلحاء وعباد کے ساتھ معاملہ ہوگا، یا کچھ سزا بھگتنے کے بعد، جیسا کہ گنہگار مسلمانوں کے ساتھ ہوگا، مگر مسلمان سب کے سب آخر کار جہنم سے نجات پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی راحتوں اور نعمتوں کے مالک بن جائیں گے، بخلاف کفار کے کہ ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہے، وہ اگر دُنیا کی چند روزہ راحت پر مغرور ہوں تو دھوکا ہی دھوکا ہے، اسی لئے آخرِ آیت میں فرمایا کہ دُنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، کیونکہ عموماً یہاں کی لذتیں آخرت کی شدید کلفتوں کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور یہاں کی تکالیف بیشتر آخرت کے لئے ذخیرہ ہو جاتی ہیں۔

اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اِیذائیں پہنچنا ایک قدرتی امر ہے، اور سب کا علاج صبر وتقویٰ ہے

ساتویں آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، جس کا ذِکر اِجمالی ابھی مذکور الصدر دُوسری آیت میں آچکا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جب آیت مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (البقرۃ: ۲۴۵) نازل ہوئی، جس میں ایک بلیغ عنوان میں صدقہ وخیرات اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا ہے، اور اس بلیغ عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ یہاں دوگے اس کا بدلہ آخرت میں ایسا یقینی ہو کر ملے گا جیسے کسی کا قرض ادا کیا جاتا ہے۔

ایک جاہل یا معاند یہودی نے اس کو سن کر یہ الفاظ کہے: اِنَّ اللّٰہَ فَقِیۡرٌ وَّنَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو اس کی گستاخی پر غصہ آیا اور یہودی کے ایک طمانچہ رسید کیا، یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ الآیۃ، جس میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ دِین کے لئے جان ومال کی قربانیوں سے اور کفار ومشرکین اور اہلِ کتاب کی بدزبانی کی اِیذاؤں سے گھبرانا نہیں چاہئے، یہ سب ان کی آزمائش ہے، اور اس میں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر سے کام لیں اور اپنے اصل مقصد تقویٰ کی تکمیل میں مصروف رہیں، اُن کی جواب دہی کی فکر میں نہ پڑیں۔

---

[1] ترجمہ:- زندگی صحرا کی ہوا کی طرح گزر گئی، غمی خوشی، اچھی بُری حالت گزر گئی۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ

اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کروگے لوگوں سے

وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

اور نہ چھپاؤگے پھر پھینک دیا انہوں نے وہ عہد اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید کیا اس کے بدلے تھوڑا مول،

فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا

سو کیا برا ہے جو خریدتے ہیں۔ تو نہ سمجھ کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنے کئے پر

وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ

اور تعریف چاہتے ہیں بن کئے پر، سو مت سمجھ ان کو کہ چھوٹ گئے

مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

عذاب سے، اور ان کے لئے عذاب ہے دردناک۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان کی اور زمین کی،

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹ ۹ ۱۰

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (ان لوگوں کو وہ وقت نہ بھولنا چاہئے) جب اللہ نے اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ: "تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے ضرور کھول کھول کر بیان کروگے، اور اس کو چھپاؤگے نہیں" پھر انہوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلی۔ اس طرح کتنی بُری ہے وہ چیز جو یہ مول لے رہے ہیں! ﴿۱۸۷﴾ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جو لوگ اپنے کئے پر بڑے خوش ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اُن کی تعریف ان کاموں پر بھی کی جائے جو انہوں نے کئے ہی نہیں، ایسے

لوگوں کے بارے میں ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ وہ عذاب سے بچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کے لئے دردناک سزا (تیار) ہے ﴿۱۸۸﴾ اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت صرف اللہ کی ہے، اور اللہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے ﴿۱۸۹﴾

ربطِ آیات

جیسا کہ پچھلی آیات میں یہودیوں کے افعالِ بد اور بُری خصلتوں کا بیان تھا، مذکورہ پہلی آیت میں ان کے ایک ایسے ہی بُرے عمل کا ذِکر ہے، اور وہ ہے عہد و پیمان کی خلاف ورزی، کیونکہ اہلِ کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام جو تورات میں آئے ہیں وہ اُن کی اِشاعت عام کریں گے، اور کسی حکم کو اپنی نفسانی غرض سے چھپائیں گے نہیں، اہلِ کتاب نے یہ عہد توڑ دیا، اَحکام کو چھپایا، اور پھر دلیری یہ کی کہ اس پر خوشی کا اِظہار کیا، اور اپنے اس فعل کو قابلِ تعریف قرار دیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور (یہ حالت بھی قابلِ ذِکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (کتبِ سابقہ میں) اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا (یعنی ان کو حکم فرمایا اور انہوں نے قبول کرلیا) کہ اس کتاب کے (سب مضامین) عام لوگوں کے رُوبرو بیان کر دینا اور اس (کے کسی مضمون) کو (دُنیوی غرض سے) پوشیدہ نہ رکھنا، سو اُن لوگوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک دیا (یعنی اس پر عمل نہ کیا) اور اس کے مقابلہ میں (دُنیا کا) کم حقیقت معاوضہ لے لیا، سو بُری چیز ہے جس کو وہ لوگ لے رہے ہیں (کیونکہ انجام اس کا سزائے دوزخ ہے)۔

(اے مخاطب!) جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار (بد) پر خوش ہوتے ہیں اور جو (نیک) کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ (دُنیا میں) خاص طور کے عذاب سے بچاؤ (اور حفاظت) میں رہیں گے (ہرگز نہیں بلکہ دُنیا میں بھی کچھ سزا ہوگی) اور (آخرت میں بھی) ان کو دردناک سزا ہوگی۔

اور اللہ ہی کے لئے (خاص) ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

علمِ دِین کو چھپانا حرام اور بغیر عمل کئے اس پر مدح و تعریف کا اِنتظار و اِہتمام مذموم ہے

مذکورہ تین آیتوں میں علمائے اہلِ کتاب کے دو جرم اور ان کی سزا کا بیان ہے، اوّل یہ کہ ان کو حکم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ

کی کتاب میں جو اَحکام آئے ہیں ان کو سب کے سامنے بے کم وکاست بیان کریں گے، اور کسی حکم کو چھپائیں گے نہیں، مگر انہوں نے اپنی دُنیوی اغراض اور طمع نفسانی کی خاطر اس عہد کی پروانہ کی، بہت سے اَحکام کو لوگوں سے چھپالیا۔

دُوسرے یہ کہ وہ نیک عمل کرتے تو ہیں نہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر عمل کے اُن کی تعریف کی جائے۔

اَحکامِ توراۃ کو چھپانے کا واقعہ تو صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ایک بات پوچھی کہ کیا یہ توراۃ میں ہے؟ ان لوگوں نے چھپالیا، اور جو توراۃ میں تھا اس کے خلاف بیان کردیا، اور اپنے اس عملِ بد پر خوش ہوتے ہوئے واپس آئے کہ ہم نے خوب دھوکا دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ان لوگوں کے لئے وعید ہے۔

اور دُوسرا معاملہ نہ کئے ہوئے عمل پر تعریف ومدح کے خواہش مند ہیں یہ ہے کہ منافقینِ یہود کا ایک طرزِ عمل یہ بھی تھا کہ جب کسی جہاد کا وقت آتا تو بہانے کرکے گھر میں بیٹھ جاتے، اور اس طرح جہاد کی مشقت سے بچنے پر خوشیاں مناتے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آتے تو آپ کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا کر عذر بیان کردیتے، اور اس کے طالب ہوتے تھے کہ ان کے اس عمل کی تعریف کی جائے۔ (رواہ البخاری) [1]

قرآنِ کریم نے ان دونوں چیزوں پر ان کی مذمت فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ علمِ دِین اور اَحکامِ خدا اور رسول کو چھپانا حرام ہے، مگر یہ حرمت اسی طرح کے چھپانے کی ہے جو یہود کا عمل تھا کہ اپنی دُنیوی اَغراض سے اَحکامِ خداوندی کو چھپاتے تھے، اور اس پر لوگوں سے مال وصول کرتے تھے، اور اگر کسی دِینی اور شرعی مصلحت سے کوئی حکم عوام پر ظاہر نہ کیا جائے تو وہ اس میں داخل نہیں، جیسا کہ اِمام بخاریؒ نے ایک مستقل باب میں اس مسئلہ کو بحوالۂ اَحادیث بیان فرمایا ہے کہ بعض اوقات کسی حکم کے اِظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے اس خطرہ کی بنا پر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

اور کوئی نیک عمل کرنے کے بعد بھی اس پر مدح وثنا کا اِنتظار و اِہتمام کرے تو عمل کرنے کے باوجود بھی قواعدِ شرعیہ کی رُو سے مذموم ہے، اور نہ کرنے کی صورت میں تو اور بھی زیادہ مذموم ہے، اور طبعی طور پر یہ خواہش ہونا کہ میں بھی فلاں نیک کام کروں اور نیک نام بنوں وہ اس میں داخل نہیں، جبکہ اس نیک نامی کا اِہتمام نہ کرے۔ (بیان القرآن) [2]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ الآیۃ ج:۲ ص:۶۵۶

[2] تفسیر بیان القرآن تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۸۳

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

بے شک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں

لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ

عقل والوں کو۔ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ

اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں، کہتے ہیں: اے رَبّ ہمارے! تو نے یہ عبث نہیں بنایا،

سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ

تو پاک ہے سب عیبوں سے، سو ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے۔ اے رَبّ ہمارے! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا

فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا

سو اس کو رُسوا کردیا، اور نہیں کوئی گنہگاروں کا مددگار۔ اے رَبّ ہمارے! ہم نے سنا کہ ایک پکارنے والا

يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا

پکارتا ہے ایمان لانے کو کہ ایمان لاؤ اپنے رَبّ پر، سو ہم ایمان لے آئے، اے رَبّ ہمارے! اب بخش دے گناہ ہمارے

وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا

اور دُور کردے ہم سے بُرائیاں ہماری اور موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے رَبّ ہمارے! اور دے ہم کو جو

وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

وعدہ کیا تو نے ہم سے رسولوں کے واسطے سے اور رُسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن، بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں اُن عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں ﴿۱۹۰﴾ جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اُٹھتے ہیں کہ) ''اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں۔ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے ﴿۱۹۱﴾ اے ہمارے ربّ! آپ جس کسی کو دوزخ میں داخل کردیں، اسے آپ نے یقیناً رُسوا ہی کردیا۔ اور ظالموں کو کسی قسم کے مددگار نصیب نہ ہوں گے ﴿۱۹۲﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کو سنا جو اِیمان کی طرف پکار رہا تھا کہ ''اپنے پروردگار پر اِیمان لاؤ'' چنانچہ ہم اِیمان لے آئے۔ لہٰذا اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر ہمارے گناہ بخش دیجئے، ہماری بُرائیوں کو ہم سے مٹادیجئے، اور ہمیں نیک لوگوں میں شامل کر کے اپنے پاس بلایئے ﴿۱۹۳﴾ اور اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ کچھ بھی عطا فرمایئے جس کا وعدہ آپ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے کیا ہے، اور ہمیں قیامت کے دن رُسوا نہ کیجئے۔ یقیناً آپ وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کیا کرتے۔'' ﴿۱۹۴﴾

ربطِ آیات

چونکہ اُوپر اِختصاص سے توحید مفہوم ہوئی، اگلی آیت میں توحید پر دلائل لاتے ہیں، اور اس کے ساتھ توحید کے کامل اِقتضاء پر عمل کرنے والوں کی فضیلت بیان فرماتے ہیں، جس میں اِشارۃً دُوسروں کو بھی ترغیب ہے اس اِقتضاء پر عمل کرنے کی۔ اُوپر جو کفار سے اِیذائیں پہنچنے کا مضمون تھا، آیتِ آئندہ کو اس سے بھی مناسبت ہے، اس طرح کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناداً یہ درخواست کی کہ صفا پہاڑ کو سونے کا بنادیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حق کے دلائل تو بہت ہیں، ان میں کیوں نہیں فکر کرتے۔

اور ان لوگوں کی یہ درخواست تحقیقِ حق کے لئے نہ تھی، بلکہ عناداً تھی، جس سے درخواست پورا ہونے پر بھی اِیمان نہ لاتے۔

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دِن کے آنے جانے میں دلائل (توحید کے موجود) ہیں اہلِ عقل (سلیم) کے (اِستدلال کے) لئے جن کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور یہی حالت

ان کے عاقل ہونے کی علامت بھی ہے کیونکہ عقل کا اِقتضاء دفعِ مضرّت وتحصیلِ منفعت ہے اور اس پر اس حالت کا مجموعہ دال ہے وہ حالت یہ ہے) کہ وہ لوگ (ہر حال میں دِل سے بھی اور اس زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی، اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوّتِ عقلیّہ سے) غور کرتے ہیں (کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں جن میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس مخلوق سے خالق تعالیٰ کے وجود پر اِستدلال کیا جاوے) ہم آپ کو (لایعنی پیدا کرنے سے) منزّہ سمجھتے ہیں (اس لئے ہم نے اِستدلال کیا اور توحید کے قائل ہوئے) سو ہم کو (موحد و مؤمن ہونے کی وجہ سے) عذابِ دوزخ سے بچا لیجئے (جیسا کہ شرعاً اس کا یہ مقتضیٰ ہے گو کسی عارض سے یہ اِقتضاء ضعیف ہو جاوے اور چندے عذاب ہونے لگے، ایک عرض تو ان لوگوں کی یہ تھی اور وہ اسی مضمونِ ایمان کے مناسب اور معروضات بھی کرتے ہیں جو آگے آتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! (ہم اس لئے عذابِ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں کہ) بے شک آپ جس کو (بطورِ اَصل جزا کے) دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رُسوا ہی کر دیا، (مراد اس سے کافر ہے) اور ایسے بے اِنصافوں کا (جن کی اصلی جزا دوزخ تجویز کی جاوے) کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں (اور آپ کا وعدہ ہے اہلِ اِیمان کے لئے رُسوا نہ کرنے کا بھی اور نصرت کرنے کا بھی، بس اِیمان لا کر ہماری درخواست ہے کہ کفر کی اصلی جزا سے بچایئے، اِیمان کا اصل مقتضیٰ یعنی دوزخ سے نجات مرتب فرمایئے)۔

اے ہمارے پروردگار! ہم نے (جیسے مصنوعات کی دلالت سے عقلی اِستدلال کیا اسی طرح ہم نے) ایک (حق کی طرف) پکارنے والے کو (مراد اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بواسطہ یا بلا واسطہ) سنا کہ وہ اِیمان لانے کے لئے اِعلان کر رہے ہیں کہ (اے لوگو!) تم اپنے پروردگار (کی ذات وصفات) پر اِیمان لاؤ سو ہم (اس دلیلِ نقلی سے اِستدلال کر کے بھی) اِیمان لے آئے (اس درخواست میں اِیمان باللہ کے ساتھ اِیمان بالرسول بھی ضمناً آ گیا، پس اِیمان کے دونوں جز و یعنی اِعتقادِ توحید و اِعتقادِ رِسالت کامل ہو گئے)۔

اے ہمارے پروردگار! پھر (اس کے بعد ہماری یہ درخواست ہے کہ) ہمارے (بڑے) گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے اور ہماری (چھوٹی) بدیوں کو ہم سے (معاف کر کے) زائل کر دیجئے اور (ہمارا اَنجام بھی جس پر مدار ہے دُرست کیجئے اس طرح کہ) ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ (شامل رکھ کر) موت دیجئے (یعنی نیکی پر خاتمہ ہو)۔

اے پروردگار! اور (جس طرح ہم نے اپنی مضرتوں سے محفوظ رہنے کے لئے درخواست کی ہے جیسے دوزخ و رُسوائی اور ذُنوب و سیئات، اسی طرح ہم اپنے منافع کی دُعا کرتے ہیں کہ) ہم کو وہ چیز (یعنی ثواب و جنت) بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے (کہ مؤمنین و اَبرار کو اَجرِ عظیم ملے گا) اور (یہ ثواب و جنت

ہم کو اس طرح دیجئے کہ ثواب ملنے سے پہلے بھی) ہم کو قیامت کے روز رُسوا نہ کیجئے (جیسا کہ بعض کو اوّل سزا ہوگی پھر جنت میں جاویں گے، مطلب یہ کہ اوّل ہی سے جنت میں داخل کر دیجئے اور) یقیناً آپ (تو) وعدہ خلافی نہیں کرتے (لیکن ہم کو یہ خوف ہے کہ جن کے لئے وعدہ ہے یعنی مؤمنین و اَبرار کہیں ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ ہم ان صفات سے موصوف نہ رہیں جن پر وعدہ ہے، اس لئے ہم آپ سے یہ اِلتجا کرتے ہیں کہ ہم کو اپنے وعدہ کی چیزیں دیجئے، یعنی ہم کو ایسا کر دیجئے اور ایسا ہی رکھئے جس سے ہم وعدہ کے مخاطب و محل ہو جاویں)۔

معارف و مسائل

آیت کا شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق ابنِ حبانؒ نے اپنی صحیح میں اور محدّث ابنِ عساکرؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی وہ مجھے بتلایئے، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپ کی کس شان کو پوچھتے ہو؟ اُن کی تو ہر شان عجیب ہی تھی، ہاں ایک واقعہ عجیب سناتی ہوں، وہ یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میرے پاس تشریف لائے اور لحاف میں میرے ساتھ داخل ہوگئے، پھر فرمایا کہ اِجازت دو کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں، بستر سے اُٹھے، وضو فرمایا، پھر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، اور قیام میں اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینۂ مبارک پر بہہ گئے، پھر رُکوع فرمایا اور اس میں بھی روئے، پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر روئے، پھر سر اُٹھایا، اور مسلسل روتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، حضرت بلالؓ آئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اِطلاع دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضور! اس قدر کیوں گریہ فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں، آپ نے فرمایا: تو کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں؟ اور شکر یہ میں گریہ وزاری کیوں نہ کروں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آج کی شب مجھ پر یہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی ہے: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیۃ، اس کے بعد آپ نے فرمایا: بڑی تباہی ہے اس شخص کے لئے جس نے ان آیتوں کو پڑھا اور ان میں غور نہیں کیا۔ [1]

لہٰذا آیت پر غور و فکر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مسائل پر غور کرنا ہے:-

[1] صحیح ابن حبان، کتاب الرقائق، باب التوبة رقم الحدیث: ۶۲۲

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے کیا مراد ہے؟

پہلا یہ کہ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے کیا مراد ہے؟ خلق مصدر ہے، جس کے معنی ایجاد و اختراع کے ہیں، معنی یہ ہوئے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں، اس لئے اس میں تمام وہ مخلوقات اور مصنوعاتِ باری تعالیٰ بھی داخل ہو جاتی ہیں جو آسمان اور زمین کے اندر ہیں، پھر ان مخلوقات میں قسم قسم کی مخلوقات ہیں، جن میں ہر ایک کے خواص و کیفیات علیحدہ علیحدہ ہیں، اور ہر مخلوق اپنے خالق کی پوری طرح نشان دہی کر رہی ہے، پھر اگر زیادہ غور کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اَلسَّمٰوٰتِ میں تمام رفعتیں داخل ہیں، اور اَلْاَرْضِ میں تمام پستیاں داخل ہیں، سو جس طرح اللہ تعالیٰ رفعتوں کا خالق ہے اسی طرح پستیوں کا بھی خالق ہے۔

اِختلافِ لیل ونہار کی مختلف صورتیں

دُوسرا یہ کہ اِختلافِ لیل ونہار سے کیا مراد ہے؟ لفظ ''اِختلاف'' اس جگہ عربی کے اس محاورہ سے مأخوذ ہے کہ "اِخْتَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا" یعنی وہ شخص فلاں شخص کے بعد آیا، پس اِختلاف اللیل والنہار کے معنی یہ ہوئے کہ رات جاتی ہے اور دِن آتا ہے، اور دِن جاتا ہے تو رات آتی ہے۔

اِختلاف کے دُوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اِختلاف سے زیادتی و کمی مراد لی جائے سردیوں میں رات طویل ہوتی ہے اور دِن چھوٹا ہوتا ہے، اور گرمیوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اسی طرح رات دِن میں تفاوت ملکوں کے تفاوت سے بھی ہوتا ہے، مثلاً جو ممالک قطبِ شمالی سے قریب ہیں ان میں دن زیادہ طویل ہوتا ہے، بہ نسبت ان شہروں کے جو قطبِ شمالی سے دُور ہیں، اور ان اُمور میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر روشن دلیل ہے۔

لفظِ ''آیات'' کی تحقیق

تیسرا اَمر یہ ہے کہ لفظِ ''آیات'' کے کیا معنی ہیں؟ ''آیات'' آیۃ کی جمع ہے، اور یہ لفظ چند معانی کے لئے بولا جاتا ہے، آیات، معجزات کو بھی کہا جاتا ہے، اور قرآن مجید کی آیات پر بھی اس کا اِطلاق ہوتا ہے، اس کے تیسرے معنی دلیل اور نشانی کے بھی ہیں، یہاں پر یہی تیسرے معنی مراد ہیں، یعنی ان اُمور میں اللہ کی بڑی نشانیاں اور قدرت کے دلائل ہیں۔

چوتھا امر ''أولوا الألباب'' کے معنی سے متعلق ہے، الباب، لب کی جمع ہے، جس کے معنی مغز کے ہیں، اور ہر چیز کا مغز اس کا خلاصہ ہوتا ہے، اور اسی سے اس کی خاصیت وفوائد معلوم ہوتے ہیں، اسی لئے اِنسانی عقل کو لب کہا گیا ہے، کیونکہ عقل ہی انسان کا اصلی جوہر ہے، ''أولوا الألباب'' کے معنی ہیں عقل والے۔

عقل والے صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور ہر حال میں اس کا ذِکر کرتے ہیں

اب یہاں یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ عقل والوں سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیونکہ ساری دُنیا عقل مند ہونے کی مدعی ہے، کوئی بیوقوف بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے قرآنِ کریم نے عقل والوں کی چند ایسی علامات بتلائی ہیں جو درحقیقت عقل کا صحیح معیار ہیں۔ پہلی علامت اللہ تعالیٰ پر اِیمان ہے، غور کیجئے تو محسوسات کا علم، کان، آنکھ، ناک، زبان وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے، جو بے عقل جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے، اور عقل کا کام یہ ہے کہ علامات وقرائن اور دلائل کے ذریعے کسی ایسے نتیجے تک پہنچ جائے جو محسوس نہیں ہے، اور جس کے ذریعہ سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی کو پایا جاسکے۔

اس اُصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کائناتِ عالم پر غور کیجئے، آسمان اور زمین اور ان میں سمائی ہوئی تمام مخلوقات اور ان کی چھوٹی بڑی چیزوں کا مستحکم اور حیرت انگیز نظام عقل کو کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتا ہے جو علم وحکمت اور قوت وقدرت کے اِعتبار سے سب سے زیادہ بالاتر ہو، اور جس نے ان تمام چیزوں کو خاص حکمت سے بنایا ہو، اور جس کے اِرادہ اور مشیت سے یہ سارا نظام چل رہا ہو، اور وہ ہستی ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہی کی ہوسکتی ہے، کسی عارف کا قول ہے ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید[1]

اِنسانی اِرادوں اور تدبیروں کے فیل ہونے کا ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس کو اس نظام کا چلانے والا نہیں کہا جاسکتا، اس لئے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات کی پیدائش میں غور وفکر کرنے کا نتیجہ عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اِطاعت وذِکر ہے، جو اس سے غافل ہے وہ عقل مند کہلانے کا مستحق نہیں، اس لئے قرآنِ کریم نے عقل والوں کی یہ علامت بتلائی: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے، مراد یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دُنیا نے جس چیز کو عقل اور عقل مندی کا معیار سمجھ لیا ہے، وہ محض ایک دھوکا ہے، کسی نے مال ودولت سمیٹ لینے کو عقل مندی قرار دے دیا، کسی نے مشینوں کے کل پُرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اَصلی پاور

---

[1] ترجمہ:- جو گھاس بھی زمین سے اُگتی ہے وحدہٗ لاشریک لہٗ کہتی ہے۔

سمجھ لینے کا نام عقل مندی رکھ دیا، لیکن عقلِ سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام لے کر آئے کہ علم وحکمت کے ذریعہ سلسلۂ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تمہیں سائنس نے پہنچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھو، تا کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی، مٹی یا لوہے، تانبے کا ہے، نہ مشین کا، نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا، بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی اور ہوا پیدا کی، جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ تمہارے ہاتھ آئی ؎

کارِ زُلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند [1]

اس کو ایک عامیانہ محسوس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رُک جاتی ہے، اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے، تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو روک دیتی اور چلا دیتی ہے، تو علم وعقل والے اس کو احمق کہیں گے، اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں، بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے، لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کہے گا کہ انجن ڈرائیور کو پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم اور بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا، لیکن ایک فلاسفر یا سائنس داں اس کو بھی یہ کہہ کر بیوقوف بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے، لیکن حکمت وفلسفہ یہاں آکر تھک جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم! جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت اور پاور کا مالک سمجھ بیٹھنا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا مالک سمجھ لینا بھی تیری فلسفیانہ غلطی ہے، ایک قدم اور آگے بڑھ، تا کہ تجھے اس اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آئے، اور سلسلۂ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہو جائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں اور پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے، اور یہ اسٹیم تیار ہوئی۔

اس تفصیل سے آپ نے معلوم کرلیا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں، اور ہر وقت ہر حال میں اس کو یاد کریں، اسی لئے اُولی الالباب کی صفت قرآنِ کریم نے یہ بتلائی: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

---

[1] ترجمہ:- مشک کی مہک تمہاری زُلفوں ہی کی وجہ سے ہے البتہ عاشقوں نے کسی مصلحت کی خاطر چین کے ہرن پر یہ تہمت لگادی ہے۔

اس لئے حضراتِ فقہائے کرامؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انتقال سے قبل یہ وصیت کر جائے کہ میرا مال عقلاء کو دے دیا جائے، تو کس کو دیا جائے گا؟ اس کے جواب میں حضراتِ فقہائے کرامؒ نے تحریر فرمایا کہ ایسے عالم زاہد اس مال کے مستحق ہوں گے جو دُنیا طلبی اور غیر ضروری مادّی وسائل سے دُور ہوں، کیونکہ صحیح معنی میں وہی عقلاء ہیں۔ (درمختار، کتاب الوصیة) [۱]

اس جگہ یہ اَمر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت میں ذِکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا، لیکن ذِکر کے متعلق اِرشاد ہے کہ: اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ (الاحزاب)، وجہ اس کی یہ ہے کہ ذِکر کے سوا سب عبادات کے لئے کچھ شرائط اور قواعد ہیں، جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں، بخلاف ذِکر کے کہ اس کو اِنسان کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے، باوضو ہو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت اَنجام دے سکتا ہے، اس آیت میں شاید اسی حکمت کی طرف اِشارہ ہے۔

آیتِ مذکورہ میں عقل والوں کی دُوسری علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی تخلیق و پیدائش میں تفکر کرتے ہیں: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ الآیۃ۔

یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ اس تفکر سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے؟

فکر اور تفکر کے لفظی معنی غور کرنے اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ہیں، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذِکر عبادت ہے اسی طرح فکر بھی ایک عبادت ہے، فرق یہ ہے کہ ذِکر تو اللہ جل شانہٗ کی ذات وصفات کا مطلوب ہے، اور فکر و تفکر اس کی مخلوقات میں مقصود ہے، کیونکہ ذات وصفاتِ اِلٰہیہ کی حقیقت کا اِدراک اِنسان کی عقل سے بالاتر ہے، اس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر بجز حیرانی کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا، عارفِ رُومیؒ نے فرمایا۔

دور بینانِ بارگاہِ الست
غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست [۲]

بلکہ بعض اوقات حق جل شانہٗ کی ذات وصفات میں زیادہ غور و فکر اِنسان کی ناقص عقل کے لئے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے اکابر اہلِ معرفت کی وصیت ہے کہ: "تَفَكَّرُوْا فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور و فکر کرو، مگر خود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں غور و فکر نہ کرو کہ وہ تمہاری رسائی سے بالاتر ہے۔ آفتاب کی رُوشنی میں ہر چیز کو دیکھا جا سکتا ہے، مگر خود آفتاب کو کوئی دیکھنا چاہے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، ذات وصفات کے مسئلہ میں تو بڑے بڑے ماہر فلاسفہ اور جہانوں کی سیر کرنے والے اَربابِ معرفت نے آخر کار یہی نصیحت کی ہے کہ ۔

---

[۱] الدر المختار، کتاب الوصایا ج:۶ ص:۶۵۶

[۲] ترجمہ:- عہدِ الست پر نظر رکھنے والے اللہ کے سوا کسی چیز کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ وہ ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن[۱]

البتہ غور وفکر اور عقل کی دوڑ دُھوپ کا میدان مخلوقاتِ الٰہیہ ہیں، جن میں صحیح غور وفکر کا لازمی نتیجہ ان کے خالق جل شانہٗ کی معرفت ہے، اتنا عظیم الشان، وسیع وعریض آسمان اور اس میں آفتاب ومہتاب اور دُوسرے ستارے جن میں کچھ ثوابت ہیں جو دیکھنے والوں کو اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں، کوئی بہت آہستہ حرکت ہو تو اس کا علم پیدا کرنے والے ہی کو ہے، اور انہی ستاروں میں کچھ سیارات ہیں، جن کے دورے نظامِ شمسی وقمری وغیرہ کے انداز میں نہایت محکم ومضبوط قانون کے تحت مقرّر ومتعین ہیں، نہ ایک سیکنڈ اِدھر ہوتے ہیں، نہ ان کی مشینری کا کوئی پُرزہ گھستا ہے، نہ ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو کسی ورکشاپ میں بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اس کی مشینری کبھی رنگ وروغن چاہتی ہے، ہزاروں سال سے ان کے مسلسل دورے اسی نظامِ محکم اور معین اوقات کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اسی طرح زمین کا پورا کرّہ، اس کے دریا اور پہاڑ، اور دونوں میں طرح طرح کی مخلوقات درخت اور جانور اور زمین کی تہ میں چھپی ہوئی معدنیات، اور زمین وآسمان کے درمیان چلنے والی ہوا، اور اس میں پیدا ہونے اور برسنے والی برق وباراں اور اس کے مخصوص نظام، یہ سب کے سب سوچنے، سمجھنے والے کے لئے کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتے ہیں جو علم وحکمت اور قوّت وقدرت میں سب سے بالاتر ہے، اور اسی کا نام معرفت ہے، تو یہ غور وفکر معرفتِ الٰہیہ کا سبب ہونے کی وجہ سے بہت بڑی عبادت ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: "تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ" (ابنِ کثیر)[۲] یعنی "ایک گھڑی آیاتِ قدرت میں غور کرنا، پوری رات کی عبادت سے بہتر اور زیادہ مفید ہے۔"

اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس غور وفکر کو افضل عبادت فرمایا ہے۔ (ابنِ کثیر)[۳]

حسن بن عامرؒ نے فرمایا کہ میں نے بہت سے صحابہ کرامؓ سے سنا ہے، سب یہ فرماتے تھے کہ ایمان کا نور اور روشنی تفکر ہے۔

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نگاہ پڑتی ہے میں کھلی آنکھوں دیکھتا ہوں کہ اس میں میرے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور اس کے وجود میں میرے لئے عبرت حاصل کرنے کا سامان موجود ہے (ابنِ کثیر)۔[۴] اسی کو بعض عارفین نے فرمایا کہ ؎

۱ ترجمہ:- ہر جگہ (عقل کے) گھوڑے نہیں دوڑائے جاسکتے، بہت سی جگہوں پر تلوار ڈالنی پڑتی ہے۔

۲ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۸۴

۳ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۸۵

۴ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۸۴

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید [۱]

حضرت سفیان بن عیینہؒ کا اِرشاد ہے کہ غور وفکر ایک نور ہے جو تیرے دِل میں داخل ہو رہا ہے۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کثرت سے غور وفکر کرے گا تو حقیقت سمجھ لے گا، اور جو سمجھ لے گا اس کو علمِ صحیح حاصل ہو جائے گا، اور جس کو علمِ صحیح حاصل ہو گیا وہ ضرور عمل بھی کرے گا۔ (ابنِ کثیر) [۲]

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ ایک بزرگ کا گزر ایک عابد زاہد کے پاس ہوا، جو ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کے ایک طرف قبرستان تھا اور دُوسری طرف گھروں کا کوڑا کباڑ وغیرہ تھا، گزرنے والے بزرگ نے کہا کہ دُنیا کے دو خزانے تمہارے سامنے ہیں، ایک اِنسانوں کا خزانہ جس کو قبرستان کہتے ہیں، دُوسرا مال و دولت کا خزانہ جو فضلات اور گندگی کی صورت میں ہے، یہ دونوں خزانے عبرت کے لئے کافی ہیں۔ (ابنِ کثیر) [۳]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے قلب کی اِصلاح ونگرانی کے لئے شہر سے باہر کسی ویرانہ کی طرف نکل جاتے تھے، اور وہاں پہنچ کر کہتے: "اَیْنَ اَھْلُكَ" یعنی تیرے بسنے والے کہاں گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص:۸۸) یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے (ابنِ کثیر)۔ [۴] اس طرح تفکر کے ذریعہ آخرت کی یاد اپنے قلب میں مستحضر کرتے تھے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت میں تفکر کرتے تو اس کی معصیت و نافرمانی نہ کر سکتے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے ضعیف الخلقت آدمی! تو جہاں بھی ہو خدا سے ڈر، اور دُنیا میں ایک مہمان کی طرح بسر کر، اور مساجد کو اپنا گھر بنالے، اور اپنی آنکھوں کو خوفِ خدا سے رونے کا اور جسم کو صبر کا اور قلب کو تفکر کا عادی بنادے، اور کل کے رزق کی فکر نہ کر۔

آیتِ مذکورہ میں اسی فکر و تفکر کو عقل مند اِنسان کا اعلیٰ وصف کر کے بیان فرمایا ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر کر کے حق تعالیٰ کی معرفت اور دُنیا کی ناپائیداری کا علم حضوری حاصل کر لینا افضل عبادت اور نورِ ایمان ہے، اسی طرح آیاتِ اِلٰہیہ کو دیکھنے اور برتنے کے باوجود خود ان مخلوقات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اُلجھ کر رہ جانا اور ان کے

---

[۱] ترجمہ:- جو گھاس بھی زمین سے اُگتی ہے، وحدہٗ لاشریک لہٗ کہتی ہے۔

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۸۴

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۸۵

[۴] بحوالۂ بالا۔

ذریعہ مالکِ حقیقی کی معرفت حاصل نہ کرنا سخت نادانی اور ناسمجھ بچوں کی سی حرکت ہے، مولانا جامیؒ نے اسی کو فرمایا ہے ؎

ہمہ اندر زمن ترا ازین است
کہ تو طفلی وخانہ رنگین است [1]

اوراسی بے بصیرتی کو حضرت مجذوبؒ نے اس طرح بیان فرمایا ؎

کچھ بھی مجنوں جو بصیرت تجھے حاصل ہوجائے
تو نے لیلیٰ جسے سمجھا ہے وہ محمل ہوجائے

بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائناتِ عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے، آج کی سائنٹفک اور حیرت انگیز اِیجادات اور ان میں اُلجھ کر رہ جانے والے موجدین کی خدا تعالیٰ اور اپنے انجامِ کار سے غفلت حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہے کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں خدا تعالیٰ کی کمالِ صنعت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں، اتنا ہی وہ خدا شناسی اور حقیقت آگاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں، بقول اکبر مرحوم ؎

بھول کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

قرآنِ کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق اِرشاد فرمایا ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (یوسف) یعنی آسمان اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں، اُن کی حقیقت وصنعت اور ان کے صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ومصنوعات میں غور وفکر کر کے اس کی عظمت وقدرت کا اِستحضار ایک اعلیٰ عبادت ہے، اُن سے کوئی عبرت حاصل نہ کرنا سخت نادانی ہے۔ آیت مذکورہ کے آخری جملے نے آیاتِ قدرت میں غور وفکر کا نتیجہ یہ بتلایا ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یعنی حق تعالیٰ کی عظیم اور غیر محصور مخلوقات میں غور وفکر کرنے والا اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے فضول وبیکار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خلقت میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں، ان سب کو اِنسان کا خادم اور اِنسان کو مخدومِ کائنات بنا کر انسان کو اس غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ ساری کائنات تو اس کے فائدے کے لئے بنی ہے، اور اِنسان خدا تعالیٰ کی طاعت وعبادت کے لئے پیدا ہوا ہے، یہی اس کا مقصدِ زندگی ہے، اس کے بعد غور وفکر اور تفکر وتدبر کے نتیجہ میں وہ لوگ اس حقیقت پر پہنچے کہ کائناتِ عالم فضول وبیکار پیدا نہیں کی گئی، بلکہ یہ

---

[1] ترجمہ:- یہ سب کچھ میں نے تمہیں اس لئے کہا ہے کہ تم فی الحال بچے اور خانہ رنگین ہو (یعنی رنگوں کے شیدائی ہو)۔

سب خالق کائنات کی عظیم قدرت و حکمت کے روشن دلائل ہیں۔

آگے ان لوگوں کی چند درخواستوں اور دُعاؤں کا ذِکر ہے، جو انہوں نے اپنے ربّ کو پہچان کر اس کی بارگاہ میں پیش کیں:-

پہلی درخواست یہ ہے کہ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ یعنی ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائیے۔

دُوسری درخواست یہ ہے کہ ہمیں آخرت کی رُسوائی سے بچائیے، کیونکہ جن کو آپ نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو سارے جہان کے سامنے رُسوا کر دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ میدانِ حشر کے اندر رُسوائی ایک ایسا عذاب ہوگا کہ آدمی یہ خواہش کرے گا کہ کاش! اسے جہنم میں ڈال دیا جائے اور اس کی بدکاریوں کا چرچا اہلِ محشر کے سامنے نہ ہو۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف سے آنے والے منادی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا، اور اس پر ایمان لائے تو آپ ہمارے بڑے گناہوں کو معاف فرمادیں، اور ہمارے عیوب اور بُرائیوں کا کفارہ فرمادیں اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دیں، یعنی ان کے زُمرے میں شامل فرمالیں۔

یہ تین درخواستیں تو عذاب اور تکلیف اور مضرّت سے بچنے کے لئے تھیں، آگے چوتھی درخواست فوائد اور منافع حاصل کرنے کے متعلق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو وعدہ آپ نے جنت کی نعمتوں کا فرمایا ہے، وہ ہمیں اس طرح عطا فرمائیے کہ قیامت میں رُسوائی بھی نہ ہو، یعنی اوّل مؤاخذہ اور بدنامی، بعد میں معافی کی صورت کے بجائے اوّل ہی سے معافی فرمادیجئے، آپ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے، مگر اس عرض معروض کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اس قابل بنادیجئے کہ ہم یہ وعدہ حاصل کرنے کے مستحق ہوجائیں، اور پھر اس پر قائم رہیں، یعنی خاتمہ ایمان اور عملِ صالح پر ہو۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ

پھر قبول کی ان کی دُعا ان کے ربّ نے کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی تم میں سے مرد ہو

اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

یا عورت، تم آپس میں ایک ہو، پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے

وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ

اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے البتہ دُور کروں گا میں اُن سے بُرائیاں ان کی اور داخل کروں گا ان کو

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، یہ بدلہ ہے اللہ کے ہاں سے، اور اللہ کے ہاں ہے

حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ط ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ

اچھا بدلہ۔ تجھ کو دھوکا نہ دے چلنا پھرنا کافروں کا شہروں میں، یہ فائدہ ہے

قَلِيْلٌ قف ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ

تھوڑا سا، پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ لیکن جو لوگ ڈرتے رہے اپنے ربّ سے

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط

اُن کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، ہمیشہ رہیں گے ان میں مہمانی ہے اللہ کے ہاں سے،

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ

اور جو اللہ کے ہاں ہے سو بہتر ہے نیک بختوں کے واسطے۔ اور کتاب والوں میں بعضے وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لا لَا يَشْتَرُوْنَ

اور جو اُترا تمہاری طرف اور جو اُترا اُن کی طرف عاجزی کرتے ہیں اللہ کے آگے نہیں خریدتے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ

اللہ کی آیتوں پر مول تھوڑا، یہی ہیں جن کے لئے مزدوری ہے ان کے ربّ کے ہاں، بے شک اللہ

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾

جلد لیتا ہے حساب۔

آسان ترجمۂ قرآن

چنانچہ اُن کے پروردگار نے ان کی دُعا قبول کی (اور کہا) کہ: "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب آپس میں ایک جیسے ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے ہجرت کی، اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا، اور میرے راستے میں تکلیفیں دی گئیں، اور جنہوں نے (دِین کی خاطر) لڑائی لڑی اور قتل ہوئے، میں ان سب کی بُرائیوں کا ضرور کفارہ کردوں گا، اور انہیں ضرور بالضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے اِنعام ہوگا، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین اِنعام ہے ﴿۱۹۵﴾ جن لوگوں نے کفر اَپنالیا ہے ان کا شہروں میں (خوشحالی کے ساتھ) چلنا پھرنا تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے ﴿۱۹۶﴾ یہ تو تھوڑا سا مزہ ہے (جو یہ اُڑا رہے ہیں) پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بدترین بچھونا ہے ﴿۱۹۷﴾ لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوئے عمل کرتے ہیں، اُن کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ کی طرف سے میزبانی کے طور پر وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لئے کہیں بہتر ہے ﴿۱۹۸﴾ اور بیشک اہلِ کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کے آگے عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ پر بھی اِیمان رکھتے ہیں، اُس کتاب پر بھی جو تم پر نازل کی گئی ہے اور اُس پر بھی جو اُن پر نازل کی گئی تھی، اور اللہ کی آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر بیچ نہیں ڈالتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے پاس اپنے اَجر کے مستحق ہیں۔ بیشک اللہ حساب جلد چکانے والا ہے۔ ﴿۱۹۹﴾

ربطِ آیات

سابقہ آیات میں مؤمنینِ صالحین کی چند دُعاؤں کا ذِکر تھا، مذکورہ پہلی آیت میں ان دُعاؤں کی قبولیت اور ان کے اعمالِ صالحہ کے اَجرِ عظیم کا بیان ہے۔ دُوسری، تیسری آیتوں میں یہ ہدایت ہے کہ کفار کے ظاہری عیش و عشرت، مال و دولت اور دُنیا میں چلنے پھرنے سے مسلمانوں کو کوئی دھوکا نہ ہونا چاہئے، کہ وہ چند روزہ ہے، اور پھر عذابِ دائمی۔

چوتھی آیت میں پھر تقویٰ شعار مسلمانوں کے لئے جنت کی لازوال نعمتوں کا وعدہ ہے، پانچویں میں خصوصیت سے اُن مسلمانوں کے اجرِ عظیم کا ذِکر ہے جو پہلے اہلِ کتاب میں سے تھے پھر مسلمان ہوگئے۔

خلاصۂ تفسیر

سو قبول کرلیا ان کی دُعاؤں کو ان کے رَبّ نے اس وجہ سے (کہ میری عادت مستمرّہ ہے کہ) میں کسی شخص کے

(نیک) کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا (کہ اس کا بدلہ نہ دیا جائے) خواہ وہ (کام کرنے والا) مرد ہو یا عورت (دونوں کے لئے ایک ہی قانون ہے، کیونکہ) تم (دونوں) آپس میں ایک دُوسرے کے جزو ہو (اس لئے حکم بھی دونوں کا ایک سا ہی ہے، پس جب انہوں نے ایمان قبول کر کے بڑا نیک عمل کیا، اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات کی درخواست کی تو میں نے ان کی دُعا و درخواست کو اپنی عادتِ مستمرّہ کے مطابق منظور کر لیا اور جب ہم ایمان پر ایسے ثمرات عطا فرماتے ہیں) تو جن لوگوں نے (ایمان کے ساتھ اور اعمالِ شاقہ بھی کئے جیسے ہجرت یعنی) ترکِ وطن کیا اور (وہ بھی ہنسی خوشی، سیر و سیاحت کے لئے نہیں، بلکہ اس طرح کہ) اپنے گھروں سے (تنگ کر کے) نکالے گئے اور (اس کے سوا طرح طرح کی) تکلیفیں (بھی) دیئے گئے (اور یہ باتیں یعنی ہجرت اور وطن سے نکالنا اور مختلف قسم کی ایذائیں سب) میری راہ میں (یعنی میرے دِین کے سبب ان کو پیش آئیں اور ان سب کو انہوں نے برداشت کیا) اور (اس سے بڑھ کر انہوں نے یہ کام کیا کہ) جہاد (بھی) کیا اور (بہت سے ان میں سے) شہید (بھی) ہو گئے (اور آخر تک جہاد سے نہ ہٹے، تو ایسے محنت کے اعمال پر ثمرات اور نعمتیں کیوں نہ ملیں گی) ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں (جو میرے حقوق کے متعلق ہو گئی ہوں) معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی (ان کو) یہ بدلہ ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس (یعنی اس کے قبضۂ قدرت میں) اچھا عوض ہے (مذکورہ آیات میں مسلمانوں کی کلفتوں کا بیان اور اس کا انجامِ نیک مذکور تھا، آگے کافروں کے عیش و آرام اور اس کے انجامِ بد کا ذِکر ہے، تاکہ مسلمانوں کی تسلی ہو اور بدعمل لوگوں کو اِصلاح اور توبہ کی توفیق ہو)۔

لَا یَغُرَّنَّكَ (اے طالبِ حق!) تجھ کو ان کافروں کا (کسبِ معاش یا تفریحات کے لئے) چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے (کہ اس حالت کی کچھ وقعت کرنے لگے) یہ چند روزہ بہار ہے (کیونکہ مرتے ہی اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا، اور) پھر (انجام یہ ہوگا کہ) ان کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ بُری ہی آرام گاہ ہے، لیکن (ان میں سے بھی) جو لوگ خدا سے ڈریں (اور مسلمان و فرمانبردار ہو جائیں) ان کے لئے بہشتی باغات ہیں جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ (ان کی) مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے، اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں (جن کا ابھی ذِکر ہوا، یعنی بہشتی باغ اور نہریں وغیرہ) یہ نیک بندوں کے لئے بدرجہا بہتر ہیں (کفار کی چند روزہ عیش و مسرّت سے)۔

(مذکورہ آیاتِ دُعا سے پہلے اہلِ کتاب کی بُری خصلتوں اور ان کے عذاب و انجامِ بد کا مسلسل ذِکر آیا ہے، آگے ان لوگوں کا ذِکر ہے جو اہلِ کتاب میں سے مسلمان صالح ہو گئے، اس لئے قرآن کی عام عادت کے مطابق بدکرداروں کے قبائح کے بعد نیکوکاروں کی مدائح کا ذِکر ہے)

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اور بالیقین بعضے لوگ اہلِ کتاب میں سے ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ پر اِعتقاد رکھتے ہیں، اوراس کتاب کے ساتھ بھی (اِعتقادر کھتے ہیں) جو تمہارے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اوراس کتاب کے ساتھ بھی (اِعتقاد رکھتے ہیں) جواُن کے پاس بھیجی گئی (یعنی توراۃ اور اِنجیل اور خدا کے ساتھ جو اِعتقاد رکھتے ہیں تو) اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے (بھی) ہیں (اس لئے اس اِعتقاد میں حدود سے تجاوز نہیں کرتے کہ اللہ پر اولاد کی تہمت لگائیں، یا اَحکام میں اِفتراء کریں، اور توراۃ واِنجیل کے ساتھ جو اِعتقاد رکھتے ہیں تو اس طور پر کہ) اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلہ میں (دُنیا کا) کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (اور اس میں کچھ دیر بھی نہ لگے گی، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب (کتاب) کردیں گے (اور حساب کتاب کرتے یہ سب کا دینا لینا بے باق کردیں گے)۔

معارف ومسائل

ہجرت اور شہادت سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں، مگر قرض وغیرہ حقوق العباد کی معافی کا وعدہ نہیں

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ کے تحت خلاصۂ تفسیر میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ اللہ کے حقوق میں جو کوتاہیاں اور گناہ ہوئے وہ معاف ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں قرض اور دَین کا مستثنیٰ ہونا بیان فرمایا ہے، اس کی معافی کا ضابطہ یہی ہے کہ خود یا اس کے وارث ان حقوق کو اَدا کردیں یا معاف کرادیں، اور کسی شخص پر حق تعالیٰ خاص فضل فرمادیں اور اَصحابِ حق کو اس سے راضی کرکے معاف کرادیں یہ اور بات ہے، اور بعض کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو، اور ڈرتے رہو اللہ سے

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۲۰۰ ع ۲۰ ۱۱

تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اِیمان والو! صبر اِختیار کرو، مقابلے کے وقت ثابت قدمی دِکھاؤ، اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے جمے رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ (۲۰۰)

ربطِ آیات

یہ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت ہے، مسلمانوں کے لئے چند اہم وصیتوں پر مشتمل ہے، گویا پوری سورت کا خلاصہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! (تکالیف پر) خود صبر کرو اور (جب کفار سے مقاتلہ ہو تو) مقاتلہ میں صبر کرو اور (اِحتمالِ مقاتلہ کے وقت) مقابلے کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ حدودِ شرعیہ سے نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں لازمی اور ضروری اور بعض اوقات دُنیا میں بھی)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں تین چیزوں کی وصیت مسلمانوں کو کی گئی ہے: صبر، مصابرہ، مرابطہ، اور چوتھی چیز تقویٰ ہے، جو اِن تینوں کے ساتھ لازم ہے۔

''صبر'' کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں، اور اِصطلاحِ قرآن وسنت میں نفس کو خلافِ طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو ''صبر'' کہا جاتا ہے، جس کی تین قسمیں ہیں:-

اوّل: صبر علی الطاعات:- یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

دُوسرے: صبر عن المعاصی:- یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ نفس کے لئے کتنی ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو ان سے روکنا۔

تیسرے: صبر علی المصائب:- یعنی مصیبت وتکلیف پر صبر کرنا حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف وراحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

''مصابرت'' اسی لفظ ''صبر'' سے مأخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دُشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔ ''مرابطہ'' یہ لفظ ''ربط'' سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی باندھنے کے ہیں، اور اسی وجہ سے ''رباط'' اور ''مرابطہ'' کے معنی گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لئے جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں اسی معنی کے لئے آیا ہے وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (الانفال:٦٠) اِصطلاحِ قرآن وحدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لئے اِستعمال کیا گیا ہے:-

اوّل اِسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لئے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے، تاکہ دُشمن اسلامی سرحد کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

دُوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی سے دُوسری نماز کے اِنتظار میں رہے، یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے فضائل بے شمار ہیں، ان میں سے چند یہاں لکھے جاتے ہیں:-

رباط یعنی اسلامی سرحد کی حفاظت کا اِنتظام

اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں قیام کرنے کو ''رباط'' اور ''مرابطہ'' کہا جاتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کسی جنگ کا خطرہ سامنے نہیں، سرحد مامون ومحفوظ ہے، محض حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی نگرانی کرنا ہے، ایسی حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ آدمی وہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے بسنے لگے اور زمین کی کاشت وغیرہ سے اپنا معاش پیدا کرتا رہے، اس حالت میں اگر اس کی اصل نیت حفاظتِ سرحد کی ہے، رہنا بسنا اور کسبِ معاش اس کے تابع ہے تو اس شخص کو بھی رباط فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا، خواہ کبھی جنگ نہ کرنا پڑے، لیکن جس کی اصل نیت حفاظتِ سرحد نہ ہو بلکہ اپنا گزارہ ہی مقصد ہو خواہ اتفاقی طور پر سرحد کی حفاظت کی بھی نوبت آجائے، یہ شخص مرابط فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ سرحد پر دُشمن کے حملے کا خطرہ ہے، ایسی حالت میں عورتوں بچوں کو وہاں رکھنا دُرست نہیں، صرف وہ لوگ رہیں جو دُشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ (قرطبی) [١]

ان دونوں صورتوں میں رباط کے فضائل بے شمار ہیں، صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ کے راستہ میں ایک دِن کا رباط تمام دُنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔'' [٢] اور صحیح مسلم میں بروایت سلمان رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ایک دن رات کا رباط ایک مہینہ کے مسلسل روزے اور تمام شب عبادت میں گزارنے سے بہتر ہے، اور اگر وہ اسی حال میں مرگیا تو اس

[١] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:٤ ص:٣٢٤

[٢] صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب فضل رباط یوم إلخ ج:١ ص:٤٠٥

کے عملِ رباط کا روزانہ ثواب ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رِزق جاری رہے گا اور وہ شیطان سے مامون ومحفوظ رہے گا۔'' [۱]

اور ابوداؤد نے بروایت فضالہ بن عبید نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے، بجز مرابط کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے، اور قبر میں حساب وکتاب لینے والوں سے مامون ومحفوظ رہتا ہے۔ [۲]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عملِ رباط ہر صدقۂ جاریہ سے بھی زیادہ افضل ہے، کیونکہ صدقۂ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان، زمین، یا تصانیفِ کتب یا وقف کی ہوئی کتابوں وغیرہ سے لوگ فائدہ اُٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہوجائے تو ثواب بھی بند ہوجاتا ہے، مگر مرابط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک منقطع ہونے والا نہیں، وجہ یہ ہے کہ سب مسلمانوں کو اَعمالِ صالحہ پر قائم رہنا جب ہی ممکن ہے جبکہ وہ دُشمن کے حملوں سے محفوظ ہوں تو ایک مرابط کا عمل تمام مسلمانوں کے اعمالِ صالحہ کا سبب بنتا ہے، اسی لئے قیامت تک اس کے عملِ رباط کا ثواب بھی جاری رہے گا، اور اس کے علاوہ وہ جتنے نیک کام دُنیا میں کیا کرتا تھا ان کا ثواب بھی بغیر عمل کئے ہمیشہ جاری رہے گا، جیسا کہ ابنِ ماجہ [۳] میں باسنادِ صحیح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

مَنْ مَّاتَ مُرَابِطًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُجْرِیَ عَلَیْہِ اَجْرُ عَمَلِہِ الصَّالِحِ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُہٗ وَاُجْرِیَ عَلَیْہِ رِزْقُہٗ وَاَمِنَ مِنَ الْفَتَّانِ وَبَعَثَہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اٰمِنًا مِّنَ الْفَزَعِ۔ (از تفسیر قرطبی)

''جو شخص حالتِ رباط میں مرجائے تو وہ جو کچھ عملِ صالح دُنیا میں کیا کرتا تھا اُن سب اعمال کا ثواب برابر جاری رہے گا، اور اس کا رِزق بھی جاری رہے گا، اور شیطان سے (یا سوالِ قبر سے) محفوظ رہے گا، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسا مطمئن اُٹھائیں گے کہ محشر کا کوئی خوف اس پر نہ ہوگا۔''

اس رِوایت میں جو فضائل مذکور ہیں ان میں شرط یہ ہے کہ حالتِ رباط ہی میں اس کی موت آجائے، مگر بعض دُوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ بھی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ گیا تو یہ ثواب پھر بھی جاری رہے گا۔

حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی کمزور

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، فضل الرباط فی سبیل اللہ ج:۲ ص:۱۴۲

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الجھاد، باب فی فضل الرباط ج:۱ ص:۳۳۸

[۳] سنن ابن ماجۃ، ابواب الجھاد، باب فضل الرباط فی سبیل اللہ ج:۱ ص:۱۹۸

سرحد کی حفاظت اِخلاص کے ساتھ ایک دن رمضان کے علاوہ دُوسرے دنوں میں کرنے کا ثواب سو سال کے مسلسل روزوں اور شب بیداری سے افضل ہے، اور رمضان میں ایک دن کا رباط افضل واعلیٰ ہے ایک ہزار سال کے صیام وقیام سے (اس لفظ میں راوی نے کچھ تردّد کا اِظہار کیا ہے) پھر فرمایا: اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح سالم اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹا دیا تو ایک ہزار سال اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا، اور نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور اس کے عملِ رباط کا اَجر قیامت تک جاری رہے گا۔ (قرطبی) [1]

نمازِ باجماعت کی پابندی ایک نماز کے بعد دُوسری کے اِنتظار میں رہنا بھی رباط فی سبیل اللہ ہے

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چیز بتاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیں اور تمہارے درجات بلند کریں، وہ چیزیں یہ ہیں: وضو کو مکمل طور پر کرنا باوجودیکہ سردی یا کسی زخم ودرد وغیرہ کے سبب اعضائے وضو کا دھونا مشکل نظر آرہا ہو، اور مسجد کی طرف کثرت سے جانا اور ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کا اِنتظار، پھر فرمایا: ذٰلکم الرباط (یعنی یہی رباط فی سبیل اللہ ہے)۔ [2]

اِمام قرطبیؒ نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حدیث کی رُو سے اُمید ہے کہ جو شخص ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کے اِنتظار کی پابندی کرے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وہ ثوابِ عظیم عطا فرمادیں گے جو رباط فی سبیل اللہ کے لئے احادیث میں مذکور ہے۔ [3]

فائدہ:- اس آیت میں اوّل تو مسلمانوں کو "صبر" کا حکم دیا گیا ہے جو ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ ہوسکتا ہے، اور اس کی تفصیل اُوپر بیان ہوچکی ہے، دُوسرا حکم "مصابرہ" کا جو کفار سے مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت ہوتا ہے، تیسرا حکم "مرابطہ" کا جو کفار سے مقابلہ کا اِحتمال اور خطرہ لاحق ہونے کے وقت ہوتا ہے، اور سب سے آخر میں "تقویٰ" کا حکم ہے جو ان سب کاموں کی رُوح اور قبولیتِ اعمال کا مدار ہے، یہ مجموعہ تقریباً تمام اَحکامِ شرعیہ پر حاوی ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو ان اَحکام پر عمل کرنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائیں، وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ۔

سورۂ آلِ عمران تمام شد

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۳۲۵۔ وکنز العمال رقم الحدیث:۱۰۷۴۵ حرف الجیم۔
[2] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل إسباغ الوضوء إلخ ج:۱ ص:۱۲۷
[3] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۳۲۶

سُورَةُ النِّسَآءِ

اٰیاتها ۱۷٦ ۴ سُورَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ ۹۲ رکوعاتها ۲۴

سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ایک سو چھہتر آیتیں اور چوبیس رُکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ

اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے ربّ سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے

وَّ خَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَ بَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ

اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں، اور ڈرتے رہو اللہ سے

الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ① وَ اٰتُوا

جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔ اور دے ڈالو

الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ

یتیموں کو ان کا مال اور بدل نہ لو بُرے مال کو اچھے مال سے، اور نہ کھاؤ ان کے مال

اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

اپنے مالوں کے ساتھ، یہ ہے بڑا وبال۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دُنیا میں) پھیلا دیئے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دُوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رِشتہ داریوں (کی حق تلفی سے) ڈرو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے ۝۱ اور یتیموں کو ان کے مال دے دو، اور اچھے مال کو خراب مال سے تبدیل نہ کرو، اور اُن (یتیموں) کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ بیشک یہ بڑا گناہ ہے ۝۲

ربطِ آیات وسورت

سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت تقویٰ پر ختم ہوئی ہے، اور یہ سورت بھی حکم تقویٰ سے شروع ہو رہی ہے، پہلی سورت میں بعض غزوات اور مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے اور غزوات کے سلسلہ میں مالِ غنیمت حاصل ہونے پر خیانت کی مذمت، اور بعض دیگر اُمور کا ذِکر تھا، اس سورت کے شروع میں اپنوں سے میل جول یعنی حقوق العباد سے متعلق اَحکام ہیں، مثلاً یتیموں کے حقوق، رِشتہ داروں اور بیویوں کے حقوق وغیرہ، لیکن حقوق کچھ تو ایسے ہیں جو قانونِ انضباط میں آسکتے ہیں، اور ان کی ادائیگی بزورِ قانون کرائی جاسکتی ہے، جیسے عام معاملات بیع وشراء، اِجارہ ومزدوری کے ذریعہ پیدا ہونے والے حقوق، جو باہمی معاہدات اور صلح کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں، اگر کوئی فریق مقرّرہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو بزورِ حکومت بھی دِلوائے جاسکتے ہیں، لیکن اولاد، والدین، شوہر اور بیوی ویتیم بچے جو اپنی تحویل میں ہوں، اور دُوسرے رشتہ دار ان کے باہمی حقوق جو ایک دُوسرے پر عائد ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی کا مدار، ادب، اِحترام، دِلداری، ہمدردی اور قلبی

خیر خواہی پر ہے، اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کس کانٹے میں تولی نہیں جاسکتیں، اور معاہدات کے ذریعہ بھی ان کی پوری تعیین مشکل ہے، لہٰذا اُن کی ادائیگی کے لئے بجز خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کے کوئی دُوسرا ذریعہ نہیں، جس کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ تقویٰ کی طاقت حکومت اور قانون کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس سورت کو امر بالتقویٰ سے شروع فرمایا، اور اِرشاد ہوا:-

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ یعنی ''اے لوگو! اپنے رَبّ کی مخالفت سے ڈرو'' اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو خطبۂ نکاح میں پڑھا کرتے تھے، اور خطبۂ نکاح میں اس کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ خطاب یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کے ذریعے فرمایا گیا ہے، جس میں تمام اِنسان شامل ہیں، مرد ہوں یا عورت، اور نزولِ قرآن کے وقت موجود ہوں یا آئندہ قیامت تک پیدا ہوں۔ پھر حکم اِتَّقُوْا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے لفظِ ''رَبّ'' کو اِختیار کیا گیا، جس میں امر تقویٰ کی علت اور حکمت کی طرف اِشارہ فرمادیا کہ جو ذات تمہاری پرورِش کی کفیل ہے اور جس کی شانِ رُبوبیت کے مظاہر اِنسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس کی مخالفت اور سرکشی کس قدر خطرناک ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی رَبّ تعالیٰ کی ایک خاص شان کا ذِکر فرمایا کہ اس نے اپنی حکمت و رحمت سے تم سب کو پیدا کیا، پھر پیدا کرنے اور موجود کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی تھیں، ان میں سے ایک خاص صورت کو اِختیار فرمایا، کہ سب اِنسانوں کو ایک ہی اِنسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کر کے سب کو اُخوّت و برادری کے ایک مضبوط رشتہ میں باندھ دیا، علاوہ خوفِ خدا و آخرت کے اس رشتۂ اُخوّت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ باہمی ہمدردی و خیر خواہی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں، اور اِنسان اِنسان میں ذات پات کی اُونچ نیچ، نسلی اور لونی یا لسانی اِمتیازات کو شرافت و رذالت کا معیار نہ بنایا جائے، اس لئے فرمایا:-

اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً یعنی ''اپنے اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے، آدم علیہ السلام سے اس طرح پیدا فرمایا کہ پہلے ان کی بیوی حضرت حوّاء کو پیدا کیا، پھر اس جوڑے کے ذریعہ بہت سے مرد اور عورتیں پیدا فرمائیں۔''

غرض یہ پوری آیت ان اَحکام کی تمہید ہے جو آگے اس سورت میں آنے والے ہیں، اس تمہید میں ایک طرف تو پروردگارِ عالم کے حقوق سامنے رکھ کر اس کی مخالفت سے روکا گیا، دُوسری طرف تمام اَفرادِ اِنسانی کو ایک باپ کی اولاد بتلا کر ان میں محبت اور باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو بیدار کیا گیا، تاکہ اہلِ قرابت و یتیموں اور زوجین کے درمیان باہمی حقوق کی ادائیگی دِل سے ہوسکے۔

اس کے بعد پھر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کا دوبارہ اعلان کیا ایک خاص عنوان سے فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط یعنی "اللہ تعالیٰ سے ڈرو، جس کے نام پر تم دُوسروں سے اپنے حقوق طلب کرتے ہو، اور جس کی قسمیں دے کر دُوسروں سے اپنا مطلب نکالتے ہو۔" آخر میں فرمایا: وَالْاَرْحَامَ ط یعنی قرابت کے تعلقات خواہ باپ کی طرف سے ہوں خواہ ماں کی طرف سے، ان کی نگہداشت اور ادائیگی میں کوتاہی کرنے سے بچو۔

دُوسری آیت میں یتیم بچوں کے حقوق کی تاکید اور ان کے اموال کی حفاظت کے اَحکام ہیں، مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:-

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! اپنے پروردگار (کی مخالفت سے) ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا، (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی زوجہ حوّاء کو) پیدا کیا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دُنیا میں) پھیلائیں اور (تم سے مکرّر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے کہ) تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دُوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو (جس مطالبہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ خدا سے ڈر کر میرا حق دیدے، سو جب دُوسروں کو خدا کی مخالفت سے ڈرنے کو کہتے ہو، تو معلوم ہوا کہ تم اس ڈرنے کو ضروری سمجھتے ہو تو تم بھی ڈرو) اور (اوّل تو تمام اَحکامِ اِلٰہیہ میں مخالفت سے بچنا اور ڈرنا ضرور ہے، لیکن اس مقام پر ایک حکم خصوصیت کے ساتھ ذِکر کیا جاتا ہے کہ) قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب (کے حالات) کی اِطلاع رکھتے ہیں (اگر مخالفت کروگے مستحقِ سزا ہوگے) اور جن بچوں کا باپ مرجائے ان کے (مملوک) مال انہی کو پہنچاتے رہو (یعنی انہی کے خرچ میں لگاتے رہو) اور (جب تک تمہارے قبضہ میں ہو) تم (ان کے مال میں شامل کرنے کے لئے ان کی) اچھی چیز سے بُری چیز کو مت بدلو (یعنی ایسا مت کرو کہ ان کی اچھی چیز تو نکال لی جاوے اور بُری چیز ان کے مال میں ملا دی جاوے) اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں (کے رہنے) تک (البتہ جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے تو بقدر حق الخدمت اپنے گزارے کے لئے ان کے مال سے لینا دُرست ہے جیسا آگے آوے گا، وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا (النساء:٦) ایسی کارروائی کرنا (کہ بُری چیز ان کے مال میں شامل کردی یا بلاضرورت ان کے مال سے منتفع ہوا) بڑا گناہ ہے (جس کی وعید آگے آئے گی اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى الخ (النساء:١٠))۔

معارف ومسائل

یہ پہلا حکم ہے جو تمہید کے بعد اِرشاد فرمایا گیا اور تمام تعلقاتِ قرابت کی نگہداشت پر حاوی اور شامل ہے۔

صلۂ رحمی کے معنی اور اس کے فضائل

لفظِ ''اَرحام'' رحم کی جمع ہے، رحم بچہ دانی کو کہتے ہیں، جس میں ولادت سے پہلے ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، چونکہ ذریعۂ قرابت یہ رحم ہی ہے، اس لئے اس سلسلے کے تعلقات وابستہ رکھنے کو ''صلۂ رحمی''، اور رِشتہ داری کی بنیاد پر جو فطری طور پر تعلقات پیدا ہوگئے، ان کی طرف سے بے توجہی و بے اِلتفاتی برتنے کو ''قطع رحمی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

احادیث شریفہ میں صلۂ رحمی پر بہت زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:-

مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ [۱]

''یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رِزق میں کشادگی پیدا ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے۔''

اس حدیث سے صلۂ رحمی کے دو بڑے اہم فائدے معلوم ہوگئے، کہ آخرت کا ثواب تو ہے ہی، دُنیا میں صلۂ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رِزق کی تنگی دُور ہوتی ہے اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور میں حاضر ہوا تو آپ کے وہ مبارک کلمات جو سب سے پہلے میرے کانوں میں پڑے، یہ تھے، آپ نے فرمایا:-

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ! اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔ [۲]

''لوگو! ایک دُوسرے کو کثرت سے سلام کیا کرو، اللہ کی رضاجوئی کے لئے لوگوں کو کھانا کھلایا کرو، صلۂ رحمی کیا کرو، اور ایسے وقت میں نماز کی طرف سبقت کیا کرو جبکہ عام لوگ نیند کے مزے میں ہوں، یاد رکھو! ان اُمور پر عمل کر کے تم حفاظت اور سلامتی کے ساتھ بغیر کسی رُکاوٹ کے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔''

ایک اور حدیث میں ذِکر ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک باندی کو آزاد کر دیا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذِکر کیا تو آپ نے فرمایا:-

لَوْ اَعْطَيْتِهَا اَخْوَالَكِ كَانَ اَعْظَمُ لِاَجْرِكِ۔ [۳]

''اگر تم اپنے ماموں کو دے دیتیں تو زیادہ ثواب ہوتا۔''

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ ج:۲ ص:۴۱۹

[۲] مشکوٰۃ، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ ج:۱ ص:۱۶۸

[۳] مشکوٰۃ، کتاب الزکاۃ، باب افضل الصدقۃ ج:۱ ص:۱۷۱

اسلام میں غلام باندی کو آزاد کرنے کی بہت ترغیب ہے، اور اسے بہترین کارِ ثواب قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود صلہ رحمی کا مرتبہ اس سے بہرحال اعلیٰ ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحْمِ ثِنْتَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ۔ [۱]

''یعنی کسی محتاج کی مدد کرنا صرف صدقہ ہی ہے، اور اپنے کسی عزیز قریب کی مدد کرنا دو اَمروں پر مشتمل ہے: ایک صدقہ اور دُوسرا صلہ رحمی۔''

صرف مصرف کے تبدیل کرنے سے دو طرح کا ثواب مل جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں قطعِ رحمی کے حق میں جو شدید ترین وعیدیں روایاتِ حدیث میں مذکور ہیں اس کا اندازہ دو حدیثوں سے بخوبی ہوسکتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

۱- لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ [۲]

''جو آدمی حقوقِ قرابت کی رعایت نہیں کرتا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔''

۲- لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰى قَوْمٍ فِيْهِ قَاطِعُ رَحِمٍ۔ [۳]

''اس قوم پر اللہ کی رحمت نہیں اُترے گی جس میں کوئی قطع رحمی کرنے والا موجود ہو۔''

اخیر میں پھر دِلوں میں ادائے حقوق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے جو تمہارے دِلوں اور اِرادوں سے باخبر ہے۔'' اگر رسمی طور پر شرما شرمی، بے دِلی سے کوئی کام بھی کردیا مگر دِل میں جذبۂ ایثار و خدمت نہ ہوا تو قابلِ قبول نہیں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ وہ سب پر ہمیشہ نگراں ہے، قرآنِ کریم کا یہ عام اُسلوب ہے کہ قانون کو محض دُنیا کی حکومتوں کے قانون کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ تربیت و شفقت کے انداز میں بیان کرتا ہے، قانون کے بیان کے ساتھ ساتھ ذہنوں اور دِلوں کی تربیت بھی کرتا ہے۔

یتیموں کے حقوق اور ان کے اموال کی حفاظت

پہلی آیت میں مطلقاً قرابت کی حفاظت اور اس کے حقوق ادا کرنے کی تاکید عام انداز میں بیان فرمانے کے بعد

---

[۱] بحوالۂ بالا۔

[۲] مشكوٰة، كتاب الآداب، باب البر والصلة ج:۲ ص:۴۱۹

[۳] مشكوٰة، كتاب الآداب، باب البر والصلة ج:۲ ص:۴۲۰

دُوسری آیت میں یتیموں کے اموال کی حفاظت کا حکم، اور ان میں کسی قسم کی خورد بُرد کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ یتیم بچے کا نگراں اور ولی عموماً اس کا کوئی رِشتہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی حقِ قرابت کی ادائیگی سے ہے۔

پہلے جملہ میں اِرشاد ہے: وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "یتیموں کے مال انہی کو پہنچاؤ"، یتیم کے لفظی معنی اکیلے اور منفرد کے ہیں، اسی لئے جو موتی سیپ میں تنہا ایک ہو، اس کو "دُرِّ یتیم" کہا جاتا ہے، اِصطلاحِ شرع میں اس بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے جس کا باپ مرگیا ہو، اور جانوروں میں اس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں مرگئی ہو (قاموس)۔[1] بالغ ہونے کے بعد شرعی اِصطلاح میں اس کو یتیم نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں تصریح ہے: "لَا یُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ" یعنی "بلوغ کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی۔" (مشکوٰۃ شریف)[2]

یتیم بچوں کی ملکیت میں اگر کچھ مال ہے جو اُن کو کسی نے ہبہ کیا ہو، یا کسی کی میراث میں ان کو پہنچ گیا ہو تو یتیم کے ساتھ اس کے مال کی حفاظت بھی اس شخص کے ذمہ ہے جو یتیم کا ولی ہے، خواہ اس ولی کا تقرّر اس کے مرنے والے باپ نے خود کردیا ہو، یا حکومت کی جانب سے کوئی ولی مقرّر کیا گیا ہو، ساتھ ہی ولی میں یہ بھی لازم ہے کہ یتیم کے ضروری اخراجات تو اس کے مال سے پورے کرے، لیکن اس کا مال بالغ ہونے سے پہلے اس کے قبضہ میں نہ دے، کیونکہ وہ ناسمجھ بچہ ہے، کہیں ضائع کردے گا، تو آیت کے اس جملے میں جو اِرشاد فرمایا گیا کہ یتیموں کے مال ان کو پہنچادو اس کی توضیح آگے پانچویں آیت میں آتی ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ان کے مال ان کو اس وقت پہنچاؤ جب دیکھ لو کہ وہ بالغ ہوگئے، اور ان کو اپنے نفع ونقصان اور بھلے بُرے کی تمیز پیدا ہوگئی۔

اس لئے اس آیت میں یتیموں کے اموال ان کو پہنچانے کا مطلب یہ ہوا کہ ان اموال کی حفاظت کرو، تاکہ اپنے وقت پر یہ مال اُن کو پہنچائے جاسکیں، اس کے علاوہ اس جملے میں اس طرف بھی اِشارہ ہے کہ ولیِ یتیم کی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یتیم کے مال کو خود نہ کھائے یا خود ضائع نہ کرے، بلکہ اس کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی حفاظت کرکے اس قابل بنائے کہ بالغ ہونے کے بعد اس کو مل سکے۔

دُوسرے جملہ میں اِرشاد ہے: وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ یعنی "اچھی چیز کا بُری چیز سے تبادلہ مت کرو" بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ یتیم کے مال کی تعداد تو محفوظ رکھتے تھے مگر اس میں جو اچھی چیز نظر آتی وہ خود لے لی اور اس کی جگہ اپنی خراب چیز رکھ دی، عمدہ بکری کے بدلے میں لاغر بیمار بکری اس کے مال میں لگادی، یا کھرے نقد کے بدلے میں

[1] القاموس المحيط، فصل الياء ج:۴ ص:۲۹۸

[2] مشكوٰة، كتاب النكاح، باب الخلع والطلاق ج:۲ ص:۲۸۴

کھوٹا رکھ دیا، یہ بھی چونکہ مالِ یتیم میں خیانت ہے، اور ممکن تھا کہ کسی شخص کا نفس یہ حیلہ تراشے کہ ہم نے تو یتیم کا مال لیا نہیں بلکہ بدلا ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے صراحۃً اس کی ممانعت فرمادی، اس ممانعت میں جس طرح یہ داخل ہے کہ خود اپنی خراب چیز دے کر اچھی چیز لے لیں، اسی طرح یہ بھی داخل ہے کہ کسی دُوسرے شخص سے تبادلہ کا ایسا معاملہ کریں جس میں یتیم بچے کا نقصان ہو۔

تیسرے جملہ میں اِرشاد فرمایا: وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۚ یعنی ''یتیموں کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھا جاؤ'' ظاہر ہے کہ اس کا مقصد تو یتیم کے مال کو ناجائز طور پر کھا جانے کی ممانعت ہے، خواہ اپنے مال میں ملا کر کھا جائے یا علیحدہ رکھ کر کھائے، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ یتیموں کا مال اپنے مال میں شامل رکھا، اس میں سے خود بھی کھایا، یتیم کو بھی کھلا دیا، اس صورت میں جداگانہ حساب نہ ہونے کی وجہ سے ایک دِین دار متبع شریعت کو بھی یہ دھوکا ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، اس لئے خاص طور سے اپنے اموال کے ساتھ ملا کر کھانے کی حرمت کا ذِکر اور اس پر تنبیہ فرمادی کہ یا تو یتیم کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو اور علیحدہ خرچ کرو جس میں کسی زیادتی کا خطرہ ہی نہ رہے، یا پھر ملا کر رکھو تو ایسا حساب رکھو جس میں یہ یقین ہو کہ یتیم کا مال تمہارے ذاتی خرچ میں نہیں آیا، اس کی تشریح سورۂ بقرہ کے رُکوع ۲۷ میں گزر چکی ہے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ (البقرۃ:۲۲۰)

اس طرزِ بیان میں اس طرف بھی اِشارہ فرمادیا کہ یتیموں کے مال میں خورد بُرد کرنے والے عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس اپنے مال بھی موجود ہوتے ہیں، تو اس عنوان سے ان کو عار دِلائی گئی کہ اپنا حلال مال موجود ہوتے ہوئے یتیموں کا مال حرام طور پر کھا جانا بڑی شرم کی بات ہے۔

آیت میں مالِ یتیم کے کھانے کی ممانعت کا ذِکر ہے، اس لئے کہ مال کا سب سے بڑا اہم فائدہ کھانا ہے، لیکن محاورہ میں مال کے ہر تصرف کو کھانا بولا جاتا ہے، خواہ اِستعمال کر کے ہو یا کھا کر، قرآنِ کریم نے بھی اسی محاورے پر لَا تَأْكُلُوٓا فرمایا ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف داخل ہے، لہٰذا یتیم کے مال کو کسی بھی طریقے سے ناجائز طور پر خرچ کرنا حرام ہوا۔

آیت کے آخری جملہ میں اِرشاد فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ لفظ ''حوب'' بقول ابنِ عباس رضی اللہ عنہما حبشی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں بڑا گناہ، عربی زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، معنی یہ ہوئے کہ مالِ یتیم میں کسی قسم کا ناجائز تصرف خواہ حفاظت کی کمی سے ہو یا خراب چیز کے بدلہ میں اچھی چیز لے کر ہو، یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کا مال کھانے سے ہو، بہرحال یہ بہت بڑا گناہ ہے، اور یتیم کے مال کو کھانے کی سخت وعید اس رُکوع کے ختم پر آرہی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

اور اگر ڈرو کہ نہ انصاف کرسکوگے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کرلو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں،

مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

دو دو تین تین چار چار، پھر اگر ڈرو کہ ان میں اِنصاف نہ کرسکوگے تو ایک ہی نکاح کرو،

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳

یا لونڈی جو اپنا مال ہے، اس میں اُمید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑوگے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکوگے تو (ان سے نکاح کرنے کے بجائے) دُوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند آئیں، دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے۔ ہاں! اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان اِنصاف نہ کرسکوگے تو پھر ایک ہی بیوی پر اِکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ اس طریقے میں اس بات کا زیادہ اِمکان ہے کہ تم بے اِنصافی میں مبتلا نہیں ہوگے ۳

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

ماقبل کی آیت میں یتامیٰ کی حق تلفی کی ممانعت تھی کہ اولیاء کو ان کے اموال خورد بُرد کرنا حرام ہے، اس آیت میں بھی ایک دُوسرے عنوان سے اس حکم کا اِعادہ ہے کہ جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہیں ان سے اس خیال سے نکاح نہ کریں کہ اپنے اِختیار کی لڑکی ہے، جتنا چاہیں گے مہر مقرّر کردیں گے، اور جو اَموال ان کی ملک میں ہیں وہ بھی اپنے قبضہ میں آجائیں گے۔

غرض قرآنِ کریم کی اس آیت نے صراحۃً بتلادیا کہ مالِ یتیم پر قبضہ کرنے کا ہر حیلہ اور بہانہ ناجائز ہے، اور اولیاء کا

فرض ہے کہ وہ دیانت داری سے اُن کے حقوق کی نگہداشت کریں، چنانچہ فرمایا:-

اور اگر تم کو اس بات کا اِحتمال (بھی) ہو (اور یقین ہو تو بدرجہ اولیٰ) کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں (بابت ان کے مہر کے) اِنصاف (کی رعایت) نہ کرسکو گے تو (ان سے نکاح مت کرو بلکہ) اور (حلال) عورتوں سے جو تم کو (اپنی کسی مصلحت کے اِعتبار سے) پسند ہوں نکاح کرلو (کیونکہ وہ مجبور نہیں، آزادی سے اپنی رضا ظاہر کرسکتی ہیں، اور یہ نکاح اس قید کے ساتھ ہو کہ جو ایک عورت سے زیادہ کرنا چاہے تو ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو، ایک صورت یہ کہ ایک ایک مرد) دو دو عورتوں سے (نکاح کرلے) اور (دُوسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) تین تین عورتوں سے (نکاح کرلے) اور (تیسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) چار چار عورتوں سے (نکاح کرلے) پس اگر تم کو (غالب) اِحتمال اس کا ہو کہ (کئی بیبیاں کرکے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بی بی کے حقوقِ واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو یا (اگر دیکھو کہ ایک کے حقوق بھی ادا نہ ہوں گے تو) جو لونڈی (حسبِ قاعدۂ شرعیہ) تمہاری ملک میں ہو وہی سہی اس امرِ مذکور میں (یعنی ایک بی بی کے رکھنے یا صرف لونڈی پر بس کرنے میں) زیادتی (و بے اِنصافی) نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے (کیونکہ ایک صورت میں تو کوئی تعداد نہیں جس میں برابری کرنا پڑے، دُوسری صورت میں بی بی کے حقوق سے بھی کم حقوق ہیں، مثلاً مہر نہیں، صحبت کا حق نہیں تو اندیشہ اور کم ہے)۔

معارف و مسائل

یتیم لڑکیوں کی حق تلفی کا اِنسداد

زمانۂ جاہلیت میں جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جو شکل وصورت سے اچھی سمجھی جاتیں یا ان کی ملکیت میں کوئی مال، جائیداد ہوتی تو ان کے اولیاء ایسا کرتے تھے کہ خود ان سے نکاح کرتے یا اپنی اولاد سے ان کا نکاح کردیتے تھے، جو چاہا کم سے کم مہر مقرّر کردیا، اور جس طرح چاہا ان کو رکھا، کیونکہ وہی ان کے ولی اور نگراں ہوتے تھے، ان کا باپ موجود نہ ہوتا تھا جو ان کے حقوق کی پوری نگرانی کرسکتا، اور ان کی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر نظر اور فلاح و بہبود کا مکمل اِنتظام کرکے ان کا نکاح کردیتا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہدِ رسالت میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص کی ولایت میں ایک یتیم لڑکی تھی، اور اس کا ایک باغ تھا جس میں یہ لڑکی بھی شریک تھی، اس شخص نے اس یتیم لڑکی سے خود اپنا نکاح کرلیا، اور بجائے اس کے کہ اپنے پاس سے مہر وغیرہ دیتا اس کے باغ کا حصہ بھی اپنے قبضہ میں لے

لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ یعنی ''اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے خود اپنا نکاح کرنے میں تم اِنصاف پر قائم نہ رہو گے، بلکہ ان کی حق تلفی ہو جائے گی، تو تمہارے لئے دُوسری عورتیں بہت ہیں، ان میں جو تمہارے لئے حلال اور پسند ہیں ان سے نکاح کرلو۔'' [۱]

نکاحِ نابالغہ کا مسئلہ

اس آیت میں یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، اور اِصطلاحِ شرع میں یتیم اسی لڑکی یا لڑکے کو کہا جاتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو، اس لئے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یتیم لڑکی کے ولی کو یہ بھی اِختیار ہے کہ بحالتِ صغرسنی بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کردے، البتہ لڑکی کی مصلحت اور آئندہ فلاح و بہبود پیشِ نظر رہے، ایسا نہ ہو جیسے بہت سی برادریوں میں رائج ہے کہ بڑی لڑکی کا نکاح چھوٹے بچے سے کر دیا، عمروں کا تناسب نہ دیکھا، یا لڑکے کے حالات و عادات کا جائزہ نہ لیا ویسے ہی نکاح کر دیا۔

اور وہ بالغ لڑکیاں جن کے باپ مر چکے ہیں، اگرچہ بالغ ہو جانے کی بنا پر خود مختار ہیں لیکن لڑکیاں شرم و حیا کی بنا پر عادۃً بالغ ہونے کے بعد بھی اپنے نکاح کے معاملہ میں خود کچھ نہیں بولتیں، اولیاء اور وارث جو کچھ کر دیں اسی کو قبول کر لیتی ہیں، اس لئے ان کے اولیاء پر بھی لازم ہے کہ ان کی حق تلفی سے پرہیز کریں۔

بہرحال اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے ازدواجی حقوق کی پوری نگہداشت کا حکم مذکور ہے، مگر عام حکومتوں کے قانون کی طرح اس کے نافذ کرنے کی ذمہ داری براہِ راست حکومت پر ڈالنے کے بجائے خود عوام کو خدا تعالیٰ کے خوف کا حوالہ دے کر حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں اس میں بے اِنصافی کا خطرہ ہو تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی کے خیال کو چھوڑ دو، دُوسری عورتیں تمہارے لئے بہت ہیں، اُن سے نکاح کرو۔

ساتھ ہی ذمہ دارانِ حکومت کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس کی نگرانی کریں، کسی جگہ حق تلفی ہوتی نظر آئے تو بزورِ قانون حقوق ادا کرائیں۔

قرآن میں تعدّدِ ازواج اور اِسلام سے پہلے اَقوامِ عالم میں اس کا رِواج

ایک مرد کے لئے متعدّد بیبیاں رکھنا اِسلام سے پہلے بھی تقریباً دُنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان، ایران، مصر، بابل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرتِ اَزواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی اِنکار نہیں کرسکتا۔ دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعدّدِ ازواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی،

[۱] صحیح البخاري، کتاب الشرکۃ، باب شرکۃ الیتیم إلخ ج:۱ ص:۳۳۹

تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اَب وہاں کے اہلِ بصیرت حکماء خود اس کو رِواج دینے کے حق میں ہیں، مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعدّدِ اَزواج کی حمایت میں اِنجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

''ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدّدِ اَزواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔''

اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور اپزک ٹیلر نے پُرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے، اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدّدِ اَزدواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اِجازت معلوم ہوتی ہے۔

کرشن جو ہندوؤں میں واجب التعظیم اوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیبیاں تھیں۔ جو مذہب اور قانون عفت وعصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زِنا کاری کا اِنسداد ضروری جانتا ہو، اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدّدِ اَزواج کی اِجازت دے، اس میں زِنا کاری کا بھی اِنسداد ہے، اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے، اگر اس کی اِجازت نہ دی جائے تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی اِفراط ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدّدِ اَزواج کی اِجازت نہیں ان میں زِنا کی کثرت ہے، یورپین اقوام کو دیکھ لیجئے ان کے یہاں تعدّدِ اَزواج پر تو پابندی ہے، مگر بطورِ دوستانہ جتنی بھی عورتوں سے مرد زِنا کرتا ہے اس کی پوری اِجازت ہے، کیا تماشا ہے کہ نکاح ممنوع اور زِنا جائز۔

غرض اسلام سے پہلے کثرتِ اَزواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود ونصاریٰ نے، نہ ہندوؤں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے اِبتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی، لیکن اس غیر محدود کثرتِ اَزواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اوّل اوّل تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے مگر پھر اُن کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، اور یہ عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں۔

پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان میں عدل ومساوات کا کہیں نام ونشان نہ تھا، جس سے دل بستگی ہوئی اس کو نوازا گیا، جس سے رُخ پھر گیا اس کے کسی حق کی پروا نہیں۔

اسلام نے تعدّدِ ازدواج پر ضروری پابندی لگائی اور عدل ومساوات کا قانون جاری کیا

قرآن نے عام معاشرہ کے اس ظلمِ عظیم کو روکا، تعدّدِ ازدواج پر پابندی لگائی، اور چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا، اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر ہیں ان میں مساواتِ حقوق کا نہایت مؤکد حکم اور اس کی خلاف ورزی پر وعیدِ شدید سنائی۔

آیتِ مذکورہ میں اِرشاد ہوا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ یعنی ''جو حلال عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر سکتے ہو، دودو، تین تین، چار چار۔''

آیت میں مَا طَابَ کا لفظ آیا ہے، حسن بصریؒ، ابنِ جبیرؒ اور ابنِ مالکؒ نے مَا طَابَ کی تفسیر ''مَـا حَـلَّ'' سے فرمائی ہے، یعنی جو عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

اور بعض حضرات نے مَا طَابَ کے لفظی معنی کے اِعتبار سے ''پسندیدہ'' کا ترجمہ کیا ہے، مگر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، یہ مراد ہوسکتی ہے کہ جو عورتیں طبعی طور پر تمہیں پسند ہوں اور تمہارے لئے شرعاً حلال بھی ہوں۔

اس آیت میں ایک طرف تو اس کی اِجازت دی گئی کہ ایک سے زائد دو، تین، چار عورتیں نکاح میں جمع کر سکتے ہیں، دُوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کی جاسکتیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان نے اس قرآنی تخصیص اور پابندی کو اور زیادہ واضح کر دیا، اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص غیلان بن اسلمہ ثقفیؓ مسلمان ہوئے، اُس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ بھی مسلمان ہوگئی تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمِ قرآنی کے مطابق ان کو حکم دیا کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کرلیں، باقی کو طلاق دے کر آزاد کر دیں، غیلان بن اسلمہ ثقفیؓ نے حکم کے مطابق چار عورتیں رکھ کر باقی سے علیحدگی اِختیار کرلی (مشکوٰۃ شریف، بحوالہ ترمذی وابنِ ماجہ)۔[1] مسندِ احمد میں اسی روایت کے تکملہ میں ایک واقعہ بھی مذکور ہے، اس کا ذِکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں، کیونکہ اس کا تعلق بھی نسوانی حقوق سے ہے، وہ یہ کہ:-

غیلان بن اسلمہ نے حکمِ شرعی کے مطابق چار عورتیں رکھ لی تھیں، مگر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں انہوں نے ان کو بھی طلاق دے دی، اور اپنا کل مال وسامان اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی

[1] مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب المحرمات ج:۲ ص:۲۷۴

اِطلاع ملی، تو ان کو حاضر کر کے فرمایا کہ تم نے ان عورتوں کو اپنی میراث سے محروم کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے جو سراسر ظلم ہے، اس لئے فوراً ان کی طلاق سے رجعت کرو، اور اپنا مال بیٹوں سے واپس لو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہیں سخت سزا دِی جائے گی۔ [۱]

قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں، میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذِکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو باقی کو طلاق دے دو۔ (ابوداؤد) [۲]

اور مسندِ امام شافعیؒ میں نوفل بن معاویہ دیلمیؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی ایک عورت کو طلاق دینے کا حکم دیا، [۳] یہ واقعہ مشکوٰۃ شریف [۴] میں بھی ''شرح السنۃ'' سے نقل کیا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے اس تعامل سے آیتِ قرآنی کی مراد بالکل واضح ہوگئی کہ چار سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعدّدِ ازدواج

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سراپا رحمت و برکت ہے، تبلیغِ اَحکام اور تزکیۂ نفوس اور ابلاغِ قرآن آپ کا سب سے بڑا مقصدِ بعثت تھا، آپ نے اِسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دُنیا میں پھیلا دیا، یعنی آپ بتاتے بھی تھے اور کرتے بھی تھے، پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی کی رہبری کی ضرورت نہ ہو، نمازِ باجماعت سے لے کر بیویوں کے تعلقات، آل و اولاد کی پرورِش اور پاخانہ پیشاب اور طہارت تک کے بارے میں آپ کی قولی و فعلی ہدایات سے کتبِ حدیث بھرپور ہیں، اندرونِ خانہ کیا کیا کام کیا، بیویوں سے کیسے میل جول رکھا، اور گھر میں آ کر مسائل پوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا، اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جن سے اَزواجِ مطہراتؓ کے ذریعہ ہی اُمت کو رہنمائی ملی ہے، تعلیم و تبلیغ کی دِینی ضرورت کے پیشِ نظر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کثرتِ اَزواج ایک ضروری اَمر تھا، صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اَحکام و مسائل، اخلاق و آداب اور سیرتِ نبوی سے متعلق دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں جو کتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد تین سو اٹھتر تک پہنچی ہوئی ہے۔ حافظ ابنِ قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' (ج:۱ ص:۹) میں لکھا ہے کہ اگر حضرت اُمّ سلمہ

[۱] مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رقم الحدیث:۴۴۰۳

[۲] سنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب فی من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع ج:۱ ص:۳۰۴

[۳] مسند الشافعی من کتاب احکام القرآن، تحت عنوان فارق واحدۃ إلخ رقم الحدیث:۱۲۲۹

[۴] مشکوٰۃ، باب النکاح، باب المحرمات ج:۱ ص:۲۷۴

رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کیے جائیں جو انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیئے ہیں، تو ایک رسالہ مرتب ہوسکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا روایت و درایت اور فقہ و فتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلسل اڑتالیس سال تک علمِ دین پھیلایا۔

بطورِ مثال دو مقدس بیبیوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے، دیگر ازواجِ مطہراتؓ کی روایات بھی مجموعی حیثیت سے کافی تعداد میں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تبلیغ کا نفع صرف ازواجِ مطہراتؓ سے پہنچا۔

انبیائے اسلام کے مقاصدِ بلند اور پورے عالم کی اِنفرادی و اِجتماعی، خانگی اور ملکی اصلاحات کی فکروں کو دُنیا کے شہوت پرست اِنسان کیا جانیں، وہ تو سب کو اپنے اُوپر قیاس کر سکتے ہیں، اسی کے نتیجے میں کئی صدی سے یورپ کے ملحدین اور مستشرقین نے اپنی ہٹ دھرمی سے فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدّدِ ازدواج کو ایک خالص جنسی اور نفسانی خواہش کی پیداوار قرار دِیا ہے، اگر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ہوش مند منصف مزاج کبھی بھی آپ کی کثرتِ ازواج کو اس پر محمول نہیں کر سکتا۔

آپ کی معصوم زندگی قریشِ مکہ کے سامنے اس طرح گزری کہ پچّیس سال کی عمر میں ایک سن رسیدہ صاحبِ اولاد بیوہ (جس کے دو شوہر فوت ہو چکے تھے) سے عقد کر کے عمر کے پچّیس سال تک انہی کے ساتھ گزارہ کیا، وہ بھی اس طرح کہ مہینہ مہینہ گھر چھوڑ کر غارِ حراء میں مشغولِ عبادت رہتے تھے۔ دُوسرے نکاح جتنے ہوئے پچاس سالہ عمر شریف کے بعد ہوئے، یہ پچاس سالہ زندگی اور عنفوانِ شباب کا سارا وقت اہلِ مکہ کی نظروں کے سامنے تھا، کبھی کسی دُشمن کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں ملا جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے، آپ کے دُشمنوں نے آپ پر ساحر، مجنون، کذّاب، مفتری جیسے اِلزامات میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، لیکن آپ کی معصوم زندگی پر کوئی ایسا حرف کہنے کی جرأت نہیں ہوئی جس کا تعلق جنسی اور نفسانی جذبات کی بے راہ روی سے ہو۔

ان حالات میں کیا یہ بات غور طلب نہیں ہے کہ جوانی کے پچاس سال اس زُہد و تقویٰ اور لذائذِ دُنیا سے یکسوئی میں گزارنے کے بعد وہ کیا داعیہ تھا جس نے آخرِ عمر میں آپ کو متعدّد نکاحوں پر مجبور کیا؟ اگر دِل میں ذرا سا بھی اِنصاف ہو تو ان متعدّد نکاحوں کی وجہ اس کے سوا نہیں بتلائی جا سکتی جس کا اُوپر ذِکر کیا گیا ہے، اور اس کثرتِ ازدواج کی حقیقت کو بھی سن لیجئے کہ کس طرح وجود میں آئی۔

پچّیس سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر شریف ہونے تک تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ

رہیں، اُن کی وفات کے بعد حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نکاح ہوا، مگر حضرت سودہؓ تو آپ کے گھر تشریف لے آئیں اور حضرت عائشہؓ صغرسنی کی وجہ سے اپنے والد کے گھر ہی رہیں، پھر چند سال کے بعد ۲ھ میں مدینہ منوّرہ میں حضرت عائشہؓ کی رُخصتی عمل میں آئی، اُس وقت آپ کی عمر چوّن سال ہوچکی ہے، اور دو بیبیاں اِس عمر میں آکر جمع ہوئی ہیں، یہاں سے تعدّدِ ازدواج کا معاملہ شروع ہوا، اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، پھر کچھ ماہ بعد حضرت زینب بنتِ خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اور صرف اٹھارہ ماہ آپ کے نکاح میں رہ کر وفات پائی، ایک قول کے مطابق تین ماہ آپ کے نکاح میں زندہ رہیں، پھر ۴ھ میں حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، پھر ۵ھ میں حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون [1] سال ہوچکی تھی، اور اتنی بڑی عمر میں آکر چار [2] بیویاں جمع ہوئیں، حالانکہ اُمت کو جس وقت چار بیویوں کی اِجازت ملی تھی اس وقت ہی آپ کم ازکم چار نکاح کرسکتے تھے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، ان کے بعد ۶ھ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے، اور ۷ھ میں حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے اور پھر ۷ھ میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

خلاصہ:- یہ کہ چوّن سال کی عمر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کیا، یعنی پچّیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گزارے، پھر اُٹھاون [3] سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں، اور باقی اَزواجِ مطہراتؓ دو تین سال کے اندر حرمِ نبوّت میں آئیں۔

اور یہ بات خاص طور سے قابلِ ذِکر ہے کہ ان سب بیویوں میں صرف ایک ہی عورت ایسی تھیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا، یعنی اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ باقی سب اَزواجِ مطہراتؓ بیوہ تھیں، جن میں بعض کے دو دو شوہر پہلے گزر چکے تھے، اور یہ تعداد بھی آخر عمر میں آکر جمع ہوئی ہے۔

حضراتِ صحابہؓ مرد اور عورت سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جاں نثار تھے، اگر آپ چاہتے تو سب بیویاں کنواریں جمع کرلیتے، بلکہ ہر ایک ایک دو دو مہینہ کے بعد بدلنے کا بھی موقع تھا، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

نیز یہ امر بھی قابلِ ذِکر ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق نبی تھے، نبی صاحبِ ہویٰ وہوس نہیں ہوتا، جو کچھ کرتا ہے اِذنِ اِلٰہی سے کرتا ہے، نبی ماننے کے بعد ہر اِعتراض ختم ہوجاتا ہے، اور اگر کوئی شخص آپ کو نبی

---

[1] بلکہ ستاون سال۔ محمد تقی عثمانی ۱۴/۴/۱۴۲۶ھ

[2] [3] گزشتہ عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں ۳ھ میں چار اَزواجِ مطہراتؓ آچکی تھیں، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب بنتِ خزیمہ رضی اللہ عنہن، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک پچپن سال تھی۔ محمد تقی عثمانی ۱۴/۴/۱۴۲۶ھ

ہی نہ مانے اور یہ اِلزام لگائے کہ آپ نے محض شہوت پرستی کی وجہ سے اپنے لئے کثرتِ اِزدواج کو جائز رکھا تھا، تو اس شخص سے کہا جائے گا کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنے حق میں کثرتِ اِزدواج کے معاملہ میں اُس پابندی کا اِعلان کیوں فرماتے جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی آیت لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ (الاحزاب: ۵۲) میں موجود ہے؟ اپنے حق میں اس پابندی کا اِعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا اپنے رَبّ کے اِذن سے کیا۔

تعدّدِ اِزدواج کی وجہ سے تعلیمی اور تبلیغی فوائد جو اُمت کو حاصل ہوئے، اور جو اَحکام اُمت تک پہنچے اس کی جزئیات اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا اِحصاء دُشوار ہے، کتبِ احادیث اس پر شاہد ہیں، البتہ بعض دیگر فوائد کی طرف یہاں ہم اِشارہ کرتے ہیں۔

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے نکاح کرلیا تھا، وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپ کے گھر تشریف لائیں، ان کے بچوں کی آپ نے پروَرِش کی، اور اپنے عمل سے بتادیا کہ کس پیار ومحبت سے سوتیلی اولاد کی پروَرِش کرنی چاہئے، آپ کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں، اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پروَرِش کا خانہ خالی رہ جاتا اور اُمت کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہ ملتی، ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پروَرِش پاتا تھا، ایک بار آپ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا، آپ نے فرمایا: "سَمِّ اللهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ" (اللہ کا نام لے کر کھا، داہنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا)۔ (بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ) [1]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہوکر آئی تھیں، دُوسرے قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم میں آگئیں، اور ثابت بن قیسؓ یا ان کے چچازاد بھائی کے حصہ میں ان کو لگادیا گیا، لیکن انہوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کرلیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دے دُوں گی مجھے آزاد کردو۔ یہ معاملہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور مالی اِمداد چاہی، آپ نے فرمایا: اس سے بہتر بات نہ بتادوں؟ وہ یہ کہ میں تمہاری طرف سے مال ادا کردوں اور تم سے نکاح کرلوں، انہوں نے بخوشی منظور کرلیا، تب آپ نے اُن کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرمالیا، ان کی قوم کے سینکڑوں افراد حضراتِ صحابہؓ کی ملکیت میں آچکے تھے، کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہوکر آئے تھے، جب صحابہؓ کو پتہ چلا کہ جویریہؓ آپ کے نکاح میں آگئی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِحترام کے پیشِ نظر سب نے اپنے اپنے غلام باندی آزاد کردیئے، سبحان اللہ، حضراتِ صحابہ کرامؓ کے ادب کی کیا شان تھی، اس جذبے کے پیشِ نظر کہ یہ لوگ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال

[1] مشکوٰۃ، کتاب الأطعمة ج:۲ ص:۳۶۳

والے ہوگئے، ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں، سب کو آزاد کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعے کے متعلق فرماتی ہیں:-

فَلَقَدْ اَعْتَقَ بِتَزْوِيْجِهٖ اِيَّاهَا مِائَةَ اَهْلِ بَيْتٍ مِّنْ بَنِي الْمُصْطَلِقِ فَمَا اَعْلَمُ اِمْرَاَةً اَعْظَمُ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا۔ [1]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہ سے نکاح کر لینے سے بنوالمصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہوئی ہو۔''

حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتدائے اِسلام ہی میں مکہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے قافلہ کے دُوسرے اَفراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے، وہاں ان کا شوہر نصرانی ہوگیا، اور چند دِن کے بعد مرگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے واسطے سے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، جسے انہوں نے قبول کرلیا، اور وہیں حبشہ میں نجاشی ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا، دِلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت اُمِّ حبیبہؓ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، اور حضرت ابوسفیانؓ اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے جس نے اِسلام دُشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دِیا تھا، اور وہ مسلمانوں کو اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اَذیت دینے اور انہیں فنا کے گھاٹ اُتار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جب ان کو اس نکاح کی اِطلاع ہوئی تو بلا اِختیار ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''هُوَ الْفَحْلُ لَا يُجْدَعُ اَنْفُهٗ'' (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوانمرد ہیں ان کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی)۔ مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز ہیں، ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں، اِدھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور اُدھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی۔ [2]

غرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا، اور اِسلام کے مقابلہ میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہوگئے، اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ اِسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا، اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کے مدبر اور حکیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فائدہ کو ضرور پیشِ نظر رکھا ہوگا۔

یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں، ان کے علاوہ سیرت پر عبور رکھنے والے حضرات کو بہت کچھ حکمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدّدِ اِزدواج میں مل سکتی ہیں، اس سلسلے میں سیّدی حکیم الامت قدس سرہٗ کے رسالے ''کثرتِ ازواج لصاحب المعراج'' کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

---

[1] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۵۱۶۱

[2] تفسیر الخازن باختصار تحت سورة المائدة آية: ۸۰ ج:۲ ص:۳۲۳۔ والمستدرك للحاكم رقم الحديث: ۶۷۷۱

یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلائے ہوئے پُر فریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے، کیونکہ ان کے اس دامِ تزویر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرتِ نبوی اور تاریخِ اسلام سے بے خبر ہیں، اور اِسلامیات کا علم مستشرقین ہی کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اگر متعدّد بیویوں میں مساوات اور عدل پر قدرت نہ ہو تو صرف ایک بیوی پر اِکتفا کیا جائے

چار بیویوں تک کی اِجازت دے کر فرمایا: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ یعنی ''اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا جو کنیز شرعی اُصول کے مطابق تمہاری ملک میں ہو اس سے گزارہ کرلو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے جبکہ شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کر سکے اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھی جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ظلم عام تھا کہ ایک ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا تھا جس کا ذِکر چند اَحادیث کے حوالہ سے اس آیت کے ضمن میں پہلے گزرا ہے، اور بیویوں کے حقوق میں مساوات اور عدل کا مطلق خیال نہ تھا، جس کی طرف زیادہ میلان ہوگیا اس کو ہر حیثیت سے نوازنے اور خوش رکھنے کی فکر میں لگ گئے، اور دُوسری بیویوں کے حقوق نظر اَنداز کر ڈالتے۔ قرآنِ کریم نے صاف صاف فرمادیا کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو، یا کنیز سے گزارہ کرلو۔ یہاں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ مملوک کنیز جس کا ذِکر آیت میں ہے اس کی خاص شرائط ہیں، جو عموماً آج کل مفقود ہیں، اس لئے اس زمانے میں کسی کو مملوکِ شرعی کنیز کہہ کر بے نکاح رکھ لینا حرام ہے، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآنِ کریم نے چار عورتیں تک نکاح میں رکھنے کی اِجازت دے دی، اور اس حد کے اندر جو نکاح کئے جائیں گے، وہ صحیح اور جائز ہوں گے، لیکن متعدّد بیویاں ہونے کی صورت میں ان میں عدل و مساوات قائم رکھنا واجب ہے، اور اس کے خلاف کرنا گناہِ عظیم ہے، اس لئے جب ایک سے زائد نکاح کا اِرادہ کرو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو، کہ سب کے حقوق عدل و مساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں، اگر یہ اِحتمال غالب ہو کہ عدل و مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو ایک سے زائد نکاح پر اِقدام کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اِقدام ہے، اس سے باز رہنا چاہئے، اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اِکتفا کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چار سے زائد عورتوں سے کسی نے بیک وقت یعنی ایک ہی اِیجاب و قبول میں نکاح کرلیا تو وہ نکاح

سرے سے باطل ہے، کیونکہ چار سے زائد نکاح کا کسی کو حق نہیں، اور چار کے اندر جو نکاح کئے جائیں وہ نکاح تو بہرحال ہو جائیں گے، لیکن بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھی تو سخت گناہ ہوگا، اور جس کی حق تلفی ہو رہی ہو قاضی کی عدالت میں دعویٰ کر کے اپنا حق وصول کر سکے گی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب بیویوں کے درمیان پوری مساوات وعدل کی سخت تاکید فرمائی ہے، اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں، اور خود اپنے عمل کے ذریعے بھی اس کو واضح فرمایا ہے، بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان معاملات میں بھی مساوات فرماتے تھے جن میں مساوات لازم نہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں، اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور اِنصاف نہ کر سکے تو وہ قیامت میں اس طرح اُٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (مشکوٰۃ) [۱]

البتہ یہ مساوات ان اُمور میں ضروری ہے جو اِنسان کے اِختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ میں برابری، شب باشی میں برابری، رہا وہ اَمر جو اِنسان کے اِختیار میں نہیں، مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہو جائے، تو اس غیر اِختیاری معاملہ میں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اِختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اِختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:-

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ۔ [۲]

''یا اللہ! یہ میری برابر والی تقسیم ہے اُن چیزوں میں جو میرے اِختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے، میرے اِختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کرنا۔''

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسولِ معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دُوسرا کیسے قادر ہو سکتا ہے، اس لئے قرآنِ کریم کی دُوسری آیت میں اس غیر اِختیاری معاملے کا ذِکر اس طرح فرمایا:-

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ (النساء:۱۲۹)

''عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کر سکو گے۔''

جس میں بتلا دیا کہ میلانِ قلب اور محبت ایک غیر اِختیاری معاملہ ہے، اس میں برابری کرنا اِنسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیر اِختیاری معاملے کی اِصلاح کے لئے بھی اِرشاد فرمایا: فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ یعنی ''اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دُوسری بیوی سے کلی بے اِعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز

[۱] مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب القسم ج:۲ ص:۲۷۸

[۲] سنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء ج:۱ ص:۲۹۰

نہیں۔'' اس آیت کے جملے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً میں جس عدل و مساوات کا بیان ہے، یہ وہی اُمورِ اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں بے اعتدالی گناہِ عظیم ہے، اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

مذکورہ بالا تفصیل و تشریح کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض لوگ سورۂ نساء کی آیتِ مذکورہ اور اس آیت (النساء:۱۲۹) کو ملانے سے ایک عجیب مغالطہ میں مبتلا ہو گئے، وہ یہ کہ آیتِ سورۂ نساء میں تو یہ حکم دیا گیا کہ اگر عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی نکاح پر بس کرو، اور اس دُوسری آیت میں قطعی طور پر یہ واضح کر دیا کہ عدل و مساوات ہو ہی نہیں سکتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سے زائد نکاح مطلقاً جائز نہ رہے، لیکن ان کو سوچنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا مقصود ان تمام آیات میں ایک سے زائد نکاح کو روکنا ہی ہوتا تو بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (یعنی نکاح کرو جو پسند آئیں تم کو عورتیں دو دو، تین تین، چار چار) اور پھر اس ارشاد کے کیا معنی کہ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا (یعنی اگر تمہیں بے اِنصافی کا خطرہ ہو) کیونکہ اس صورت میں تو بے اِنصافی یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔

اس کے علاوہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی اور قولی بیان اور مسلسل تعامل بھی اس پر شاہد ہے کہ ایک سے زائد نکاح کو کسی وقت اسلام میں نہیں روکا گیا۔ بات وہی ہے جو اُوپر بیان ہو چکی ہے کہ سورۂ نساء کی پہلی آیت میں اُمورِ اختیاریہ کے عدل و مساوات کا ذِکر ہے، اور دُوسری آیت میں محبت اور قلبی میلان میں عدمِ مساوات پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے، اس لئے دونوں آیتوں میں نہ کوئی تعارض ہے، اور نہ ان آیات میں مطلقاً تعدّدِ ازدواج کی ممانعت کی کوئی دلیل ہے۔

آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ اس آیت میں دو کلمے ہیں، ایک کلمہ اَدْنٰٓى یہ لفظ ''دُنُــوٌّ'' سے مشتق ہے، جو قرب کے معنی میں ہے، اور دُوسرا لفظ اَلَّا تَعُوْلُوْا ہے، عَالَ یَعُوْلُ مَالَ یَمِیْلُ کے معنی میں ہے، جس کے معنی میلان کے ہیں، اور یہاں ناجائز میلان اور ظلم و جور کے معنی میں اِستعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ تم کو بتلایا گیا ہے (یعنی عدل نہ کر سکنے کی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرنا یا باندی کے ساتھ گزارہ کر لینا) یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو اِختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تم ظلم کرنے سے بچ سکو گے، اور زیادتی و تعدی کے مواقع ختم ہو سکیں گے۔

یہاں ایک شبہ یہ ہے کہ جب ایک بیوی ہوگی تو ظلم کا بالکل کوئی موقع نہ ہوگا، پھر لفظ اَدْنٰٓی بڑھا کر یہ کیوں فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، بلکہ یہ فرمانا چاہئے کہ تم بالکل اس ظلم سے بچ جاؤ گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ اَدْنٰٓی بڑھا کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ ایک بیوی کو بھی ظلم وستم کا تختہ بنائے رکھتے ہیں، اس لئے ظلم کا راستہ بند کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ظلم کا خطرہ کم ہوجائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ جاؤ گے، اور ظلم وجور سے مکمل رہائی اس وقت ہوگی جبکہ ایک بیوی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں، اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ رہے، اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کجی پر صبر کیا جائے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا

دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے، پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو اپنی خوشی سے

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ④

تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو۔ ہاں! اگر وہ خود اس کا کچھ حصہ خوش دِلی سے چھوڑ دیں تو اسے خوشگواری اور مزے سے کھالو ④

ربطِ آیات

گزشتہ آیت میں کثرتِ ازدواج کی وجہ سے جو عورتوں پر ظلم ہوتا تھا اس کا ازالہ تھا، اس آیت میں عورتوں کے ایک خاص حق کا ذِکر ہے، اور اس میں جو ظلم وجور ہوتا تھا اس کا ازالہ ہے، اور یہ حق مہر ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دِلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دِلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا

کوئی جزو (اور یہی حکم کل کا بھی ہے) تو (اس حالت میں) تم اس کو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔

معارف و مسائل

مہر کے متعلق عرب میں کئی قسم کے ظلم ہوتے تھے:-

ایک یہ کہ مہر جو لڑکی کا حق ہے اس کو نہ دیا جاتا تھا، بلکہ لڑکی کے اولیاء شوہر سے وصول کر لیتے تھے، جو سراسر ظلم تھا، اس کو دفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ یعنی "دو عورتوں کو ان کے مہر" اس کے مخاطب شوہر بھی ہیں کہ وہ اپنی بی بی کا مہر خود بی بی کو دیں اور دوسروں کو نہ دیں، اور لڑکیوں کے اولیاء بھی مخاطب ہیں کہ اگر لڑکیوں کے مہر اُن کو وصول ہو جائیں تو یہ لڑکیوں ہی کو دے دیں، ان کی اجازت کے بغیر اپنے تصرف میں نہ لائیں۔

دُوسرا ظلم یہ بھی تھا کہ اگر کبھی کسی کو مہر دینا بھی پڑ گیا تو بہت تلخی کے ساتھ بادلِ ناخواستہ تاوان سمجھ کر دیتے تھے، اس ظلم کا ازالہ آیتِ مذکورہ کے اس لفظ نِحْلَةً سے فرمایا گیا، کیونکہ "نحلہ" لغت میں اس دینے کو کہتے ہیں جو خوش دِلی کے ساتھ دیا جائے۔

غرض اس آیت میں یہ تعلیم فرمائی گئی کہ عورتوں کا مہر ایک حق واجب ہے، اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور جس طرح تمام حقوقِ واجبہ کو خوش دِلی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے، اسی طرح مہر کو بھی سمجھنا چاہئے۔

تیسرا ظلم مہر کے بارے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ بہت سے شوہر یہ سمجھ کر کہ بیوی ان سے مجبور ہے مخالفت کر نہیں سکتی، دباؤ ڈال کر ان سے مہر معاف کرا لیتے تھے، جس سے درحقیقت معافی نہ ہوتی تھی، مگر وہ یہ سمجھ کر بے فکر ہو جاتے تھے کہ مہر معاف ہو گیا۔

اس ظلم کے اِنسداد کے لئے آیتِ مذکورہ میں اِرشاد فرمایا: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴ یعنی "اگر وہ عورتیں خوش دِلی کے ساتھ اپنے مہر کا کوئی حصہ تمہیں دے دیں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، تمہارے لئے مبارک ہوگا۔"

مطلب یہ ہے کہ جبر و اِکراہ اور دباؤ کے ذریعہ معافی حاصل کرنا تو کوئی چیز نہیں، اس سے کچھ معاف نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ بالکل اپنے اِختیار اور رضامندی سے کوئی حصہ مہر کا معاف کر دیں یا لینے کے بعد تمہیں واپس کر دیں تو وہ تمہارے لئے جائز ہے، اور دُرست ہے۔

یہ مظالمِ مذکورہ زمانۂ جاہلیت میں بہت زیادہ تھے، جن کا اِنسداد قرآنِ حکیم نے اس آیت میں فرمایا، افسوس ہے کہ جاہلیت کے زمانہ کی یہ باتیں مسلمانوں میں اب بھی موجود ہیں، مختلف قبیلوں اور علاقوں میں ان مظالم میں سے کوئی نہ کوئی

ظلم ضرور پایا جاتا ہے، ان سب مظالم سے بچنا لازم ہے۔

آیتِ شریفہ میں جو یہ قید لگائی طیبِ نفس کی کہ خوشی سے تمہاری بیویاں اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دے دیں، یا تم سے وصول ہی نہ کریں، تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اس میں ایک بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ شریعت کا یہ اُصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دُوسرے کے لئے حلال نہیں ہے، جب تک کہ طیبِ نفس سے اِجازت نہ ہو، بطور قاعدۂ کلیہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ۔ [1] (مشکوٰۃ شریف)

''خبردار ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال (دُوسرے شخص کے لئے) حلال نہیں ہے جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔''

یہ ایک عظیم اُصول ہے، اور اس کے ماتحت بہت سے جزئیات آجاتے ہیں۔

دورِ حاضر میں چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنے والا نہیں ہے، اگر سوال کروں یا معاف نہ کروں تو بددِلی یا بدمزگی پیدا ہوگی، اس لئے بادلِ ناخواستہ معاف کردیتی ہیں، اس معافی کا کوئی اِعتبار نہیں۔ سیّدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ صحیح معنی میں طیبِ نفس سے معاف کرنے کا پتہ اُس صورت میں چل سکتا ہے کہ مہر کی رقم بیوی کے حوالے کردی جائے، اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے دیدے، یہی طیبِ نفس بہنوں اور بیبیوں کی میراث میں بھی سمجھ لینا چاہئے، اکثر یہ ہوتا ہے کہ ماں یا باپ کے فوت ہوجانے پر لڑکے ہی پورے مال پر قابض ہوجاتے ہیں، اور لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے، اگر کسی کو بہت دِین داری کا خیال ہوا تو بہنوں سے معافی مانگ لیتا ہے، وہ چونکہ یہ سمجھتی ہیں کہ حصہ کسی حال میں ملنے والا نہیں، اس لئے اپنی مرضی کے خلاف معاف کرنے کو کہہ دیتی ہیں، پھر باپ کی وفات پر اس کی بیوی کا حصہ بھی نہیں دیا جاتا، خصوصاً سوتیلی ماں کو تو دیتے ہی نہیں، یہ سب حقوق دبالینا ہے، اگر کوئی طیبِ نفس سے معاف کردے تو معاف ہوسکتا ہے، جس کی علامت اُوپر گزر چکی۔

سیّدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلے میں طیبِ نفس کا ذِکر ہے، طیبِ قلب نہیں فرمایا، اس لئے کہ کسی کا مال حلال ہونے کے لئے اس کے دِل کی خوشی کافی نہیں، جو لوگ رِشوت یا سود دیتے ہیں بہت سے ظاہری منافع سوچ کر اور عقلی طور پر آمدنی کا حساب لگا کر خرچ کردیتے ہیں، مگر یہ خوشی معتبر نہیں، اگر نفس سے پوچھا جائے تو وہ اس خرچہ پر قطعاً راضی نہ ہوگا، اسی وجہ سے طیبِ نفس کو فیصل قرار دِیا گیا۔

مساجد و مدارس یا اور کسی ضرورت کے لئے اگر چندہ کیا جائے اس میں بھی دینے والے کے طیبِ نفس کا خیال رکھنا

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الغصب والعاریۃ ج:۱ ص:۲۵۵

لازم ہے، پنچایت، چودھری، سردار، وفد کے دباؤ سے اگر کوئی شخص چندہ دے اور طیبِ نفس نہ ہو تو اس چندہ کو کام میں لگانا حلال نہیں، بلکہ اس کو واپس کیا جائے گا۔

آیت میں جو لفظ "صَدُقَات" آیا ہے "صَدُقَة" (بفتح الصاد وضم الدّال) کی جمع ہے، صَدُقَة اور صُدَاق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے، مُلّا علی قاریؒ "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں لکھتے ہیں: "وَسُمِّيَ بِهٖ لِاَنَّهٗ يَظْهَرُ بِهٖ صِدْقُ مَيْلِ الرَّجُلِ اِلَى الْمَرْاَةِ" [۱] یعنی مہر کو صداق اور صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ "صدق" کے اس مادّہ میں سچ کے معنی ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس مناسبت سے مہر کو صُدَاق کہنے لگے۔

اور هَنِيْٓـًٔا اور مَّرِيْٓـًٔا دونوں فعیل کے وزن پر صفت کے الفاظ ہیں، هَنِيْٓـًٔا (مِنْ هَنَـأَ وَهَنُؤَ وَهَنِئَ) لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت و تکالیف کے بغیر حاصل ہو جائے، جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی خوشگوار طعام کے ہوتے ہیں، یعنی ایسا طعام جو کسی مشقت کے بغیر حلق سے اُتر جائے، اور آسانی سے ہضم ہو کر جزوِ بدن بن جائے۔

مَّرِيْٓـًٔا (مِنْ مَرَاَ الطَّعَامُ فَهُوَ مَرِیْءٌ اَیْ هَنِیْءٌ) کا لفظ بھی مذکورہ معنی میں اِستعمال کیا جاتا ہے (قاموس) [۲]، غرض دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، اسی وجہ سے حضرت تھانویؒ نے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ "خوشگوار" کے الفاظ سے کیا ہے، اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے "رچتا پچتا" کے الفاظ اِستعمال کئے ہیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا

اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گزران کا سبب اور ان کو اس میں سے کھلاتے

وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا

اور پہناتے رہو اور کہو ان سے بات معقول۔ اور سدھارتے رہو یتیموں کو جب تک پہنچیں

النِّكَاحَ ج فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ج

نکاح کی عمر کو، پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کردو ان کے مال ان کا،

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح، کتاب النکاح، باب الصداق ج:۱۰ ص:۱۴۳

[۲] القاموس المحیط ج:۱ ص:۲۲

وَ لَا تَأْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا

اور کھا نہ جاؤ یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور حاجت سے پہلے کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں، اور جس کو حاجت نہ ہو

فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا

تو مالِ یتیم سے بچتا رہے، اور جو کوئی محتاج ہو تو کھاوے موافق دستور کے، پھر جب

دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾

ان کو حوالہ کرو ان کے مال تو گواہ کرلو اس پر، اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ناسمجھ (یتیموں) کو اپنے وہ مال حوالے نہ کرو جن کو اللہ نے تمہارے لئے زندگی کا سرمایہ بنایا ہے، ہاں اُن کو اِن میں سے کھلاؤ اور پہناؤ، اور ان سے مناسب انداز میں بات کرلو۔ ﴿۵﴾ اور یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے لائق عمر کو پہنچ جائیں، تو اگر تم یہ محسوس کرو کہ ان میں سمجھ داری آچکی ہے تو ان کے مال انہی کے حوالے کردو۔ اور یہ مال فضول خرچی کر کے اور یہ سوچ کر جلدی جلدی نہ کھا بیٹھو کہ وہ کہیں بڑے نہ ہو جائیں۔ اور (یتیموں کے سرپرستوں میں سے) جو خود مال دار ہو وہ تو اپنے آپ کو (یتیم کا مال کھانے سے) بالکل پاک رکھے، ہاں اگر وہ خود محتاج ہو تو معروف طریقِ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھالے۔ پھر جب تم ان کے مال انہیں دو تو ان پر گواہ بنالو۔ اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ ﴿۶﴾

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں یتیموں کا مال ان کو سپرد کر دینے اور عورتوں کے مہر ان کو ادا کرنے کا حکم گزر چکا ہے، جس سے بظاہر یہ مستفاد ہوسکتا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا مال بہرحال ان کے حوالے کر دینا چاہئے، خواہ ان کو معاملات کا سلیقہ بھی نہ ہو، اور وہ اموال کی حفاظت پر بھی قادر نہ ہوں، اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے ان آیات میں فرمایا ہے کہ کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کرو اور ان کی جانچ کرتے رہو، جب اموال کی حفاظت اور اُن کے مصارف کی سوجھ بوجھ ان کے اندر

محسوس ہونے لگے تو اموال ان کے سپرد کردو۔

خلاصۂ تفسیر

(اور اگر یتیم بالغ ہو جائیں جس کا مقتضٰی مال کا سپرد کر دینا ہے جیسا آگے آتا ہے، لیکن کم عقل ہوں تو) تم (ان) کم عقلوں کو اپنے (یعنی ان کے) وہ مال مت دو جن کو خدا تعالیٰ نے (ایسے کام کا پیدا کیا ہے کہ ان کو) تمہارے (سب کے) لئے مایۂ زندگی بنایا ہے (مطلب یہ کہ مال قدر کی چیز ہے، ان کو اُبھی مت دو کہ بے قدری کر کے اُڑا دیں گے) اور ان مالوں میں (سے) ان کو کھلاتے رہو، پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہتے رہو (یعنی ان کو تسلی کرتے رہو کہ مال تمہارا ہے، تمہاری خیر خواہی کی وجہ سے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا، ذرا سمجھ دار ہو جاؤ گے تو تم ہی کو دے دیا جائے گا) اور (جب مال سپرد کرنے کے لئے ہوشیاری دیکھنا ضرور ہے تو) تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری و تمیز داری کی باتوں میں) آزما لیا کرو (کیونکہ بالغ ہونے کا وقت تو سپردگیٔ مال کا وقت ہے، تو آزمائش پہلے سے چاہئے، مثلاً کچھ کچھ سودا سلف اس سے منگالیا، اور دیکھا کہ کیسے سلیقہ سے خرید کر لائے، یا کوئی چیز فروخت کی دے دی، اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا) یہاں تک کہ (ان کو آزمایا جائے) کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جاویں (یعنی بالغ ہو جاویں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر (بعد بلوغ و آزمائش) اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت و رعایت مصالحِ مال کا سلیقہ اور اِنتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو، (اور اگر ہنوز سلیقہ یا اِنتظام معلوم نہ ہو تو چندے اور حوالہ نہ کیا جائے) اور ان اموال (یتامیٰ) کو ضرورت سے زائد اُٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جاویں گے (پھر ان کو حوالہ کرنا پڑے گا) جلدی جلدی اُڑا کر مت کھاڈالو اور (اگر اس طرح نہ اُڑادیں، بلکہ تھوڑا کھانا چاہیں تو اس کا یہ حکم ہے کہ) جو شخص (اس مال سے) مستغنی ہو (یعنی اس کے پاس بھی بقدرِ کفایت موجود ہے گو صاحبِ نصاب نہ ہو) سو وہ تو اپنے کو بالکل (تھوڑا کھانے سے بھی) بچائے، اور جو شخص حاجت مند ہو تو وہ مناسب مقدار سے (یعنی جس میں حاجاتِ ضروریہ رفع ہو جاویں) کھالے (برت لے) پھر جب (بعد وجودِ شرائط یعنی بلوغ و رُشد مذکور کے) ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے اموال ان کو دے دینے) پر گواہ بھی کر لیا کرو (شاید کسی وقت کچھ اِختلاف واقع ہو تو گواہ کام آویں) اور (یوں تو) اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والا کافی ہے (اگر خیانت نہ کی ہو تو گواہوں کا نہ ہونا بھی مضر نہیں، کیونکہ اصل حساب جن کے متعلق ہے وہ تو اس کی صفائی جانتے ہیں اور اگر خیانت کی ہے تو گواہوں کا ہونا کوئی نافع نہیں، کیونکہ جن سے حساب کا سابقہ ہے وہ اس کا ملوّث ہونا جانتے ہیں، صرف ظاہری اِنتظام کے لئے گواہوں کا ہونا مصلحت ہے)۔

معارف ومسائل

مال سرمایۂ زندگی ہے اور اس کی حفاظت لازمی ہے

ان آیات میں ایک طرف تو مال کی اہمیت اور اِنسانی معاش میں اس کا بڑا دخل ہونا بیان فرما کر اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا، دُوسری طرف حفاظتِ اموال کے متعلق ایک عام کوتاہی کی اِصلاح فرمائی گئی، وہ یہ کہ بہت سے آدمی طبعی محبت سے مغلوب ہو کر ناتجربہ کار نابالغ بچوں اور ناواقف عورتوں کو اپنے اموال حوالہ کر دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ مال کی بربادی اور بہت جلد افلاس وتنگدستی ہوتی ہے۔

عورتوں، بچوں اور کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کئے جائیں

مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ اپنا پورا مال کم عقل بچوں اور عورتوں کے سپرد کر کے خود ان کے محتاج نہ بنو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوّام اور منتظم بنایا ہے، تم مال کو خود اپنی حفاظت میں رکھ کر بقدرِ ضرورت ان کے کھلانے پہنانے پر خرچ کرتے رہو، اور اگر وہ مال کو اپنے قبضے میں لینے کا مطالبہ بھی کریں تو ان کو معقول بات کہہ کر سمجھا دو، جس میں دِل شکنی بھی نہ ہو اور مال بھی ضائع نہ ہونے پائے، مثلاً یہ کہہ دو کہ یہ سب تمہارے ہی لئے رکھا ہے، ذرا تم ہوشیار ہو جاؤ گے تو تمہیں دے دیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر پر آیت کا مفہوم ان سب عورتوں، بچوں اور کم عقل ناتجربہ کار لوگوں کو شامل ہے جن کو مال سپرد کر دینے پر مال میں نقصان کا خطرہ ہے، خواہ وہ اپنے بچے ہوں یا یتیم بچے، اور خواہ وہ مال ان بچوں اور یتیموں کا اپنا ہو یا اولیاء کا ہو۔ یہی تفسیر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، اور اِمامِ تفسیر حافظ طبریؒ نے بھی اسی کو اِختیار کیا ہے۔ [1]

پچھلی اور اگلی آیتوں کا سیاق اگرچہ اس حکم کو بھی یتیم بچوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا رُجحان پیدا کرسکتا ہے، لیکن الفاظ کا عموم اپنی جگہ ہے، جس میں یتیم اور غیر یتیم سب بچے داخل ہیں، اور شاید اس جگہ اَمْوَالَكُمْ بصیغۂ خطاب فرمانے میں یہی حکمت ہو کہ وہ اپنے اموال کو بھی شامل ہے، اور یتیموں کے اموال کو بھی، جب تک اُن میں ہوشیاری نہ آئے ان کی ذمہ داری میں ہونے کی وجہ سے گویا انہی کے اموال ہیں، اور اس سے پہلی آیت میں وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ فرما کر اصل حقیقت کو واضح بھی کر دیا گیا ہے کہ یتیموں کے مال انہی کو دینا ہے، جس کے بعد کوئی مغالطہ باقی نہیں رہ سکتا۔

---

[1] تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۷ ص:۵۶۵

مال کی حفاظت ضروری اَمر ہے اور اس کو ضائع کرنا گناہ ہے، اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شخص مقتول ہوجائے تو شہید ہے، جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے مقتول ہونے پر شہادت کا اجر موعود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔ [۱]

''اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص مقتول ہوجائے وہ شہید ہے (یعنی ثواب کے اِعتبار سے شہیدوں میں شمار ہے)۔''

نیز اِرشاد فرمایا:-

نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ (مشکوٰۃ) [۲]

''نیک آدمی کے لئے اس کا اچھا اور پاکیزہ مال بہترین متاعِ حیات ہے۔''

نیز اِرشاد فرمایا:-

لَا بَأْسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللہَ عَزَّ وَجَلَّ۔ (مشکوٰۃ) [۳]

''جو شخص اللہ عزّ وجل سے ڈرتا ہو، اس کی مال داری میں دِین کا کوئی حرج نہیں۔''

آخر کی ان دونوں حدیثوں میں یہ بات بتائی ہے کہ صالح اور متقی آدمی کا مال پاس رکھنا اس کے حق میں مضر نہیں ہے، کیونکہ ایسا شخص اللہ سے خوف کھاتے ہوئے اپنے مال کو گناہوں میں خرچ کرنے سے بچے گا، بہت سے اولیاء اللہ اور صوفیائے زاہدین سے جو مال کی بُرائی منقول ہے، وہ انہی لوگوں کے حق میں ہے جو گناہوں میں خرچ کرکے اپنے کمائے ہوئے مال کو آخرت کے عذاب کا ذریعہ بناتے ہیں، اور چونکہ اِنسان طبعی طور پر مال دار ہونے کے بعد اِسراف اور دیگر معاصی سے محفوظ رہنے کی فکر چھوڑ دیتا ہے اس لئے مال سے دُور رہنے کو محبوب سمجھا گیا ہے، بقدرِ ضرورت تھوڑا بہت کمایا اور اللہ کا نام لیا، اور مال کے حساب سے اپنی جان بچائی، یہ پُرانے بزرگوں کا طرز تھا۔ دورِ حاضر میں لوگوں میں دِین واِیمان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، دُنیوی ساز وسامان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اور معمولی سی تکلیف ہی نہیں بلکہ ظاہری فیشن کے خلاف ورزی ہوجانے پر دِین چھوڑنے کو تیار ہوجاتے ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے مالِ حلال کسب کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کی زیادہ اہمیت ہے، اسی طرح کے لوگوں کے لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

---

[۱] صحیح البخاری، ابواب المظالم والغصب، باب من قتل دون مالہ إلخ ج:۱ ص:۳۳۷، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من قصد إلخ ج:۱ ص:۸۱

[۲] مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ، باب رزق الولاۃ وھدایاھم ج:۲ ص:۳۲۶

[۳] مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب استحباب المال إلخ ج:۲ ص:۴۵۱

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا۔ (مشکوٰۃ) [۱]

''یعنی تنگدستی اِنسان کو بعض اوقات کافر بناسکتی ہے۔''

حضرت سفیان ثوریؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: ''كَانَ الْمَالُ فِيْمَا مَضٰى يُكْرَهُ، فَاَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ'' یعنی ''زمانۂ سابق میں مال کو پاس رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ مال مؤمن کی ڈھال ہے۔'' [۲]

نیز انہوں نے فرمایا: ''مَنْ كَانَ فِيْ يَدِهٖ مِنْ هٰذِهٖ شَيْئًا فَلْيُصْلِحْهُ فَاِنَّهٗ زَمَانٌ اِنِ احْتَاجَ كَانَ اَوَّلَ مَنْ يَّبْذُلُ دِيْنَهٗ'' یعنی ''جس کے پاس دَراہم و دَنانیر میں سے کچھ موجود ہو اسے چاہئے کہ اس مال کو مناسب طریقے پر کام میں لائے، کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر کچھ حاجت پیش آگئی تو اِنسان سب سے پہلے حاجت پوری کرنے کے لئے اپنے دِین ہی کو خرچ کرے گا'' مطلب یہ ہے کہ حاجت پورے کرنے کی اہمیت دِین پر چلنے سے زیادہ ہوگئی۔ (مشکوٰۃ) [۳]

نابالغوں کی سمجھ اور صلاحیت جانچنے کا حکم

پہلی آیت میں جب یہ معلوم ہوگیا کہ جب تک معاملات میں نابالغوں کی ہوشیاری ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک ان کو اموال سپرد نہ کئے جائیں، اس لئے دُوسری آیت میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا اِنتظام اور پھر اِمتحان کرکے ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے اَحکام دیئے گئے، ارشاد ہوا:-

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ یعنی ''بالغ ہونے سے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے معمولی معاملات خرید وفروخت ان کے سپرد کرکے ان کی صلاحیت کا اِمتحان لیتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل یعنی بالغ ہوجائیں'' تو اَب خاص طور سے اس کا اندازہ لگاؤ کہ وہ اپنے معاملات میں ہوشیار ہوگئے یا نہیں، جب ہوشیاری محسوس کرلو تب ان کے اموال ان کے سپرد کردو۔

خلاصہ یہ کہ بچوں کی مخصوص طبیعت اور ان میں عقل وہوش کے نشو ونما کے اِعتبار سے ان کے تین درجے کردیئے گئے، ایک بلوغ سے پہلے، دُوسرا بلوغ کے بعد، تیسرا ہوشیاری کے بعد۔ بلوغ سے پہلے بچوں کے اولیاء کو یہ حکم ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کی کوشش کریں، معاملات میں ان کو ہوشیار کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے معاملات خرید وفروخت کے ان کے ہاتھ سے کرائیں، آیت میں وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى کا یہی مطلب ہے۔ اس سے اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نابالغ بچے جو معاملاتِ خرید وفروخت اپنے ولی کی اجازت سے کریں وہ صحیح اور نافذ ہیں۔

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب ما ینهی عنه إلخ ج:۲ ص:۴۳۹

[۲] مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب استحباب المال إلخ ج:۲ ص:۴۵۱

[۳] بحوالۂ بالا۔

دُوسرا حکم یہ ہے کہ جب وہ بالغ اور نکاح کے قابل ہو جائیں تو اَب معاملات اور تجربہ کے اِعتبار سے ان کے احوال کی جانچ کرو، اگر دیکھو کہ وہ اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے لگے ہیں، اور معاملات سلیقہ سے کرتے ہیں تو ان کے مال ان کے حوالے کردو۔

بلوغ کی عمر

اس آیت میں جہاں بلوغ کا حکم بیان فرمایا گیا وہاں قرآنِ کریم نے اس بارے میں کہ بچے کا بالغ ہونا کس عمر میں سمجھا جائے گا حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فرما کر اس کی طرف اِشارہ کردیا کہ اصل بلوغ کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ اس کا مدار اُن آثار پر ہے جو بالغوں کو پیش آتے ہیں، ان آثار کے اِعتبار سے جس وقت بھی وہ نکاح کے قابل ہوجائیں بالغ سمجھے جائیں گے، خواہ عمر تیرہ چودہ سال ہی کی ہو، البتہ اگر کسی بچے میں آثارِ بلوغ نمودار ہی نہ ہوں تو عمر کے اِعتبار سے اس کو بالغ قرار دیا جائے گا، جس میں فقہاء کا اِختلاف ہے، بعض نے لڑکے کے لئے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لئے سترہ سال مقرّر کئے ہیں، اور بعض نے دونوں کے لئے پندرہ سال قرار دیئے، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مذہب میں فتویٰ اس قول پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں پندرہ سال کی عمر پوری ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے، خواہ آثارِ بلوغ پائے جائیں یا نہیں۔[1]

ہوشیاری کیونکر معلوم ہوگی؟ اس سلسلہ میں "اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا" کی تشریح

حکمِ قرآنی یہ ہے کہ جب تم ان میں ہوشیاری محسوس کرو اس وقت ان کے اموال ان کو سپرد کردو، اس ہوشیاری کی کیا میعاد ہے؟ قرآن مجید نے اس آخری میعاد کی کوئی صراحت نہیں فرمائی، اس لئے بعض فقہاء اس طرف گئے کہ جب تک پوری ہوشیاری محسوس نہ کی جائے اس وقت تک ان کے اموال ان کے سپرد نہ کئے جائیں گے، بلکہ بدستورِ سابق ولی کی حفاظت وامانت میں رہیں گے، خواہ ساری عمر اسی حالت میں گزر جائے۔

اور اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس جگہ عدمِ ہوشیاری سے وہ مراد ہے جو بچپن کے اثر سے ہو، اور بالغ ہونے کے دس سال بعد تک بچپن کا اثر ختم ہوجاتا ہے، اس لئے پندرہ سال عمرِ بلوغ اور دس سال سنِ رُشد وہوشیاری یہی کل پچیس سال کی عمر ہوجانے پر وہ رُشد وہوشیاری ضرور حاصل ہوگی جس کے حاصل ہونے میں بچپن اور کم عمری حائل تھی، اور قرآنِ کریم نے لفظ رُشْدًا نکرہ لاکر اس کی طرف اِشارہ بھی کردیا ہے کہ مکمل ہوشیاری اور دانش مندی شرط نہیں، کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لئے کافی ہے، کہ ان کے اموال ان کو دے دیئے جائیں، اس لئے پچیس سال تک اِنتظار کرکے اگر مکمل ہوشیاری نہ بھی آئے تب بھی ان کے اموال ان کو دے دیئے جائیں گے، رہی مکمل ہوشیاری اور دانش مندی، سو یہ

1 فتاویٰ شامیة، کتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام ج:۶ ص:۱۵۳

بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی، وہ ہمیشہ سیدھے بھولے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو اپنے اموال سے محروم نہ کیا جائے گا، ہاں اگر کوئی بالکل پاگل اور مجنون ہی ہو سو اس کا حکم علیحدہ ہے کہ وہ ہمیشہ نابالغ بچوں کے حکم میں رہتا ہے، اور اس کے اموال کبھی اس کے حوالہ نہ کئے جائیں گے، جب تک اس کا جنون زائل نہ ہو جائے، اگرچہ ساری عمر اس جنون میں گزر جائے۔

یتیموں کے مال بے جا خرچ کرنے کی ممانعت

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اس آیت میں اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ یتیموں کے مال ان کو اس وقت تک حوالہ نہ کرو جب تک ان میں کسی قدر ہوشیاری اور تجربہ نہ آجائے، اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ مزید کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا۔

اس حالت میں یہ اِمکان تھا کہ اولیائے یتیم کی طرف سے کوئی ایسی زیادتی ہو جس سے یتیم کا نقصان ہو، اس لئے آگے اس آیت میں اِرشاد فرمایا:-

وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوْا ؕ یعنی ''ان اموال کو ضرورت سے زائد اُٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جائیں گے تو ان کو دینا پڑے گا، جلدی جلدی اُڑا کر مت کھا ڈالو'' اس میں اولیائے یتیم کو دو چیزوں سے روکا گیا، ایک ان کے مال میں اِسراف یعنی ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے، دُوسرے اس بات سے کہ ان کا مال ضرورت پیش آنے سے پہلے جلد جلد خرچ کرنے لگیں، اس خیال سے کہ عنقریب یہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کا مال ان کو دینا پڑے گا، ہمارا اِختیار ختم ہو جائے گا۔

یتیم کا ولی اس کے مال میں سے ضرورۃً کچھ لے سکتا ہے

آخرِ آیت میں اس کا ضابطہ اِرشاد فرمایا کہ جو شخص کسی یتیم بچے کی تربیت اور اس کے مال کی حفاظت میں اپنا وقت اور محنت خرچ کرتا ہے کیا اس کو یہ حق ہے کہ یتیم کے مال میں سے اپنا حق الخدمت کچھ لے لے، چنانچہ فرمایا:-

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ یعنی جو شخص حاجت مند نہ ہو اپنی ضرورت کا تکفل کسی دُوسرے ذریعہ سے کر سکتا ہو، اس کو چاہئے کہ یتیم کے مال میں سے حق الخدمت نہ لیا کرے، کیونکہ یہ خدمت اس کے ذمہ فرض ہے، اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، پھر فرمایا:-

وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ یعنی جو ولیٔ یتیم، فقیر محتاج ہو اور دُوسرا کوئی ذریعۂ معاش نہ رکھتا ہو وہ یتیم کے مال سے ایک مناسب مقدار کھا سکتا ہے جس سے حاجاتِ ضروریہ پوری ہو جائیں۔

مال سپرد کرتے وقت گواہ بنانا

آخر میں ارشاد فرمایا: فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ یعنی ''جب آزمائش کے بعد یتیموں کے اموال ان کے سپرد کرنے لگو تو چند ثقہ اور نیک لوگوں کو گواہ بنالیا کرو، تا کہ آئندہ کسی نزاع اور جھگڑے کی صورت پیدا نہ ہو، اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حساب میں ہر چیز ہے۔''

اوقاف اور دُوسری ملکی اور ملّی خدمات کا معاوضہ

آیت کے سباق سے ایک فقہی ضابطہ اور اُصول معلوم ہو گیا، کہ جو لوگ اوقاف کے نگراں ہیں، یا مساجد و مدارس کے منتظم ہیں، یا مسلم حکومتوں کے اِداروں کے ذمہ دار ہیں، یا ایسی ہی دُوسری ملکی اور ملّی خدمات جن کا انجام دینا فرضِ کفایہ ہے اُن پر مامور ہیں، ان حضرات کے لئے بھی اعلیٰ اور افضل یہ ہے کہ اگر اپنے پاس اتنا اثاثہ ہو، اور وہ اپنے بچوں کے ضروری اخراجات پورے کر سکتے ہوں تو ان اِداروں سے اور حکومت کے بیت المال سے کچھ بھی نہ لیں، لیکن اگر اپنے پاس گزارے کے لئے مال موجود نہ ہو اور کسب کے اوقات ان کاموں میں مشغول ہو جاتے ہوں تو بقدرِ ضرورت ان اداروں سے مال لے لینے کا اِختیار ہے، مگر قدرِ ضرورت کا لفظ پیشِ نظر رہے۔ بہت سے لوگ ضابطہ کے طور پر کاغذی خانہ پُری کے لئے اپنا ماہانہ کچھ حصہ مقرّر کر لیتے ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے اس سے کہیں زیادہ بے اِحتیاطی کے ساتھ اپنی ذات پر اور بال بچوں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں، اس بے اِحتیاطی کا مداوا بجز خوفِ الٰہی کے کچھ نہیں، جس کی طرف آیت کے آخیر ٹکڑے میں وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ فرما کر جملہ عوام و خواص کو توجہ دِلا دی گئی ہے جسے اللہ کے محاسبہ کا خیال ہو وہی ناجائز مال سے بچ سکتا ہے، وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا

مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں

تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا بہت ہو، حصہ مقرّر کیا ہوا ہے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ

اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج تو ان کو کچھ کھلادو اس میں سے

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ

اور کہہ دو ان کو بات معقول۔ اور چاہیئے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑیں اپنے پیچھے

ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾

اولاد ضعیف تو ان پر اندیشہ کریں یعنی ہمارے پیچھے ایسا ہی حال ان کا ہوگا، تو چاہیئے کہ ڈریں اللہ سے اور کہیں بات سیدھی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ

جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں،

وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ ع

اور عنقریب داخل ہوں گے آگ میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

مردوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، چاہے وہ (ترکہ) تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ ﴿٧﴾ اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور مسکین لوگ آجائیں، تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دو، اور ان سے مناسب انداز میں بات کرو۔ ﴿٨﴾ اور وہ لوگ (یتیموں کے مال میں خرد برد کرنے سے) ڈریں جو اگر اپنے پیچھے کمزور بچے چھوڑ کر جائیں تو ان کی طرف سے فکرمند رہیں گے۔ لہٰذا وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی سیدھی بات کہا کریں ﴿٩﴾ یقین رکھو کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی آگ میں داخل ہونا ہوگا۔ ﴿١٠﴾

ربطِ آیات

سورۂ نساء میں اوّل ہی عام اِنسانی حقوق خصوصاً عائلی زندگی سے متعلق حقوق کا بیان چل رہا ہے، اس سے پہلی آیت میں یتیموں کے حقوق کا بیان تھا، مذکورہ چار آیتوں میں بھی عورتوں اور یتیموں کے خاص حقوق متعلقہ وراثت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں جاہلیت کی اس رسم کو باطل کیا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کو میراث کا مستحق ہی نہیں مانا جاتا تھا، اس آیت نے ان کو اپنے شرعی حصہ کا مستحق قرار دے کر ان کے حق میں کمی کرنے اور نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت کی، پھر چونکہ مستحقینِ میراث کا ذِکر آیا تھا اور ایسے موقع پر تقسیم کے وقت غیر مستحقین فقراء اور یتیم بچے بھی حاضر ہوجایا کرتے ہیں تو دُوسری آیت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور مراعات کا حکم اِرشاد فرمایا، لیکن یہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ اِستحبابی ہے۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیت میں بھی اَحکامِ یتامیٰ کے سلسلے میں اسی مضمون کی تاکید ہے۔

خلاصۂ تفسیر

مردوں کے لئے بھی (خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرّر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (یا دُوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں، اور (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرّر) ہے اس چیز میں جس کو (ان عورتوں کے) ماں باپ اور (یا دُوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جاویں، خواہ وہ (چھوڑی ہوئی) چیز قلیل ہو یا کثیر ہو (سب میں سے ملے گا اور) حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مقرّر ہے، اور جب (وارثوں میں ترکہ کے) تقسیم ہونے کے وقت (یہ لوگ) موجود ہوں (یعنی دُور کے) رِشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ (اس توقع سے کہ شاید ہم کو بھی کچھ مل جاوے، رِشتہ دار تو ممکن ہے کہ گمانِ اِستحقاق سے اور دُوسرے لوگ بامید خیر خیرات کے) تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دے دو اور ان کے ساتھ خوبی (اور نرمی) سے بات کرو (وہ بات رِشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ سمجھا دو کہ تمہارا حصہ شرع سے اس میں نہیں ہے، ہم معذور ہیں، اور دُوسروں سے یہ کہ دے کر اِحسان نہ جتلاؤ) اور (یتامیٰ کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر (مر) جاویں تو ان (بچوں) کی ان (لوگوں) فکر ہو (کہ دیکھئے ان کو کوئی آزار نہ دے، تو ایسا ہی دُوسرے کے بچوں کے

لئے بھی خیال رکھنا چاہئے، کہ ہم ان کو آزار نہ دیں) سو (اس بات کو سوچ کر) ان لوگوں کو چاہئے کہ (یتامیٰ کے معاملہ میں) خدا تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں (یعنی فعلاً آزار وضرر نہ پہنچائیں) اور (قولاً بھی اُن سے) موقع کی بات کہیں (اس میں تسلی اور دِل جوئی کی بات بھی آگئی، اور تعلیم وتادیب کی بات بھی آگئی، غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اِصلاح کریں) بلاشبہ جولوگ یتیموں کا مال بلا اِستحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں (دوزخ کی) آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی انجام اس کھانے کا یہ ہونے والا ہے) اور (اس انجام کے مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں، کیونکہ) عنقریب (ہی دوزخ کی) جلتی (آگ) میں داخل ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)۔

معارف ومسائل

والدین اور دیگر اقرباء کے اموال میں حقِ میراث

اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں اِنسان کی صنفِ ضعیف، یتیم بچے اور صنفِ نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہے ہیں، اوّل تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق دِلائے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل اِنتظام کیا، قانونِ وراثت میں بھی عام اقوامِ دُنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور واجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔

عرب نے تو اُصول ہی یہ بنالیا تھا کہ وراثت کا مستحق صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو اور دُشمنوں کا مقابلہ کرکے اس کا مالِ غنیمت جمع کرے۔ (رُوح المعانی ج:۴ ص:۲۱۰)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنفِ ضعیف بچے اور عورتیں اس اُصول پر نہیں آسکتیں، اس لئے ان کے اُصولِ وراثت کی رُو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہوسکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ سمجھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہوتا تو وہ بھی مستحقِ وراثت نہ تھا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک واقعہ [1] پیش آیا کہ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اِنتقال ہوا اور دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچازاد بھائیوں نے آکر مرحوم کے پورے مال پر قبضہ کرلیا اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقاً

[1] عمدة القاري، كتاب الوصايا، باب قول الله عزَّ وجلَّ وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى إلخ ج:۱۵ ص:۳۰۹

مستحقِ وراثت نہ سمجھی جاتی تھی خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہوگئیں، اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کردیا گیا، لہٰذا پورے مال کے وارث دو چچازاد بھائی ہوگئے۔

اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچازاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ کررہے ہیں تو ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کرلیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو، مگر انہوں نے یہ بھی قبول نہ کیا، تب اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرضِ حال کیا، اور اپنی اور اپنے بچوں کی بے کسی اور محرومی کی شکایت کی، اس وقت تک چونکہ قرآنِ حکیم میں آیتِ میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے میں توقف فرمایا، آپ کو اطمینان تھا کہ وحیٔ الٰہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدلا جائے گا، چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی:-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝

اور اس کے بعد دوسری آیتِ وراثت نازل ہوئی، جس میں حصوں کی تفصیلات ہیں، اور اس سورت کا دوسرا رُکوع ان تفصیلات پر مشتمل ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اَحکامِ قرآنی کے مطابق کل ترکہ کا آٹھواں حصہ بیوی کو دے کر باقی سب مال مرحوم کے لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح تقسیم کردیا کہ اس کا آدھا لڑکے کو اور آدھے میں دونوں لڑکیاں برابر کی شریک رہیں، اور چچازاد بھائی بمقابلہ اولاد کے چونکہ اقرب نہ تھے اس لئے ان کو محروم کیا گیا۔ (رُوح المعانی)[1]

اِستحقاقِ میراث کا ضابطہ

اس آیت نے وراثت کے چند اَحکام کے ضمن میں قانونِ وراثت کا ضابطہ بیان فرمادیا ہے:-

مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ان دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اُصول بتلادیئے، ایک رشتۂ ولادت، جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے، اور جس کو لفظ "وَالِدَانِ" سے بیان کیا گیا ہے، دُوسرے عام رِشتہ داری جو لفظ "أَقْرَبُونَ" کا مفہوم ہے، اور صحیح یہ ہے کہ لفظ "أَقْرَبُونَ" ہر قسم کی قرابت اور رِشتہ داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ ہیں، یا دُوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رِشتوں میں، یا وہ رِشتے جو اِزدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ "أَقْرَبُونَ" سب پر حاوی ہے، لیکن والدین کو اُن کی اہمیت کی وجہ سے بطورِ خاص جدا کردیا گیا، پھر اس لفظ نے یہ بھی بتلادیا کہ مطلق رِشتہ داری وراثت کے لئے کافی نہیں، بلکہ رِشتے میں اَقرب ہونا شرط ہے، کیونکہ اگر

[1] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۴۳۸

اَقربیت کو معیاری شرط نہ بنایا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت پوری دُنیا کی تمام اِنسانی آبادی پر تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا، کیونکہ سب ایک ماں باپ آدم وحوّاء علیہم السلام کی اولاد ہیں، دُور قریب کا کچھ نہ کچھ رِشتہ سب میں موجود ہے، اور یہ اوّل تو اِمکان سے باہر ہے، دُوسرے اگر کسی طرح کوشش کر کے اس کا انتظام کر بھی لیا جائے تو متروکہ مال جزء لا یتجزّی بن کر ہی تقسیم ہو سکے گا جو کسی کے کام نہ آئے گا، اس لئے ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رِشتہ داری پر ہو تو اُصول یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دُور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رِشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اَقرب کے ہوتے ہوئے اَبعد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رِشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں، اگرچہ وجوہِ اقربیت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب مستحق وراثت ہوں گے، جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ کہ یہ سب اَقرب ہیں، اگرچہ اقربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔

نیز ایک اور بات اسی لفظ "اَقْـرَبُـوْنَ" نے بتلائی کہ جس طرح مردوں کو مستحقِ وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ رِشتہ اولاد کا یا ماں باپ کا ہو، یا دُوسری قسم کے رِشتے ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے، جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوئی۔

پھر قرآنِ کریم کے اُسلوب کو دیکھئے کہ "لِلرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ" کو جمع کر کے مختصر لفظوں میں ان کے حق کا بیان ہو سکتا تھا، اس کو اِختیار نہیں کیا، بلکہ مردوں کے حق کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے، اسی تفصیل وتشریح کے ساتھ عورتوں کا حق جداگانہ بیان فرمایا، تاکہ دونوں کے حقوق کا مستقل اور اہم ہونا واضح ہو جائے۔

نیز اسی لفظ "اَقْـرَبُـوْنَ" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مالِ وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وارثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میّت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہو گا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہو گا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اَقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنایا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اِختیار کر سکتا ہے، کیونکہ اَقربیت کے علاوہ دُوسرا معیار لامحالہ وقتی اِجتہادی ہو گا، کیونکہ فقر وحاجت کوئی دائمی چیز نہیں، اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں، درجات بھی، ایسی صورت میں اِستحقاق کے بہت سے دعوے دار نکل آیا کریں گے، اور فیصلہ کرنے والوں کو ان کا فیصلہ مشکل ہو گا۔

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

اگر اس قرآنی اُصول کو سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ جو آج کل بلاوجہ ایک نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے، وہ خود بخود ایک قطعی فیصلہ کے ساتھ حل ہو جاتا ہے کہ اگرچہ یتیم پوتا بہ نسبت بیٹے کے ضرورت مند زیادہ ہو، لیکن "اَقْرَبُوْنَ" کے قانون کی رُو سے وہ مستحقِ وراثت نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بیٹے کی موجودگی میں اَقرب نہیں، البتہ اُس کی ضرورت رفع کرنے کے لئے دُوسرے اِنتظامات کئے گئے ہیں جس میں سے ایک ایسا ہی اِنتظام اگلی آیت میں آرہا ہے۔

اس مسئلہ میں موجودہ دور کے مغرب زدہ متجدّدین کے علاوہ کسی نے بھی اِختلاف نہیں کیا، ساری اُمت آج تک قرآن وحدیث کی تصریحات سے یہی سمجھتی آئی ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہ ملے گی، خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مر گیا ہو۔

متوفی کی ملکیت میں جو کچھ ہو سب میں وراثت کا حق ہے

اس آیت میں مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ فرما کر ایک دُوسری جاہلانہ رسم کی اِصلاح فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ بعض قوموں میں بعض اقسامِ مال کو بعض خاص وارثوں کے لئے مخصوص کر لیا جاتا تھا، مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ اسلحہ، یہ سب صرف نوجوان مردوں کا حق تھا، دُوسرے وارثوں کو ان سے محروم کر دیا جاتا تھا، قرآنِ کریم کی اس ہدایت نے بتلا دیا کہ میّت کی ملکیت میں جو چیز بھی تھی، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہر چیز میں ہر وارث کا حق ہے، کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا جائز نہیں۔

میراث کے مقرّرہ حصے اللہ کی جانب سے طے شدہ ہیں

آخرِ آیت میں جو اِرشاد فرمایا: نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ اس سے یہ بھی بتلا دیا کہ مختلف وارثوں کے جو مختلف حصے قرآن نے مقرّر فرمائے ہیں، یہ خدا کی طرف سے مقرّر کردہ حصے ہیں، ان میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی، یا تغیر وتبدل کا کوئی حق نہیں۔

وراثت ایک جبری مِلک ہے اس میں مالک ہونے والے کی رضامندی شرط نہیں

اور اسی لفظ مَّفْرُوضًا سے ایک اور مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت کے ذریعہ جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے، ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے، نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے، بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا، یہ دُوسری بات ہے کہ وہ مالک

بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دُوسرے کو ہبہ کر دے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کر دے۔

محروم الارث رشتہ داروں کی دِلداری ضروری ہے

میّت کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو ضابطۂ شرعی کے ماتحت اس کی میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ فرائض کی تفصیلات کا علم ہر شخص کو نہیں ہوتا، عام طور پر ہر رشتہ دار خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کو بھی میراث میں سے حصہ ملے، اس لئے وہ رشتہ دار جو شرعی ضابطۂ میراث کے تحت محروم قرار دیئے گئے ہیں، تقسیم میراث کے وقت ان کا دِل افسردہ اور رنجیدہ ہوسکتا ہے، خصوصاً جبکہ تقسیمِ میراث کے وقت وہ موجود بھی ہوں، اور بالخصوص جبکہ ان میں کچھ یتیم اور مسکین حاجت مند بھی ہوں، ایسی حالت میں جبکہ دُوسرے رشتہ دار اپنا اپنا حصہ لے جا رہے ہوں، اور یہ کھڑے دیکھ رہے ہوں، ان کی حسرت ویاس اور دِل شکنی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر کبھی یہ کیفیت گزری ہو۔

اب قرآنی نظام کی خوبی وخوش اُسلوبی کو دیکھئے کہ ایک طرف تو خود قرآن ہی کا بتایا ہوا عادلانہ ضابطہ یہ ہے کہ اَقْرَبْ کے مقابلے میں اَبْعَدْ کو محروم کیا جائے، دُوسری طرف محروم ہونے والے اَبْعَدْ کی حسرت اور دِل شکنی بھی گوارا نہیں کی جاتی، اس کے لئے ایک مستقل آیت میں یہ ہدایت کی گئی:-

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ یعنی "جو دُور کے رِشتہ دار اور یتیم مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم رہے ہوں، اگر وہ تقسیم میراث کے وقت آموجود ہوں تو میراث پانے والوں کا اَخلاقی فرض ہے کہ اس مال میں سے باختیارِ خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں جو ان کے لئے ایک قسم کا صدقہ اور موجبِ ثواب ہے، اور ایسے وقت میں جبکہ ایک مال بغیر کسی سعی وعمل کے محض خدا تعالیٰ کے دین سے انہیں مل رہا ہو تو صدقہ خیرات فی سبیل اللہ کا خود بھی داعیہ دِل میں ہونا چاہئے۔" جیسا کہ اس کی ایک نظیر دُوسری آیت میں مذکور ہے: كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ إِذَآ أَثْمَرَ وَاٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ یعنی "اپنے باغ کا پھل کھاؤ جبکہ وہ پھل دینے لگے، اور جس روز پھل کاٹو تو اس کا حق نکال کر فقراء ومساکین کو دے دو۔" (یہ آیت سورۂ اَنعام: ۱۴۱ میں آرہی ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دُور کے رشتہ دار، یتیم، مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا کوئی حصہ ضابطۂ شرعی سے اس میراث میں نہیں ہے تو ان کے جمع ہو جانے سے تم تنگدل نہ ہو، بلکہ جو مال خدا تعالیٰ نے تمہیں بلامحنت عطا فرمایا ہے، اس میں سے بطورِ شکرانہ کچھ عطا کر دو، اور غنیمت جانو کہ خرچ کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے، اس موقع پر ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے دینے سے ان دُور کے رشتہ داروں کی دِل شکنی اور حسرت کا اِزالہ ہو جائے گا، اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آگیا، اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کو چاہئے کہ اس کو اپنے اپنے حصہ سے بخوشی کچھ دے دیں۔

آخرِ آیت میں فرمایا: وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا سا دینے پر بھی راضی نہ ہوں بلکہ دُوسروں کے برابر حصہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو چونکہ ان کا یہ مطالبہ قانونِ شرع کے خلاف اور غیر منصفانہ ہے، اس لئے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی تو گنجائش نہیں، لیکن اس پر بھی اُن کو کوئی ایسی بات نہیں کہی جائے جس سے اُن کی دِل شکنی ہو، بلکہ معقول طور پر ان کو سمجھا دیا جائے کہ شرعی قاعدہ سے میراث میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ محض تبرّعاً دیا ہے۔ اور ایک بات یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو تبرّعاً جو دِیا جائے گا مجموعی مال میں سے نہیں، بلکہ بالغین ورثاء میں سے جو حاضر ہوں وہ اپنے حصہ میں سے دیں، نابالغ اور غائب کے حصہ میں سے دینا دُرست نہیں۔

اللہ سے ڈرتے ہوئے میراث تقسیم کریں

تیسری آیت میں عام مسلمانوں کو خطابِ عام ہے کہ اس کا پورا اہتمام کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جائے، اور ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کریں جس میں اولاد کے حصہ پر کوئی ناگوار اثر پڑتا ہو، اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت یا تصرف کرتے ہوئے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دُوسرے وارثوں کو نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے تو آپ پر لازم ہے کہ اس کو ایسی وصیت یا ایسے تصرف سے روکیں، جیسا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنا پورا مال یا آدھا مال صدقہ کرنے سے روک دیا، اور صرف ایک تہائی مال کو صدقہ کرنے کی اِجازت دے دی (مشکوٰۃ باب الوصایا) [1] کیونکہ پورا مال یا آدھا مال صدقہ کر دیا جاتا تو وارثوں کا حصہ ختم یا کم ہو جاتا۔

نیز اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا دینے کا بڑا اِہتمام کریں، اس میں ادنیٰ کوتاہی کو راہ نہ دیں، اور دُوسروں کے یتیم بچوں کے حالات کو اپنے بچوں اور اپنی محبت کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیں، اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ لوگ اچھا معاملہ کریں، اور وہ پریشان نہ ہوں، کوئی ان پر ظلم نہ کرے تو ان کو چاہئے کہ دُوسرے کی اولاد یتامیٰ کے ساتھ یہی معاملہ کریں۔

یتیم کا مال ظلماً کھانا پیٹ میں انگارے بھرنا ہے

چوتھی آیت میں یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنے والوں کے لئے وعیدِ شدید کا بیان ہے، کہ جو شخص ناجائز طور پر یتیم کا مال کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔

اس آیت نے یتیم کے مال کو جہنم کی آگ قرار دِیا ہے، بہت سے مفسرین نے اس کو تشبیہ اور کنایہ پر محمول کیا ہے،

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الفرائض والوصایا، باب الوصایا ج: ۱ ص: ۲۶۵

یعنی یتیموں کا مال ناحق کھانا ایسا ہے جیسے کوئی پیٹ میں آگ بھرے، کیونکہ اس کا انجام بالآخر قیامت میں ایسا ہی ہونے والا ہے۔ مگر اہلِ تحقیق کا قول یہ ہے کہ آیت میں کوئی مجاز اور کنایہ نہیں ہے، بلکہ جو مال یتیم کا ناجائز طریقے سے کھایا جائے وہ حقیقت میں آگ ہی ہے، اگرچہ اس وقت اس کی صورت آگ کی معلوم نہ ہوتی ہو۔ جیسے کوئی شخص دیا سلائی کو کہے کہ یہ آگ ہے، یا سنکھیا کو کہے کہ قاتل ہے، تو ظاہر ہے کہ دیا سلائی کو ہاتھ میں لینے سے ہاتھ نہیں جلتا، اور سنکھیا کو ہاتھ میں لینے سے بلکہ منہ میں رکھنے سے بھی کوئی آدمی نہیں مرتا، البتہ ذرا سی رگڑ کھانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا سلائی کو آگ کہا تھا وہ صحیح کہا تھا، اسی طرح حلق کے نیچے اُترنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سنکھیا کو قاتل کہنے والا سچا تھا۔ قرآنِ کریم کے عام اطلاقات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انسان جو عمل نیک یا بد کر رہا ہے یہی عمل جنت کے درخت اور پھل پھول ہیں یا جہنم کے انگارے ہیں، اگرچہ ان کی صورت یہاں اور ہے مگر قیامت کے روز اپنی شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آئیں گی قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (الکہف ۴۹) یعنی ”قیامت کے روز وہ اپنے کئے ہوئے کو موجود پائیں گے“ یعنی جو عذاب وثواب ان کو نظر آئے گا، وہ حقیقت میں ان کا اپنا عمل ہوگا۔

بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اُٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک اور کانوں، آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔ [۱]

اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے روز اس طرح اُٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھڑک رہے ہوں گے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا۔ (ابنِ کثیر) [۲]

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی، گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں شدید احتیاط کے لئے واضح ہدایات دی ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

اُحَرِّجُ مَالَ الضَّعِيْفَيْنِ الْمَرْاَةِ وَالْيَتِيْمِ۔ (ابن کثیر ج:۱ ص:۴۵۶) [۳]

”میں تم کو خاص طور پر دو ضعیفوں کے مال سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہوں، ایک عورت اور دُوسرے یتیم۔“

سورۂ نساء کے اوّل رُکوع میں شروع سے آخر تک عموماً یتامیٰ ہی کے اَحکام ہیں، یتامیٰ کے اموال کی نگہداشت رکھنے، ان کے مال کو اپنا مال نہ بنالینے، ان کے وراثت میں ملے ہوئے اموال سے ان کو حصہ دینے کا حکم فرمایا، اور بڑا

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۴۹۲۴ سورة النساء، تحت الآیة: اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا

[۲] ج:۱ ص:۴۸۳، ومسند ابی یعلٰی رقم الحدیث: ۷۴۷۱ حدیث ابی برزة الأسلمی رضی اللہ عنہ۔

[۳] وأیضًا فی المستدرک للحاکم، کتاب الأطعمة رقم الحدیث: ۷۴۷۱

ہو جانے کے ڈر سے ان کا مال اُڑا دینے میں جلدی کرنا، یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے مہر کم کر دینا، یا ان کے مال پر قبضہ کر لینا وغیرہ ان سب اُمور کی ممانعت فرمائی۔

آخر میں فرمایا کہ ناحق یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ کے انگارے بھرنا ہے، کیونکہ اس کی پاداش میں موت کے بعد اس طرح کے لوگوں کے پیٹوں میں آگ بھری جائے گی، لفظ یَاْكُلُوْنَ استعمال فرمایا ہے، اور یتیم کا مال کھانے پر وعید سنائی گئی ہے، لیکن یتیم کے مال کا ہر استعمال کھانے پینے میں ہو یا برتنے میں، سب حرام اور باعثِ عتاب وعذاب ہے، کیونکہ محاورے میں کسی کا مال ناحق کھالینا ہر استعمال کو شامل ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر ہر حصہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس کے نابالغ بچے یتیم ہوتے ہیں، ان بچوں کے ساتھ عموماً ہر گھر میں ظلم وزیادتی کا برتاؤ ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص جو اِن بچوں کے باپ کی وفات کے بعد مال پر قابض ہوتا ہے خواہ ان بچوں کا چچا ہو، یا بڑا بھائی ہو، یا والدہ ہو، یا اور کوئی ولی یا وصی ہو، اکثر اُن اُمور کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کی ممانعت اس رُکوع میں کی گئی ہے، اوّل تو سالہا سال مال کو تقسیم کرتے ہی نہیں، ان بچوں کی روٹی کپڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں، پھر بدعات، رُسومات اور فضولیات میں اسی مالِ مشترک سے خرچ کئے چلے جاتے ہیں، اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہیں، اور سرکاری کاغذات میں نام بدلوا کر اپنے بچوں کا نام لکھواتے ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی ہی گھر خالی رہتا ہوگا۔

مدرسوں اور یتیم خانوں میں جو چندہ یتیموں کے لئے آتا ہے اس کو یتیموں پر خرچ نہ کرنا بھی ایک صورت یتیم کا مال ہضم کرنے کی ہے۔

مسئلہ:- میّت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں، ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں، بعض علاقوں میں تانبے، پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دے دیتے ہیں، حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ پہلے مال بانٹ لیں، جس میں مرنے والے کی اولاد، بیوی، والدین، بہنیں، جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہو اس کو دے دیں، اس کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کریں، یا مل کر کریں تو صرف بالغین کریں، نابالغ کی اجازت کا بھی اِعتبار نہیں، اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف دُرست نہیں۔

مسئلہ:- میّت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازہ کے اُوپر ڈالی جاتی ہے، وہ کفن میں شامل نہیں ہے، اس کو میّت کے مال سے خریدنا جائز نہیں، کیونکہ وہ مالِ مشترک ہے، کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کر دے تو جائز ہے۔ بعض علاقوں میں نمازِ جنازہ پڑھانے والے اِمام کے لئے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلیٰ تیار کیا جاتا ہے، اور پھر یہ مصلیٰ اِمام کو

دے دیا جاتا ہے، یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے فاضل ہے، ورثہ کے مشترک مال میں سے اس کا خریدنا جائز نہیں۔

مسئلہ: - بعض جگہ میّت کے غسل کے لئے نئے برتن خریدے جاتے ہیں، پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے، اوّل تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں سے غسل دیا جاسکتا ہے، اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ جائے تو توڑنا جائز نہیں، اوّل تو اس میں مال ضائع کرنا ہے، اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق وابستہ ہے۔

مسئلہ: - ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صدقہ وخیرات کچھ جائز نہیں، اس طرح کے صدقہ وخیرات کرنے سے مردے کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا، بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے، اس لئے کہ مورث کے مرنے کے بعد اَب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں، اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چرا کر میّت کے حق میں صدقہ کر دیا جائے، پہلے مال تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میّت کے حق میں صدقہ خیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں، اس لئے کہ اُن میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں، اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دِلی سے اجازت دیں، ہوسکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں، اور لوگوں کے طعنوں کے خوف سے کہ اپنے مردہ کے حق میں دو پیسے تک خرچ نہ کئے، اس عار سے بچنے کے لئے بادلِ ناخواستہ ہامی بھر لے۔ حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جبکہ دینے والا طیبِ خاطر سے دے رہا ہو، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہوجائے گا، یہ بزرگ ایک مسلمان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، تھوڑی دیر مریض کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی رُوح پرواز کرگئی، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انہوں نے فوراً اسے بجھا دیا، اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا، اور روشنی کی، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت تھی، اور اس کی روشنی استعمال کرنا دُرست تھا، اب یہ اس دُنیا سے رُخصت ہوگیا تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہوگیا، لہٰذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کرسکتے ہیں، اور وہ سب یہاں موجود نہیں ہیں، لہٰذا اپنے پیسوں سے تیل منگا کر روشنی کی۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ

حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے،

فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانَتْ

پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کے لئے ہے دوتہائی اس مال سے جو چھوڑ مرا، اور اگر

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

ایک ہی تو اس کے لئے آدھا ہے، اور میّت کے ماں باپ کو ہر ایک کے لئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے

مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ

اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میّت کے اولاد ہے، اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اس کے ماں باپ

فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ

تو اس کی ماں کا ہے تہائی، پھر اگر میّت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ بعد وصیت کے

يُّوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ؕ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ

جو کر مرا یا بعد ادائے قرض کے، تمہارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کون

أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ؕ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

نفع پہنچائے تم کو زیادہ، حصہ مقرّر کیا ہوا اللہ کا ہے، بے شک اللہ خبردار ہے حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اور اگر (صرف) عورتیں ہی ہوں، دو یا دو سے زیادہ، تو مرنے والے نے جو کچھ چھوڑا ہو، انہیں اس کا دوتہائی حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف ایک عورت ہو تو اسے (ترکے کا) آدھا حصہ ملے گا۔ اور مرنے والے کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ مرنے والے کی کوئی اولاد ہو، اور اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں تہائی

حصے کی حق دار ہے۔ ہاں اگر اس کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، (اور یہ ساری تقسیم) اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی جو مرنے والے نے کی ہو، یا اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد۔ تمہیں اس بات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ بیٹوں میں سے کون فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے؟ یہ تو اللہ کے مقرّر کئے ہوئے حصے ہیں، یقین رکھو کہ اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۱۱)

ربطِ آیات

پچھلے رُکوع میں لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ الخ میں میراث کا اِستحقاق رکھنے والے لوگوں کا اجمالاً ذِکر تھا، اس رُکوع میں انہی مستحقینِ میراث کی بعض اقسام کی تفصیل مذکور ہے، اور ان کے مختلف حالات کے اِعتبار سے ان کے حصص بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ کی کچھ تفصیل سورت کے آخر میں آرہی ہے، اور باقی ماندہ حصوں کو اَحادیث کے اندر بیان کیا گیا ہے، فقہاء نے نصوصِ شرعیہ سے اس کی تمام تفصیلات اخذ کر کے مستقل فن ''فرائض'' کی شکل میں مدوّن کر دیئے ہیں۔

مندرجہ آیت میں اولاد اور والدین کے حصص بیان کئے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ میراث کے کچھ اور مسائل بھی مذکور ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے (میراث پانے) کے باب میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر (یعنی لڑکا لڑکی ایک ایک یا کئی کئی ملی جلی ہوں تو ان کے حصوں میں باہم یہ نسبت ہوگی کہ ہر لڑکے کو دُہرا اور ہر لڑکی کو اِکہرا) اور اگر (اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے (اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے، کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا، تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے نہ گھٹتا، پس جب دُوسری بھی لڑکی ہے تب تو تہائی سے کسی طرح گھٹ نہیں سکتا، اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں، پس اس کا بھی ایک تہائی ہوگا، دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین لڑکیوں میں شبہ تھا کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی کل مل جاوے، اس لئے فرمایا کہ گو لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں مگر دو تہائی سے نہ بڑھے گا) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو (کل ترکہ کا) نصف ملے گا (اور پہلی صورت میں ایک ثلث بچا ہوا، اور دُوسری صورت کا ایک نصف بچا ہوا دُوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے، یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر اسی کو دے دیا جاوے گا، جیسا کہ کتبِ فرائض

میں مذکور ہے) اور ماں باپ (کو میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں، ایک صورت تو ان) کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میّت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ (مقرّر) ہے، اگر میّت کے کچھ اولاد ہو (خواہ مذکر یا مؤنث، خواہ ایک یا زیادہ اور بقیہ میراث اولاد اور دُوسرے خاص خاص ورثہ کو ملے گی، اور پھر بھی بچ جاوے تو پھر سب کو دِی جاوے گی) اور اگر اس میّت کے کچھ اولاد نہ ہو اور (صرف) اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں (یہ دُوسری صورت ہے، اور ''صرف'' اس لئے کہا کہ بھائی بہن بھی نہ ہو، جیسا آگے آتا ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور باقی دوتہائی باپ کا، اور چونکہ صورتِ مفروضہ میں یہ ظاہر تھا، اس لئے تصریح کی حاجت نہیں ہوئی) اور اگر میّت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن (کسی قسم کے) ہوں (خواہ ماں باپ دونوں میں شریک جس کو عینی کہتے ہیں، خواہ صرف باپ ایک ماں الگ الگ جس کو علاتی کہتے ہیں، خواہ صرف ماں ایک باپ الگ الگ جس کو اَخیافی کہتے ہیں، غرضیکہ کسی طرح کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور یہ تیسری صورت ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کو (ترکہ کا) چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا۔ یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میّت اس کی وصیت کر جاوے یا دَین (اگر ہو تو اس کو بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے) تمہارے اُصول وفروع جو ہیں تم (ان کے متعلق) پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کا کونسا شخص تم کو (دُنیوی یا اُخروی) نفع پہنچانے میں (باعتبار توقع کے) نزدیک تر ہے (یعنی اگر تمہاری رائے پر یہ قصہ رکھا جاتا تو بغالب اَحوال تم لوگ تقسیم میں مدار ترجیح وتفضیل کا اس شخص کے نفع رسانی پر رکھتے، اور اس مدار کے تیقن کا خود کوئی طریقہ کسی کے پاس نہیں ہے، تو اس کا مدار تجویز ٹھہرانا ہی صحیح نہ تھا، پس جب نفع میں مدار بننے کی قابلیت نہ تھی اس لئے دُوسرے مصالح اور اَسرار کو گو وہ تمہارے ذہن میں نہ آویں اس حکم کا مبنیٰ اور مدار ٹھہرا کر) یہ حکم من جانب اللہ مقرّر کر دیا گیا (اور یہ امر) بالیقین (مُسلّم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں (پس جو حکمتیں انہوں نے اپنے علم سے اس میں مرعی رکھی ہیں وہی قابلِ اِعتبار ہیں، اس لئے تمہاری رائے پر نہیں رکھا)۔

معارف ومسائل

حقوقِ متقدمہ علی المیراث

شریعت کا اُصول یہ ہے کہ مرنے والے کے مال سے پہلے شریعت کے مطابق اس کے کفن دفن کے اِخراجات پورے کئے جائیں، جن میں نہ فضول خرچی ہو، نہ کنجوسی ہو، اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں، اگر قرضے اتنے ہی

ہوں جتنا اس کا مال ہے یا اس سے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی نہ کوئی وصیت نافذ ہوگی، اور اگر قرضوں کے بعد مال بچ جائے یا قرضے بالکل ہی نہ ہوں تو اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو اور وہ کسی گناہ کی وصیت نہ ہو، تو اَب جو مال موجود ہے اس کے ایک تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی، اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر دے تب بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہوگی۔ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا مناسب بھی نہیں ہے، اور وَارثوں کو محروم کرنے کی نیت سے وصیت کرنا گناہ بھی ہے۔

اَدائے دَین کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے جس کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، اگر وصیت نہ کی ہو تو اَدائے دَین کے بعد پورا مال میراث میں تقسیم ہوگا۔

اولاد کا حصہ

جیسا کہ گزشتہ رُکوع میں گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم الاقرب فالاقرب کے اُصول پر ہوگی، مرنے والے کی اولاد اور اس کے والدین چونکہ اقرب ترین ہیں، اس لئے ان کو ہر حال میں میراث ملتی ہے، یہ دونوں رِشتے اِنسان کے قریب ترین اور بلاواسطہ رِشتے ہیں، دُوسرے رِشتے بالواسطہ ہوتے ہیں، قرآن شریف میں پہلے انہی کے حصے بیان فرمائے، اور اولاد کے حصہ سے شروع فرمایا، چنانچہ اِرشاد ہے:-

یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۚ یہ ایک ایسا قاعدۂ کلیہ ہے جس نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا مستحق بھی بنا دیا اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرّر کر دیا، اور یہ اُصول معلوم ہوگیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصہ میں جو مال آئے گا اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دُگنا مل جائے، مثلاً کسی نے ایک لڑکا، دو لڑکیاں چھوڑے تو مال کے چار حصے کر کے $\frac{2}{4}$ لڑکے کو اور $\frac{1}{4}$ ہر لڑکی کو دے دیا جائے گا۔

لڑکیوں کو حصہ دینے کی اہمیت

قرآن مجید نے لڑکیوں کو حصہ دِلانے کا اس قدر اِہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصہ کو اَصل قرار دے کر اس کے اِعتبار سے لڑکوں کا حصہ بتلایا، اور بجائے "لِلْاُنْثَیَیْنِ مِثْلُ حَظِّ الذَّكَرِ" (دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے بقدر) فرمانے کے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (لڑکے کو دو لڑکیوں کے حصہ کے بقدر) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ جو لوگ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے، اور وہ یہ سمجھ کر بادِلِ ناخواستہ شرما شرمی معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو کیوں بھائیوں سے بُرائی لیں، ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت

گنہگار ہیں، ان میں بعض بچیاں نابالغ بھی ہوتی ہیں، ان کو حصہ نہ دینا دُہرا گناہ ہے، ایک گناہ وارثِ شرعی کے حصہ کو دبانے کا اور دُوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔

اس کے بعد مزید تشریح فرماتے ہوئے لڑکیوں کا حصہ یوں بیان فرمایا:-

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ یعنی اگر نرینہ اولاد نہ ہوں اور صرف لڑکیاں ہوں اور ایک سے زائد ہوں تو ان کو مالِ موروث سے دوتہائی ملے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی، اور باقی ایک تہائی دُوسرے ورثاء مثلاً میّت کے والدین، بیوی یا شوہر وغیرہ میراث کے حق داروں کو ملے گا، دولڑکیاں اور دو سے زائد سب دوتہائی میں شریک ہوں گی۔

دولڑکیوں سے زائد کا حکم تو قرآنِ کریم کی آیت میں صراحۃً مذکور ہے، جیسا کہ فَوْقَ اثْنَتَيْنِ کے الفاظ اس پر دَلالت کررہے ہیں، اورلڑکیاں دو ہوں تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو دو سے زیادہ کا حکم ہے، اس کا ثبوت حدیث شریف میں مذکور ہے:-

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى جِئْنَا اِمْرَاَةً مِّنَ الْاَنْصَارِ فِي الْاَسْوَافِ فَجَاءَتِ الْمَرْاَةُ بِابْنَتَيْنِ لَهَا فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ بِنْتَا ثَابِتِ [۱] بْنِ قَيْسٍ قُتِلَ مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ وَقَدِ اسْتَفَاءَ عَمُّهُمَا مَا لَهُمَا وَمِيْرَاثَهُمَا كُلَّهٗ وَلَمْ يَدَعْ مَالًا اِلَّا اَخَذَهٗ فَمَا تَرٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ لَا تُنْكَحَانِ اَبَدًا اِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقْضِي اللّٰهُ فِيْ ذٰلِكَ، وَقَالَ نَزَلَتْ سُوْرَةُ النِّسَآءِ "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۚ" الآيَة، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اُدْعُوْا لِيَ الْمَرْاَةَ وَصَاحِبَهَا، فَقَالَ لِعَمِّهِمَا: اَعْطِهِمَا الثُّلُثَيْنِ وَاَعْطِ اُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِيَ فَلَكَ۔ (ابوداوٗد، کتاب الفرائض، وبمعناه فى الترمذى ابواب الفرائض) [۲]

ترجمہ:- ''جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، اتنے میں ہمارا گزر اسواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شہید ہوگئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان

[۱] قال ابوداوٗد واخطأ بشر فيه انما هما ابنتا سعد بن الربيع وثابت بن قيس قتل يوم اليمامة۔

[۲] سنن ابى داوٗد، باب ما جاء فى ميراث الصلب ج:۲ ص:۴۰۰ وجامع الترمذى، ابواب الفرائض، باب ما جاء فى ميراث البنات ج:۲ ص:۲۹

کی پوری میراث پر خود قابض ہوگیا ہے، اوران کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ خدا کی قسم اگران لڑکیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو کوئی شخص اُن کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرمادے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۂ نساء کی یہ آیت "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر قبضہ کرلیا تھا) بلاؤ، آپ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دو، ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو۔"

اس حدیث میں جس مسئلہ کا ذِکر ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لڑکیوں کو بھی دو تہائی حصہ دے دیا، جس طرح دو سے زیادہ کا یہی حکم خود قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت میں منصوص ہے۔

اس کے بعد اِرشاد فرمایا: وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ یعنی "اگر مرنے والے نے اپنی اولاد میں صرف ایک لڑکی چھوڑی اور اولادِ نرینہ بالکل نہ ہو، تو اس کو اس کے والد یا والدہ کے چھوڑے ہوئے مالِ موروث کا آدھا حصہ ملے گا، باقی دُوسرے ورثاء لے لیں گے۔"

والدین کا حصہ

اس کے بعد خداوندِ قدوس نے مرنے والے کے ماں باپ کا حصہ بتایا، اور تین حالتیں ذِکر فرمائیں۔

اوّل یہ کہ والدین دونوں زندہ چھوڑے ہوں اور اولاد بھی چھوڑی، خواہ ایک ہی لڑکا یا لڑکی ہو، اس صورت میں ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا، دیگر ورثہ اولاد اور بیوی یا شوہر لے لیں گے، اور بعض حالات میں کچھ بچا ہوا پھر والد کو پہنچ جاتا ہے، جو اس کے لئے مقرّرہ چھٹے حصہ کے علاوہ ہوتا ہے، علمِ فرائض کی اِصطلاح میں اس طرح کے اِستحقاق کو اِستحقاقِ تعصیب کہتے ہیں۔

دُوسری حالت یہ بتائی کہ مرنے والے کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں، اور ماں باپ موجود ہوں، اس صورت میں مال کا تہائی $\frac{1}{3}$ ماں کو اور باقی دو تہائی والد کو مل جائیں گے، یہ اس صورت کا حکم ہے جبکہ مرنے والے کے ورثہ میں اس کا شوہر یا اس کی بیوی بھی موجود نہ ہو، اگر شوہر یا بیوی موجود ہے تو سب سے پہلے ان کا حصہ الگ کیا جاوے گا اور باقی میں $\frac{1}{3}$ والدہ کو اور $\frac{2}{3}$ والد کو مل جائے گا۔

تیسری حالت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہوں لیکن بھائی بہن ہوں جن کی تعداد دو ہو، خواہ دو بھائی ہوں،

خواہ دو بہنیں ہوں، یا دو سے زیادہ ہوں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اور کوئی وارث نہیں تو بقیہ ۵/۶ حصے باپ کو مل جائیں گے، بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی سے ماں کا حصہ کم ہوگیا، لیکن بھائی بہن کو بھی کچھ نہ ملے گا، کیونکہ باپ بہ نسبت بھائی بہن کے اقرب ہے، جو بچے گا باپ کو مل جائے گا، اس صورت میں ماں کا حصہ ۱/۳ کے بجائے ۱/۶ ہوگیا۔ ''فرائض'' کی اِصطلاح میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں، اور یہ بہن بھائی جن کی وجہ سے والدین کا حصہ کٹ رہا ہے خواہ حقیقی ہوں، خواہ باپ شریک ہوں، خواہ ماں شریک ہوں، ہر صورت میں ان کے وجود سے ماں کا حصہ گھٹ جائے گا، بشرطیکہ ایک سے زیادہ ہوں۔

حصص مقرّرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا ؕ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۱۱﴾ یعنی ''اولاد اور ماں باپ کے یہ حصے خداوندِ عالم نے اپنے طور پر مقرّر کردیئے ہیں، اور اللہ کو سب کچھ معلوم ہے، اور وہ حکیم ہے، جو حصے مقرّر کئے گئے ہیں ان میں بڑی حکمتیں ہیں، اگر تمہاری رائے پر تقسیمِ میراث کا قصہ رکھا جاتا تو مدارِ تقسیم تم لوگ نفع رساں ہونے کو بناتے، لیکن نفع رساں کون ہوگا؟ اور سب سے زیادہ نفع کس سے پہنچ سکتا ہے؟ اس کا یقینی علم حاصل کرنا تمہارے لئے مشکل تھا، اس لئے بجائے نافع ہونے کے اقربیت کو مدارِ حکم بنایا۔''

قرآنِ کریم کی اس آیت نے بتلادیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرّر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے، اس میں کسی کو رائے زنی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں، اور تمہیں پورے اِطمینانِ قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے، تمہارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے اِحاطۂ علم سے باہر نہیں ہے، اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمہیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہوسکتی، اگر تقسیمِ میراث کا مسئلہ خود تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا، تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کرپاتے، اور میراث کی تقسیم میں بے اِعتدالی ہوجاتی، اللہ جل شانہٗ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں عدل و اِنصاف کی پوری پوری رعایت ہو، اور میّت کا سرمایہ منصفانہ طریقے سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔

وَلَکُمْ نِصْفُ مَا تَرَکَ اَزْوَاجُکُمْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ

اور تمہارا ہے آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد، اور اگر

کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْنَ بِهَآ

ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد وصیت کے جو کر گئیں

اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ

یا بعد قرض کے، اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہارے اولاد، اور اگر

كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ

تمہارے اولاد ہے تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو کچھ کہ تم نے چھوڑا بعد وصیت کے

تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ

جو تم کر مرو یا قرض کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر جائیں، اس کا آدھا حصہ تمہارا ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔ اور اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو اُس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو انہوں نے کی ہو، اور ان کے قرض کی ادائیگی کے بعد تمہیں ان کے ترکے کا چوتھائی حصہ ملے گا۔ اور تم جو کچھ چھوڑ کر جاؤ اس کا ایک چوتھائی اُن (بیویوں) کا ہے، بشرطیکہ تمہاری کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔ اور اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو اُس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو تم نے کی ہو، اور تمہارے قرض کی ادائیگی کے بعد ان کو تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

یہاں تک اُن مستحقینِ میراث کے حصص کا بیان تھا، جن کا میّت کے ساتھ نسب اور ولادت کا رِشتہ تھا، مذکورہ آیت میں بعض دُوسرے مستحقین کا ذِکر ہے، اور میّت سے ان کا رِشتہ نسب کا نہیں، بلکہ اِزدواج کا ہے، جس کا بیان یہ ہے:-

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جاویں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث، نہ واحد نہ کثیر) اور اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو (اس صورت میں) تم کو ان کے ترکہ سے ایک

چوتھائی ملے گا (یہ کل دوصورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دُوسرے ورثاء کو ملے گا، لیکن ہر صورت میں یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جائیں یا دَین (اگر ہو تو اس کے نکالنے) کے بعد (ملے گی)۔ اور بیبیوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ (خواہ ایک ہو یا کئی ہوں تو وہ چوتھائی سب میں برابر بٹ جاوے گا) اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث، نہ واحد نہ کثیر) اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو (خواہ ان بیبیوں سے یا اور عورت سے) تو (اس صورت میں) ان کو (خواہ وہ ایک ہو یا کئی) تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا (یہ بھی دوصورتیں ہوئیں، اور دونوں صورتوں میں بقیہ دُوسرے ورثاء کو ملے گا، لیکن یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دَین (اگر ہو تو اس کے بھی نکالنے) کے بعد (ملے گی)۔

معارف ومسائل

شوہر اور بیوی کا حصہ

مندرجہ بالا سطور میں شوہر اور بیوی کے حصوں کی تعیین کی گئی ہے، اور پہلے شوہر کا حصہ بتایا، شاید اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اس کی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے، کیونکہ عورت کی وفات کے بعد شوہر دُوسرے گھر کا آدمی ہو جاتا ہے، اگر اپنے میکے میں عورت کا اِنتقال ہوا ہو اور اس کا مال وہیں ہو تو شوہر کا حصہ دینے سے گریز کیا جاتا ہے، گویا اس زیادتی کا سدِباب کرنے کے لئے شوہر کا حصہ پہلے بیان فرمایا۔ اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فوت ہونے والی عورت نے اگر کوئی بھی اولاد نہ چھوڑی ہو تو شوہر کو بعد اَدائے دَین واِنفاذِ وصیت کے مرحومہ کے کل مال کا نصف ملے گا، اور باقی نصف میں دُوسرے ورثاء مثلاً مرحومہ کے والدین، بھائی بہن، حسبِ قاعدہ حصہ پائیں گے۔

اور اگر مرنے والی نے اولاد چھوڑی ہو، ایک ہو یا دو ہوں، یا اس سے زائد ہوں، لڑکا ہو یا لڑکی ہو، اس شوہر سے ہو جس کو چھوڑ کر وفات پائی ہے، یا اس سے پہلے کسی اور شوہر سے ہو، تو اِس صورت میں موجودہ شوہر کو مرحومہ کے مال سے اَدائے دَین واِنفاذِ وصیت کے بعد کل مال کا چوتھائی ملے گا، اور بقیہ تین چوتھائی حصے دُوسرے ورثاء کو ملیں گے۔ یہ شوہر کے حصے کی تفصیل تھی۔

اور اگر میاں بیوی میں سے مرنے والا شوہر ہے، اور اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو اَدائے دَین واِنفاذِ وصیت کے بعد بیوی کو مرنے والے کے کل مال کا چوتھائی ملے گا، اور اگر اس نے کوئی اولاد چھوڑی ہے، خواہ اس بیوی سے ہو یا کسی دُوسری بیوی سے تو اس صورت میں بعد اَدائے دَین ووصیت کے آٹھواں حصہ ملے گا، اگر بیوی ایک سے زائد ہے تو بھی

مذکورہ تفصیل کے مطابق ایک بیوی کے حصے میں جتنی میراث آئے گی، وہ ان سب بیویوں میں تقسیم کی جائے گی، یعنی ہر عورت کو چوتھائی اور آٹھواں حصہ نہیں ملے گا، بلکہ سب بیویاں چوتھائی اور آٹھویں حصے میں شریک ہوں گی، اور ان دونوں حالتوں میں شوہر، بیوی کو ملنے کے بعد جو کچھ ترکہ بچے گا وہ اس کے دُوسرے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

مسئلہ:- یہ دیکھنا چاہئے کہ بیوی کا مہر اَدا ہوگیا ہے یا نہیں؟ اگر بیوی کا مہر اَدا نہ کیا ہو تو دُوسرے قرضوں کی طرح اوّلاً کل مال سے دَینِ مہر ادا ہوگا، اس کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا، اور مہر لینے کے بعد عورت اپنی میراث کا حصہ بھی میراث میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے وصول کرے گی، اور اگر میّت کا مال اتنا ہے کہ مہر اَدا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو بھی دُوسرے دیون کی طرح پورا مال دَینِ مہر میں عورت کو دے دیا جائے گا، اور کسی وارث کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ

اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا عورت ہو ایسی ہی اور اس میّت کے ایک بھائی ہے یا بہن ہے

فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ

تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے، اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو سب شریک ہیں

فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً

ایک تہائی میں بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو، یہ حکم ہے

مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۗ ﴿۱۲﴾

اللہ کا، اور اللہ ہے سب کچھ جاننے والا تحمل کرنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم ہونی ہے، ایسا ہو کہ نہ اس کے والدین زندہ ہوں نہ اولاد، اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک چھٹے حصے کا حق دار ہے۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک

تہائی میں شریک ہوں گے، (مگر) جو وصیت کی گئی ہو اس پر عمل کرنے کے بعد اور مرنے والے کے ذمے جو قرض ہو اس کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ (وصیت یا قرض کے اِقرار کرنے سے) اس نے کسی کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یہ سب کچھ اللّٰہ کا حکم ہے، اور اللّٰہ ہر بات کا علم رکھنے والا، بُردبار ہے۔ ﴿۱۲﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیت

نسب اور اِزدواج سے جو رِشتے پیدا ہوتے ہیں ان کے مختصر حقوق بیان کرنے کے بعد اَب ایسے میّت کے ترکہ کا حکم بیان کیا جارہا ہے جس نے اولاد یا والدین نہ چھوڑے ہوں۔

اور اگر کوئی میّت جس کی میراث دُوسروں کو ملے گی خواہ وہ میّت مرد ہو یا عورت، ایسا ہو جس کے نہ اُصول ہوں (یعنی باپ دادا) اور نہ فروع ہوں (یعنی اولاد اور بیٹے کی اولاد) اور اس (میّت) کے ایک بھائی یا ایک بہن (اَخیافی) ہو، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے) زیادہ ہوں (مثلاً دو ہوں یا اور زیادہ) تو وہ سب تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے (اور ان میں مذکر ومؤنث کا برابر حصہ ہے اور بقیہ میراث دُوسرے ورثاء کو، اور اگر کوئی اور نہ ہو تو پھر انہی کو دِی جائے گی، یہ دو صورتیں ہوئیں، اور دونوں صورتوں میں یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد جس کی وصیت کردی جاوے یا (اگر) دَین (ہو تو اس کے بھی نکالنے) کے بعد (ملے گی) بشرطیکہ (وصیت کرنے والا) کسی (وارث) کو ضرر نہ پہنچاوے (نہ ظاہراً نہ اِرادۃً، ظاہراً یہ کہ مثلاً ثلث سے زیادہ وصیت کرے، تو وہ وصیت میراث پر مقدم نہ ہوگی، اور اِرادۃً یہ کہ رہے ثلث کے اندر، لیکن نیت یہ ہو کہ وارث کو کم ملے، یہ ظاہراً نافذ ہوجاوے گی، لیکن گناہ ہوگا) یہ (جس قدر یہاں تک مذکور ہوا) حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللّٰہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون مانتا ہے کون نہیں مانتا اور نہ ماننے والوں کو جو فوراً سزا نہیں دیتے تو وجہ یہ کہ) حلیم (بھی) ہیں۔

معارف ومسائل

کلالہ کی میراث

ان سطور میں ''کلالہ'' کی میراث بیان کی گئی ہے، ''کلالہ'' کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، جو علامہ قرطبیؒ نے

اپنی تفسیر میں بھی نقل کی ہیں، [۱] مشہور تعریف یہی ہے جو خلاصۂ تفسیر میں مذکور ہے، کہ جس مرنے والے کے اُصول اور فروع نہ ہوں وہ ''کلالہ'' ہے۔

صاحبِ رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے جو کلال کے معنی میں ہے، اور کلال کے معنی ہیں تھک جانا، جو ضعف پر دَلالت کرتا ہے، [۲] باپ بیٹے والی قرابت کے سوا قرابت کو کلالہ کہا گیا، اس لئے کہ وہ قرابت باپ بیٹے کی قرابت کی نسبت سے کمزور ہے۔

پھر کلالہ کا اِطلاق اس مرنے والے پر بھی کیا گیا جس نے نہ اولاد چھوڑی اور نہ والد، اور اس وارث پر بھی اِطلاق کیا گیا جو مرنے والے کا ولد اور والد نہ ہو، لغت کے اِعتبار سے جو اِشتقاق بتلایا اس کا تقاضا ہے کہ لفظ ''ذو'' مقدر ہو، اور کلالہ بمعنی ''ذو کلالہ'' ہوگا، یعنی ضعیف رشتہ والا، پھر اس مالِ موروث پر بھی اس کا اِطلاق ہونے لگا، جو ایسے میّت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی ولد اور والد نہ ہو۔

حاصلِ کلام یہ کہ اگر کوئی شخص مرد یا عورت وفات پا جائے، اور اس کے نہ باپ ہو نہ دادا، اور نہ اولاد ہو، اور اس نے ایک بھائی یا بہن ماں شریک چھوڑے ہوں، تو ان میں سے اگر بھائی ہے تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا، اور نہیں ہے تو بہن کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر ایک سے زیادہ ہوں، مثلاً ایک بھائی ایک بہن ہو، یا دو بھائی، یا دو بہنیں ہوں، تو یہ سب مرنے والے کے کل مال کے تہائی حصے میں شریک ہوں گے، اور اس میں مذکر کو مؤنث سے دُہرا نہیں ملے گا، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ''وَلَيْسَ فِي الْفَرَائِضِ مَوْضِعٌ يَكُوْنُ فِيْهِ الذَّكَرُ وَالْاُنْثٰى سَوَآءً اِلَّا فِيْ مِيْرَاثِ الْاِخْوَةِ لِلْاُمِّ''۔ [۳]

بہن بھائی کا حصہ

واضح رہے کہ اس آیت میں ''اخیافی'' (ماں شریک) بہن بھائی کا حصہ بتلایا گیا ہے، اگرچہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں یہ قید مذکور نہیں ہے، لیکن یہ قید بالاجماع معتبر ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اس آیت میں اس طرح ہے: ''وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنْ اُمِّهٖ'' جیسا کہ علامہ قرطبیؒ، صاحبِ رُوح المعانی اور ابوبکر جصاصؒ اور دیگر حضرات نے نقل کیا ہے، گو یہ قراءت متواتر نہیں ہے، لیکن اجماعِ اُمت ہونے کی وجہ سے معمول بہا ہے، اور اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ نساء کے ختم پر بھی کلالہ کی میراث کا ذِکر کیا ہے، [۴] وہاں بتایا ہے کہ اگر

---

[۱] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۷۶، ۷۷

[۲] روح المعاني تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۶۵

[۳] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۷۹

[۴] روح المعاني ج:۴ ص:۲۳۱

ایک بہن ہوتو اس کو آدھا ملے گا، اور اگر ایک بھائی ہو تو اپنی بہن کے پورے مال کا وارث بنے گا، اور اگر دو بہنیں ہوں تو دوتہائی مال پائیں گی، اور اگر متعدّد بھائی بہن ہوں تو مذکور کو مؤنث سے دُہرا دیا جائے گا، سورت کے ختم پر جو یہ حکم اِرشاد فرمایا ہے، ''عینی''، یعنی حقیقی بہن بھائی، اور ''علاتی''، یعنی باپ شریک بہن بھائی کا ذِکر ہے، اگر یہاں علاتی اور عینی بھائی بہن کو شامل کرلیا جائے تو اَحکام میں تعارض لازم آجائے گا۔

وصیت کے مسائل

اس رُکوع میں تین مرتبہ میراث کے حصے بیان کر کے یہ فرمایا کہ حصوں کی یہ تقسیم وصیت اور دَین کے بعد ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، کہ میّت کی تجہیز وتکفین کے بعد کل مال سے قرضے ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے اس میں سے تہائی مال میں وصیت نافذ ہوگی، اگر اس سے زیادہ وصیت ہو تو اس کا شرعاً اِعتبار نہیں، ضابطہ میں اَدائے دَین اِنفاذِ وصیت سے مقدم ہے، اگر تمام مال اَدائے دُیون میں لگ جائے تو نہ وصیت نافذ ہوگی نہ میراث چلے گی، اس رُکوع میں تینوں جگہ جہاں جہاں وصیت کا ذِکر آیا ہے وہاں وصیت کا ذِکر دَین سے پہلے کیا گیا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا حق دَین سے مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہوئے فرمایا:-

اِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ: مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ۔ (مشکوٰۃ) [۱]

''یعنی آپ حضرات یہ آیت تلاوت کرتے ہیں مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ اس میں گولفظ وصیت مقدم ہے، لیکن عملی طور پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دَین کے بعد رکھا ہے۔''

تاہم یہ نکتہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اگر عملاً وصیت مؤخر ہے، تو لفظاً اس کو دَین سے پہلے کیوں بیان کیا گیا، صاحبِ رُوح المعانی اس بارے میں لکھتے ہیں:-

وَتَقْدِيْمُ الْوَصِيَّةِ عَلَى الدَّيْنِ ذِكْرًا مَعَ اَنَّ الدَّيْنَ مُقَدَّمٌ عَلَيْهَا حُكْمًا لِاِظْهَارِ كَمَالِ الْعِنَايَةِ بِتَنْفِيْذِهَا لِكَوْنِهَا مَظَنَّةً لِّلتَّفْرِيْطِ فِيْ اَدَائِهَا اِلخ۔'' [۲]

یعنی آیت میں دَین پر وصیت کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ میراث کی طرح بغیر کسی عوض کے ملتی ہے، اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں، اس لئے وارثین کی جانب سے اس کو نافذ کرنے میں کوتاہی ہونے یا دیر ہوجانے کا قوی اندیشہ تھا، اپنے مورث کا مال کسی کے پاس جاتا ہوا دیکھنا اس کو ناگوار ہوسکتا تھا، اس لئے شانِ وصیت کا اِہتمام فرماتے

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الفرائض والوصایا ج:۱ ص:۲۶۲

[۲] روح المعانی، تفسیر سورۃ النساء تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۲۲۷

ہوئے دَین پر اس کو مقدم کیا گیا، پھر یہ بھی بات ہے کہ قرض کا ہر میّت پر ہونا ضروری نہیں، اور اگر زِندگی میں رہا ہوتو موت تک اس کا باقی رہنا بھی ضروری نہیں، اور اگر موت کے وقت موجود بھی ہو تب بھی چونکہ اس کا مطالبہ حق دار کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے ورثاء بھی اِنکار نہیں کر سکتے، اس وجہ سے اس میں کوتاہی کا اِحتمال بہت کم ہے، بخلاف وصیت کے کہ جب میّت مال چھوڑتا ہے تو اس کا یہ بھی دِل چاہتا ہے کہ صدقۂ جاریہ کے طور پر اپنے مال کا حصہ کسی کارِ خیر میں صَرف کر جائے، یہاں چونکہ اس مال میں کسی کی طرف سے مطالبہ نہیں ہوتا، اس لئے وارثوں کی طرف سے کوتاہی کا اِمکان تھا، جس کا سدِباب کرنے کے لئے بطورِ خاص ہر جگہ وصیت کو مقدم کیا گیا۔

مسئلہ:- اگر دَین اور وصیت نہ ہو تو تجہیز و تکفین کے بعد بچا ہوا کل مال وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

مسئلہ:- وارث کے حق میں وصیت کرنا باطل ہے، اگر کسی نے اپنے لڑکے، لڑکی، شوہر یا بیوی کے لئے یا اور کسی ایسے شخص کے لئے وصیت کی جس کو میراث میں حصہ ملنے والا ہے تو اس وصیت کا کچھ اِعتبار نہیں، وارثوں کو صرف میراث کا حصہ ملے گا، اس سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اِرشاد فرمایا:-

[1] اِنَّ اللهَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، پس کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت معتبر نہیں۔''

ہاں اگر دیگر وارث اِجازت دے دیں تو جس وارث کے لئے وصیت کی ہے، اس کے حق میں وصیت نافذ کر کے باقی مال شرعی طریقہ پر تقسیم کیا جائے، جس میں اس وارث کو بھی اپنے حصہ کی میراث ملے گی، بعض روایاتِ حدیث میں "اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ الْوَرَثَةُ" [2] کا اِستثنا بھی مذکور ہے۔ (کما ذکر صاحب الهداية)

"غَيْرَ مُضَآرٍّ" کی تفسیر

کلالہ کی میراث کے خاتمہ پر یہ بتانے کے بعد کہ یہ میراث وصیت اور دَین کے بعد نافذ ہوگی، لفظ غَيْرَ مُضَآرٍّ فرمایا، یہ قید اگرچہ صرف اسی جگہ مذکور ہے، لیکن اس سے پہلے جو دو جگہ وصیت اور دَین کا ذِکر ہے وہاں پر بھی معتبر اور معمول بہ ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ مرنے والے کے لئے وصیت یا دَین کے ذریعہ وارثوں کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، وصیت کرنے یا اپنے اُوپر قرض کا فرضی اِقرار کرنے میں وارثوں کو محروم کرنے کا اِرادہ ہونا اور اس اِرادے پر عمل کرنا سخت ممنوع ہے، اور گناہِ کبیرہ ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ، باب الوصايا ج:۱ ص:۲۶۵

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۶ ص:۲۶۴، وسنن الدارقطنی، کتاب الفرائض السنن رقم الحدیث: ۴۱۹۴

دَین یا وصیت کے ذریعہ ضرر پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں، مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کرلے کسی دوست وغیرہ کو دِلانے کے لئے، یا اپنے مخصوص مال کو جو اس کا اپنا ذاتی ہے یہ ظاہر کردے کہ فلاں شخص کی امانت ہے، تاکہ اس میں میراث نہ چلے، یا ایک تہائی سے زائد مال کی وصیت کرے، یا کسی شخص پر اپنا قرض ہو اور وہ وصول نہ ہوا ہو، لیکن جھوٹ یہ کہہ دے کہ اس سے قرض وصول ہوگیا، تاکہ وارثوں کو نہ مل سکے، یا مرض الوفات میں ایک تہائی سے زیادہ کسی کو ہبہ کردے۔

یہ صورتیں ضرر پہنچانے کی ہیں، ہر مورث جو دُنیا سے جا رہا ہے اُسے زندگی کے آخری لمحات میں اس طرح کے اِضرار سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مقرّرہ حصوں کے مطابق تقسیم کرنے کی تاکید

میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ پاک نے اِرشاد فرمایا: وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۚ یعنی جو کچھ حصے مقرّر کئے گئے، اور دَین اور وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی اس سب پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے، اللہ پاک کی طرف سے ایک عظیم وصیت اور مہتم بالشان حکم ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا، پھر مزید تنبیہ کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۱۲ یعنی اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے ہوئے حصے مقرّر فرمائے، جو اَحکامِ مذکورہ پر عمل کرے گا اللہ کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہ ہوگی، اور جو خلاف ورزی کرے گا اس کی یہ بدکرداری بھی اللہ کے علم میں آئے گی، جس کی پاداش میں اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

نیز جو کوئی مرنے والا دَین یا وصیت کے ذریعہ سے ضرر پہنچائے گا اللہ کو اس کا بھی علم ہے، اس کے مؤاخذہ سے بےخوف نہ رہو، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلاف ورزی کرنے پر اس دُنیا میں سزا نہ دے، اس لئے کہ وہ حلیم ہے، خلاف ورزی کرنے والے کو یہ دھوکا نہ لگنا چاہئے کہ میں بچ گیا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ

یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں، اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اس کو داخل کرے گا جنتوں میں جن کے

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳

نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں، اور یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا

اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جاوے اس کی حدوں سے ڈالے گا اس کو آگ میں ہمیشہ رہے گا

فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ع

اس میں، اور اس کے لئے ذِلت کا عذاب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اِطاعت کرے گا، وہ اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ایسے لوگ ہمیشہ ان (باغات) میں رہیں گے، اور یہ زبردست کامیابی ہے ﴿۱۳﴾ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرّر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا، اسے اللہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ ﴿۱۴﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

میراث کے مذکورہ اَحکام بیان کرنے کے بعد اِن دو آیتوں میں ان اَحکام کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کی فضیلت اور نافرمانی کرنے کی بُری عاقبت کا بیان ہے، جس سے اَحکامِ مذکورہ کی اہمیت مقصود ہے۔

یہ سب اَحکامِ مذکورہ (متعلقہ میراث یا مع اَحکامِ یتامیٰ کے) خداوندی ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اِطاعت کرے گا (یعنی ان ضابطوں کی پابندی کرے گا) اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں (فوراً) داخل کردیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا (یعنی پابندی کو ضروری بھی نہ سمجھے گا اور یہ حالت کفر کی ہے) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے، اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذِلت بھی ہے۔

معارف ومسائل

قرآنِ کریم کا یہ اُسلوب ہے کہ اَحکام وعقائد کے بیان کے بعد تتمہ کے طور پر ماننے والوں کے لئے ترغیب اور ان کی فضیلت کا ذِکر ہوتا ہے، اور نہ ماننے والوں کے لئے ترہیب وسزا اوران کی مذمت مذکور ہوتی ہے۔

یہاں بھی چونکہ اَحکام کا ذِکر تھا اس لئے آخر کی اِن دو آیتوں میں اِطاعت کرنے والوں اور نافرمانوں کے نتائج کا ذِکر کردیا گیا۔

تکملۂ اَحکامِ میراث

مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا

اگرچہ میراث کی تقسیم نسبی قرابت پر رکھی گئی ہے، لیکن اس میں سے بعض چیزیں مستثنیٰ ہیں، اوّل یہ کہ مورث اور وارث دو مختلف دِین والے نہ ہوں، لہٰذا مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوگا، خواہ ان میں آپس میں کوئی بھی نسبی رِشتہ ہو، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

[1] لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ، وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ۔ (مشکوٰۃ)

''یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔''

یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جبکہ پیدائش کے بعد ہی سے کوئی شخص مسلم یا کافر ہو، لیکن اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا، پھر العیاذ باللہ اسلام سے پھر گیا اور مرتد ہوگیا، اگر ایسا شخص مرجائے یا مقتول ہوجائے، تو اس کا وہ مال جو اِسلام کے زمانہ میں کسب کیا تھا، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، اور جو اِرتداد کے بعد کمایا ہو وہ بیت المال میں جمع کردیا جائے گا۔

لیکن اگر عورت مرتد ہوگئی تو اس کا کل مال خواہ زمانۂ اسلام میں حاصل ہوا ہو یا زمانۂ اِرتداد میں، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، لیکن خود مرتد مرد ہو یا عورت اس کو نہ کسی مسلمان سے میراث ملے گی نہ کسی مرتد سے۔

قاتل کی میراث

اگر کوئی شخص ایسے آدمی کو قتل کردے جس کے مال میں اس کو میراث پہنچتی ہو تو یہ قاتل اس شخص کی میراث سے

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الوصایا والفرائض ج:۱ ص:۲۶۳

محروم ہوگا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: "اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ" (مشکوٰۃ) [1] یعنی "قاتل وارث نہیں ہوگا" البتہ قتلِ خطا کی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے)۔

پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی میراث

اگر کسی شخص نے اپنی کچھ اولاد چھوڑی، اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے، تو یہ بچہ بھی وارثوں کی فہرست میں آئے گا، لیکن چونکہ یہ پتہ چلانا دُشوار ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، یا ایک سے زیادہ بچے ہیں، اس لئے بچہ پیدا ہونے تک تقسیمِ میراث ملتوی رکھنا مناسب ہوگا، اور اگر تقسیم کرنا ضروری ہی ہو تو سرِدست ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کرکے دونوں کے اِعتبار سے دو صورتیں فرض کی جائیں، ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں ورثاء کو کم ملتا ہو وہ ان میں تقسیم کردیا جائے، اور باقی اُس حمل کے لئے رکھا جائے۔

معتدّہ کی میراث

جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق رجعی ہے، پھر طلاق سے رُجوع اور عدّت ختم ہونے سے پہلے وفات پاگیا، تو یہ عورت میراث میں حصہ پاوے گی، اس لئے کہ نکاح باقی ہے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات میں بیوی کو طلاق دی، اگرچہ طلاق بائن یا مُغلّظہ ہی ہو، اور عدّت ختم ہونے سے پہلے پہلے مرگیا، تب بھی وہ عورت اس کی وارث ہوگی، اور عورت کو وارث بنانے کی وجہ سے دو عدتوں میں سے جو سب سے زیادہ دراز ہو اسی کو اِختیار کیا جائے گا، جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ:-

عدّتِ طلاق تین حیض ہے، اور عدّتِ وفات چار مہینے دس دن ہے، ان دونوں میں جو عدّت زیادہ دِنوں کی ہو اسی کو عدّت قرار دِیا جائے گا، تاکہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو حصہ مل سکے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفات سے پہلے بائن یا مُغلّظہ طلاق دِی اور اس کے چند دِن بعد عورت کی عدّت میں وہ فوت ہوگیا، تو اس صورت میں اس کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، البتہ اگر طلاقِ رجعی دی ہے تو وہ وارث ہوگی۔

مسئلہ:- اگر کسی عورت نے شوہر کے مرضِ وفات میں خود سے خلع کرلیا تو وارث نہیں ہوگی، اگرچہ اس کا شوہر اس کی عدّت کے دوران مرجائے۔

عصبات کی میراث

فرائض کے مقرّرہ حصے بارہ ورثاء کے لئے طے شدہ ہیں، اور ان وارثوں کو "اَصحابُ الفروض" کہا جاتا ہے، جن

[1] مشکوٰۃ، کتاب الوصایا والفرائض ج:۱ ص:۲۶۳

کی تفصیل کسی قدر اُوپر گزر چکی ہے، اگر اَصحابُ الفروض میں سے کوئی نہ ہو، یا اَصحابُ الفروض کے حصے دے دینے کے بعد کچھ مال بچ جائے تو وہ عصبہ کو دے دیا جاتا ہے، اور بعض مرتبہ ایک ہی شخص کو دونوں حیثیتوں سے مال مل جاتا ہے، بعض صورتوں میں میّت کی اولاد اور میّت کا والد بھی عصبہ ہوجاتے ہیں، دادا کی اولاد یعنی چچا اور باپ کی اولاد یعنی بھائی بھی عصبہ ہوجاتے ہیں۔

عصبات کی کئی قسمیں ہیں، جن کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، یہاں ایک مثال لکھی جاتی ہے، مثلاً: زید فوت ہوگیا، اور اس نے اپنے پیچھے چار وارث چھوڑے، بیوی، لڑکی، ماں اور چچا، تو اس کے مال کے کل چوبیس حصے کیے جائیں گے، جن میں سے آدھا یعنی بارہ حصے لڑکی کو، $\frac{1}{8}$ کے حساب سے تین حصے بیوی کو، $\frac{1}{6}$ کے حساب سے چار حصے ماں کو، اور بقیہ پانچ حصے جو بچے وہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے چچا کو ملیں گے۔

مسئلہ:- عصبات اگر نہ ہوں تو اَصحابِ فرائض سے جو مال بچے وہ ان کے حصوں کے مطابق انہی کو دے دیا جاتا ہے، اور کو علمِ فرائض کی اِصطلاح میں "رَدّ" کہتے ہیں۔ البتہ شوہر اور بیوی پر رَدّ نہیں ہوتا، کسی حال میں اُن کو مقرّرہ حصے سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔

مسئلہ:- اگر اَصحابِ فروض میں سے کوئی نہ ہو، اور عصبات میں بھی کوئی نہ ہو تو "ذوِی الارحام" کو میراث پہنچ جاتی ہے، "ذوِی الارحام" کی فہرست طویل ہے، نواسے، نواسیاں، بہنوں کی اولاد، پھوپھیاں، ماموں، خالہ، یہ لوگ "ذوِی الارحام" کی فہرست میں آتے ہیں، اور اس مسئلہ میں تفصیل ہے، جس کا یہ محل نہیں، یہاں اسی پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ اُن پر چار مرد

مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ

اپنوں میں سے، پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اُٹھا لیوے ان کو موت یا

یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا

مقرّر کردے اللہ ان کے لئے کوئی راہ۔ اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو، پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں

وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۶﴾

اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

آسان ترجمۂ قرآن

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا اِرتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنالو۔ چنانچہ اگر وہ (ان کی بدکاری کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک کر رکھو یہاں تک کہ انہیں موت اُٹھا کر لے جائے، یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ پیدا کردے۔ ﴿۱۵﴾ اور تم میں سے جو دو مرد بدکاری کا اِرتکاب کریں، ان کو اَذیت دو۔ پھر اگر وہ توبہ کر کے اپنی اِصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو۔ بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۶﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں اُن بے اِعتدالیوں کی اِصلاح کی گئی ہے جو زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے حق میں اور مواریث کے سلسلہ میں ہوتی تھیں، یہ لوگ عورتوں پر بھی ظلم وستم ڈھاتے تھے، اور ان کے معاملہ میں رُسومِ قبیحہ میں مبتلا تھے، جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے ان سے نکاح کرلیتے تھے۔

اگلی آیات میں ان معاملات کی اِصلاح فرماتے ہیں، اور اگر کسی عورت سے کوئی ایسا قصور سرزد ہوجائے جو شرعاً قصور ہو اس پر تادیب کی اِجازت دیتے ہیں، اور اِصلاح وتادیب کا یہ مضمون بھی اگلے دو تین رُکوع تک چلا گیا ہے۔

اور جو عورتیں بے حیائی کا کام (یعنی زِنا) کریں تمہاری (منکوحہ) بیبیوں میں سے سو تم لوگ ان عورتوں (کے اس فعل) پر چار آدمی اپنوں میں سے (یعنی مسلمان، آزاد، عاقل، بالغ، مذکر) گواہ کرلو (تاکہ ان کی گواہی پر حکام سزائے آئندہ جاری کریں) سو اگر وہ گواہی دے دیں تو (ان کی سزا یہ ہے کہ) تم ان کو (بحکمِ حاکم) گھروں کے اندر (سیاسۃً) مقید رکھو یہاں تک کہ (یا تو) موت ان کا خاتمہ کردے (اور) یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ (یعنی حکمِ ثانی) تجویز فرماویں (بعد میں جو حکمِ ثانی اس سلسلے میں تجویز ہوا اس کا ذِکر معارف ومسائل میں آرہا ہے) اور (سزائے زِنا میں کچھ زَنِ منکوحہ کی تخصیص نہیں، بلکہ) جون سے دو شخص بھی وہ بے حیائی کا کام (یعنی زِنا) کریں تم میں سے (یعنی بالغ عاقل

مسلمانوں میں سے) توان دونوں کو اَذیت پہنچاؤ پھر (بعد اَذیت پہنچانے کے) اگر وہ دونوں (گزشتہ سے) توبہ کرلیں اور (آئندہ کے لئے اپنی) اِصلاح کرلیں، (یعنی پھر ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہو) توان دونوں سے کچھ تعرض نہ کرو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں (اس لئے اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا معاف کردی، پھر تم کو بھی ان کے درپے آزار نہ ہونا چاہئے)۔

معارف ومسائل

ان آیات میں ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں سزا تجویز کی گئی ہے جن سے فاحشہ یعنی زِنا کا صدور ہوجائے، پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزد ہوجائے تو اس کے ثبوت کے لئے چار گواہ مرد طلب کئے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوتِ زِنا کے لئے وہ چار گواہ طلب کریں، جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں، اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے، اس سلسلے میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

زِنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے، چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے جس سے عزّت اور عفت مجروح ہوتی ہے، اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اوّلاً تو یہ شرط لگائی کہ مرد ہی گواہ ہوں، عورتوں کی گواہی کا اِعتبار نہیں کیا گیا۔ ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دِیا، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے، جس کا وجود میں آنا شاذ ونادر ہی ہوسکتا ہے، یہ سختی اس لئے اِختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی بہن ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ اِلزام نہ لگائیں، یا دُوسرے بدخواہ لوگ دُشمنی کی وجہ سے اِلزام اور تہمت لگانے کی جرأت نہ کرسکیں، کیونکہ اگر چار افراد سے کم لوگ زِنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیئے جاتے ہیں، اور ایک مسلمان پر اِلزام لگانے کی وجہ سے ان پر ''حدِقذف'' جاری کردی جاتی ہے۔

سورۂ نور میں واضح طور پر اِرشاد فرمایا: لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ هُمُ الۡكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾ (النور) جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ چار گواہ نہ لاسکیں وہ جھوٹے ہیں۔

بعض اکابر نے چار گواہوں کی ضرورت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس معاملہ میں چونکہ دو اَفراد ملوّث ہوتے ہیں، مرد اور عورت، تو گویا کہ یہ ایک ہی معاملہ تقدیراً دو معاملوں کے حکم میں ہے، اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا اس کے لئے چار گواہ ضروری ہوں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اِصلاح کرلیں تو ان سے تعرض مت کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دینے کے بعد اگر انہوں نے توبہ کرلی تو پھر انہیں ملامت مت کرو، اور مزید سزا مت دو، یہ مطلب نہیں

کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہوگئی، اس لئے کہ یہ توبہ سزا کے بعد مذکور ہے، جیسا کہ فاء کی تفریع سے ظاہر ہے، ہاں اگر توبہ نہ کی ہو تو سزا کے بعد بھی ملامت کر سکتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی ان دو آیتوں میں زِنا کے لئے کوئی متعین حد بیان نہیں کی گئی، بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ان کو تکلیف پہنچاؤ، اور زِنا کار عورتوں کو گھروں میں بند کردو۔

تکلیف پہنچانے کا بھی کوئی خاص طریقہ نہیں بتلایا گیا، اور حکام کی صواب دِید پر اس کو چھوڑ دیا گیا۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں اِیذا دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو زبان سے عار دِلائی جائے اور شرمندہ کیا جائے اور ہاتھ سے بھی جوتے وغیرہ کے ذریعے ان کی مرمت کی جائے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی بطورِ تمثیل کے معلوم ہوتا ہے، اصل بات وہی ہے کہ یہ معاملہ حکام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

نزول کے اِعتبار سے قرآنِ کریم کی ان دو آیتوں کی ترتیب یہ ہے شروع میں تو ان کو ایذا دینے کا حکم نازل ہوا، اور اس کے بعد خاص طور سے عورتوں کے لئے یہ حکم بیان کیا گیا کہ ان کو گھروں میں محبوس رکھا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مرجائے، اس کی زندگی ہی میں آنے والا حکم آجائے گا تو بطورِ حد کے اسی کو نافذ کردیا جائے گا۔

چنانچہ بعد میں وہ ''سبیل'' بیان کردی گئی، جس کا اللہ جل شانہٗ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا تھا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ''سبیل'' کی تفسیر فرماتے ہیں: "يَعْنِي الرَّجْمُ لِلثَّيِّبِ وَالْجَلْدُ لِلْبِكْرِ" کہ شادی شدہ کے حق میں زِنا کی حد اس کو سنگسار کردینا ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے اس کو کوڑے مارنا۔ (بخاری) [۱]

مرفوع اَحادیث میں بھی اس ''سبیل'' کا بیان رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے، اور شادی شدہ، غیر شادی شدہ ہر ایک کے لئے الگ الگ حکم بیان کیا گیا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ اور قبیلۂ اَزْدْ کی ایک عورت پر زِنا کی حد جاری فرمائی تھی، [۲] اور یہ دونوں چونکہ شادی شدہ تھے، اس لئے ان کو سنگسار کردیا گیا تھا۔ نیز ایک یہودی کو بھی زِنا کی وجہ سے رجم کیا گیا تھا، اور اس کے حق میں یہ فیصلہ توراۃ کے حکم پر کیا گیا تھا۔ [۳]

غیر شادی شدہ کا حکم خود قرآنِ کریم کی سورۂ نور میں مذکور ہے:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور:۲)

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب التفسير، سورة النساء ج:۲ ص:۶۵۷

[۲] سنن ابی داؤد، كتاب الحدود، باب في الرجم، باب في والمرأة التي أمر النبي صلى الله عليه وسلم إلخ ج:۲ ص:۲۰۸، ۲۰۹

[۳] سنن ابی داؤد، كتاب الحدود، باب في رجم اليهوديين ج:۲ ص:۲۱۰

''زِنا کار عورت اور زِنا کار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

شروع میں رجم کے حکم کے لئے قرآن کریم کی آیت بھی نازل کی گئی تھی، لیکن بعد میں اس کی تلاوت منسوخ کردی گئی، البتہ حکم باقی رکھا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اِرشاد ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى آيَةَ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ اِلخ۔ (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰۃ) [۱]

''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب بھی نازل کردی، جو کچھ وحی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اس میں رجم کی آیت بھی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد رجم کیا، رجم کا حکم اس شخص کے لئے ثابت ہے جو زِنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔''

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں جو حبس فی البیوت اور ایذا کا حکم ہے وہ شرعی حد نازل ہونے پر منسوخ ہوگیا، اور اَب حدِ زنا سو کوڑے یا رجم پر عمل کرنا لازم ہوگا، مزید تفصیل اِن شاء اللہ تعالیٰ سورۂ نور کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

غیر فطری طریقہ سے قضائے شہوت کا حکم

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ ''میرے نزدیک وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا کا مصداق وہ لوگ ہیں جو غیر فطری طریقہ پر قضائے شہوت کرتے ہیں، یعنی مرد اِستلذاذ بالمثل کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' [۲]

قاضی صاحبؒ کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اسی قول کو لیا ہے، الفاظِ قرآن مجید میں چونکہ لفظ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا موصول اور صلہ دونوں مذکر کے الفاظ ہیں، اس لئے اِن حضرات کا یہ قول بعید نہیں ہے، گو جن حضرات نے زانی اور زانیہ مراد لیا ہے، انہوں نے بطور تغلیب مذکر کا یہ صیغہ زانیہ کے لئے بھی شامل رکھا ہے، تاہم موقع کی مناسبت سے اِستلذاذ بالمثل کی حرمت وشدّت اور اس کی جزاو تعزیر کا ذِکر اس جگہ بے جا نہ ہوگا۔

احادیث و آثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطورِ نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے:-

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الحدود ج:۲ ص:۳۰۹

[۲] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۴۵

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَعَنَ اللهُ سَبْعَةً مِّنْ خَلْقِهٖ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوَاتِهٖ وَرَدَّدَ اللَّعْنَةَ عَلٰی وَاحِدٍ مِّنْهُمْ ثَلَاثًا وَّلَعَنَ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ لَعْنَةً تَكْفِيْهِ قَالَ: مَلْعُوْنٌ مَّنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ، مَلْعُوْنٌ مَّنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ، مَلْعُوْنٌ مَّنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ۔ الحديث (الترغيب والترهيب) [1]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اُوپر سے لعنت بھیجی ہے، اوران سات میں سے ایک پر تین تین دفعہ لعنت بھیجی ہے، اور باقی پر ایک دفعہ، فرمایا: ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے، ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے، ملعون ہے وہ شخص جو قومِ لوط والا عمل کرتا ہے۔''

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَرْبَعَةٌ يُّصْبِحُوْنَ فِیْ غَضَبِ اللهِ وَيُمْسُوْنَ فِیْ سَخَطِ اللهِ، قُلْتُ: مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: اَلْمُتَشَبِّهُوْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتُ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ وَالَّذِیْ يَاْتِی الْبَهِيْمَةَ وَالَّذِیْ يَاْتِی الرِّجَالَ۔ (الترغيب والترهيب) [2]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہٗ کے غضب میں ہوتے ہیں، اور شام کو بھی اللہ جل شانہٗ ان سے ناراض ہوتے ہیں، میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ مرد جو عورتوں کی طرح بنتے ہیں، اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں، اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے، اور وہ مرد جو مرد سے قضائے شہوت کرتا ہے۔''

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ وَجَدْتُّمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ۔ (الترغيب والترهيب) [3]

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] الترغيب والترهيب، كتاب الحدود، باب الترغيب في الأمر بالمعروف إلخ رقم الحديث: ٣٤٢٠

[2] الترغيب والترهيب، كتاب الحدود وغيرها رقم الحديث: ٣٤٤٩

[3] الترغيب والترهيب رقم الحديث: ٣٤٢٢

جس کو تم قومِ لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔"

حافظ زکی الدینؒ نے "ترغیب وترہیب" میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور ہشام بن عبدالملک نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلاڈالا تھا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے محمد بن المنکدر کی روایت سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں عرب کے ایک علاقہ میں ایک مرد ہے جس کے ساتھ عورت والا کام کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کو جمع کیا، اور ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ کہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا اِرتکاب سوائے ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا، اور اللہ جل شانہٗ نے اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے، میری رائے ہے کہ اسے آگ میں جلادیا جائے، دُوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اس پر اِتفاق کرلیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے آگ میں جلادینے کا حکم دے دیا۔

مذکورہ روایات میں قومِ لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم کفر وشرک کے علاوہ اِس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی، اور جب حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہٗ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اُٹھالیا، اور اوندھا کرکے زمین پر پھینک دیا، جس کا ذِکر سورۂ اَعراف میں آئے گا، اِن شاء اللہ۔

مندرجہ بالا روایات اِستلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں، روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَنْظُرُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ اِلٰى رَجُلٍ اَتٰى رَجُلًا اَوِ امْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا۔ [1] (الترغیب والترہیب)

"حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جل شانہٗ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے۔"

عَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ

[1] الترغيب والترهيب، كتاب الحدود رقم الحديث: ۳۴۳۴

الْحَقِّ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، لَا تَاْتُوا النِّسَآءَ فِيْ اَدْبَارِهِنَّ۔ (الترغیب والترھیب) [۱]

''خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے، (پھر فرمایا) عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو۔''

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتٰى امْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا۔ (الترغیب والترھیب) [۲]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے۔''

وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَتٰى حَائِضًا اَوِ امْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا اَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهٗ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ [۳]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا غیر فطری طریقہ سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب سے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے، تو ایسے لوگ اس دین سے منکر ہوگئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔''

اس قبیح فعل کے لئے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، تاہم اس کے لئے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو ان کی ہے جو کرتے ہیں برا کام جہالت سے پھر توبہ کرتے ہیں

[۱] کتاب الحدود رقم الحدیث: ۳۴۲۷

[۲] کتاب الحدود رقم الحدیث: ۳۴۳۲

[۳] الترغیب والترھیب، کتاب الحدود رقم الحدیث: ۳۴۳۳

مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

جلدی سے تو ان کو اللہ معاف کردیتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ

اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں بُرے کام یہاں تک کہ جب سامنے آجاوے ان میں سے کسی کے

الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۗ

موت تو کہنے لگا: میں توبہ کرتا ہوں اب، اور نہ ایسوں کی توبہ جو کہ مرتے ہیں حالتِ کفر میں،

اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

ان کے لئے تو ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے کوئی بُرائی کر ڈالتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے، اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا بھی ہے، حکمت والا بھی ﴿۱۷﴾ توبہ کی قبولیت ان کے لئے نہیں جو بُرے کام کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آ کھڑا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کرلی ہے، اور نہ ان کے لئے ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے تو ہم نے دُکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ﴿۱۸﴾

ربطِ آیات

ماقبل کی آیت میں توبہ کا ذِکر آیا تھا، اب ان دو آیتوں میں قبولِ توبہ کی شرائط اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کی صورتیں بتلاتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

توبہ جس کا قبول کرنا (حسبِ وعدہ) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو انہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ (صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو) کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں (یعنی قبل حضورِ موت جس کے معنی آگے آتے ہیں) توبہ کر لیتے ہیں، سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ (قبولِ توبہ کے ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول کر لیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں (کہ کس نے دِل سے توبہ کی) حکمت والے ہیں (کہ دِل سے توبہ نہ کرنے والے کو فضیحت نہیں کرتے) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو (برابر) گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی (حضورِ موت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دُوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں) تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں (پس نہ تو ایسوں کی توبہ قبول) اور نہ ان لوگوں کی (توبہ یعنی ایمان لانا ایسے وقت کا مقبول ہے) جن کو حالتِ کفر پر موت آ جاتی ہے، ان (کافر) لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا (یعنی عقوبتِ دوزخ) تیار کر رکھی ہے۔

معارف ومسائل

کیا قصد واِختیار سے کیا ہوا گناہ معاف نہیں ہوتا؟

یہاں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ قرآن مجید میں لفظ بِجَهَالَةٍ کا وارِد ہوا ہے اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ انجانی اور نادانی سے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی، جان بوجھ کر کرے تو توبہ قبول نہیں ہوگی، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے جو تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ "جهالةٍ" سے اسی جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ اس کو گناہ کے گناہ ہونے کی خبر نہ ہو، یا گناہ کا قصد واِرادہ نہ ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کو گناہ کے انجامِ بد اور اُخروی عذاب سے غفلت اس گناہ پر اِقدام کا سبب ہوگئی، اگرچہ گناہ کو گناہ جانتا ہو، اور اس کا قصد واِرادہ بھی کیا ہو۔

دُوسرے الفاظ میں جہالت کا لفظ اس جگہ حماقت و بیوقوفی کے معنی میں ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر میں مذکور ہوا ہے، اس کی نظیر سورۂ یوسف میں ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۱۹﴾ (یوسف) اس میں بھائیوں کو جاہل کہا گیا ہے، حالانکہ انہوں نے جو کام کیا وہ کسی خطایا نسیان سے نہیں بلکہ قصد واِرادہ سے جان بوجھ کر کیا تھا، مگر اس فعل کے انجام سے غفلت کے سبب ان کو جاہل کہا گیا ہے۔

ابوالعالیہؒ اور قتادہؒ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر متفق تھے کہ "كُلُّ ذَنْبٍ اَصَابَهٗ عَبْدٌ فَهُوَ

جِهَالَةٌ عَمَدًا كَانَ اَوْ غَيْرَهٗ" یعنی ''بندہ جو گناہ کرتا ہے خواہ بلا قصد ہو یا بالقصد بہر حال جہالت ہے۔''

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا: "كُلُّ عَامِلٍ بِمَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَهُوَ جَاهِلٌ حِيْنَ عَمِلَهَا" یعنی ''جو شخص کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ یہ کام کرتے ہوئے جاہل ہی ہے۔'' اگر چہ صورت میں بڑا عالم اور باخبر ہو۔ (ابن کثیر) [۱]

اور ابوحیانؒ نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا ہے کہ: ''یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث میں ارشاد ہے: لَا يَزْنِي الزَّانِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ''یعنی زنا کرنے والا مؤمن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا'' مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ اس فعل بد میں مبتلا ہوا ہے اس وقت وہ ایمانی تقاضہ سے دور جا پڑا۔''

اسی لئے حضرت عکرمہؓ نے فرمایا کہ: "اُمُوْرُ الدُّنْيَا كُلُّهَا جَهَالَةٌ" یعنی ''دنیا کے وہ سارے کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت سے خارج ہوں سب کے سب جہالت ہیں۔'' [۲] اور وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا تھوڑی دیر کی لذت کو ہمیشہ باقی رہنے والی لذت پر ترجیح دے رہا ہے، اور جو اس تھوڑی دیر کی لذت کے بدلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذابِ شدید خرید ے وہ عاقل نہیں کہا جاسکتا، اس کو ہر شخص جاہل ہی کہے گا، اگر چہ وہ اپنے فعلِ بد کو جانتا ہو اور اس کا قصد وارادہ بھی کر رہا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ قصداً کرے یا خطاً دونوں حالت میں گناہ جہالت ہی سے ہوتا ہے، اسی لئے صحابہؓ وتابعینؒ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہو اس کی بھی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ (بحر محیط) [۳]

آیتِ مذکورہ میں ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس میں قبولِ توبہ کے لئے یہ شرط بتلائی ہے کہ قریب زمانہ میں ہی توبہ کرلے، توبہ کرنے میں دیر نہ کرے، اس میں قریب کا کیا مطلب ہے؟ اور کتنا زمانہ قریب میں داخل ہے؟ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر ایک حدیث میں خود اس طرح بیان فرمائی ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ۔ [۴]

حدیث کے معنی یہ ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس پر موت اور نزعِ رُوح کا غرغرہ طاری نہ ہو جائے۔''

اور محدث ابنِ مردویہؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندۂ مؤمن موت سے ایک مہینہ پہلے اپنے گناہ سے توبہ کرے، یا ایک دِن یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے، بشرطیکہ اِخلاص کے ساتھ سچی توبہ کی گئی ہو۔ (ابن کثیر) [۵]

---

۱ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲۳۵

۲ تفسیر البحر المحیط، ج:۳ ص:۶۶،۶۷ تحت الآیة المذكورة۔

۳ بحوالۂ بالا۔

۴ جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب فی فضل التوبة إلخ ج:۲ ص:۱۹۴

۵ وأيضًا في المعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۱۳۴۳۳

خلاصہ یہ کہ مِنۡ قَرِيۡبٍ کی تفسیر جوخود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری عمر کا زمانہ قریب ہی میں داخل ہے، موت سے پہلے پہلے جو توبہ کرلی جاوے قبول ہوگی، البتہ غرغرۂ موت کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔

اس کی توضیح جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے تفسیر ''بیان القرآن'' میں بیان فرمائی ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں، ایک تو یاس و نا اُمیدی کی جبکہ اِنسان ہر دوا و تدبیر سے عاجز ہوکر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو ''حالتِ یأس'' بالیاء سے تعبیر کیا گیا ہے، دُوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزعِ رُوح شروع ہوجائے اور غرغرہ کا وقت آجائے، اس حالت کو ''بأس'' بالباء کہا جاتا ہے، پہلی حالت یعنی حالتِ یأس تک تو مِنۡ قَرِيۡبٍ کے مفہوم میں داخل ہے، اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے، مگر دُوسری حالت یعنی حالتِ بأس کی توبہ مقبول نہیں، جبکہ فرشتے اور عالمِ آخرت کی چیزیں اِنسان کے سامنے آجائیں، کیونکہ وہ مِنۡ قَرِيۡبٍ کے مفہوم میں داخل نہیں۔

اس آیت میں مِنۡ قَرِيۡبٍ کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ اِنسان کی ساری عمر ہی ایک قلیل زمانہ ہے، اور موت جس کو وہ بعید سمجھ رہا ہے اس کے بالکل قریب ہے۔

''قریب'' کی یہ تفسیر جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی ہے، دُوسری آیت میں خود قرآن نے بھی اس کی طرف اِشارہ فرمادیا ہے، جس میں یہ بتلایا ہے کہ موت کے وقت کی توبہ قبول نہیں۔

خلاصۂ مضمون آیت کا یہ ہوگیا کہ جو شخص کسی گناہ کا اِرتکاب کرتا ہے خواہ جان بوجھ کر قصد و اِرادہ سے کرے یا خطا و ناواقفیت کی بنا پر کرے، وہ بہرحال جہالت ہی ہوتا ہے، ہر ایسے گناہ سے اِنسان کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، بشرطیکہ موت سے پہلے پہلے سچی توبہ کرلے۔

اپنے ذمہ لے لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمالیا ہے جس کا پورا ہونا یقینی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی فرض، واجب یا کسی کا حق لازم نہیں ہوتا۔ پہلی آیت میں تو اس توبہ کا ذِکر تھا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول ہے، دُوسری آیت میں اس توبہ کا بیان ہے جو قابلِ قبول نہیں۔

اس میں بیان فرمایا ہے کہ اُن لوگوں کی توبہ قابلِ قبول نہیں جو عمر بھر جرأت کے ساتھ گناہ کرتے رہے اور جب موت سر پر آ پہنچی اور نزعِ رُوح شروع ہوگیا، موت کے فرشتے سامنے آگئے، اُس وقت کہنے لگے کہ ہم اب توبہ کرتے ہیں، انہوں نے فرصتِ عمر گنوا کر توبہ کا وقت کھودیا، اس لئے ان کی توبہ مقبول نہیں ہوگی، جیسے فرعون اور آلِ فرعون نے غرق ہونے کے وقت پکارا کہ ہم رَبِّ موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے ہیں، تو ان کو جواب ملا کہ کیا اب اِیمان لاتے ہو جب اِیمان لانے کا وقت گزر چکا؟

اور یہی مضمون آیت کے آخری جملے میں اِرشاد فرمایا کہ اُن لوگوں کی توبہ بھی قابلِ قبول نہیں جن کو حالتِ کفر پر

موت آ گئی، اور عین نزعِ رُوح کے وقت ایمان کا اِقرار کیا، یہ اِقرار وایمان بے وقت اور بے سود ہے، ان کے لئے عذاب تیار کرلیا گیا ہے۔

توبہ کی تعریف اور حقیقت

دونوں آیتوں کی لفظی تفسیر کے بعد ضروری بات یہ باقی رہتی ہے کہ توبہ کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کی کیا حقیقت اور کیا درجہ ہے؟

اِمام غزالیؒ نے ''اِحیاء العلوم'' میں فرمایا کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں:-

پہلا یہ کہ کسی گناہ کا کبھی اِرتکاب نہ ہو، یہ فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیاء علیہم السلام کی۔ دُوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اِقدام کرے، اور پھر اُن پر اِصرار جاری رہے، کبھی اُن پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے، یہ درجہ شیاطین کا ہے۔ تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو، اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا یہ خالص شیاطین کا کام ہے اس لئے باجماعِ اُمت توبہ فرض ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:-

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ (التحریم:۸)

''یعنی اِیمان والو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو، سچی توبہ، تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کا کفارہ کردیں اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کردیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

کریم الکرماء اور رحیم الرحماء کی بارگاہِ رحمت کی شان دیکھئے کہ اِنسان ساری عمر اسی کی نافرمانی میں مبتلا رہے، مگر موت سے پہلے سچے دِل سے توبہ کرلے تو صرف یہی نہیں کہ اس کا قصور معاف کردیا جائے بلکہ اس کو اپنے محبوب بندوں میں داخل کرکے جنت کا وارث بنادیا جاتا ہے۔

حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

اَلتَّائِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ۔ (ابن ماجة) [1]

''یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب ہے، اور جس نے گناہ سے توبہ کرلی وہ ایسا ہوگیا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔''

[1] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب ذكر التوبة ج:۲ ص:۳۱۳۔ لیکن اس حدیث مبارک کا پہلا جزء ''التائب حبیب اللہ'' سنن ابن ماجہ میں نہیں ملا۔

بعض روایات میں ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کرے اور وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہو جائے، تو صرف یہی نہیں کہ اس پر مؤاخذہ نہ ہو، بلکہ اس کو فرشتوں کے لکھے ہوئے نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، تاکہ اس کی رُسوائی بھی نہ ہو۔ [۱]

البتہ یہ ضروری ہے کہ توبہ سچی اور توبۃ النصوح ہو، جس کے تین رُکن ہیں، اوّل اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں اِرشاد ہے: "اِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ" [۲] یعنی "توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔" دُوسرا رُکن توبہ کا یہ ہے کہ جس گناہ کا اِرتکاب کیا ہے اس کو فوراً چھوڑ دے، اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم و اِرادہ کرے۔

تیسرا رُکن یہ ہے کہ تلافی مافات کی فکر کرے، یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتنا تدارک اس کے قبضے میں ہے اس کو پورا کرے، مثلاً نماز روزہ فوت ہوا ہے تو اس کو قضا کرے، فوت شدہ نمازوں اور روزوں کی صحیح تعداد یاد نہ ہو، تو غور وفکر سے کام لے کر تخمینہ متعین کرے، پھر ان کی قضا کرنے کا پورا اِہتمام کرے، بیک وقت نہیں کر سکتا تو ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز قضائے عمری کی پڑھ لیا کرے، ایسے ہی متفرق اوقات میں روزوں کی قضا کا اِہتمام کرے، فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گزشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی یک مشت یا تدریجاً ادا کرے، کسی اِنسان کا حق لے لیا ہے تو اس کو واپس کرے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے، لیکن اگر اپنے کئے پر ندامت نہ ہو، یا ندامت تو ہو مگر آئندہ کے لئے اس گناہ کو ترک نہ کرے، تو یہ توبہ نہیں ہے، گو ہزار مرتبہ زبان سے "توبہ، توبہ" کہا کرے ؎

توبہ برلب، سبحہ برکف، دِل پُر اَز ذوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید زِاستغفارِ ما [۳]

جب کسی اِنسان نے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق توبہ کر لی تو وہ ہر طرح کا گناہ کر چکنے کے باوجود اللہ کا محبوب بندہ بن گیا۔

اور اگر پھر بتقاضائے بشریت کبھی اس سے گناہ کا اِرتکاب ہو گیا، تو پھر فوراً توبہ کی تجدید کرے، بارگاہِ غفور کریم سے ہر دفعہ توبہ قبول کرنے کی اُمید رکھے ؎

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ [۴]

---

[۱] کنز العمال، حرف الباء رقم الحدیث: ۱۰۱۷۹

[۲] سنن ابن ماجة، ابواب الزهد، باب ذكر التوبة ج: ۲ ص: ۳۱۳

[۳] ترجمہ:- زبان پر توبہ، ہاتھ میں تسبیح، دِل گناہ کے ذوق سے لبریز، گناہ کو بھی میرے اِستغفار پر ہنسی آ رہی ہے۔

[۴] ترجمہ:- اس دربار میں نااُمیدی نہیں ہے، سو بار بھی اگر توبہ توڑی ہے پھر بھی باز آ۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۖ

اے ایمان والو! حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی،

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ

اور نہ روکے رکھو ان کو اس واسطے کہ لے لو ان سے کچھ اپنا دیا ہوا مگر یہ کہ وہ کریں بے حیائی

مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ

صریح، اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح، پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو شاید

أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿۱۹﴾ وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ

تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی۔ اور اگر بدلنا چاہو

زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ ۙ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ

ایک عورت کی جگہ دُوسری عورت کو اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال تو مت پھیرلو اس میں سے کچھ،

أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ

کیا لیا چاہتے ہو اس کو ناحق اور صریح گناہ سے۔ اور کیونکر اس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے

بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴿۲۱﴾

تم میں کا ایک دُوسرے تک اور لے چکیں وہ عورتیں تم سے عہد پختہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! یہ بات تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن بیٹھو، اور ان کو اس غرض

سے مقیدمت کرو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ لے اُڑو، اِلَّا یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔اور ان کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو، اور اگر تم انہیں پسند نہ کرتے ہو تو یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو ⑲ اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دُوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہتے ہو، اور ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مہر دے چکے ہو، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے (مہر) واپس لو گے؟ ⑳ اور آخر تم کیسے (وہ مہر) واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دُوسرے کے اتنے قریب ہو چکے تھے، اور انہوں نے تم سے بڑا بھاری عہد لیا تھا؟ ㉑

ربطِ آیات

مندرجہ بالا آیات میں توبہ کا ذِکر ایک مناسبت سے آیا تھا، اس سے پہلے عورتوں سے متعلق اَحکام کا ذِکر چل رہا تھا، ان آیات میں بھی عورتوں کے متعلق اَحکام ہیں، جاہلیت میں عورتوں پر ان کے شوہروں کی طرف سے بھی ظلم ہوتا تھا، اور ان کے وارثوں کی طرف سے بھی۔

جب عورت کا شوہر مرجاتا تو شوہر کے ورثاء اپنی من مانی کرتے تھے، دِل چاہتا تو اسی عورت کے ساتھ خود نکاح کرلیتے، یا دُوسرے کے ساتھ کرادیتے، اور اگر رغبت نہ ہوئی تو نہ خود نکاح کریں اور نہ دُوسرے سے نکاح کرنے دیں، بلکہ ان کو قیدی بنا کر رکھیں، تاکہ اس کو ذریعۂ آمدنی بناویں، اس لئے کہ اس صورت میں اب وہ یا تو اپنا مال متاع ان کو دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیتی، اور یا یوں ہی اس کے گھر میں قید رہتی، اور اسی حالت میں اس کو موت آجاتی تھی۔

شوہر بھی اپنی بیویوں پر ظلم وستم کیا کرتے تھے، اگر رغبت نہ ہوتی تو نہ حقوقِ زوجیت ادا کرتے اور نہ اس کو طلاق دیتے، تاکہ وہ اپنا مال دے کر طلاق حاصل کرلے۔

ان آیات میں انہی مفاسد کا سدِ باب ہے، اور وَعَاشِرُوهُنَّ سے خاص شوہروں کو خطاب کیا گیا ہے، وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ سے مِّيثَاقًا غَلِيظًا ㉑ تک کی یہ دو آیتیں بھی اسی مضمون کا تتمہ ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے (مال یا جان کے) جبراً مالک ہو جاؤ (مال کا مالک ہونا تین طرح ہے، ایک یہ کہ اس عورت کا جو حق شرعی میراث میں ہے اس کو خود لے لیا جاوے اس کو نہ دِیا جائے، اور دُوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے یہاں تک کہ وہ یہاں ہی مرجائے پھر اس کا مال لے لیں، یا اپنے ہاتھ سے کچھ دے، تیسرے

یہ کہ خاونداس کو بے وجہ مجبور کرے کہ وہ اس کو کچھ مال دے تب یہ اس کو چھوڑے۔

اوّل اور تیسری صورت میں جبر کی قید سے یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ اُمور بالکل عورت کی خوشی سے ہوں تو جائز اور حلال ہیں، اور دُوسری صورت میں یہ جبر واقع میں نکاح سے روکنے میں ہے جس سے غرض مال لینا تھا، اس لئے لفظوں میں اس سے متعلق کردیا، اس سے بھی وہی فائدہ ہوا، یعنی اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح نہ کرے تو ان لوگوں کو گناہ نہیں۔

اور جان کا مالک ہونا یہ تھا کہ مردہ کی عورت کو میّت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، اس صورت میں جبر کی قید واقعی یعنی بیانِ واقعہ کے لئے ہے، کہ وہ ایسا کرتے تھے، مگر اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر عورت اپنی رضامندی سے اپنے کو مالِ میّت کی طرح ترکۂ موروثہ بنانے پر راضی ہوجائے تو وہ سچ مچ میراث اور ملک ہوجاوے گی) اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے (یعنی خود تم نے یا تمہارے عزیزوں نے) ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ (بھی ان سے) وصول کرلو (اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں، ایک یہ کہ میّت کا وارث اس میّت کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دے، تاکہ ہم کو یہ کچھ دے، دُوسرے یہ کہ خاونداس کو مجبور کرے کہ مجھ کو کچھ دے تب چھوڑوں، تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی بدون کچھ لئے اس کو نکاح نہ کرنے دے، یہاں کی پہلی صورت اُوپر کی دُوسری صورت کا ایک جزو ہے، اور یہاں کی دُوسری صورت اُوپر کی تیسری صورت ہے، اور وہاں کی پہلی صورت اور یہاں کی تیسری صورت الگ الگ ہے) مگر (بعض صورتوں میں ان سے مال لینا یا ان کو مقید کرنا جائز ہے وہ) یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں (اس میں بھی تین صورتیں آگئیں، ایک یہ کہ ناشائستہ حرکت نافرمانی شوہر کی اور بدخلقی ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ اس کو بدون مال لئے ہوئے جو مہر سے زیادہ نہ ہو اس کو نہ چھوڑے، دُوسرے یہ کہ ناشائستہ حرکت زِنا ہو تو اِبتدائے اِسلام میں قبل نزولِ حدود خاوند کو جائز تھا کہ اس جرمانے میں اس سے اپنا دِیا ہوا مال واپس کرلے اور اس کو نکال دے، اب یہ حکم منسوخ ہے، زِنا سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوتا، ان دو صورتوں میں مال لیا جائے گا، اور تیسری صورت یہ کہ ناشائستہ حرکت زِنا ہو تو خاوند کو اور نیز دُوسرے ورثاء کو جیسا کہ شروع رُکوع میں مذکور ہے بطور سزا کے بحکمِ حاکم عورتوں کو گھروں کے اندر مقید رکھنا جائز تھا، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، پس یہ مقید رکھنا بطور سزا کے ہوگا، بغرض وصولِ مال کے نہ ہوگا، پس یہ اِستثنا مطلق عضل سے ہوگا، نہ عضلِ مقید بغرضِ اذہاب مال سے۔ آگے خاص شوہروں کو حکم ہے) اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو (یعنی خوش اخلاقی اور نان ونفقہ کی خبر گیری) اور اگر (بتقاضائے طبیعت) وہ تم کو ناپسند ہوں (مگر ان کی طرف سے کوئی اَمر ناپسندیدگی کا موجب واقع نہ ہو) تو (تم بتقاضائے عقل یہ سمجھ کر برداشت کرو کہ) ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت (دُنیوی یا دِینی) رکھ دے (مثلاً وہ تمہاری خدمت گار اور آرام رساں اور ہمدرد ہو، یہ دُنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہوکر بچپن میں مرجائے یا زِندہ رہے اور صالح ہو، جو ذخیرۂ آخرت ہوجائے یا

اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنے کا ثواب وفضیلت تو ضرور ہی ملے گی) اور اگر تم (خود اپنی رغبت کی وجہ سے) بجائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دُوسری بیوی کرنا چاہو (اور پہلی بیوی کا کوئی قصور نہ ہو) اور تم اس ایک کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ وعطیہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو (خواہ ہاتھ میں سونپ دیا، یا خاص مہر کے لئے صرف معاہدہ میں دینا کیا ہو) تو تم اس (دیئے ہوئے یا معاہدہ کئے ہوئے) میں سے (عورت کو تنگ کر کے) کچھ بھی (واپس) مت لو (اور معاف کرانا بھی حکماً واپس لینا ہے) کیا تم اس کو (واپس) لیتے ہو (اس کی ذات پر نافرمانی یا بدکاری کا) بہتان رکھ کر اور (اس کے مال میں) صریح گناہ (یعنی ظلم) کے مرتکب ہو کر (خواہ بہتان صراحۃً ہو یا کہ اس طور پر دلالۃً ہو کہ اُوپر صرف نافرمانی و بدکاری کی صورت میں اس سے مال لینے کی اِجازت تھی، پس جب اس سے مال لیا تو گویا اس کو نافرمان و بدکردار دُوسروں کے ذہن میں تصوّر کرایا اور ظلم مالی کی وجہ ظاہر ہے کہ بغیر خوش دِلی کے عورت نے دِیا، اور ہبہ کی صورت میں یہ ظلم اس لئے کہ زوجین کے آپس میں کوئی کسی کو ہدیہ دیدے تو اَب اس سے واپس لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں، اور واپس لے گا تو وہ ایک قسم کا غصب ہوگا، اور بہتان بھی اسی سے لازم آتا ہے، کیونکہ واپس لینا گویا یہ کہنا ہے کہ یہ میری زوجہ نہ تھی، اس کا بہتان ہونا ظاہر ہے، کہ اس کو دعوتِ زوجیت میں کاذبہ اور معاشرت میں فاسقہ ٹھہراتا ہے) اور تم اس (دیئے ہوئے) کو (حقیقۃً یا حکماً) کیسے لیتے ہو حالانکہ (علاوہ بہتان وظلم کے اس کے لینے سے دو امر اور بھی مانع ہیں، ایک یہ کہ) تم باہم ایک دُوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو (یعنی صحبت ہو چکی ہے، یا خلوتِ صحیحہ کہ وہ بھی حکمِ صحبت میں ہے، بہرحال انہوں نے اپنی ذات تمہارے تمتع وتلذذ کے لئے تمہارے سپرد کر دی ہے، اور مہر اسی سپردگی کا معاوضہ ہے، پس مبدل منہ کو حاصل کر کے بدل کو واپس لینا یا کہ نہ دینا عقلِ سلیم کے بالکل خلاف ہے اور اگر وہ مالِ مہر نہیں بلکہ عطیہ تھا تو یہ بے حجابانہ ملاقات اثرِ زوجیت کی وجہ سے مانع ہے، اور اصل مانع زوجیت ہے) اور (دُوسرا مانع یہ کہ) وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اِقرار (یعنی عہدِ مستحکم) لے چکی ہیں (وہ عہد وہ ہے کہ نکاح کے وقت تم نے مہر اپنے ذمہ رکھا تھا اور عہد کر کے خلاف کرنا یہ بھی عقل کے نزدیک مذموم ہے، اور اگر وہ ہبہ اور عطیہ ہے تو قبل بے حجابانہ ملاقات کے یہ عہد بھی اثرِ زوجیت ہونے کی وجہ سے واپسیٔ ہبہ سے مانع ہے، غرض چار موانع کے ہوتے ہوئے واپسی نہایت ہی مذموم ہے)۔

معارف ومسائل

اسلام سے پہلے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا اِنسداد

ان تین آیتوں میں اُن مظالم کی روک تھام ہے جو اِسلام سے پہلے صنفِ نازک پر رَوا رکھے جاتے تھے، ان میں

ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورتوں کی جان و مال کا اپنے کو مالک سمجھتے تھے، عورت جس کے نکاح میں آ گئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملک سمجھتا تھا، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے، اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے، چاہیں تو وہ خود اس سے نکاح کرلیں، یا دُوسرے کسی سے مال لے کر اس کا نکاح کردیں، شوہر کا لڑکا جو دُوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو اپنے نکاح میں لاسکتا تھا، اور جب عورت کی جان ہی اپنی ملک سمجھ لی گئی تو مال کا معاملہ ظاہر ہے اور اس ایک بنیادی غلطی کے نتیجے میں عورتوں پر طرح طرح کے صدہا مظالم ہوا کرتے تھے، مثلاً:-

ایک یہ ظلم تھا کہ جو مال عورت کو کہیں سے وراثت میں ملا یا اس کے میکے والوں کی طرف سے بطور ہدیہ تحفہ ملا، بیچاری عورت اس سب سے محروم و بے تعلق رہتی، اور یہ سب مال سسرال کے مرد ہضم کرلیتے تھے۔

دُوسرا ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر عورت نے اپنے حصہٴ مال پر کہیں قبضہ کر ہی لیا تو مرد اس کو نکاح کرنے سے اس لئے روکتے تھے کہ یہ اپنا مال باہر نہ لے جاسکے بلکہ یہیں مرجائے اور مال چھوڑ جائے تو ہمارے قبضہ میں آجائے۔

تیسرا ظلم کہیں کہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود محض طبعی طور پر وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی تو شوہر اس کے حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتا، مگر طلاق دے کر اس کی گلوخلاصی بھی اس لئے نہیں کرتا کہ یہ تنگ آکر زیور اور زَرِ مہر جو وہ اسے دے چکا ہے واپس کردے، یا اگر ابھی نہیں دیا تو معاف کردے تب اسے آزادی ملے گی۔ اور بعض اوقات شوہر طلاق بھی دے دیتا لیکن پھر بھی اپنی اس مطلقہ کو کسی دُوسرے سے نکاح نہیں کرنے دیتا تاکہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مہر واپس کردے یا واجب الادا مہر کو معاف کردے۔

چوتھا ظلم بعض اوقات یوں ہوتا تھا کہ شوہر مرگیا، اس کے وارث اس کی بیوہ کو نکاح نہیں کرنے دیتے، یا جاہلانہ عار کی وجہ سے یا اس طمع میں کہ اس کے ذریعہ کچھ مال وصول کریں۔

یہ سب مظالم اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کا بھی اپنے آپ کو مالک سمجھا جاتا تھا، قرآنِ کریم نے اس فساد کی جڑ کو اُکھاڑ ڈالا، اور اس کے تحت ہونے والے تمام مظالم کے اِنسداد کے لئے اِرشاد فرمایا:-

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا

”اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مالک بن بیٹھو۔“

جبراً کی قید اس جگہ بطورِ شرط کے نہیں کہ عورتوں کی رضامندی سے ان کا مالک بن جانا صحیح قرار دیا جائے، بلکہ

بیانِ واقعہ کے طور پر ہے کہ عورتوں کی جان و مال کا بلا وجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھنا ظاہر ہے کہ جبراً ہی ہوسکتا ہے، اس پر کوئی ہوش و عقل والی عورت راضی کہاں ہوسکتی ہے (بحرِ محیط)۔ [1] اسی لئے شریعت نے اس معاملہ میں اس کی رضا کو مؤثر نہیں قرار دیا، کوئی عورت بیوقوفی سے کسی کی مملوک بننے پر راضی بھی ہوجائے تو اِسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد اِنسان کسی کا مملوک ہوجائے۔

ظلم و فساد کی ممانعت کا عام طریقہ یہ ہے کہ بصیغۂ نہی اس سے منع کر دیا جائے، لیکن اس جگہ قرآنِ کریم نے اس عام طریقے کو چھوڑ کر لفظ لَا یَحِلُّ سے اس کو بیان فرمایا ہے، اس میں اس معاملہ کے شدید گناہ ہونے کے علاوہ اس طرف بھی اِشارہ ہوسکتا ہے کہ اگر کسی نے کسی بالغ عورت سے بغیر اس کی رضا و اجازت کے نکاح کر بھی لیا تو وہ نکاح شرعاً حلال نہیں، بلکہ کالعدم ہے، ایسے نکاح سے نہ اُن دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رِشتہ قائم ہوتا ہے، اور نہ وراثت یا نسب کے اَحکام اس سے متعلق ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے اپنا دِیا ہوا مہر واپس لے لیا، یا واجب الادا مہر کو جبراً معاف کرالیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً معتبر نہیں، نہ اس سے لیا ہوا مال مرد کے لئے حلال ہوتا ہے، نہ کوئی حقِ واجب معاف ہوتا ہے، اور اسی مضمون کی مزید توضیح کے لئے اِرشاد فرمایا:-

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ یعنی ''عورتوں کو اپنی مرضی کا نکاح کرنے سے نہ روکو، اس خیال پر کہ جو مال تم نے یا تمہارے عزیز نے ان کو بطور مہر کے یا بطور ہدیہ تحفہ کے دے دیا ہے وہ اس سے واپس لے لو۔'' مہر دینے اور واپس لینے میں یہ بھی داخل ہے کہ جو مہر دینا مقرّر کر چکے ہیں اس کو معاف کرایا جائے، غرض دِیا ہوا مہر جبراً واپس لیں یا واجب الادا کو جبراً معاف کرائیں، یہ سب ناجائز اور حرام ہیں، اسی طرح جو مال بطور ہدیہ تحفہ کے مالکانہ طور پر بیوی کو دِیا جاچکا ہے، ان کا واپس لینا نہ خود شوہر کے لئے حلال ہے نہ اس کے وارثوں کے لئے۔ مالکانہ طور پر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر شوہر نے کوئی زیور یا اور کوئی اِستعمالی چیز بیوی کو محض عاریۃً اِستعمال کے لئے دی ہے مالک بنا کر نہ دی ہو تو وہ بیوی کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوتی، اس لئے اس کی واپسی بھی ممنوع نہیں۔

اس کے بعد اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فرما کر بعض ایسی صورتوں کو مستثنیٰ فرما دیا گیا ہے جن میں شوہر کے لئے اپنا دِیا ہوا مالِ مہر وغیرہ واپس لینا جائز ہوجاتا ہے۔

معنی یہ ہیں کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی ناشائستہ حرکت ایسی صادر ہوجائے جس کی وجہ سے طلاق

---

[1] تفسیر البحر المحیط ج:۴ ص:۷۲، تحت هٰذه الآیة۔

دینے کے لئے آدمی طبعاً مجبور ہو جائے، تو ایسی صورت میں مضائقہ نہیں کہ شوہر اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک یہ اس کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔

اور اس جگہ لفظ "فاحشہ" یعنی ناشائستہ حرکت سے مراد حضرت ابنِ عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاکؒ وغیرہ کے نزدیک تو شوہر کی نافرمانی اور بدزبانی ہے۔

اور ابو قلابہؒ، حسن بصریؒ نے "فاحشہ" سے مراد اس جگہ بے حیائی اور زِنا لیا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر ان عورتوں سے کوئی بے حیائی کا کام سرزد ہو گیا یا وہ نافرمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں، جس سے مجبور ہو کر مرد طلاق پر آمادہ ہو رہا ہے، تو چونکہ قصور عورت کا ہے، اس لئے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس وقت تک اپنے نکاح میں روکے رکھے جب تک اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس وصول نہ کرے یا مقرّر کردہ مہر معاف نہ کرالے۔

اگلی دو آیتوں میں بھی اسی مضمون کا تفصیلی بیان ہے، اِرشاد ہے کہ جب عورت کی طرف سے کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لئے موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دُوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال بھی اس کو دے چکا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس سے دیئے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق کے معاوضہ میں واپس لے، یا واجب الادا مہر کو معاف کرائے، کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں، اور جس سبب سے مہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے، یعنی عقدِ نکاح بھی ہو گیا اور دونوں آپس میں بے حجابانہ مل بھی چکے ہیں، تو اَب دِیا ہوا مال واپس لینے یا واجب الادا مہر کے معاف کرانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس رقم کی واپسی کے ظلم و گناہ ہونے کو تین مرحلوں میں بیان فرمایا گیا، اوّل فرمایا: اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ یعنی "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بیوی پر زِنا وغیرہ کے بہتان لگانے کا کھلا گناہ کر کے اپنا مال واپس لینے کا راستہ نکالو"، یعنی جب یہ معلوم ہو چکا کہ دِیا ہوا مال واپس لینا صرف اس وقت جائز ہے جبکہ بیوی کسی ناشائستہ حرکت کی مرتکب ہو، تو اَب اس سے مال واپس لینا درحقیقت اس کا اِعلان کرنا ہے کہ اس نے کوئی ناشائستہ حرکت بے حیائی وغیرہ کی ہے، خواہ زبان سے اس پر تہمت زِنا کی لگائے یا نہ لگائے، بہرحال یہ ایک صورت تہمت اور بہتان کی ہے جس کا اِثمِ مبین یعنی کھلا گناہِ عظیم ہونا ظاہر ہے۔

دُوسرا جملہ یہ اِرشاد فرمایا گیا: وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ یعنی "اب تم اپنا مال ان سے کیسے

واپس لے سکتے ہو، جبکہ صرف عقدِ نکاح ہی نہیں بلکہ خلوتِ صحیحہ اور ایک دُوسرے سے بے حجابانہ ملنا بھی ہو چکا ہے'' کیونکہ اس صورت میں دیا ہوا مال اگر مہر کا ہے تو عورت اس کی پوری مستحق اور مالک ہو چکی ہے، کیونکہ اس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کر دیا، اب اس کی واپسی کے کوئی معنی نہیں، اور اگر دِیا ہوا مال ہدیہ تحفہ کا ہے تو بھی اب اس کی واپسی ممکن نہیں، کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دُوسرے کو ہبہ کریں اس کی واپسی نہ شرعاً جائز ہے اور نہ قانوناً نافذ کی جاتی ہے، غرض اِزدواجی تعلق ہبہ کی واپسی سے مانع ہے۔

اور اسی مضمون کو تیسرے جملہ میں اِرشاد فرمایا: وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا یعنی ''ان عورتوں نے تم سے پختہ اور مضبوط عہد لے لیا ہے۔'' اس سے مراد عقدِ نکاح کا عہد ہے، جو اللہ کے نام اور خطبہ کے ساتھ مجمع کے سامنے کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس اِزدواجی عہد و میثاق اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کے لئے عورت کو مجبور کرنا کھلا ہوا ظلم و جور ہے، مسلمانوں کو اس سے اِجتناب لازم ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط

اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تمہارے باپ مگر جو پہلے ہو چکا،

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ط وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ ع حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (ع ۸ / ۱۴)

یہ بے حیائی ہے اور کام ہے غضب کا اور بُرا چلن ہے۔ حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں

وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ

اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں بھائی کی اور بہن کی

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ

اور جن ماؤں نے تم کو دُودھ پلایا اور دُودھ کی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ

اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جن کو جنا ہے تمہاری اُن عورتوں نے جن سے تم نے صحبت کی، اور اگر

لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ

تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں، اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو

مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

تمہاری پشت سے ہیں، اور یہ کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا، بے شک اللہ

كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۙ ﴿۲۳﴾

بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا (کسی وقت) نکاح کر چکے ہوں، تم انہیں نکاح میں نہ لاؤ۔ البتہ پہلے جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ یہ بڑی بے حیائی ہے، گھناؤنا عمل ہے، اور بے راہ روی کی بات ہے ﴿۲۲﴾ تم پر حرام کر دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپیاں، تمہاری خالائیں، اور بھتیجیاں اور بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دُودھ پلایا ہے، اور تمہاری دُودھ شریک بہنیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہارے زیرِ پرورش تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری ان بیویوں (کے پیٹ) سے ہوں جن کے ساتھ تم نے خلوت کی ہو۔ ہاں اگر تم نے ان کے ساتھ خلوت نہ کی ہو (اور انہیں طلاق دے دی ہو، یا ان کا انتقال ہو گیا ہو) تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں) کوئی گناہ نہیں ہے، نیز تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں، اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرو، البتہ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ بیشک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۲۳﴾

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

اور خاوند والی عورتیں مگر جن کے مالک ہوجائیں تمہارے ہاتھ، حکم ہوا اللہ کا تم پر،

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ

اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا بشرطیکہ طلب کر ان کو اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

نہ مستی نکالنے کو، پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق

فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ

جو مقرر ہوئے، اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں کہ ٹھہرالو تم دونوں آپس کی رضا سے مقرر کئے پیچھے، بے شک

اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

اللہ ہے خبردار حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

نیز وہ عورتیں (تم پر حرام ہیں) جو دُوسرے شوہروں کے نکاح میں ہوں، البتہ جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں آجائیں (وہ مستثنیٰ ہیں)۔ اللہ نے یہ اَحکام تم پر فرض کردیئے ہیں۔ ان عورتوں کو چھوڑ کر تمام عورتوں کے بارے میں یہ حلال کردیا گیا ہے کہ تم اپنا مال (بطورِ مہر) خرچ کر کے انہیں (اپنے نکاح میں لانا) چاہو، بشرطیکہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کا رِشتہ قائم کر کے عفت حاصل کرو، صرف شہوت نکالنا مقصود نہ ہو۔ چنانچہ جن عورتوں سے (نکاح کرکے) تم نے لطف اُٹھایا ہو، ان کو ان کا وہ مہر اَدا کرو جو مقرر کیا گیا ہو۔ البتہ مہر مقرر کرنے کے بعد بھی جس (کمی بیشی) پر تم آپس میں راضی ہوجاؤ، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ یقین رکھو کہ اللہ ہر بات کا علم بھی رکھتا ہے، حکمت کا بھی مالک ہے۔ ﴿۲۴﴾

ربطِ آیات

اُوپر سے جاہلیت کی رُسومِ قبیحہ کا ذِکر چلا آ رہا ہے، ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ بعض حرام عورتوں سے نکاح کرلیا کرتے تھے، مثلاً اپنی سوتیلی ماں سے، ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دُوسری بہن سے، اسی کی مناسبت سے دُوسری محرمات کا بھی ذِکر آ گیا، نیز وہ لوگ لے پالک بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے کو حرام سمجھتے تھے، اس کا بھی اِبطال فرمادیا، اس سلسلہ میں بعض ان عورتوں کی حلت کو بھی بیان کیا گیا جن میں مسلمانوں کو شبہ ہوا تھا، مثلاً باندی جو مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی ہو اور اس کا پہلا شوہر دارُالحرب میں ہو، اسی کے ساتھ نکاح کے شرائط اور اس کے متعلقات مہر وغیرہ کا بھی ذِکر آ گیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (یا دادا، یا نانا) نے نکاح کیا ہو، مگر (خیر) جو بات گزر گئی، گزر گئی، (آئندہ کبھی ایسا نہ ہو) بے شک یہ (بات عقلاً بھی) بڑی بے حیائی ہے اور (اہلِ طبائع سلیمہ کے عرف میں بھی) نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً بھی) بہت بُرا طریقہ ہے، تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں (یعنی ان سے نکاح کرنا حرام اور باطل ہے، اور ان کی کئی قسمیں ہیں:-

اوّل محرماتِ نسبیّہ وہ یہ ہیں) تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں (اور ان میں سب اُصول وفروع بواسطہ وبلا واسطہ سب داخل ہیں) اور تمہاری بہنیں (خواہ عینی ہوں یا علاتی یا اَخیافی) اور تمہاری پھوپھیاں (اس میں باپ کی اور سب مذکر اُصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آ گئیں) اور تمہاری خالائیں (اس میں ماں کی اور سب مؤنث اُصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آ گئیں) اور بھانجیاں (اس میں تینوں قسموں کی بہنوں کی اولاد بواسطہ وبلا واسطہ سب آ گئیں) اور

(قسمِ دوم محرماتِ رضاعیہ، وہ یہ ہیں) تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دُودھ پلایا ہے (یعنی انا) اور تمہاری وہ بہنیں جو دُودھ پینے کی وجہ سے بہن ہیں (یعنی تم نے ان کی حقیقی یا رضاعی ماں کا دُودھ پیا ہے، یا اس نے تمہاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دُودھ پیا ہے، گو مختلف وقت میں پیا ہو) اور

(قسمِ سوم محرمات بالمصاہرہ، وہ یہ ہیں) تمہاری بیبیوں کی مائیں (اس میں زوجہ کے سب مؤنث اُصول آ گئے) اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں (اس میں زوجہ کے سب مؤنث فروع آ گئے) جو کہ (عادۃً) تمہاری پرورِش میں رہتی ہیں (مگر اس میں ایک قید بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لڑکیاں) ان بیبیوں سے (ہوں) کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو (یعنی کسی عورت کے ساتھ صرف نکاح کرنے سے اس کی لڑکی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب اس عورت سے صحبت بھی ہو جائے تب لڑکی حرام

ہوتی ہے) اور اگر (ہنوز) تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو (گو نکاح ہو چکا ہو) تو (ایسی بی بی کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے میں) تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمہاری ان بیٹوں کی بیبیاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمہاری نسل سے ہوں (اس میں سب مذکر فروع کی بیبیاں آگئیں، اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے یعنی لے پالک جس کو متبنّٰی کہتے ہیں اس کی بی بی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو لیکن جو (اس حکم سے) پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں (کہ رحمت سے گناہ معاف کر دیتے ہیں) اور

(قسمِ چہارم) وہ عورتیں ہیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر (اس قسم میں وہ مستثنیٰ ہیں) جو کہ (شرعاً) تمہاری مملوک ہو جائیں (اور ان کے حربی شوہر دار الحرب میں موجود ہوں، اور بعد ایک حیض آ جانے یا وضع حمل کے حلال ہیں، کذا فی الهداية)[1] اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تم پر فرض کر دیا ہے اور ان عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو (یعنی مہر ہونا نکاح میں ضرور ہے اور) اس طرح کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (جس کی شرطیں شرع میں مشہور ہیں، مثلاً گواہ بھی ہوں، وہ نکاح مؤقت بھی نہ ہو، وغیرہ) صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو (اس کے عموم میں زِنا اور متعہ سب داخل ہو گیا، گو اس میں بھی مال خرچ کیا جاتا ہے) پھر (نکاح ہو جانے کے بعد) جس طریق سے (من جملہ طرقِ شرعیہ معتبرہ کے) تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو سو ان کو (ان کے عوض) ان کے مہر دو جو کچھ مقرّر ہو چکے ہیں (اور یہ نہ سمجھو کہ اس مقرّرہ میں کسی طرح مثل نماز و روزہ کے کمی بیشی ممکن نہ ہو بلکہ) مقرّر ہوئے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بیوی) باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں (مثلاً خاوند نے اور مہر بڑھا دیا، یا عورت نے کم کر دیا، یا معاف ہی کر دیا، ہر طرح دُرست ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں (تمہاری مصلحتوں کو خوب جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (ان مصلحتوں کی رعایت سے احکام مقرّر فرمائے ہیں، گو کہیں تمہاری سمجھ میں نہ آوے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں محرمات یعنی ان عورتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے، پھر بعض محرمات تو وہ ہیں جو کسی حال میں حلال نہیں ہوتیں، جنہیں ''محرماتِ ابدیہ'' کہا جاتا ہے، اور بعض محرمات ابدیہ نہیں ہیں، وہ بعض حالتوں میں حلال بھی ہو جاتی ہیں۔

[1] الهداية، كتاب النكاح، باب نكاح اهل الشرك ج:۱ ص:۲۲۰

شروع کی تین قسمیں محرماتِ نسبیہ، محرماتِ رضاعیہ اور محرمات بالمصاہرۃ، محرماتِ ابدیہ ہیں، اور آخر کی ایک قسم منکوحہ عورتیں اُس وقت تک کے لئے حرام ہیں جب تک وہ غیر کے نکاح میں ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ جاہلیت کے زمانے میں اس میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیتے تھے، اس آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منع فرمایا اور اس کو موجبِ مقت یعنی خدائے پاک کی ناراضگی کا باعث بتایا، ظاہر ہے کہ یہ کیسی اخلاق کی موت اور کردار کی خرابی ہے کہ جس کو ایک عرصے تک ماں کہتے رہے، اس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ لیا۔

مسئلہ:- آیتِ شریفہ میں باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی قید نہیں لگائی ہے کہ باپ نے اس سے وطی بھی کی ہو، لہٰذا کسی بھی عورت سے اگر باپ کا عقد بھی ہو جائے تو اس عورت سے بیٹے کے لئے نکاح کبھی بھی حلال نہیں۔

اسی طرح سے بیٹے کی بیوی سے باپ کو نکاح کرنا دُرست نہیں، اگرچہ بیٹے کا صرف نکاح ہی ہوا ہے، قَالَ الشَّامِیُّ: وَتَحْرُمُ زَوْجَةُ الْاَصْلِ وَالْفَرْعِ بِمُجَرَّدِ الْعَقْدِ دَخَلَ بِهَا اَوْ لَا۔ [1]

مسئلہ:- اگر باپ نے کسی عورت سے زِنا کر لیا ہو تو بھی بیٹے کو اس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ یعنی اپنی والدہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لفظ اُمَّهٰتُكُمْ کے عموم میں دادیاں اور نانیاں سب داخل ہیں۔

وَبَنٰتُكُمْ اپنی صلبی لڑکی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لڑکی کی لڑکی سے بھی، اور بیٹے کی لڑکی سے بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، پوتی، پڑپوتی، نواسی، پڑنواسی، ان سب سے نکاح کرنا حرام ہے، اور سوتیلی لڑکی جو دُوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس سے نکاح کرنے نہ کرنے میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے، اور جو لڑکا لڑکی صلبی نہ ہو بلکہ گود لے کر پال لیا ہو ان سے اور ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کسی دُوسرے طریقہ سے حرمت نہ آئی ہو، اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زِنا کیا تو اس نطفے سے جو لڑکی پیدا ہو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے، اس سے بھی نکاح دُرست نہیں۔

وَاَخَوٰتُكُمْ اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، اور اس بہن سے بھی جو علاتی (باپ شریک) اور اس بہن سے بھی جو اَخیافی (ماں شریک) ہو۔

وَعَمّٰتُكُمْ اپنے باپ کی حقیقی بہن، علاتی، اَخیافی بہن، ان تینوں سے نکاح حرام ہے، غرض کہ تینوں طرح کی

[1] ترجمہ:- علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ: "باپ اور بیٹے کی بیوی محض نکاح کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہے باپ اور بیٹے نے اس سے ہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو۔ الشامی، کتاب النکاح، فصل في المحرمات ج:۳ ص:۳۱

پھوپھیوں سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

وَخٰلٰتُكُمْ اپنی والدہ کی بہن، حقیقی ہو یا علاتی ہو یا اَخیافی، ہر ایک سے نکاح حرام ہے۔

وَبَنٰتُ الْاَخِ بھائی کی لڑکیوں، یعنی بھتیجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، حقیقی ہو، علاتی ہو یا اَخیافی ہو، تینوں طرح کے بھائیوں کی لڑکیوں سے نکاح حلال نہیں ہے۔

وَبَنٰتُ الْاُخْتِ بہن کی لڑکیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، اور یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ بہنیں خواہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اَخیافی، ان کی لڑکیاں شرعاً نکاح میں نہیں آسکتیں۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ جن عورتوں کا دُودھ پیا ہے، اگر چہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حرمتِ نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں، اور ان سے بھی نکاح حرام ہے، تھوڑا سا دُودھ پیا ہو یا زیادہ، ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدّد دفعہ پیا ہو، ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہوجاتی ہے، فقہاء کی اِصطلاح میں اس کو حرمتِ رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمتِ رضاعت اُسی زمانہ میں دُودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دُودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: "اِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ" یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی، وہ اسی زمانہ کے دُودھ پینے سے ہوگی جس زمانہ میں دُودھ پینے ہی سے بچے کا نشو ونما ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم) [۱]

اور یہ مدّت اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لے کر ڈھائی سال تک ہے، اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں اِمام ابوحنیفہؒ کے مخصوص شاگرد اِمام ابو یوسف اور اِمام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں، صرف دو سال کی مدّت تک رضاعت ثابت ہوسکتی ہے اور اسی پر اِمام محمدؒ کا فتویٰ بھی ہے، اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دُودھ پیا تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔ [۲]

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ یعنی رضاعت کے رشتہ سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے اَیامِ رضاع میں کسی عورت کا دُودھ پی لیا، وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی، اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا، اور اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے، اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں، اور اس کا عورت کا جیٹھ دیور ان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے، اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں، اور باہم ان سب میں حرمتِ رضاعت ثابت ہوگئی۔ نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا رضاع إلخ ج:۲ ص:۷۶۴ وصحیح مسلم، کتاب الرضاع ج:۱ ص:۴۷۰

[۲] الشامیة، کتاب الرضاع ج:۳ ص:۲۱۱

ہے، رضاع کے رشتہ سے بھی حرام ہوجاتا ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: "يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ" (بخاری)[1] اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے: "اِنَّ اللهَ حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ"۔ (بحوالہ مشکوٰۃ)[2]

مسئلہ:- اگر ایک لڑکے اور ایک لڑکی نے کسی عورت کا دُودھ پیا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کی لڑکی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ:- رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے، اور نسبی بہن کی رضاعی ماں سے بھی حلال ہے، اور رضاعی بہن کی نسبی بہن سے بھی اور نسبی بہن کی رضاعی بہن سے بھی نکاح جائز ہے۔

مسئلہ:- منہ یا ناک کے ذریعہ اَیامِ رضاعت میں دُودھ اندر جانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، اور اگر اور کسی راستہ سے دُودھ اندر پہنچادیا جائے یا دُودھ کا انجکشن دے دیا جائے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ:- عورت کے دُودھ کے علاوہ کسی اور دُودھ (مثلاً چوپائے کا دُودھ یا کسی مرد کا) سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ:- دُودھ اگر دوا میں، یا بکری، گائے، بھینس کے دُودھ میں ملا ہوا ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت اس وقت ثابت ہوگی جبکہ عورت کا دُودھ غالب ہو، اور اگر دونوں برابر ہوں تب بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے، لیکن اگر عورت کا دُودھ کم ہے تو یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ:- اگر مرد کے دُودھ نکل آئے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ:- اگر دُودھ پینے کا شک ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کسی عورت نے کسی بچے کے منہ میں پستان دیا، لیکن دُودھ جانے کا یقین نہ ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی اور نکاح کی حلت پر اس کا اثر نہ پڑے گا۔

مسئلہ:- اگر کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کرلیا، اور کسی اور عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دُودھ پلایا ہے تو اگر دونوں اس کی تصدیق کریں تو نکاح کے فاسد ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے گا، اور اگر یہ دونوں اس کی تکذیب کریں اور عورت دِین دار، خداترس ہو تو فسادِ نکاح کا فیصلہ نہ ہوگا، لیکن طلاق دے کر مفارقت کرلینا پھر بھی افضل ہے۔

مسئلہ:- حرمتِ رضاع کے ثبوت کے لئے دو دِین دار مردوں کی گواہی ضروری ہے، ایک مرد یا ایک عورت کی

[1] صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب ما يحل من الدخول والنظر إلخ ج:۲ ص:۷۸۸

[2] مشكوة، كتاب النكاح، باب المحرمات ج:۲ ص:۲۷۳

گواہی سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، لیکن چونکہ معاملہ حرام وحلال سے متعلق ہے، اس لئے اِحتیاط کرنا افضل ہے، حتیٰ کہ بعض فقہاء نے یہ تفصیل لکھی ہے کہ اگر کسی عورت سے نکاح کرنا ہو اور ایک دِین دار مرد گواہی دے کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں تو نکاح کرنا جائز نہیں، اور اگر نکاح کے بعد ہو تو اِحتیاط جدا ہونے میں ہے، بلکہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے تب بھی اِحتیاط اسی میں ہے کہ مفارقت اِختیار کرلیں۔

مسئلہ:- جس طرح دو دِین دار مردوں کی گواہی سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوجاتی ہے، اسی طرح ایک دِین دار مرد اور دو دِین دار عورتوں کی گواہی سے بھی اس کا ثبوت ہوجاتا ہے، البتہ اِحتیاط اسی میں ہے کہ اگر نصابِ شہادت پورا نہ ہو تب بھی شک سے بچنے کے لئے حرمت کو ترجیح دی جائے۔

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىٕكُمْ بیویوں کی مائیں بھی شوہروں پر حرام ہیں، یہاں بھی اُمہات میں تفصیل ہے۔

اس میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں نسبی ہوں یا رضاعی سب داخل ہیں۔

مسئلہ:- جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے، اسی طرح اُس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہم بستری کی ہو، یا جس کے ساتھ زِنا کیا ہو، یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہو۔

مسئلہ:- نفسِ نکاح ہی سے بیوی کی ماں حرام ہوجاتی ہے، حرمت کے لئے دُخول وغیرہ ضروری نہیں۔

وَ رَبَآىٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ٘ جس عورت کے ساتھ نکاح کیا اور نکاح کے بعد ہم بستری بھی کی تو اس عورت کی لڑکی جو دُوسرے شوہر سے ہے، اسی طرح اس کی پوتی، نواسی حرام ہوگئیں، ان سے نکاح کرنا جائز نہیں، لیکن اگر ہم بستری نہیں کی، صرف نکاح ہوا تو صرف نکاح سے مذکورہ قسمیں حرام نہیں ہوجاتیں، لیکن نکاح کے بعد اگر اس کو شہوت کے ساتھ چھوا، یا اس کے اندامِ نہانی کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا تو یہ بھی ہم بستری کے حکم میں ہے، اس سے بھی اس عورت کی لڑکی وغیرہ حرام ہوجاتی ہے۔

مسئلہ:- یہاں بھی نِسَآىٕكُمْ میں تعمیم ہے، لہٰذا اس عورت کی لڑکی، پوتی اور نواسی بھی حرام ہوگئیں، جس کے ساتھ شبہ میں ہم بستری کی ہو یا اس کے ساتھ زِنا کیا ہوا۔

وَ حَلَآىٕلُ اَبْنَآىٕكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ٘ بیٹے کی بیوی حرام ہے، اور بیٹے کے عموم میں پوتا، نواسا بھی داخل ہیں، لہٰذا ان کی بیویوں سے نکاح جائز نہ ہوگا۔

مِنْ اَصْلَابِكُمْ ٘ کی قید سے متبنّٰی (لے پالک) کو نکالنا مقصود ہے، اس کی بیوی سے نکاح حلال ہے، اور رضاعی بیٹا بھی نسبی بیٹے کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، حقیقی بہنیں ہوں یا علاتی ہوں یا اَخیافی،

نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں، یہ حکم سب کو شامل ہے، البتہ طلاق ہو جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے، لیکن یہ جواز عدت گزرنے کے بعد ہے، عدت کے دوران نکاح جائز نہیں ہے۔

مسئلہ :- جس طرح ایک ساتھ دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اسی طرح پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا یُجْمَعُ بَیْنَ الْمَرْاَةِ وَعَمَّتِهَا وَلَا بَیْنَ الْمَرْاَةِ وَخَالَتِهَا۔ (بخاری ومسلم) [1]

مسئلہ :- فقہائے کرام نے بطور قاعدۂ کلیہ یہ لکھا ہے کہ ہر ایسی دو عورتیں جن میں سے اگر کسی ایک کو مذکر فرض کیا جائے تو شرعاً ان دونوں کا آپس میں نکاح درست نہ ہو، اس طرح کی دو عورتیں ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ [2]

اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ یعنی جاہلیت میں جو کچھ ہوتا رہا اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا، یہ الفاظ وَلَاتَنْكِحُوْا مَانَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ کی آیت میں بھی ذکر ہوئے ہیں، اور وہاں پر بھی یہی معنی ہیں کہ جاہلیت میں جو کچھ تم سے صادر ہوا سو ہوا، اب اسلام لانے کے بعد اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا، اور آئندہ کے لئے اجتناب لازم ہے۔

اسی طرح اگر نزولِ تحریم کے اس وقت میں باپ کی منکوحہ یا دو بہنیں نکاح میں ہوں تو تفریق ضروری ہے، اور دو بہنوں کی صورت میں ایک بہن کو الگ کر دینا لازم ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہ بن نیارؓ کو ایک آدمی کے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا، اس لئے کہ اس شخص نے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا۔ (مشکوٰۃ) [3]

ابنِ فیروز دیلمیؒ کی روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں اسلام لے آیا تو دو بہنیں میرے نکاح میں تھیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک کو طلاق دے کر جدا کر دو، اور ایک کو باقی رکھ لو۔ [4]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حالتِ اسلام میں ابتداءً منكوحة الأب اور جمع بین

---

[1] ترجمہ:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت اور اس کی پھوپھی، اسی طرح کسی عورت اور اس کی خالہ ایک شخص کے نکاح میں جمع نہ کی جائیں۔ صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا تنکح المرأة إلخ ج:۲ ص:۷۶۶، وصحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الجمع بین المرأة إلخ ج:۱ ص:۴۵۲

[2] بدائع الصنائع، کتاب النکاح، باب فصل انواع الجمع إلخ ج:۵ ص:۴۲۷

[3] مشکوٰة، کتاب النکاح، باب المحرمات ج:۲ ص:۲۷۴

[4] بحوالۂ بالا۔

الاُختین جائز نہیں، اسی طرح اگر حالتِ کفر میں نکاح کی یہ صورت واقع ہوئی ہو تو اسلام لانے کے بعد اس کو باقی رکھنا جائز نہ ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٢٣﴾ اسلام سے پہلے جو کچھ انہوں نے حماقت میں کیا، اب اسلام لانے کے بعد اللہ جل شانہٗ ان سے درگزر کرے گا، اور ان کی طرف اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ یعنی شوہروں والی عورتیں بھی حرام کی گئیں، جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، دُوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد شوہر والی نہیں ہوسکتی ہے، اس دور کے بعض جاہل ملحد کہنے لگے ہیں کہ مردوں کو جب ایک سے زائد بیویوں کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ایک سے زائد شوہروں سے متمتع ہونے کی اجازت ملنی چاہئے، یہ مطالبہ اس آیت شریفہ کے بالکل خلاف ہے، ایسی جاہلانہ باتیں کرنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مرد کے لئے کثرتِ اَزواج ایک نعمت ہے، جسے ہر مذہب وملت میں جائز قرار دِیا گیا ہے، جس پر اِنسان کی تاریخ شاہد ہے، لیکن عورت کے لئے ایک وقت میں ایک سے زائد شوہر ہونا، اس عورت کے لئے بھی باعثِ مصیبت ہے، اور جو مرد ایک عورت کے شوہر بن جائیں، ان کے لئے بھی باعثِ ننگ وعار ہے، اور سراسر بے شرمی ہے، نیز اس میں کسی بچے کے ثابت النسب ہونے کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، جب کئی مرد کسی عورت سے اِستمتاع کریں گے تو پیدا ہونے والی اولاد کو ان میں سے کسی ایک کا بیٹا تجویز کرنے کا کوئی طریق باقی نہ رہے گا، اس طرح کا بدترین مطالبہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اِنسانیت کے سراپا دُشمن ہوں، اور جن کی غیرت وحیا کا جنازہ نکل چکا ہو، ایسے لوگ اولاد اور والدین کے حقوق کی لائن سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے پوری اِنسانیت کو محروم کرنے کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں، جب نسب ثابت نہیں ہوگا تو باہمی حقوق وفرائض کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟

خالص طبعی اور عقلی اِعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو ایک عورت کے لئے متعدّد شوہر ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا:-

۱- ازدواج کا بنیادی مقصد تناسل ہے، اس اِعتبار سے متعدّد عورتیں تو ایک مرد سے حاملہ ہوسکتی ہیں، لیکن ایک عورت متعدّد مردوں سے حاملہ نہیں ہوسکتی، وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی، اس لئے متعدّد شوہروں کی صورت میں ایک کے علاوہ باقی شوہروں کی قوت ضائع گئی، شہوت رانی کے سوا ان کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔

۲- تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں صنفِ نازک ہے، وہ سال کے اکثر حصہ میں اِستمتاع کے بھی قابل نہیں رہتی، بعض حالات میں اس کے لئے ایک ہی شوہر کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شوہر ہوں۔

۳- چونکہ مرد جسمانی قوت کے اعتبار سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند ہے، اس لئے اگر کسی مرد کی جنسی قوت معمول سے زیادہ ہو، اور ایک عورت سے اس کی تشفی نہ ہو سکتی ہو تو اسے جائز طریقہ سے دُوسرے اور تیسرے نکاح کا موقع ملنا چاہئے، ورنہ وہ دُوسرے ناجائز طریقے اختیار کرے گا، اور پورے معاشرے کو بگاڑ دے گا، لیکن عورت سے ایسے بگاڑ کا اندیشہ نہیں ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں اس مسئلہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت کے دُوسرے نکاح کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی عورت کا کوئی شوہر طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدّت گزرنے تک بھی کسی دُوسرے شخص سے اس عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یہ جملہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ سے اِستثنا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی بیوی سے کسی دُوسرے شخص کو نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اِلَّا یہ کہ کوئی عورت مملوکہ باندی ہو کر آجائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دارُالحرب کے کافروں سے جہاد کیا، اور وہاں سے کچھ عورتیں قید کر کے لے آئے، ان عورتوں میں جو عورت دارُالاسلام میں لائی گئی اور اس کا شوہر دارُالحرب میں رہ گیا، تو اس عورت کا نکاح دارُالاسلام میں آنے سے اپنے سابق شوہر سے ختم ہو گیا، اب یہ عورت اگر کتابیہ یا مسلمہ ہو تو اس سے دارُالاسلام کا کوئی بھی مسلمان نکاح کر سکتا ہے، اور اگر امیرالمؤمنین اس کو باندی بنا کر کسی فوجی سپاہی کو مالِ غنیمت کی تقسیم میں دیدے تب بھی اس سے اِستمتاع جائز ہے، لیکن یہ نکاح و اِستمتاع ایک حیض آنے کے بعد ہی جائز ہے، اور اگر حمل ہے تو وضعِ حمل ضروری ہے۔

مسئلہ:- اگر کوئی کافر عورت دارُالحرب میں مسلمان ہو جائے اور اس کا شوہر کافر ہے تو تین حیض گزرنے کے بعد وہ اس کے نکاح سے جدا ہو جائے گی۔

مسئلہ:- اور اگر دارُالاسلام میں کوئی کافر عورت مسلمان ہو جائے، اور اس کا شوہر کافر ہو، تو حاکمِ شرع اس کے شوہر پر اِسلام پیش کرے، اگر وہ مسلمان ہونے سے اِنکار کرے تو قاضی ان دونوں میں تفریق کر دے، اور یہ تفریق طلاق شمار ہوگی، اس کے بعد عدّت گزار کر وہ عورت کسی مسلمان سے نکاح کر سکتی ہے۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یعنی جن محرمات کا ذِکر ہوا ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے، قَالَ الْقُرْطُبِيُّ: اَیْ حُرْمَتُ هٰذِهِ النِّسَآءُ كِتَابًا مِّنَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔[1]

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ یعنی جو محرمات اب تک مذکور ہوئیں، ان کے علاوہ دُوسری عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، مثلاً چچا کی لڑکی، خالہ کی لڑکی، ماموں زاد بہن، ماموں، چچا کی بیوی ان کی وفات یا طلاق دینے کے بعد،

---

[1] ترجمہ:- علامہ قرطبیؒ نے فرمایا: یعنی یہ عورتیں تم پر حرام ہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے۔

بشرطیکہ یہ مذکورہ اقسام اور کسی رشتہ سے محرم نہ ہوں، اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی جب وہ طلاق دیدے یا وفات پاجائے، بیوی مرجائے تو اس کی بہن کے ساتھ ـــــ وغیرہ ـــــ بے شمار صورتیں بنتی ہیں، ان سب کو مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے عموم میں داخل فرمادیا۔

مسئلہ:- بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، اس کا تفصیلی بیان سورۂ نساء کے شروع میں گزر چکا ہے، قریب کی آیات میں اس کا ذِکر نہ دیکھ کر کسی کو یہ مغالطہ نہ ہوجائے کہ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کے عموم میں بغیر کسی پابندی کے عورتوں سے نکاح جائز ہے، نیز بہت سی محرمات وہ ہیں جن کا ذِکر اَحادیث شریفہ میں ہے، اور ان کی طرف آیات میں اِشارات بھی ہیں، جن کو ہم تفسیر کے ذیل میں ذِکر کرتے چلے آئے ہیں۔

اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ یعنی محرمات کا یہ بیان تمہارے لئے اس لئے کیا گیا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعے حلال عورتیں تلاش کرو، اور ان کو اپنے نکاح میں لاؤ۔

ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ "اَحکام القرآن" میں لکھتے ہیں کہ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نکاح مہر سے خالی نہیں ہوسکتا (حتیٰ کہ اگر زوجین آپس میں یہ طے کرلیں کہ نکاح بغیر مہر کے ہوگا تب بھی مہر لازم ہوگا، جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے) دُوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ مہر وہ چیز ہونی چاہئے جس کو مال کہا جاسکے۔

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ دس دِرہم سے کم مہر نہیں ہونا چاہئے،[1] ایک دِرہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے۔

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ یعنی اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں طلب کرو اور یہ سمجھ لو کہ عورتوں کی تلاش عفت وعصمت کے لئے جو نکاح کا اہم مقصد ہے، اور نکاح کے ذریعہ اس چیز کو حاصل کرو، مال خرچ کرکے زِنا کے لئے عورتیں تلاش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زِناکار بھی مال خرچ کرتے ہیں، لیکن وہ مال خرچ کرنا بھی حرام ہے، اور اس مال کے ذریعہ جو عورت حاصل کی جائے اس سے اِستمتاع حلال نہیں ہوتا۔

لفظ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ بڑھا کر زِنا کی ممانعت فرماتے ہوئے اس طرف بھی اِشارہ فرمایا کہ زِنا میں صرف شہوت رانی، سفحِ ماء، پانی بہانا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طلب الولد اور اِبقاء النسل کا اِرادہ نہیں ہوتا، مسلمانوں کو پاک دامن رہنے اور تکثیرِ نسلِ انسانی کے لئے اپنی قوّت کو برمحل خرچ کرنا چاہئے، جس کا طریقہ ملکِ نکاح اور ملکِ یمین ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے اِستمتاع کرلو تو ان کے مہر دے دو، یہ دینا تمہارے اُوپر فرض کیا گیا ہے۔

[1] احکام القرآن للجصاص، سورة النساء، باب الاختلاف فی مقدار المهر ج:۲ ص:۲۶۳

اس آیت میں اِستمتاع سے بیویوں سے ہم بستر ہونا اور وطی کرنا مراد ہے، اگر محض نکاح ہوجائے اور رُخصتی نہ ہو اور شوہر کو اِستمتاع کا موقع نہ ملے، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی طلاق دیدے تو آدھا مہر واجب ہوتا ہے، اور اگر اِستمتاع کا موقع مل جائے تو پورا مہر واجب ہوجاتا ہے، اس آیت میں خصوصی توجہ دِلائی ہے کہ جب کسی عورت سے اِستمتاع کرلیا تو اس کا مہر دینا ہر طرح سے واجب ہوگیا، اس میں کوتاہی کرنا شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے، اور اِنسانی غیرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جب نکاح کا مقصد حاصل ہوگیا تو بیوی کے حق میں کوتاہی اور ٹال مٹول نہ ہو۔ البتہ شریعت عورت کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ مہر اگر معجّل ہے تو مہر کی وصولی تک وہ شوہر کے پاس جانے سے اِنکار کرسکتی ہے۔

حرمتِ متعہ

لفظ ''اِستمتاع'' کا مادّہ ''م، ت، ع'' ہے، جس کے معنی کسی فائدہ کے حاصل ہونے کے ہیں، کسی شخص سے یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا تو اس کو ''اِستمتاع'' کہتے ہیں۔ عربی قواعد کی رُو سے کسی کلمہ کے مادّہ میں ''س'' اور ''ت'' کا اِضافہ کردینے سے طلب و حصول کے معنی پیدا ہوجاتے ہیں، اس لغوی تحقیق کی بنیاد پر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کا سیدھا مطلب پوری اُمت کے نزدیک خلفاً عن سلف وہی ہے جو ہم نے ابھی اُوپر بیان کیا ہے، لیکن ایک فرقے کا کہنا ہے کہ اس سے اِصطلاحی متعہ مراد ہے، اور ان لوگوں کے نزدیک یہ آیت متعہ حلال ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ متعہ جس کو کہتے ہیں اس کی صاف تردید قرآنِ کریم کی آیتِ بالا میں لفظ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ سے ہورہی ہے، جس کی تشریح آگے آرہی ہے۔

متعہ اِصطلاحی جس کے جواز کا ایک فرقہ مدعی ہے یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کے لئے اتنے پیسے یا فلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں، متعہ اِصطلاحی کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، محض مادّۂ اشتقاق کو دیکھ کر یہ فرقہ مدعی ہے کہ آیت سے حلتِ متعہ کا ثبوت ہورہا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب دُوسرے معنی بھی کم از کم محتمل ہے (گو ہمارے نزدیک متعین ہے) تو ثبوت کا کیا راستہ ہے؟

دُوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے محرمات کا ذِکر فرماکر یوں فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ اپنے اُصول کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اس حال میں کہ پانی بہانے والے نہ ہوں، یعنی محض شہوت رانی مقصود نہ ہو، اور ساتھ ہی ساتھ مُّحْصِنِيْنَ کی قید لگائی ہے، یعنی یہ کہ عفت کا دھیان رکھنے والے ہوں۔ متعہ چونکہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں نہ حصولِ اولاد مقصود ہوتا ہے، نہ گھر بار بسانا، اور نہ عفت و عصمت، اور اسی لئے جس عورت سے متعہ کیا جائے اس کو فریقِ مخالف زوجۂ وارثہ بھی قرار نہیں دیتا، اور اس کو اَزواجِ معروفہ کی گنتی میں بھی شمار نہیں کرتا۔ اور چونکہ مقصد محض

قضائے شہوت ہے، اس لئے مرد وعورت عارضی طور پر نئے نئے جوڑے تلاش کرتے رہتے ہیں، جب یہ صورت ہے تو متعہ عفت و عصمت کا ضامن نہیں بلکہ دُشمن ہے۔

صاحبِ ہدایہ نے حضرت امام مالکؒ کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک متعہ جائز ہے، لیکن یہ نسبت بالکل غلط ہے، جیسا کہ شراحِ ہدایہ اور دیگر اکابر نے تصریح کی ہے کہ صاحبِ ہدایہ سے تسامح ہوا ہے۔[1]

البتہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اخیر تک حلتِ متعہ کے قائل تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، امام ترمذیؒ نے "باب ما جاء فی نکاح المتعة"[2] کا باب قائم کر کے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث یہ ہے:-

عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَآءِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ زَمَنَ خَيْبَرَ۔

''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔[3]

دُوسری حدیث جو امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ حَتّٰى اِذَا نَزَلَتِ الْاٰيَةُ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ۔[4]

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں: متعہ اسلام کے عہدِ اوّل میں مشروع تھا، یہاں تک کہ آیتِ کریمہ: اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ نازل ہوئی تو وہ منسوخ ہوگیا، اس کے بعد حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ: زوجۂ شرعیہ اور مملوکۂ شرعیہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے اِستمتاع حرام ہے۔''

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کچھ عرصہ تک متعہ کو جائز سمجھتے تھے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے (جیسا کہ صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۵۲ پر ہے) اور آیتِ شریفہ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ

---

[1] فتح القدیر، کتاب النکاح، فصل فی بیان المحرمات ج:۲ ص:۴۳۷

[2] جامع الترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی نکاح المتعة ج:۱ ص:۲۱۳

[3] صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۵۲

[4] جامع الترمذی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی نکاح المتعة ج:۱ ص:۲۱۳

اَیۡمَانُهُمۡ (المؤمنون:٦) سے متنبہ ہو کر رُجوع فرمالیا، جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو فرقہ حلتِ متعہ کا قائل ہے باوجودیکہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محبّ اور فرمانبردار ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس مسئلہ میں وہ ان کا بھی مخالف ہے، وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۲۲۷﴾ (الشعراء)

صاحبِ رُوح المعانی، قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر سے پہلے متعہ حلال تھا، پھر غزوۂ خیبر میں حرام کردیا گیا، اس کے بعد فتحِ مکہ کے دِن حلال کردیا گیا لیکن پھر تین دن کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام کردیا گیا۔[1]

نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ فرمانِ باری تعالیٰ شانہٗ: وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۶﴾ (المؤمنون) یہ ایسا واضح ارشاد ہے جس میں کسی تأویل کی گنجائش نہیں، اس سے حرمتِ متعہ صاف ظاہر ہے، اس کے مقابلہ میں بعض شاذ قراءتوں کا سہارا لینا قطعاً غلط ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اِسۡتَمۡتَعۡتُمۡ سے متعہ اصطلاحی مراد ہونے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، محض ایک احتمال ہے، یہ احتمال اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ کے قطعی الدلالۃ مضمون کے ہرگز معارض نہیں ہوسکتا، اور بالفرض اگر دونوں دلیلیں قوّت میں برابر ہوں تو کہا جائے گا کہ دونوں دلیلیں حلت وحرمت میں متعارض ہیں، بالفرض اگر تعارض مان لیا جائے تب بھی عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ محرم کو مبیح پر ترجیح ہونی چاہئے۔

مسئلہ: - نکاحِ متعہ کی طرح نکاحِ مؤقت بھی حرام اور باطل ہے، نکاحِ مؤقت یہ ہے کہ ایک مقرّرہ مدّت کے لئے نکاح کیا جائے۔ اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ متعہ میں لفظ متعہ بولا جاتا ہے، اور نکاحِ مؤقت لفظِ نکاح سے ہوتا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَةِ آیت کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ باہمی مہر مقرّر کرنے کے بعد مہرِ مقرّرہ کوئی حتمی چیز نہیں ہوجاتی کہ اس میں کمی بیشی دُرست نہ ہو، بلکہ شوہر مقرّرہ مہر پر اپنی طرف سے اِضافہ بھی کرسکتا ہے، اور بیوی اگر چاہے تو اپنی خوش دِلی سے تھوڑا یا پورا مہر معاف کرسکتی ہے، الفاظ کے عموم سے معلوم ہوا کہ عورت اگر مہرِ معجّل طے کرکے تأجیل کرلے، یعنی بعد میں لینے کو منظور کرلے تو یہ بھی دُرست ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۲۴﴾ آیت کے ختم پر یہ جملہ بڑھا کر ایک تو یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے، اَحکامِ مذکورہ کی اگر کوئی شخص خلاف ورزی کرے تو اگرچہ اس کی خبر قاضی، حاکم اور کسی اِنسان کو نہ ہو، لیکن اللہ جل شانہٗ کو تو سب خبر ہے، اس سے ہر حال میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

اور یہ بھی بتلایا کہ جو اَحکام اِرشاد فرمائے ہیں یہ سب کچھ حکمت پر مبنی ہیں، ''حکمت'' اس دقیق بات کو کہتے ہیں جو

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۶،۵

ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتی، حرمت وحلت کے احکام جو آیات میں مذکور ہیں ان کی علت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ان کو ہر حال میں ماننا لازم ہے، کیونکہ اگر ہمیں علت معلوم نہیں تو صاحبِ حکم باری تعالیٰ شانہ کو تو معلوم ہے جو علیم اور حکیم ہے۔

اس دور کے بہت سے پڑھے لکھے جاہل احکامِ خداوندیہ کی علّتیں تلاش کرتے ہیں، اگر کوئی علت معلوم نہیں ہوتی تو معاذ اللہ حکمِ ربیّ کو نامناسب یا دورِ حاضر کے تقاضوں کے خلاف کہہ کر ٹال دیتے ہیں، ان الفاظ میں ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا گیا ہے، اور بتلا دیا گیا ہے کہ تم نادان ہو، اللہ جل شانہ دانا ہے، تم ناسمجھ ہو اللہ حکیم ہے، اپنی سمجھ کو معیارِ حقانیت نہ بناؤ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ

اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ نکاح میں لائے بیبیاں مسلمان

فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

تو نکاح کرلے ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں جو کہ تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان، اور اللہ کو خوب معلوم ہے

بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ

تمہاری مسلمانی، تم آپس میں ایک ہو، سو ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دو

اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ

ان کے مہر موافق دستور کے قید میں آنے والیاں ہوں نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں،

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ

پھر جب وہ قیدِ نکاح میں آچکیں تو اگر کریں بے حیائی کا کام تو ان پر آدھی سزا ہے بیبیوں کی

مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ

سزا سے، یہ اس کے واسطے ہے جو کوئی تم میں ڈرے تکلیف میں پڑنے سے، اور صبر کرو تو بہتر ہے

لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

تمہارے حق میں، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تم میں سے جو لوگ اس بات کی طاقت نہ رکھتے ہوں کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکیں، تو وہ ان مسلمان کنیزوں میں سے کسی سے نکاح کر سکتے ہیں جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اور اللہ کو تمہارے اِیمان کی پوری حالت خوب معلوم ہے۔ تم سب آپس میں ایک جیسے ہو۔ لہٰذا ان کنیزوں سے ان کے مالکوں کی اِجازت سے نکاح کر لو، اور ان کو قاعدے کے مطابق ان کے مہر اَدا کرو، بشرطیکہ ان سے نکاح کا رِشتہ قائم کر کے انہیں پاک دامن بنایا جائے، نہ وہ صرف شہوَت پوری کرنے کے لئے کوئی (ناجائز) کام کریں، اور نہ خفیہ طور پر ناجائز آشنائیاں پیدا کریں۔ پھر جب وہ نکاح کی حفاظت میں آجائیں، اور اس کے بعد کسی بڑی بے حیائی (یعنی زِنا) کا اِرتکاب کریں تو ان پر اس سزا سے آدھی سزا واجب ہوگی جو (غیر شادی شدہ) آزاد عورتوں کے لئے مقرّر ہے۔ یہ سب (یعنی کنیزوں سے نکاح کرنا) تم میں سے ان لوگوں کے لئے ہے جن کو (نکاح نہ کرنے کی صورت میں) گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر تم صبر ہی کئے رہو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۲۵﴾

ربطِ آیات

اُوپر سے چونکہ نکاح کے اَحکام چلے آرہے ہیں، اس لئے اسی کے ذیل میں اب شرعی لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کا ذِکر شروع ہوا، اور پھر انہی کے متعلق حد کا حکم بھی بیان کر دیا گیا کہ باندی اور غلام کی حد آزاد عورت و مرد سے مختلف ہوتی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص تم میں پوری مقدرت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس (والوں) کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی (شرعاً) مملوکہ ہیں نکاح کر لے (کیونکہ اکثر لونڈیوں کا مہر وغیرہ کم ہوتا ہے اور ان کو غریب کے ساتھ بیاہ دینے میں عار بھی نہیں کرتے) اور (لونڈی سے نکاح کرنے میں عار نہ کرے، کیونکہ دِین کی رُو سے تو ممکن ہے کہ وہ تم سے بھی افضل ہو، وجہ یہ کہ مدارِ اَفضلیت دِین کا اِیمان ہے اور) تمہارے اِیمان کی پوری

حالت اللہ ہی کو معلوم ہے (کہ اس میں کون اعلیٰ ہے کون ادنیٰ ہے، کیونکہ وہ متعلق قلب کے ہے، جس کی پوری اطلاع اللہ ہی کو ہے، اور دُنیا کی رُو سے زیادہ وجہ عار کی تفاوتِ نسب ہے، اس میں جو انساب کا اصل مبدأ ہے یعنی حضرت آدم و حوّا علیہما السلام اس میں مشارکت کے اِعتبار سے) تم سب آپس میں ایک دُوسرے کے برابر ہو (پھر عار کی کیا وجہ) سو (جب عدمِ عار کی وجہ معلوم ہوگئی تو ضرورتِ مذکورہ کے وقت) ان سے نکاح کرلیا کرو (مگر شرط یہ بھی ہے کہ) ان کے مالکوں کی اجازت سے (ہو) اور ان (کے ان مالکوں) کو ان کے مہر قاعدہ (شرعیہ) کے موافق دے دیا کرو (اور یہ مہر دینا) اس طور پر (ہو) کہ وہ منکوحہ بنائی جاویں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں (یعنی وہ مہر بمقابلہ نکاح ہو بطور اُجرتِ زِنا کے دینے سے وہ حلال نہ ہوگی) پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنالی جاویں، پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (یعنی زِنا) کریں تو (بعد ثبوت بشرطیکہ مسلمان ہوں) ان پر اس سزا سے نصف سزا (جاری) ہوگی جو کہ (غیر منکوحہ) آزاد عورتوں پر ہوتی ہے (جیسا کہ نکاح کے قبل بھی لونڈیوں کی یہی سزا تھی، اور اسی طرح غلاموں کی بھی) یہ (لونڈیوں سے نکاح کرنا) اس شخص کے لئے (مناسب) ہے جو تم میں (بوجہ غلبۂ شہوت اور آزاد منکوحہ میسر نہ ہونے کے) زِنا (میں مبتلا ہوجانے) کا اندیشہ رکھتا ہو، (اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے مناسب نہیں) اور (اگر اس اندیشہ کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قادر ہو تو) تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (بہ نسبت نکاح کنیز کے) اور (یوں) اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں (اگر صورتِ کراہت میں بھی نکاح کرلیا، ہم مؤاخذہ نہیں کریں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (کہ حرمت کا حکم نہیں فرمایا)۔

معارف و مسائل

"طَوْلٌ" قدرت اور غنا کو کہتے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس کو آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو، یا اس کا سامان میسر نہ ہو، تو مؤمن باندیوں سے نکاح کرسکتا ہے، اس سے پتہ چلا کہ جہاں تک ممکن ہو آزاد عورت ہی سے نکاح کرنا چاہئے، باندی سے نکاح نہ کرے، اور اگر باندی سے نکاح کرنا ہی پڑ جائے تو مؤمن باندی تلاش کرے۔

حضرت اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے کہ آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرلینا یا کتابیہ باندی سے نکاح کرلینا مکروہ ہے۔

اور حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور کتابیہ باندی سے نکاح کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ [1]

---

[1] بدائع الصنائع، کتاب النکاح، فصل ومنها بأن لا تكون معتدة الغير ج:۲ ص:۲۶۸

بہر حال باندی کے نکاح سے بچنا آزاد مرد کے لئے ہر حال میں بہتر ہے، اور اگر مجبوراً کرنا ہو تو مؤمن باندی سے نکاح کریں، وجہ اس کی یہ ہے کہ باندی سے جو اولاد پیدا ہو وہ اس شخص کی غلام ہوتی ہے جو باندی کا مالک ہے، اور غیر مؤمن باندی سے جو اولاد ہوگی اندیشہ ہے کہ وہ ماں کے ڈھنگ پر غیر دِین اختیار کریں، اولاد کو غلامی سے بچانے اور مؤمن بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کی ماں آزاد ہو، اور اگر باندی ہو تو کم از کم مؤمنہ ضرور ہو، تا کہ بچے کا اِیمان محفوظ رہے۔ اسی لئے علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ کتابی عورت جو آزاد ہو اس سے اگرچہ نکاح کرنا دُرست ہے، لیکن بچنا بہتر ہے، اور اس دور میں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کی عورتیں عموماً مسلمانوں سے اس لئے نکاح کرتی ہیں کہ خود شوہر کو اور شوہر کی اولاد کو اپنے دِین پر لاسکیں۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے اِیمان کا خوب علم ہے۔ اِیمان وجہِ فضیلت ہے، بعض مرتبہ غلام اور باندی اِیمانی مرتبے میں آزاد مرد و عورت سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے مؤمن باندی سے نکاح کرنے کو قابلِ نفرت نہ جانیں، بلکہ اس کے اِیمان کی قدر کریں۔

آخر میں فرمایا: بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ یعنی آزاد اور غلام سب ایک ہی جنس بنی آدم سے تعلق رکھتے ہیں، اور سب ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں، فضیلت کا مدار اِیمان اور تقویٰ پر ہے، قَالَ فِي الْمَظْهَرِيْ: فَهَاتَانِ الْجُمْلَتَانِ لِتَأْنِيْسِ النَّاسِ بِنِكَاحِ الْإِمَاءِ وَمَنْعِهِمْ عَنِ الْاِسْتِنْكَافِ مِنْهُنَّ، [1] یعنی ''ان دونوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باندیوں کے نکاح سے مانوس ہوں اور اس نکاح کو قابلِ نفرت نہ سمجھیں۔''

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی باندیوں سے نکاح ان کے مالکوں کی اِجازت سے کرو، اگر وہ اِجازت نہ دیں تو باندیوں کا نکاح صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ باندی کو خود اپنے نفس پر ولایت حاصل نہیں ہوتی، یہی حکم غلام کا بھی ہے کہ وہ اپنے آقا کی اِجازت کے بغیر نکاح نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا کہ باندیوں سے نکاح کرو تو ان کے مہر خوبی کے ساتھ ادا کردو، یعنی ٹال مٹول نہ کرو اور پورا ادا کردو، باندی سمجھ کر اس بارے میں تکلیف نہ دو۔

اس سلسلہ میں اِمام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مہر باندی کا حق ہے، اور دُوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ باندی کے مہر میں جو مال ملے اس کا مالک بھی باندی کا آقا ہے۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ یعنی مؤمن باندیوں سے نکاح کرو اس حال میں کہ وہ پاک دامن ہوں، نہ وہ مسافحات ہوں (یعنی علانیہ زِنا کرنے والی) اور نہ خفیہ طریقہ پر آشنا رکھنے والی ہو، گو اس جگہ پر باندیوں کے

---

[1] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۸۱

بارے میں فرمایا ہے کہ نکاح کے لئے پاک دامن باندیوں کو تلاش کرو، لیکن آزاد عورت جوزانیہ ہو اس سے نکاح سے بچنا بھی افضل اور بہتر ہے۔

جیسا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرّہ کے ساتھ نکاح کی قدرت نہ ہو تو باندی کے ساتھ نکاح کرو، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ متعہ جائز نہیں، اس لئے کہ اگر متعہ جائز ہوتا تو حرّہ کے ساتھ نکاح کے عدم اِستطاعت کی صورت میں کسی شخص کے لئے آسان ترین صورت متعہ کرنے کی تھی کہ اس میں جنسی خواہش بھی پوری ہو جاتی، اور مالی بوجھ بھی نکاح کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا۔

نیز آیت میں مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ کے ساتھ باندیوں کی صفت بیان کی گئی ہے، اور متعہ کی صورت میں سفاح ہی سفاح ہوتا ہے، کہ ایک عورت قلیل مدّت میں متعدّد اشخاص کے اِستعمال میں آتی ہے، اور چونکہ بچہ کسی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، اس لئے تناسل کا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور سب کی قوّت صرف شہوت رانی میں ضائع چلی جاتی ہے۔

پھر فرمایا: فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ یعنی جب باندیاں نکاح میں آگئیں، اور ان کے پاک دامن رہنے کا اِنتظام ہو گیا تو اب اگر زِنا کر بیٹھیں تو ان کو اس سزا سے آدھی سزا ملے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرّر ہے، اس سے غیر شادی آزاد عورتیں مراد ہیں، غیر شادی شدہ آزاد مرد و عورت سے اگر زِنا کا صدور ہو جائے تو اس کو سو کوڑے لگائے جائیں گے، جس کا ذِکر سورۂ نور کی دُوسری آیت میں ہے، اور جو کوئی شادی شدہ مرد و عورت زِنا کرلے تو اس کی سزا رجم ہے، یعنی پتھروں سے مار مار کر قتل کر دیا جائے گا، چونکہ اس میں تنصیف نہیں ہوسکتی، اس لئے چاروں اِماموں کا مذہب یہی ہے کہ غلام یا باندی خواہ شادی شدہ ہوں خواہ کنورے ہوں اگر ان سے زِنا سرزد ہو جائے تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہیں۔ باندیوں کا حکم تو آیتِ شریفہ میں مذکور ہے، اور بطور دلالۃ النص غلام کا مسئلہ بھی اسی سے سمجھ میں آرہا ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ یعنی باندیوں سے نکاح کرنے کی اِجازت اس شخص کے لئے ہے جس کو زِنا میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ یعنی باوجود اندیشۂ زِنا کے بھی اگر صبر کرلو اور اپنے نفسوں کو پاک دامن رکھ سکو تو یہ تمہارے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ باندیوں سے نکاح کرو۔

آیت کے ختم پر فرمایا: وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾ یعنی باندیوں سے نکاح کرنا مکروہ ہے، اگر اس کراہت پر عمل کرلو گے تب بھی اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے، اور وہ رحم والا بھی ہے، کیونکہ اس نے باندیوں سے نکاح کی اِجازت دے دی، اور اس کو ممنوع قرار نہیں دیا۔

فائدہ:- آیتِ بالا کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذِکر آیا ہے، ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں، جو کافر مرد وعورت جہاد کے موقع پر قید کر لئے جاتے تھے اور اَمیر المؤمنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ قیدی غلام باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی (باستثناء بعض صورتوں کے) جن کا تفصیلی ذِکر فقہ کی کتابوں میں ہے۔ جب سے مسلمانوں نے شرعی طور پر جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے اور اپنے جہاد اور صلح و جنگ کا مدار دُشمنانِ دِین کے اِشاروں پر رکھ دیا ہے، اور غیر شرعی اُصولوں کے پابند ہوگئے ہیں، اُس وقت سے غلام اور باندی سے بھی محروم ہوگئے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ آزاد ہیں۔

بعض علاقوں میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے، اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ

اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے واسطے اور چلائے تم کو پہلوں کی راہ اور معاف کرے

عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ

تم کو اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر متوجہ ہووے، اور چاہتے ہیں

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ

وہ لوگ جو لگے ہوئے ہیں اپنے مزوں کے پیچھے کہ تم پھر جاؤ راہ سے بہت دُور۔ اللہ چاہتا ہے کہ

يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝

تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان بنا ہے کمزور۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے (اَحکام کی) وضاحت کر دے، اور جو (نیک) لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں، تم کو ان کے طور طریقوں پر لے آئے، اور تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائے، اور اللہ ہر بات کا جاننے والا بھی ہے، حکمت

والا بھی (۲۶) اللہ تو چاہتا ہے کہ تمہاری طرف توجہ کرے، اور جو لوگ نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر بہت دُور جا پڑو (۲۷) اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے، اور اِنسان کمزور پیدا ہوا ہے۔ (۲۸)

ربطِ آیات

ماقبل کی آیتوں میں اَحکام کی تفصیل مذکور ہوئی، اِن آیتوں میں اللہ جل شانہٗ اپنا اِنعام واِحسان بتلاتے ہیں، اور یہ کہ ان اَحکام کی مشروعیت میں تمہارے ہی منافع ومصالح کی رعایت رکھی گئی ہے، اگرچہ تم اس کی تفصیل کو نہ سمجھو، پھر اس کے ساتھ ہی ان اَحکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے، اور گمراہوں کے ناپاک اِرادوں پر بھی متنبہ کیا گیا کہ یہ لوگ تمہارے بدخواہ ہیں، جو تمہیں مستقیم راستہ سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ کو (ان مضامینِ مذکورہ کے اِرشاد فرمانے سے اسی طرح دُوسرے مضامین سے اپنا کوئی نفع مقصود نہیں کہ یہ محالِ عقلی ہے، بلکہ تم کو نفع پہنچانے کے لئے) یہ منظور ہے کہ (آیاتِ اَحکام میں تو) تم سے (تمہاری مصلحت کے اَحکام) بیان کردے اور (آیاتِ قصص میں) تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتلادے (تاکہ تم کو اتباع کی رغبت اور مخالفت سے خوف ہو) اور (خلاصۂ مشترک مقصود یہ ہے کہ) تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرماوے (اور وہ توجہ یہی بیان فرمانا اور بتلانا ہے جس میں سرتاسر بندوں ہی کا نفع ہے جیسا مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (کہ بندوں کی مصلحت جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (کہ بلا وجوب ان مصلحتوں کی رعایت فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو تو (بیانِ اَحکام وقصص سے جیسا ابھی مذکور ہوا) تمہارے حال پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمانا منظور ہے، اور جو لوگ (کفار وفجار میں سے) شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم (راہِ راست سے) بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ (اور انہی جیسے ہو جاؤ، چنانچہ وہ اپنے فاسد خیالات مسلمانوں کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کو اَحکام میں جس طرح تمہاری مصلحت پر نظر ہے اسی طرح تمہاری آسانی پر بھی نظر ہے، جیسا اِرشاد ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو (اَحکام میں) تمہارے ساتھ تخفیف (یعنی آسانی بھی) منظور ہے اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) آدمی (بہ نسبت اور مکلّفین کے بدن اور ہمت دونوں میں) کمزور پیدا کیا گیا ہے (اس لئے اس کے ضعف کے مناسب اَحکام مقرّر فرمائے ہیں، ورنہ باعتبار رعایت مصلحت کے اعمالِ شاقہ کا تجویز کیا جانا بھی مضائقہ نہ تھا، مگر ہم نے دونوں امر کا مجموعاً لحاظ فرمایا اور یہ بڑے علم وحکمت اور نیز رحمت وشفقت پر موقوف ہے)۔

معارف و مسائل

نکاح کے بہت سے اَحکام بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں یہ بتایا کہ اللہ پاک واضح طور پر خوب کھول کر تمہیں اَحکام بتاتے ہیں، اور انبیائے کرام علیہم السلام اور صالحینِ عظامؒ جو پہلے گزرے ہیں ان کے طریق کی رہبری فرماتے ہیں، تم یہ نہ سمجھو کہ یہ حرام وحلال کی تفصیلات صرف ہمارے ہی لئے ہے، بلکہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں ان کو بھی اس طرح کے اَحکام بتائے گئے تھے، جنہوں نے عمل کیا، اور مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہوئے۔

جو لوگ متبعِ شہوات ہیں یعنی زِناکار اور وہ قومیں اور اَصحاب مذاہبِ باطلہ جن کے نزدیک حرام حلال کوئی چیز نہیں، وہ تم کو بھی راہِ حق سے ہٹا کر اپنے باطل اِرادوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، تم ان سے ہوشیار رہنا۔ بعض مذہبوں میں اپنی محرم عورتوں سے بھی نکاح کرلینا دُرست ہے، اور بہت سے ملحدین اس دور میں نکاح کو ختم کرنے ہی کے حق میں ہیں، اور بعض ممالک میں عورت کو متاعِ مشترک قرار دیئے جانے کی باتیں ہورہی ہیں، یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو سراپا نفس کے بندے اور خواہش کے غلام ہیں، اسلام کا کلمہ پڑھنے والے بعض ضعیف الایمان لوگ جو اِن ملحدوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں ان کی باتوں میں آکر اپنے دِین کو فرسودہ خیال کرنے لگتے ہیں، اور دُشمنوں کی باتوں کو اِنسانیت کی ترقی سمجھتے ہیں، اور نادانستہ طور پر اس خام خیالی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ ماڈرن نظریات کے حامی ہیں، کاش! ہمارا دِین بھی اس کی اِجازت دیتا۔ العیاذ باللہ۔ اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی ہے کہ تم لوگ ایسے بدطینت اِنسانوں کے نظریات کو اَپنانے سے دُور رہنا۔

پھر فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ یعنی اللہ پاک تم پر خفیف اور ہلکے اَحکام کا اِرادہ فرماتے ہیں، تمہاری دِقتیں دُور کرنے کے لئے نکاح کے بارے میں ایسے نرم اَحکام دیئے جن پر سب عمل پیرا ہوسکتے ہیں، اور اگر آزاد عورتوں سے نکاح کی طاقت نہ ہو تو باندیوں سے نکاح کی اِجازت دے دی ہے، مہر کے بارے میں طرفین کو باہمی رضامندی سے طے کرنے کا اِختیار دیا اور ضرورت کے وقت ایک سے زائد عورت سے بھی نکاح کی اِجازت دی گئی، بشرطیکہ عدل ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

پھر فرمایا: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ یعنی اِنسان خلقی طور پر ضعیف ہے، اور اس کے اندر شہوانی مادّہ رکھا گیا ہے، اگر بالکل ہی عورتوں سے دُور رہنے کا حکم دیا جاتا تو اِطاعت اور فرمانبرداری کرنے سے عاجز رہ جاتا، اس کے عجز وضعف کے پیشِ نظر عورتوں سے نکاح کرنے کی اِجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب دی، اور نکاح کے بعد آپس میں جو ایک دُوسرے کو نفس اور نظر کی پاکیزگی کا نفع اور دُوسرے فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے طرفین کو تقویت پہنچتی ہے، پس نکاح ضعف کے دُور کرنے کا باہمی معاہدہ اور ایک بے مثال طریقہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ

اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دُوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ

تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

تجارت ہو آپس کی خوشی سے، اور نہ خون کرو آپس میں، بے شک اللہ

كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ

تم پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی یہ کام کرے تعدی سے اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے

نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

آگ میں اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اِیمان والو! آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، اِلَّا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)، اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے ۝۲۹ اور جو شخص زیادتی اور ظلم کے طور پر ایسا کرے گا، تو ہم اس کو آگ میں داخل کریں گے۔ اور یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے ۝۳۰

ربطِ آیات

شروع سورۂ نساء میں تمام اِنسانوں کا ایک ماں باپ سے پیدا ہونا اور سب کا ایک رشتۂ اُخوّت میں جکڑے رہنا بیان فرما کر عام اِنسانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ادائیگی کی طرف اجمالی اِشارہ فرمایا، پھر یتیموں اور عورتوں کا تفصیلی بیان آیا، پھر میراث کے اَحکام کا بیان ہوا، جس میں یتیموں، عورتوں کے علاوہ دُوسرے رِشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تاکید آئی، اس کے بعد نکاح کے اَحکام آئے کہ کس عورت سے نکاح حلال ہے کس سے حرام، کیونکہ نکاح ایک ایسا معاملہ اور معاہدہ ہے جس سے عورت کی جان اور مال میں تصرف کرنے کا کسی کو حق ملتا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں عام اِنسانوں کے جان و مال کی حفاظت اور ان میں ہر ناجائز تصرف کرنے کی ممانعت کا بیان ہے، خواہ وہ اِنسان مرد ہوں یا عورتیں اور عزیز رشتہ دار ہوں یا غیر، یہاں تک کہ مسلم ہوں یا وہ غیر مسلم جن سے ترکِ جنگ کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔ (کما صرح بہ المظہری)[1]

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (مباح طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرائطِ شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں (یہ تو مالی تصرف تھا، آگے تصرف نفسی کو فرماتے ہیں) اور تم ایک دُوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں (اس لئے ضرر رسانی کی صورتوں کو منع فرمادیا، بالخصوص جبکہ اس میں یہ اثر ہو کہ دُوسرا شخص پھر تم کو ضرر پہنچاوے گا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تم کو بھی ضرر سے بچالیا) اور (چونکہ قتل ان دونوں امروں میں اشد ہے اس لئے اس پر بالخصوص وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص ایسا فعل (یعنی قتل) کرے گا اس طور پر کہ حد (شرع) سے گزر جائے اور (وہ گزرنا بھی خطاءِ فعل یا خطاءِ رائے سے نہ ہو بلکہ) اس طور پر کہ (قصداً) ظلم کرے تو ہم عنقریب (یعنی بعد الموت) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے اور یہ امر (یعنی ایسی سزا دینا) خدا تعالیٰ کو (بالکل) آسان ہے (کچھ اِہتمام کی حاجت نہیں جس میں اس اِحتمال کی گنجائش ہو کہ شاید کسی وقت اِہتمام و سامان جمع نہ ہو تو سزا ٹل جائے گی)۔

معارف و مسائل

جس طرح باطل طریقہ سے غیر کا مال کھانا جائز نہیں، خود اپنا مال بھی باطل طریق سے خرچ کرنا جائز نہیں

آیت کے الفاظ میں اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں: ''اپنے مال آپس میں'' اس میں یہ بات تو باتفاقِ مفسرین داخل ہے ہی کہ کوئی شخص دُوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھائے، ابوحیانؒ نے تفسیر ''بحرِ محیط'' میں فرمایا کہ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی اپنا ہی مال ناجائز طور پر کھائے، مثلاً ایسے کاموں میں خرچ کرے جو شرعاً

---

[1] تفسیر المظہری تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۸۷

گناہ یا اِسراف بے جا ہیں، وہ بھی آیت کی رُو سے ممنوع و ناجائز ہے۔[1]

آیت میں لَا تَأْكُلُوْٓا کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں: ''مت کھاؤ'' مگر عام محاورہ کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں کہ دُوسرے کے مال میں ناحق طور پر کسی قسم کا تصرف نہ کرو، خواہ کھانے پینے کا ہو، یا اسے اِستعمال کرنے کا، عرفِ عام میں کسی کے مال میں تصرف کرنے کو اس کا کھانا ہی بولا جاتا ہے، اگرچہ وہ چیز کھانے کی نہ ہو۔ لفظ ''باطل'' جس کا ترجمہ ''ناحق'' سے کیا گیا ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہؓ کے نزدیک تمام ان صورتوں پر حاوی ہے جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں، جس میں چوری، ڈاکا، غصب، خیانت، رِشوت، سود و قمار اور تمام معاملاتِ فاسدہ داخل ہیں۔ (بحرِ محیط)[2]

باطل طریقہ سے کوئی مال کھانے کی تشریح و تفصیل

قرآنِ کریم نے ایک لفظ بِالْبَاطِلِ فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کئے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا، پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمائی، آپ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید و فروخت یا ناجائز اِجارہ وغیرہ کی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں، وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہے، اس لئے وہ سب اَحکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے اَحکام ہیں، احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنے اَحکامِ شرعیہ مذکور ہوئے ہیں، سب کا عام طور پر یہی حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی قرآنی اِشارہ کی تشریح ہوتی ہے، خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے۔

آیت کے پہلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، دُوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کے لئے اِرشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ یعنی دُوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔

جائز طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث، لیکن عام طور پر ایک شخص کا مال دُوسرے کے تصرف میں آنے کی معروف و جاری صورت تجارت ہی ہے۔

پھر تجارت کے معنی عام طور پر صرف بیع و شراء کے لئے جاتے ہیں، مگر تفسیرِ مظہری میں اِجارہ یعنی ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل قرار دیا گیا ہے، کیونکہ بیع میں تو مال کے بدلے میں مال حاصل کیا جاتا ہے، اور اِجارہ میں محنت و خدمت کے بدلے میں مال حاصل ہوتا ہے، لفظِ ''تجارت'' ان دونوں کو حاوی ہے۔

---

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۰۸

[2] تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۰۷

مضمونِ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے، لیکن اگر رضامندی کے ساتھ یعنی بیع وشراء یا ملازمت ومزدوری کا معاملہ ہو جائے تو اس طرح دُوسرے کا مال حاصل کرنا اور اس میں مالکانہ تصرفات کرنا جائز ہے۔

کسبِ معاش کے ذرائع میں تجارت اور محنت سب سے افضل ہے

دُوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کے ذِکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسبِ معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اَطیب ذریعۂ معاش ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال وطیب ہے؟ آپ نے اِرشاد فرمایا:-

[۱] عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ، رواه احمد والحاكم۔ (مظہری وترغیب وترہیب)

''یعنی اِنسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی بیع وشراء (جس میں جھوٹ فریب نہ ہو)۔''

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

[۲] اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ۔ (ترمذی)

''سچا تاجر جو اَمانت دار ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

[۳] اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رواه الاصبهانی۔ (ترغیب)

''سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہوگا۔''

پاکیزہ کمائی کے خاص شرائط

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

''سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں، اور جب اُن کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان (کسی سے) خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اُس سامان کو

---

۱ الترغيب والترهيب رقم الحديث: ۱۲۹۰، باب الترغيب فی الإكتساب ومسند احمد، حديث رافع بن خديج رضی الله عنه رقم الحديث: ۱۶۲۲۸ ومستدرك للحاكم رقم الحديث: ۲۱۱۷

۲ جامع الترمذی، ابواب البيوع، باب ما جاء فی التجار ج: ۱ ص: ۲۲۹

۳ الترغيب والترهيب رقم الحديث: ۱۱۰۹، كتاب البيوع۔

بُرا اور خراب نہ بتائیں، اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹلائیں نہیں، اور جب اُن کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔" (اخرجہ الاصبہانی، از حاشیہ مظہری) [1]

اسی لئے ایک حدیث میں اِرشاد ہے:-

اِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ۔ (اَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ) [2]

"قیامت کے روز تاجر لوگ فاجروں، گنہگاروں کی صف میں ہوں گے، بجز اس شخص کے جو اللہ سے ڈرے اور نیکی کا معاملہ کرے اور سچ بولے۔"

دُوسرے کا مال حلال ہونے کے لئے تجارت اور تراضی کی دو شرطیں

آیت کے اس جملہ میں تجارت کے ساتھ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ فرما کر یہ بتلادیا کہ جہاں تجارت ہی نہ ہو بلکہ تجارت کے نام پر جوا، سٹہ، یا رِبا اور سود کا معاملہ ہو یا مال ابھی موجود نہیں، محض ذہنی قرارداد پر اس کا سودا کیا گیا ہو، وہ بیع باطل اور حرام ہے۔

اسی طرح اگر تجارت یعنی مبادلۂ اَموال تو ہو لیکن اس میں فریقین کی رضامندی نہ ہو وہ بھی بیعِ فاسد اور ناجائز ہے، اور یہ دونوں صورتیں اکلِ اموال بالباطل میں داخل ہیں، پہلی صورت کو فقہاء "بیعِ باطل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور دُوسری صورت کو "بیعِ فاسد" کے نام سے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ ایک مال کا دُوسرے مال سے تبادلہ کرنے کا نام تجارت ہے، اگر ان میں کسی ایک جانب مال ہو اور اس کے بالمقابل مال ہی نہ ہو تو وہ تجارت نہیں، بلکہ فریب ہے۔ سود کے معاملات کا یہی حال ہے کہ سود کی رقم اُدھار کی میعاد کا معاوضہ ہوتا ہے، اور یہ میعاد کوئی مال نہیں۔ اسی طرح سٹہ، جوا کہ اس میں ایک طرف تو مالِ متعین موجود ہے، دُوسری طرف مال کا ہونا یا نہ ہونا مشکوک ہے۔ اسی طرح وہ وعدے کے سودے جن میں مال ابھی تک وجود میں نہیں آیا، اور اس کا سودا کرلیا گیا تو ایک طرف مال اور دُوسری طرف موہوم وعدہ ہے، اس لئے حقیقت کے اِعتبار سے یہ تجارت ہی نہیں، بلکہ ایک قسم کا دھوکا فریب ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کو "بیعِ باطل" قرار دیا ہے۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے مال اور تبادلۂ مال تو ہو، لیکن کسی ایک جانب سے رضامندی نہ ہو، یہ

---

[1] تفسير المظهري ج:٢ ص:٨١، وشعب الإيمان للبيهقي، باب اطيب الكسب إلخ رقم الحديث:٤٢٦٠

[2] المستدرك للحاكم رقم الحديث:٢١٠٣

تجارت تو ہوئی مگر فاسد اور غلط قسم کی تجارت ہے، اس لئے اس کو "بیعِ فاسد" کہا جاتا ہے اور ناجائز ہے۔
اس تشریح سے بیع و شراء اور تجارت کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں سب نکل جاتی ہیں۔

شرطِ تراضی کی حقیقت

البتہ ایک تیسری قسم اور ہے جس میں طرفین سے تبادلۂ مال بھی ہے اور بظاہر فریقین کی رضامندی بھی، مگر وہ رضامندی درحقیقت مجبوری کی رضامندی ہوتی ہے، حقیقی رضامندی نہیں ہوتی، اس لئے شرعاً اس تیسری قسم کو بھی دُوسری ہی قسم میں داخل قرار دِیا گیا ہے، مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کر کے اور پھر اس کی قیمت میں خاطر خواہ اِضافہ کر کے فروخت کرنے لگے، چونکہ بازار میں دُوسری جگہ ملتی نہیں، گاہک مجبور ہے کہ مہنگی سستی جیسی بھی یہ فروخت کرے وہ اس کو خریدے، اس صورت میں اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے، لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری کے تحت ہے، اس لئے کالعدم ہے۔

اسی طرح کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ معاشرت کی ایسی صورتیں پیدا کردے کہ وہ اپنا مہر معاف کرنے پر مجبور ہوجائے، تو گو معافی کے وقت وہ اپنی رضامندی کا اِظہار کرتی ہے لیکن درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی۔

یا کوئی آدمی جب یہ دیکھے کہ میرا جائز کام بغیر رِشوت دیئے نہیں ہوگا، وہ رضامندی کے ساتھ رِشوت دینے کے لئے آمادہ ہو تو چونکہ یہ رضامندی بھی درحقیقت رضامندی نہیں اس لئے شرعاً کالعدم ہے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ سے بیع و شراء اور تجارت کی صرف اُنہی صورتوں کا جواز ثابت ہوا جن کا جواز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو منضبط کردیا ہے، اور جتنی صورتیں بیع و شراء اور تجارت کی شرعاً ممنوع و ناجائز ہیں، وہ سب اس سے خارج ہیں، قرآنِ کریم کے اس ایک لفظ نے فقہ کی پوری کتابُ البیوع اور کتاب الإجارۃ کا مکمل بیان کردیا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اس میں باتفاقِ مفسرین خودکشی بھی داخل ہے، اور یہ بھی کہ ایک دُوسرے کو ناحق قتل کرے۔

آیت کے پہلے جملہ میں عام اِنسانوں کے مالی حقوق اور ان کی حفاظت کا بیان تھا، اس جملے میں ان کے جانی حقوق کی حفاظت کا بیان آگیا۔ اور اس جگہ مال کو مقدم اور جان کو مؤخر شاید اس لئے بیان فرمایا گیا کہ مالی حقوق میں ظلم و جور اور کوتاہی وغفلت بہت عام ہے، ناحق قتل و خون ریزی اگرچہ اس سے زیادہ اَشد ہے مگر عادۃً اس میں اِبتلا کم ہے، اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا۔

آیت کے آخر میں اِرشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ یعنی جو اَحکام اس آیت میں دیئے گئے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق نہ کھاؤ یا کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یہ سب اَحکام تمہارے حق میں رحمتِ خداوندی ہیں، تا کہ تم ان کاموں کے اُخروی وبال سے بھی محفوظ رہو اور دُنیوی سزاؤں سے بھی۔

اس کے بعد دُوسری آیت میں اِرشاد فرمایا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ یعنی قرآنی ہدایات کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے اور جان بوجھ کر تعدی اور ظلم کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے یا کسی کو ناحق قتل کر دے تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔ تعدی اور ظلم کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر سہو و نسیان یا خطا سے ایسا ہو گیا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

اگر تم بچتے رہو گے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں تو ہم معاف کر دیں گے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے

وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو تمہاری چھوٹی برائیوں کا ہم خود کفارہ کر دیں گے، اور تم کو ایک باعزت جگہ داخل کریں گے۔ ﴿۳۱﴾

ربطِ آیات

اس آیت سے پہلی آیات میں چند بڑے بڑے گناہوں کا ذِکر اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان ہے، قرآنِ کریم کا مخصوص اندازِ بیان یہ ہے کہ جب کسی جرم پر سزا سے ڈرایا جاتا ہے جسے ''ترہیب'' کہتے ہیں، تو اس کے ساتھ ''ترغیب'' کا پہلو بھی ذِکر کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس جرم سے باز آئے گا اس کے لئے یہ اِنعامات و درجات ہیں۔

اس آیت میں بھی ایک خاص اِنعامِ خداوندی ذِکر کر کے ترغیب دی گئی ہے، وہ یہ کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں

سے بچ گئے تو تمہارے چھوٹے گناہوں کو ہم خود معاف کر دیں گے، اور اس طرح تم ہر طرح کے بڑے چھوٹے صغیرہ وکبیرہ گناہوں سے پاک وصاف ہو کر عزّت وراحت کے اس مقام میں داخل ہو سکو گے جس کا نام "جنت" ہے۔

خلاصۂ تفسیر

جن کاموں سے تم کو (شرع میں) منع کیا جاتا ہے (یعنی گناہ کے کام) ان میں سے جو بھاری بھاری کام ہیں (یعنی بڑے بڑے گناہ ہیں) اگر تم ان سے بچتے رہو تو (اس بچنے پر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اعمالِ حسنہ کے کرنے سے جبکہ وہ مقبول ہو جائیں) ہم تمہاری خفیف بُرائیاں (یعنی چھوٹے چھوٹے گناہ جو کہ دوزخ میں لے جا سکتے ہیں) تم سے دُور (یعنی معاف) فرما دیں گے (پس دوزخ سے محفوظ رہو گے) اور ہم تم کو ایک معزز جگہ (یعنی بہشت) میں داخل کر دیں گے۔

معارف ومسائل

گناہوں کی دو قسمیں

آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ کبیرہ یعنی بڑے گناہ، اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرما دیں گے۔

کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض وواجبات کو اُدا کرے، کیونکہ فرض وواجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص اس کا اہتمام پورا کرے کہ تمام فرائض وواجبات ادا کرے، اور تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچا لے، تو حق تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیں گے۔

اعمالِ صالحہ صغائر کا کفارہ ہو جاتے ہیں

کفارہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اعمالِ صالحہ کو صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا کر اس کا حساب بے باق کر دیں گے، اور بجائے عذاب کے ثواب اور بجائے جہنم کے جنت نصیب ہو گی۔ جیسے احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ ہو گیا، چہرہ دھویا تو آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، کلی کر لی تو زبان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دُھل گئے، پھر جب وہ

مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔[1]

کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں

آیت سے معلوم ہوا کہ وضو، نماز وغیرہ اعمالِ صالحہ کے ذریعے گناہوں کا کفارہ ہونا جو روایاتِ حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اور کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اور صغیرہ کی یہ شرط ہے کہ آدمی ہمت اور کوشش کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں میں مبتلا رہتے ہوئے وضو اور نماز ادا کرتا ہے تو محض وضو، نماز یا دُوسرے اعمالِ صالحہ سے اس کے صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ نہیں ہوگا، اور کبیرہ تو اپنی جگہ ہیں ہی۔ اس لئے کبیرہ گناہوں کا ایک بہت بڑا ضرر خود ان گناہوں کا وجود ہے جس پر قرآن وحدیث کی شدید وعیدیں آئی ہیں، اور وہ بغیر سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اس کے علاوہ دُوسری محرومی یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے چھوٹے گناہ بھی معاف نہیں ہوں گے، اور یہ شخص محشر میں کبائر وصغائر کے بوجھ میں لدا حاضر ہوگا اور کوئی اس وقت اس کا بوجھ ہلکا نہ کر سکے گا۔

گناہ اور اس کی دو قسمیں: صغائر، کبائر

آیت میں ''کبائر'' کا لفظ آیا ہے، اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ''گناہِ کبیرہ'' کسے کہتے ہیں؟ اور وہ کل کتنے ہیں؟ اور ''صغیرہ گناہ'' کی کیا تعریف ہے اور اس کی تعداد کیا ہے؟

علمائے اُمت نے اس مسئلہ پر مختلف انداز میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم اور ان کی تعریفات سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ مطلق ''گناہ'' نام ہے ہر ایسے کام کا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو، اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اِصطلاح میں جس گناہ کو ''صغیرہ'' یعنی چھوٹا کہا جاتا ہے، درحقیقت وہ بھی چھوٹا نہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت ہر حالت میں نہایت سخت وشدید جرم ہے، اسی حیثیت سے اِمام الحرمینؒ اور بہت سے علمائے اُمت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت کبیرہ ہی ہے۔ کبیرہ اور صغیرہ کا فرق صرف گناہوں کے باہمی مقابلہ اور موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ: "كُلُّ مَا نُهِيَ عَنْهُ فَهُوَ كَبِيْرَةٌ"[2] یعنی جس کام سے شریعتِ اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس گناہ کو اِصطلاح میں صغیرہ یا چھوٹا کہا جاتا ہے، اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں ہیں کہ

---

۱ مؤطا مالك رقم الحديث:۵۵، كتاب الطهارة، باب جامع الوضوء۔

۲ مجمع الزوائد، كتاب الايمان، باب في الكبائر ج:۱ ص:۵۶

ایسے گناہوں کے اِرتکاب میں غفلت یا سستی برتی جائے اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر اَنداز کیا جائے، بلکہ صغیرہ گناہ کو بے باکی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جائے تو وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے چھوٹا بچھو اور بڑا بچھو، یا آگ کے بڑے انگارے اور چھوٹی چنگاری کہ اِنسان ان دونوں میں سے کسی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لئے محمد بن کعب قرظیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ گناہوں کو ترک کیا جائے، جو لوگ نماز، تسبیح کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادت مقبول نہیں۔ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا۔ اور سلف صالحینؒ نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو اِنسان کو کافرانہ اعمال و اخلاق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مداح بھی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دُشمن ہو جاتے ہیں، گناہوں سے بے پروائی اِنسان کے لئے دائمی تباہی کا سبب ہے۔[1] صحیح حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دِل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ اور اِستغفار کر لیا تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دِل پر چھا جاتا ہے۔'' اور اس کا نام قرآن میں ''رَین'' ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المطففین) یعنی ''ان کے دِلوں پر زنگ لگا دیا اُن کے اعمالِ بد نے۔''[2] البتہ گناہوں کے مفاسد اور نتائجِ بد اور مضر ثمرات کے اِعتبار سے اُن کے آپس میں فرق ضروری ہے، اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

گناہِ کبیرہ

گناہِ کبیرہ کی تعریف قرآن و حدیث اور اَقوالِ سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دُنیا میں مقرّر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارِد ہوئے ہیں، یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں۔ اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائجِ بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں۔ اسی طرح جو گناہِ صغیرہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

[1] یہ حدیث بندے کو مسندِ احمد میں نہیں ملی، البتہ مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۲۸۳، مسند عائشة (رضی اللہ عنہا) میں یہ حدیث موجود ہے۔

[2] جامع الترمذی، کتاب التفسیر ومن سورة ویل للمطففین ج:۲ ص:۱۷۱

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپ نے فرمایا: سات نہیں، سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ [۱]

اِمام ابنِ حجر مکیؒ نے اپنی کتاب ''الزواجر'' میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے، جو مذکورالصدر تعریف کی رُو سے کبائر میں داخل ہیں، ان کی اس کتاب میں کبائر کی تعداد چار سو سڑسٹھ تک پہنچی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اِکتفا کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے، بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع و اقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہوگئی، اس لئے یہ کوئی تعارض و اِختلاف نہیں ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا، اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات، کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اسی سے علمائے اُمت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں اِنحصار کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا اتنا بیان کردیا گیا۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے ہیں میں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں، وہ تین ہیں: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک (ساجھی) ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی، اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔ [۲]

اسی طرح بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہوگا، تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، [۳] بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے، اور پڑوسی کے اہل و عیال کی حفاظت بھی چونکہ اپنے اہل و عیال کی طرح اِنسان کے ذمہ لازم ہے اس لئے یہ جرم دُگنا ہوگیا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے؟ فرمایا کہ ہاں! جو شخص کسی دُوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اس کے نتیجے میں وہ اس کے

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم تحت هٰذه الآیة رقم الحدیث:۵۲۵۷

[۲] صحیح البخاری، کتاب الشهادات ما قیل فی شهادة الزور ج:۱ ص:۳۶۲- وصحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان الکبائر واکبرها ج:۱ ص:۶۴

[۳] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالٰی فلا تجعلوا الآیة ج:۲ ص:۶۴۳ وصحیح مسلم، کتاب الایمان ج:۱ ص:۶۴

ماں باپ کو گالی دیتا ہے،[1] تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں، کیونکہ یہی ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتلِ ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدانِ جہاد سے بھاگنے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔[2]

بعض روایاتِ حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دِیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارُ الکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارُ الہجرۃ کو چھوڑ کر دارُ الکفر میں دوبارہ چلا جائے۔[3]

دُوسری روایاتِ حدیث میں ان صورتوں کو بھی گناہِ کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے، مثلاً جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا، دُوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادُو سیکھنا، جادُو کا عمل کرنا، اور فرمایا کہ شراب پینا اکبرالکبائر ہے، اور فرمایا کہ شراب پینا اُمّ الفواحش ہے، کیونکہ شراب میں مست ہوکر آدمی ہر بُرے سے بُرا کام کرسکتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسے عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔[4]

ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذرِ شرعی کے دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کردیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا،[5] مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا، بلکہ قضا کرکے دُوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔

بعض روایاتِ حدیث میں اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے، اور اس کے عذاب وسزا سے بےفکر و بےخوف ہوجانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔[6]

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصۂ میراث کم کرنے کے لئے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔[7]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الأدب، لا یسب الرجل والدیہ ج:۲ ص:۸۸۳، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الکبائر وأکبرھا ج:۱ ص:۶۴۔

[2] یہ سب باتیں صحیح بخاری کی کسی ایک حدیث میں بندہ کو نہیں ملیں، البتہ سنن ابی داؤد کی ایک ہی حدیث میں یہ سب باتیں موجود ہیں، ملاحظہ فرمائیے: سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی التشدید إلخ ج:۱ ص:۳۹۷

[3] المعجم الأوسط للطبرانی رقم الحدیث: ۵۸۷۰ باب المیم من اسمہ محمد۔

[4] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبۃ ج:۲ ص:۲۶۹

[5] جامع الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی الجمع بین الصلاتین ج:۱ ص:۴۸

[6] شعب الإیمان للبیہقی، باب الثانی عشر من شعب الإیمان رقم الحدیث: ۱۰۶۵

[7] کنز العمال، رقم الحدیث: ۴۶۱۳۶ ج:۱۶ ص:۲۲۸

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب وخاسر ہوئے اور تباہ ہوگئے، اور تین دفعہ اس کلمے کو دُہرایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ محروم القسمۃ اور تباہ وبرباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا: ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کُرتا اور عبا کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، دُوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے اِحسان جتلائے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی اِمام کے ہاتھ پر محض دُنیا کی خاطر بیعت کرے۔ [۱]

اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔ [۲]

اور نسائی ومسندِ احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے: شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رِشتہ داروں سے بلاوجہ قطع تعلق کرنے والا، اِحسان جتلانے والا، جنات وشیاطین یا دُوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل وعیال کو بےحیائی سے نہ روکنے والا۔ [۳]

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اُس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لئے قربان کرے۔ [۴]

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر، مردوں کو حصہ ہے

مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ

اپنی کمائی سے، اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے، اور مانگو اللہ سے

مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ

اس کا فضل، بےشک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔ اور ہر کسی کے لئے ہم نے مقرر کردیئے ہیں وارث

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال ج:۱ ص:۷۱

۲ صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یکرہ من النمیمۃ ج:۲ ص:۸۹۵ وصحیح مسلم، کتاب الایمان باب بیان غلظ التحریم النمیمۃ ج:۱ ص:۷۰

۳ سنن النسائی، کتاب الزکاۃ، باب المنان بما اعطی ج:۱ ص:۳۵۷، ومسند احمد رقم الحدیث:۵۸۳۹

۴ صحیح مسلم، کتاب الأضاحی، باب تحریم الذبح لغیر اللہ۔

مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْھُمْ

اس مال کے کہ چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے، اور جن سے معاہدہ ہوا تمہارا ان کو دے دو

نَصِيْبَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ۧ۳۳

ان کا حصہ، بے شک اللہ کے رُوبرو ہے ہر چیز۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن چیزوں میں اللہ نے تم کو ایک دُوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو، مرد جو کچھ کمائی کریں گے ان کو اس میں سے حصہ ملے گا، اور عورتیں جو کچھ کمائی کریں گی ان کو اس میں سے حصہ ملے گا۔ اور اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو۔ بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (۳۲) اور ہم نے ہر اس مال کے کچھ وارث مقرّر کئے ہیں جو والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ کر جائیں۔ اور جن لوگوں سے تم نے کوئی عہد باندھا ہو ان کو ان کا حصہ دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔ (۳۳)

ربطِ آیات

ماقبل کی آیتوں میں میراث کے اَحکام گزرے ہیں، ان میں یہ بھی بتلایا جاچکا ہے کہ میّت کے ورثہ میں اگر مرد اور عورت ہو، اور میّت کی طرف رشتہ کی نسبت ایک ہی طرح کی ہو تو مرد کو عورت کی نسبت دُگنا حصہ ملے گا، اسی طرح کے اور فضائل بھی مردوں کے ثابت ہیں۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس پر ایک دفعہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے، اور بھی فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہیں۔

مقصد اِعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی تمنا تھی کہ اگر ہم لوگ بھی مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل ہمیں بھی حاصل ہوجاتے، بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ کاش! ہم مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد میں حصہ لیتے اور جہاد کی فضیلت ہمیں حاصل ہوجاتی۔

ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: مرد کو میراث میں دُگنا حصہ ملتا ہے اور عورت کی شہادت بھی مرد سے نصف ہے، تو کیا عبادات واعمال میں بھی ہم کو نصف ہی ثواب ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں دونوں قولوں کا جواب دیا گیا ہے، حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے قول کا جواب وَلَا تَتَمَنَّوْا سے دیا گیا، اور اس عورت کے قول کا

جواب لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ سے دیا گیا۔ [1]

خلاصۂ تفسیر

اور تم (سب مردوں، عورتوں کو حکم ہوتا ہے کہ فضائلِ وہبیّہ میں سے) ایسے کسی امر کی تمنامت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (مثلاً مردوں کو) بعضوں پر (مثلاً عورتوں پر بلا دخل ان کے کسی عمل کے) فوقیت بخشی ہے (جیسے مرد ہونا یا مردوں کا دو حصہ ہونا یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیر ذالک کیونکہ) مردوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے (اور مدارِ نجات کا قانوناً یہی اعمال ہیں، اور ان میں کسی کی تخصیص نہیں، تو اگر دُوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال میں جو کہ فضائلِ کسبیّہ ہیں کوشش کر کے دُوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کرلو، باوجود اس پر قادر ہونے کے فضائلِ خاصہ مذکورہ کی تمنا محض ہوس اور فضول ہے) اور (اگر فضائلِ وہبیّہ میں ایسے فضائل کی رغبت ہے جن میں اعمال بھی دخل ہے مثلاً اَحوال وکمالاتِ باطنیہ وامثالہا تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ خالی تمنائیں کیا کرو، بلکہ یہ چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (خاص) کی درخواست (یعنی دُعا) کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس میں سب چیزیں آگئیں، یعنی فضائلِ وہبیّہ قسمِ اوّل کی وجہِ تخصیص بھی، اور فضائلِ کسبیّہ پر ثواب دینا بھی، اور فضائلِ وہبیّہ قسمِ دوم کی درخواست بھی، پس یہ جملہ سب کے متعلق ہے) اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور (دُوسرے) رِشتہ دار لوگ (اپنے مرنے کے بعد) چھوڑ جاویں، ہم نے وارث مقرّر کردیئے ہیں، اور جن لوگوں سے تمہارے عہد (پہلے سے) بندھے ہوئے ہیں (اسی کو مولی الموالات کہتے ہیں) ان کو (اب جبکہ شرع سے رِشتہ دار لوگ وارث مقرّر ہوگئے، ساری میراث مت دو، بلکہ صرف) ان کا حصہ (یعنی ایک ششم) دے دو، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں (پس اُن کو ساری میراث نہ دینے کی حکمت اور ششم حصہ مقرّر کردینے کی مصلحت اور یہ کہ یہ ششم ان کو کون دیتا ہے کون نہیں دیتا، ان سب کی ان کو خبر ہے)۔

معارف ومسائل

اُمورِ اختیاریہ اور غیر اِختیاریہ کی تمنا کرنا

آیت میں ان غیر اِختیاری فضائل کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے جو دُوسروں کو حاصل ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ

---

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر ومن سورة النساء ج:۲ ص:۱۳۱، وتفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۵۲۶۳

اِنسان جب اپنے آپ کو دُوسروں سے مال و دولت، آرام وعیش، حسن وخوبی، علم وفضل وغیرہ میں کم پاتا ہے تو عادۃً اس کے دِل میں ایک مادّہ حسد کا اُبھرتا ہے، جس کا تقاضا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ میں بھی اس کے برابر یا زیادہ ہوجاؤں، اور بسااوقات اس پر قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جن میں اِنسان کے سعی وعمل کو کوئی دخل نہیں، وہ محض قدرت کے اِنعامات ہوتے ہیں، جیسے کسی شخص کا مرد ہونا، یا کسی اعلیٰ خاندانِ نبوّت میں یا خاندانِ حکومت میں پیدا ہونا، یا حسین وخوب صورت پیدا ہونا وغیرہ کہ جس شخص کو یہ اِنعامات حاصل نہیں، وہ اگر عمر بھر اس کی کوشش کرے کہ مثلاً مرد ہوجائے یا خاندانی سیّد بن جائے، اس کا ناک نقشہ، قد وقامت حسین ہوجائے، تو یہ اس کی قدرت میں نہیں، نہ کسی دوا اور علاج یا تدبیر سے وہ ان چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے، اور جب دُوسرے کی برابری پر قدرت نہیں ہوتی تو اَب اس کے نفس میں یہ خواہش جگہ پکڑتی ہے کہ دُوسروں سے بھی یہ نعمت چھن جائے، تاکہ وہ بھی اس کے برابر یا کم ہوجائیں، اسی کا نام حسد ہے، جو اِنسانی اخلاق میں اِنتہائی شرمناک اور مضر خصلت ہے، اور دُنیا کے بہت سے جھگڑوں اور فسادات، قتل وغارت گری کا سبب ہے۔

قرآنِ کریم کی اس آیت نے اس فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے اِرشاد فرمایا: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ یعنی اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکمت ومصلحت جو کمالات وفضائل لوگوں میں تقسیم فرمائے ہیں، کسی کو کوئی وصف دے دیا، کسی کو کوئی، کسی کو کم، کسی کو زیادہ، اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت پر راضی اور خوش رہنا چاہئے، دُوسرے کے فضائل وکمالات کی تمنا میں نہ پڑنا چاہئے، کہ اس کا نتیجہ اپنے لئے رنج وغم اور حسد کے گناہِ عظیم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جس کو حق تعالیٰ نے مرد بنادیا وہ اس پر شکر اَدا کرے، جس کو عورت بنادیا وہ اسی پر راضی رہے اور سمجھے کہ اگر وہ مرد ہوجاتی تو شاید مردوں کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرسکتی اور گنہگار ہوجاتی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت پیدا کیا ہے وہ اس پر شکر گزار ہو کہ اس کو ایک نعمت ملی، اور جو بدصورت ہے وہ بھی رنجیدہ نہ ہو اور سمجھے کہ میرے لئے اسی میں کوئی خیر مقدّر ہوگی، اگر مجھے حسن وجمال ملتا تو شاید کسی فتنہ اور خرابی میں مبتلا ہوجاتا۔ جو شخص نسب کے اِعتبار سے سیّد ہاشمی ہے وہ اس پر شکر کرے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہے، اور جس کو یہ نسبت حاصل نہیں وہ اس فکر میں نہ پڑے اور اس کی تمنا بھی نہ کرے، کیونکہ یہ چیز کسی کوشش سے حاصل ہونے والی نہیں، اس کی تمنا اس کو گناہ میں مبتلا کردے گی اور بجز رنج وغم کے کچھ حاصل نہ ہوگا، بجائے نسب پر افسوس کرنے کے اعمالِ صالحہ کی فکر میں زیادہ پڑے، ایسا کرنے سے وہ بڑے نسب والوں سے بڑھ سکتا ہے۔

بعض آیاتِ قرآنی اور اِرشاداتِ نبوی میں مسابقت فی الخیرات، یعنی نیک کاموں میں دُوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کا حکم یا دُوسروں کے فضائل وکمالات کو دیکھ کر ان کی تحصیل کے لئے سعی وعمل اور جد وجہد کی ترغیب آئی ہے تو وہ

اُن اعمال وافعال سے متعلق ہے جو اِنسان کے اِختیار میں ہیں، اور کسب واِکتساب سے حاصل ہو سکتے ہیں، مثلاً علمی فضائل اور عملی واخلاقی کمالات کسی کے دیکھ کر اُن کے حاصل کرنے کی جدوجہد مستحسن اور پسندیدہ عمل ہے، یہ آیت اس کے منافی نہیں، بلکہ آیت کا آخری حصہ اس کی تائید کر رہا ہے، جس میں اِرشاد ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ یعنی جو کوئی چیز مردوں نے کسب وعمل کے ذریعے حاصل کی، ان کو اس کا حصہ ملے گا، اور جو عورتوں نے سعی وعمل کے ذریعے حاصل کی، ان کو اس کا حصہ ملے گا۔

اس میں یہ اِشارہ موجود ہے کہ فضائل وکمالات کی تحصیل میں کسب واِکتساب اور جدوجہد بیکار نہیں، بلکہ ہر مرد وعورت کو اس کی سعی وعمل کا حصہ ضرور ملے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی شخص کے علمی، عملی، اخلاقی فضائل کو دیکھ کر ان کی تمنا، اور پھر تمنا پوری کرنے کے لئے سعی وعمل اور جدوجہد کرنا مطلوب اور مستحسن ہے۔

یہاں ایک مغالطہ بھی رفع ہوگیا جس میں بہت سے ناواقف مبتلا ہوا کرتے ہیں، بعض تو غیر اختیاری فضائل کی تمنا میں لگ کر اپنے عیش وآرام اور سکون واطمینان کو دُنیا ہی میں برباد کر لیتے ہیں، اور اگر نوبت حسد تک پہنچ گئی یعنی دُوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا ہونے لگی تو آخرت بھی برباد ہوئی، کیونکہ حسد کے گناہِ عظیم کا اِرتکاب ہوا۔

اور بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی سستی، کم علمی، کم ہمتی، بلکہ بے غیرتی سے اِختیاری فضائل حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے، اور کوئی کہے تو اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے قسمت وتقدیر کے حوالے دینے لگتے ہیں۔

اس آیت نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلا دیا کہ جو کمالات وفضائل غیر اِختیاری ہیں اور ان میں اِنسان کا کسب وعمل مؤثر نہیں، جیسے کسی کا عالی نسب یا حسین وخوب صورت پیدا ہونا وغیرہ، ایسے فضائل کو تو حوالۂ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور نقد رنج وغم ہے۔

اور جو فضائل وکمالات اِختیاری ہیں جو کسب وعمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب وعمل اور جدوجہد بھی ہو، اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی وعمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی، بلکہ ہر ایک کو بقدرِ محنت حصہ ملے گا مرد ہو یا عورت۔

تفسیر ''بحر محیط'' میں ہے کہ اس آیت سے پہلے لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اور وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ کے اَحکام آئے تھے، جن میں کسی کا مال ناحق اِستعمال کرنے اور کسی کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت ہے،[1] اس آیت میں ان

---

[1] قد مرّ تخریجہ۔

دونوں جرموں کے سرچشمے کو بند کرنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ دُوسرے لوگوں کو جو مال ودولت یا عیش وعشرت یا عزّت وجاہ وغیرہ میں تم پر تفوقِ خداداد حاصل ہے، تم اس کی تمنا بھی نہ کرو۔ اس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چوری، ڈاکا اور دُوسرے ناجائز طریقوں سے کسی کا مال لینا، یا قتل وغارت گری کرنا، ان سب جرائم کا اصل منشا یہی ہوتا ہے کہ ایک اِنسان جب دُوسرے اِنسان کو مال ودولت وغیرہ میں اپنے سے فائق اور بڑھا ہوا پاتا ہے تو اوّل اس کے دِل میں اس کی برابری یا اس سے برتری کی خواہش وتمنا پیدا ہوتی ہے، پھر یہ تمنا ہی ان سب جرائم تک پہنچا دیتی ہے، قرآنی ہدایت نے ان تمام جرائم کے سرچشمہ کو بند کردیا کہ دُوسروں کے فضائل وکمالات کی تمنا ہی کو روک دیا۔

آیت میں اس کے بعد اِرشاد ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اس میں یہ ہدایت ہے کہ جب تم کسی کو کسی کمال میں اپنے سے زائد دیکھو تو بجائے اس کے کہ اُس خاص کمال میں اس کے برابر ہونے کی تمنا کرو، تمہیں کرنا یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل وکرم کی درخواست کرو، کیونکہ فضلِ خداوندی ہر شخص کے لئے جدا جدا صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، کسی کے لئے مال ودولت فضلِ اِلٰہی ہوتا ہے، اگر وہ فقیر ہوجائے تو گناہ وکفر میں مبتلا ہوجائے، اور کسی کے لئے تنگی اور تنگدستی ہی میں فضل ہوتا ہے، اگر وہ غنی اور مال دار ہوجائے تو ہزاروں گناہوں کا شکار ہوجائے۔ اسی طرح کسی کی عزّت وجاہ کی صورت میں فضلِ خداوندی ہوتا ہے، کسی کے لئے گمنامی اور کس مپرسی ہی میں اس کے فضل کا ظہور ہوتا ہے، اور حقیقتِ حال پر نظر کرے تو معلوم ہوجائے کہ اگر اس کو عزّت وجاہ ملتی تو بہت سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتا۔

اس لئے اس آیت نے یہ ہدایت دی کہ جب اللہ سے مانگو تو کسی خاص وصفِ معین کو مانگنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا فضل مانگو، تاکہ وہ اپنی حکمت کے مطابق تم پر اپنے فضل کا دروازہ کھول دے۔

آخرِ آیت میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس میں اِشارہ فرمادیا کہ حق تعالیٰ کی تقسیم عین حکمت اور عین عدل واِنصاف ہے، جس کو جس حال میں پیدا کیا اور رکھا ہے وہی مقتضائے حکمت وعدل تھا، مگر چونکہ اِنسان کو اپنے اعمال کے عواقب کا پورا پتہ نہیں ہوتا، اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کس کو کس حال میں رکھنا اس کے لئے مفید ہے۔

آیتِ مذکورہ کی شانِ نزول میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جب میراث میں مردوں کا دُہرا حصہ مقرّر ہوا تو بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ ہم مرد ہوتے تو ہمیں بھی دُہرا حصہ ملتا، اس کے مناسب دُوسری آیت میں میراث کے قانون کا اعادہ اس انداز سے کردیا گیا کہ اس میں جو کچھ حصے مقرّر کئے گئے ہیں وہ عین حکمت اور مطابقِ عدل ہیں، اِنسانی عقل چونکہ تمام عالم کے مصالح ومفاسد کا اِحاطہ نہیں کرسکتی، اس لئے وہ ان حکمتوں کو بھی نہیں پہنچ سکتی جو خدا تعالیٰ کے مقرّر کردہ قانون میں ملحوظ ہیں، اس لئے جو حصہ کسی کے لئے مقرّر کردیا گیا ہے اس کو اسی پر راضی رہنا اور شکرگزار ہونا چاہئے۔

عقدِ موالات سے میراث پہنچنے کا حکم

اس آیت کے آخر میں جو باہمی معاہدہ کی بنا پر حصہ دینا مذکور ہے، یہ ابتدائے اسلام میں تھا، بعد میں آیت: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (الانفال:۷۵) سے یہ منسوخ ہوگیا، اب اگر دُوسرے ورثاء موجود ہوں تو دو شخصوں کے باہمی معاہدہ کا میراث پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر

وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال، پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابع دار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ

اللہ کی حفاظت سے، اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو

فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ

سونے میں اور مارو ان کو، پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ اِلزام کی،

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا

بے شک اللہ ہے سب سے اُوپر بڑا۔ اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف

مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ

مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرا دیں تو اللہ موافقت کر دے گا

بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ان دونوں میں، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

مرد عورتوں کے نگراں ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دُوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔ چنانچہ نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے (اس کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو (پہلے) انہیں سمجھاؤ، اور (اگر اس سے کام نہ چلے تو) انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو، (اور اس سے بھی اِصلاح نہ ہو تو) انہیں مار سکتے ہو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان کے خلاف کارروائی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کے اُوپر، سب سے بڑا ہے۔ ﴿۳۴﴾ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو (ان کے درمیان فیصلہ کرانے کے لئے) ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے بھیج دو۔ اگر وہ دونوں اِصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان اِتفاق پیدا فرما دے گا۔ بیشک اللہ کو ہر بات کا علم اور ہر بات کی خبر ہے۔ ﴿۳۵﴾

ربطِ آیات

عورتوں کے متعلق جو اَحکام گزر چکے ہیں، اس میں ان کی حق تلفی کی ممانعت بھی مذکور ہوئی، اب آگے مردوں کے حقوق کا ذِکر ہے، اور ان کے مطالبہ اور ان کو فوت کرنے کی صورت میں تادیب کی اِجازت بھی دی گئی ہے، حقوق میں اِختلاف واقع ہونے کی صورت میں اس کے تصفیہ کا طریق اور حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت بھی مذکور ہے، اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اس سے یہ جواب بھی نکل آیا کہ جب مرد، عورت کے مقابلہ میں افضل ہیں تو یہ اِشکال نہیں ہونا چاہئے کہ میراث میں ان کا حصہ عورتوں کی نسبت زیادہ کیوں ہے؟

خلاصۂ تفسیر

مرد حاکم ہیں عورتوں پر (دو وجہ سے، ایک تو) اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (یعنی مردوں کو) بعضوں پر (یعنی عورتوں پر قدرتی) فضیلت دی ہے، (یہ تو وہبی اَمر ہے) اور (دُوسرے) اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر)

اپنے مال (مہر میں اور نان نفقہ میں) خرچ کئے ہیں (اور خرچ کرنے والوں کا ہاتھ اُونچا اور بہتر ہوتا ہے اس سے کہ جس پر خرچ کیا جاوے اور یہ اَمر مکتسب ہے) سو جو عورتیں نیک ہیں (وہ مرد کے ان فضائل وحقوق کی وجہ سے) اِطاعت کرتی ہیں (اور) مرد کی عدم موجودگی میں (بھی) بحفاظت (وتوفیقِ) الٰہی (اس کی آبرو و مال کی) نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں (اس صفت کی نہ ہوں، بلکہ) ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بد دِماغی کا اِحتمال (قوی) ہو تو ان کو (اوّل) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو) ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اِعتدال کے ساتھ) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اِطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت اور عظمت والے ہیں (ان کے حقوق اور قدرت اور علم سب بڑے ہیں، اگر تم ایسا کروگے پھر وہ بھی تم پر اپنے حقوق کے متعلق ہزاروں اِلزام قائم کرسکتے ہیں) اور اگر (قرائن سے) تم اُوپر والوں کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (تجویز کرکے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو (کہ وہ جاکر تحقیقِ حال کریں، اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو سمجھاویں) اگر ان دونوں آدمیوں کو (سچے دِل سے) اِصلاح (معاملے کی) منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی میں (بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر عمل بھی کریں) اِتفاق فرمادیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں (جس طریق سے ان میں باہم مصالحت ہوسکتی ہے اس کو جانتے ہیں، جب حَکَمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں اِلقا فرمادیں گے)۔

معارف ومسائل

سورۂ نساء کے شروع سے یہاں تک بیشتر اَحکام اور ہدایات عورتوں کے حقوق سے متعلق آئی ہیں، جن میں ان مظالم کو مٹایا گیا ہے جو اِسلام سے پہلے پوری دُنیا میں اس صنفِ نازک پر توڑے جاتے تھے، اسلام نے عورتوں کو وہ تمام اِنسانی حقوق دیئے جو مردوں کو حاصل ہیں، اگر عورتوں کے ذمہ مردوں کی کچھ خدمات عائد کیں تو مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق فرض کئے۔

سورۂ بقرہ کی آیت میں اِرشاد فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ:۲۲۸) یعنی ''عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ایسے ہی واجب ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں۔'' اس میں دونوں کے حقوق کی مماثلت کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو عرف کے حوالے سے فرمایا، جاہلیت اور تمام دُنیا کی ظالمانہ رسموں کا یکسر

خاتمہ کردیا، ہاں یہ ضروری نہیں کہ دونوں کے حقوق صورت کے اِعتبار سے متماثل ہوں، بلکہ عورت پر ایک قسم کے کام لازم ہیں تو اس کے مقابل مرد پر دُوسری قسم کے کام ہیں، عورت اُمورِ خانہ داری اور بچوں کی تربیت وحفاظت کی ذمہ دار ہے، تو مرد ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسبِ معاش کا ذمہ دار ہے، عورت کے ذمہ مرد کی خدمت و اطاعت ہے تو مرد کے ذمہ اس کا مہر اور نفقہ یعنی تمام ضروری اِخراجات کا اِنتظام ہے، غرض اس آیت نے عورتوں کو مردوں کے مماثل حقوق دے دیئے۔

لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جس میں مردوں کو عورتوں پر تفوق اور ایک خالص فضیلت حاصل ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرة:۲۲۸) یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔

ان آیات میں اسی درجہ کا بیان قرآنِ کریم کے حکیمانہ طرزِ بیان کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے کہ مردوں کی یہ فضیلت اور تفوق خود عورتوں کی مصلحت اور فائدے کے لئے اور عین مقتضائے حکمت ہے، اس میں عورت کی نہ کسرِ شان ہے نہ اس کا کوئی نقصان ہے۔

ارشاد فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء:۳۴) قَوَّامٌ، قَيَّامٌ، قَيِّمٌ، عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو، اسی لئے اس آیت میں ''قوّام'' کا ترجمہ عموماً ''حاکم'' کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اِجتماعی نظام کے لئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر و حاکم ہوتا ہے کہ اِختلاف کے وقت اس کے فیصلہ سے کام چل سکے، جس طرح ملک و سلطنت اور ریاست کے لئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مُسلّم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی، اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے، اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو ''خانہ داری'' کہا جاتا ہے، اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلہ میں اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوّتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں، اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھ دار عورت یا مرد اس کا اِنکار نہیں کرسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت میں: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرة:۲۲۸) فرماکر اور سورۂ نساء کی آیتِ متذکرہ میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ فرماکر یہ بتلادیا گیا کہ اگرچہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم وواجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں، اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو اِمتیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہیں۔ اور قرآنِ کریم کی دُوسری آیات میں یہ بھی واضح کردیا گیا کہ یہ حکومت جو مردوں کی عورتوں پر ہے، محض

آمریت اور اِستبداد کی حکومت نہیں، بلکہ حاکم یعنی مرد بھی قانونِ شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو حکم دیا گیا ہے کہ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء:١٩) یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا سلوک کرو۔

اسی طرح دُوسری آیت میں عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (البقرة:٢٣٣) کی تعلیم ہے، جس میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ اُمورِ خانہ داری میں بیوی کے مشورہ سے کام کریں۔ اس تفصیل کے بعد مرد کی حاکمیت عورت کے لئے کسی رنج کا سبب نہیں ہوسکتی، تاہم چونکہ یہ اِحتمال تھا کہ مردوں کی اس فضیلت اور اپنی محکومیت سے عورتوں پر کوئی ناگوار اَثر ہو، اس لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ صرف حکم بتلانے اور جاری کرنے پر اِکتفا نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی اس کی حکمت اور وجہ بھی بتلا دی، ایک وہبی جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں، دُوسرے کسبی جو عمل کا اثر ہے۔

پہلی وجہ یہ اِرشاد فرمائی: بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں خاص حکمت و مصلحت کے تحت ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، کسی کو افضل کسی کو مفضول بنایا ہے، جیسے ایک خاص گھر کو اللہ نے اپنا بیت اللہ اور قبلہ قرار دے دیا، بیت المقدس کو خاص فضیلت دے دی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خداداد فضیلت ہے، جس میں مردوں کی سعی و عمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں۔

دُوسری وجہ کسبی اور اختیاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر ادا کرتے ہیں، اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اُٹھاتے ہیں، ان دو وجہ سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا۔

فائدہ:- یہاں ایک بات اور قابلِ غور ہے، ابنِ حیانؒ ''بحرِ محیط'' میں لکھتے ہیں کہ آیت میں حاکمیتِ رجال کی دو وجہوں کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کسی کو ولایت و حکومت کا اِستحقاق محض زور و تغلب سے قائم نہیں ہوتا، بلکہ کام کی صلاحیت و اہلیت ہی اس کو حکومت کا مستحق بنا سکتی ہے۔[1]

مردوں کی افضلیت کے بیان کے لئے قرآنِ حکیم کا عجیب اُسلوب

پہلی وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نساء کی طرف ضمیریں عائد کر کے "فَضَّلَهُمْ عَلَيْهِنَّ" فرما دیا جاتا، مگر قرآنِ کریم نے عنوان بدل کر بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے الفاظ اِختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دُوسرے کا بعض اور جزء قرار دے کر اس طرف اِشارہ کر دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور افضلیت ثابت بھی ہو جائے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے اِنسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل، یا اِنسان کا دِل اس کے معدہ سے افضل ہے،

[1] تفسير البحر المحيط، تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۱۱۹

تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا، ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا، کیونکہ یہ دونوں ایک دُوسرے کے لئے مثل اعضاء واجزاء کے ہیں، مرد سر ہے تو عورت بدن۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالاتِ علمی و عملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے اور صفتِ حاکمیت میں بھی مرد سے فائق ہو جائے۔

مرد اور عورت کے مختلف اعمال تقسیمِ کار کے اُصول پر مبنی ہیں

دُوسری وجہ اختیاری جو یہ بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم اُمور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیاتِ میراث میں مردوں کا حصہ دُہرا اور عورتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہو سکتا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلادی کہ مالی ذمہ داریاں تمام تر مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے، اور شادی ے بعد شوہر پر، اس لئے اگر غور کیا جائے تو مرد کو دُہرا حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورت ہی کو پہنچ جاتا ہے۔

دُوسرا اشارہ ایک اہم اُصولِ زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دُوسرے ذرائعِ کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی کہ شادی سے پہلے باپ اس کا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر۔ اس کے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور اُمورِ خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مرد ان اُمور کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس لئے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اس کا رُتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیمِ کار کے اُصول پر ڈیوٹیاں تقسیم کر دی گئی ہیں، ہاں ڈیوٹیوں کے درمیان جو باہم تفاضل ہوا کرتا ہے، وہ یہاں بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت سے نہ عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے، اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔

صالح بیوی

اس آیت کے شروع میں بطورِ ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ مرد عورت پر حاکم ہے، اس کے بعد نیک و بد عورتوں کا بیان

اس طرح فرمایا: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ یعنی ''نیک عورتیں وہ ہیں جو مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کی اطاعت کرتی ہیں اور مردوں کے پیٹھ پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔'' یعنی اپنی عصمت اور گھر کے مال کی حفاظت جو اُمورِ خانہ داری میں سب سے اہم ہیں، ان کے بجالانے میں ان کے لئے مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہیں، یہ نہیں کہ ان کے سامنے تو اس کا اہتمام کریں، اور ان کی نظروں سے غائب ہوں تو اس میں لاپروائی برتیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر ارشاد فرمایا کہ:-

خَيْرُ النِّسَآءِ اِمْرَاَةٌ اِذَا نَظَرْتَ اِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِهَا وَنَفْسِهَا۔ [۱]

''یعنی بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اس کو دیکھو تو خوش ہو، اور جب اس کو کوئی حکم دو تو اطاعت کرے، اور جب تم غائب ہو تو اپنے نفس اور مال کی حفاظت کرے۔''

اور چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت دونوں آسان کام نہیں، اس لئے آگے فرمادیا: بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ یعنی اس حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں، انہی کی امداد اور توفیق سے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں، ورنہ نفس وشیطان کے مکائد ہر وقت ہر انسان مرد وعورت کو گھیرے ہوئے ہیں، اور عورتیں خصوصاً اپنی علمی اور عملی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں، اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط نظر آتی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد ہے، یہی وجہ ہے کہ بے حیائی کے گناہوں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔

اطاعت شعار، تابع دار عورتوں کی فضیلت جہاں اس آیت سے مفہوم ہوتی ہے، وہاں اس سلسلہ میں احادیث بھی وارد ہیں۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابع دار اور مطیع ہو اس کے لئے استغفار کرتے ہیں پرندے ہوا میں، اور مچھلیاں دریا میں، اور فرشتے آسمانوں میں، اور درندے جنگلوں میں۔ (بحر محیط) [۲]

نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ

اس کے بعد ان عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار نہیں، یا جن سے اس کام میں کوتاہی ہوتی ہے،

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم تحت هٰذه الآية رقم الحديث: ۵۲۸۳

[۲] تفسیر البحر المحيط تحت هٰذه الآية ج: ۴ ص: ۱۲۱

قرآنِ کریم نے ان کی اِصلاح کے لئے مردوں کو علی الترتیب تین طریقے بتلائے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ یعنی عورتوں کی طرف سے اگر نافرمانی کا صدور یا اندیشہ ہو، تو پہلا درجہ ان کی اِصلاح کا یہ ہے کہ نرمی سے ان کو سمجھاؤ، اور اگر وہ محض سمجھانے بجھانے سے باز نہ آئیں، تو دُوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کا بستر اپنے سے علیحدہ کردو، تاکہ وہ اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضی کا اِحساس کرکے اپنے فعل پر نادم ہوجائیں۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں فِی الْمَضَاجِعِ کا لفظ ہے، اس سے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ مطلب نکالا کہ جدائی صرف بستر میں ہے، مکان کی جدائی نہ کرے، کہ عورت کو مکان میں تنہا چھوڑ دے اس میں ان کو رنج بھی زیادہ ہوگا اور فساد بڑھنے کا اندیشہ بھی اس میں زیادہ ہے۔

ایک صحابیؓ سے روایت ہے:-

قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللهِ مَا حَقُّ زَوْجَةِ اَحَدِنَا عَلَیْهِ؟ قَالَ: اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَیْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِی الْبَیْتِ۔ (مشکوٰۃ) [۱]

''میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا: جب تم کھاؤ تو انہیں بھی کھلاؤ، اور تم پہنو تو انہیں بھی پہناؤ، اور چہرے پر مت مارو، اگر اس سے علیحدگی کرنا چاہو تو صرف اتنی کرو کہ (بستر الگ کردو) مکان الگ نہ کرو۔''

اور جو اس شریفانہ سزا و تنبیہ سے بھی متأثر نہ ہو تو پھر اس کو معمولی مار مارنے کی بھی اِجازت ہے، جس سے اس کے بدن پر اثر نہ پڑے، اور ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے تک نوبت نہ آئے، اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع فرمادیا گیا ہے۔

اِبتدائی دو سزائیں تو شریفانہ سزائیں ہیں، اس لئے انبیاء علیہم السلام و صلحاءؒ سے قولاً بھی ان کی اجازت منقول ہے اور اس پر عمل بھی ثابت ہے، مگر تیسری سزا یعنی مارپیٹ کی اگرچہ بدرجۂ مجبوری ایک خاص انداز میں مرد کو اجازت دی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی اِرشاد ہے: ''وَلَنْ یَّضْرِبَ خِیَارُکُمْ'' [۲] یعنی ''اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے۔'' چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے کہیں ایسا عمل منقول نہیں۔

ابنِ سعد اور بیہقی نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ پہلے مردوں کو مطلقاً عورتوں کو مارنے سے منع کردیا گیا تھا، مگر پھر عورتیں شیر ہوگئیں، تو یہ اجازت مکرّر دی گئی۔ [۳]

[۱] مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء ج:۲ ص:۲۸۱

[۲] المستدرك للحاكم رقم الحدیث:۲۷۷۵

[۳] طبقات ابن سعد، باب ذکر ضرب النساء ج:۸ ص:۲۰۴

آیتِ مذکورہ کا تعلق بھی اسی قسم کے ایک واقعہ سے ہے، اس کا شانِ نزول ہے کہ زید بن ابی زہیر رضی اللہ عنہ نے اپنی لڑکی حبیبہؓ کا نکاح حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا، اُن کے آپس میں کچھ اِختلاف پیش آیا، شوہر نے ایک طمانچہ مار دیا، حبیبہؓ نے اپنے والد سے شکایت کی، والد اُن کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے حکم دے دیا کہ حبیبہ کو حق حاصل ہے کہ جس زور سے سعد بن ربیع نے ان کے طمانچہ مارا ہے وہ بھی اتنی ہی زور سے اُن کے طمانچہ ماریں۔

یہ دونوں حکمِ نبوی سن کر چلے کہ اس کے مطابق سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ سے اپنا اِنتقام لیں گے، مگر اسی وقت آیتِ مذکورہ نازل ہوگئی، جس میں آخری درجہ میں مرد کے لئے عورت کی مار پیٹ کو بھی جائز قرار دے دیا ہے، اور اس پر مرد سے قصاص یا اِنتقام لینے کی اِجازت نہیں دی، آیت نازل ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلوا کر حق تعالیٰ کا حکم سنا دیا، اور اِنتقام لینے کا پہلا حکم منسوخ فرما دیا۔ [1]

آیت کے آخر میں اِرشاد فرمایا کہ ان تدابیر سہ گانہ کے ذریعہ اگر وہ تابع دار ہو جائیں تو پھر تم بھی چشم پوشی سے کام لو، معمولی باتوں پر اِلزام کی راہ نہ تلاش کرو، اور سمجھ لو کہ اللہ کی قدرت سب پر حاوی ہے۔

خلاصۂ مضمون

آیت سے بنیادی اُصول کی حیثیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلی آیات کے اِرشادات کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حقوق باہم متماثل ہیں، بلکہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا اس وجہ سے زیادہ اِہتمام کیا گیا ہے کہ وہ بہ نسبت مرد کے ضعیف ہیں، اپنے حقوق اپنی قوتِ بازو کے ذریعہ مرد سے حاصل نہیں کر سکتیں، لیکن اس مساوات کے یہ معنی نہیں کہ عورت و مرد میں کوئی تفاضل یا درجہ کا کوئی فرق ہی نہ ہو، بلکہ باقتضائے حکمت و اِنصاف دو سبب سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے:-

اوّل تو جنسِ مرد کو اپنے علمی اور عملی کمالات کے اِعتبار سے عورت کی جنس پر ایک خداداد فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، جس کا حصول جنسِ عورت کے لئے ممکن نہیں، افراد و احاد اور اِتفاقی واقعات کا معاملہ الگ ہے۔

دُوسرے یہ کہ عورتوں کی تمام ضروریات کا تکفل مرد اپنی کمائی اور اپنے مال سے کرتے ہیں۔ پہلا سبب وہبی غیر اِختیاری اور دُوسرا کسبی اور اِختیاری ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں سے بعض کو حاکم بعض کو محکوم بنانے کے لئے عقل و اِنصاف کی رُو سے دو چیزیں ضروری تھیں، ایک جس کو حاکم بنایا جائے اس میں علم و عمل کے

[1] التفسیر الکبیر للرازی تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۱۹۲

اعتبار سے حاکمیت کی صلاحیت، دُوسرے اس کی حاکمیت پر محکوم کی رضامندی، پہلا سبب مرد کی صلاحیت حاکمیت کو واضح کر رہا ہے، اور دُوسرا سبب محکوم کی رضامندی کو، کیونکہ بوقتِ نکاح جب عورت اپنے مہر اور نان نفقہ کے تکفل کی شرط پر نکاح کی اجازت دیتی ہے تو اس کی اس حاکمیت کو تسلیم اور منظور کرتی ہے۔

الغرض اس آیت کے پہلے جملہ میں خانگی اور عائلی نظام کا ایک بنیادی اُصول بتلایا گیا ہے کہ اکثر چیزوں میں مساواتِ حقوق کے باوجود مرد کو عورت پر ایک فضیلت حاکمیت کی حاصل ہے اور عورت محکوم وتابع ہے۔

اس بنیادی اُصول کے ماتحت عملی دُنیا میں عورتوں کے دو طبقے ہوگئے، ایک وہ جنھوں نے اس بنیادی اُصول اور اپنے معاہدہ کی پابندی کی اور مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرکے اس کی اطاعت کی۔ دُوسرے وہ جو اس اُصول پر پوری طرح قائم نہ رہا۔ پہلا طبقہ تو خانگی امن واطمینان کا خود ہی کفیل ہے، اس کو کسی اصلاح کی حاجت نہیں۔

دُوسرے طبقہ کی اِصلاح کے لئے آیت کے دُوسرے جملہ میں ایک ایسا مرتب نظام بتلایا گیا کہ جس کے ذریعہ گھر کی اِصلاح گھر کے اندر ہی ہوجائے اور میاں بیوی کا جھگڑا انہیں دونوں کے درمیان نمٹ جائے، کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہ ہو، اس میں مردوں کو خطاب کرکے اِرشاد فرمایا گیا کہ اگر عورتوں سے نافرمانی یا اطاعت میں کچھ کمی محسوس کرو تو سب سے پہلا کام یہ کرو کہ سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اِصلاح کرو، اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہوگیا، عورت ہمیشہ کے لئے گناہ سے اور مرد قلبی اذیت سے اور دونوں رنج وغم سے بچ گئے۔ اور اگر فہمائش سے کام نہ چلا تو دُوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کو تنبیہ کرنے اور اپنی ناراضی کا اِظہار کرنے کے لئے خود علیحدہ بستر پر سوؤ، یہ ایک معمولی سزا اور بہترین تنبیہ ہے، اس سے عورت متنبہ ہوگئی تو جھگڑا یہیں ختم ہوگیا۔ اور اگر وہ اس شریفانہ سزا پر بھی اپنی نافرمانی اور کج رَوِی سے باز نہ آئی تو تیسرے درجہ میں معمولی مار مارنے کی بھی اجازت دے دی گئی، جس کی حد یہ ہے کہ بدن پر اس مار کا اثر وزخم نہ ہو۔ مگر اس تیسرے درجہ کی سزا کے اِستعمال کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، بلکہ اِرشاد فرمایا کہ شریف اور بھلے لوگ ایسا نہیں کریں گے۔

بہرحال اس معمولی مار پیٹ سے بھی اگر معاملہ دُرست ہوگیا تب بھی مقصد حاصل ہوگیا، اس میں مردوں کو عورتوں کی اِصلاح کے لئے جہاں یہ تین اختیارات دیئے گئے وہیں آیت کے آخر میں یہ بھی اِرشاد فرمایا کہ: فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا یعنی اگر ان سہ نمبری تدبیروں سے وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو اَب تم بھی زیادہ بال کی کھال نہ نکالو، اور اِلزام تراشی میں مت لگو، بلکہ کچھ چشم پوشی سے کام لو اور خوب سمجھ لو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر تمہیں کچھ بڑائی دی ہے تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی تمہارے اُوپر بھی مسلط ہے، تم زیادتی کروگے تو اس کی سزا تم بھگتوگے۔

جھگڑا اگر طول پکڑ جائے تو دونوں طرف سے برادری کے حَکَم سے صلح کرائی جائے

یہ نظام تو وہ تھا کہ جس کے ذریعہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جائے، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا ہے، خواہ اس وجہ سے کہ عورت کی طبیعت میں تمرّد و سرکشی ہو، یا اس بنا پر کہ مرد کا قصور اور اس کی طرف سے بے جا تشدّد ہو، بہر حال اس صورت میں گھر کی بات کا باہر نکلنا تو لازمی ہے، لیکن عام عادت کے مطابق تو یہ ہوتا ہے کہ طرفین کے حامی ایک دُوسرے کو بُرا کہتے ہیں اور اِلزام لگاتے پھرتے ہیں، جس کا نتیجہ جانبین سے اِشتعال اور پھر دو شخصوں کی لڑائی خاندانی جھگڑے کی صورت اِختیار کر لیتی ہے۔

اس دُوسری آیت میں قرآنِ کریم نے اس فسادِ عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے حکامِ وقت، فریقین کے اولیاء اور حامیوں کو اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کر کے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اِشتعال بھی ختم ہو جائے اور اِلزام تراشی کے راستے بھی بند ہو جائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ نکل آئے، اور گھر کا جھگڑا اگر گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں ختم ہو جائے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے۔

وہ یہ کہ اَربابِ حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لئے دو حَکَم مقرّر کریں، ایک مرد کے خاندان سے، دُوسرا عورت کے خاندان سے، اور ان دونوں جگہ لفظ حَکَم سے تعبیر کر کے قرآنِ کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو ذِی علم بھی ہو اور دیانت دار بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک حَکَم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا، مقرّر کر کے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں۔ اب وہاں جا کر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اِختیارات کیا ہیں؟ قرآنِ کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا، البتہ آخر میں ایک جملہ یہ اِرشاد فرمایا: اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا یعنی اگر یہ دونوں حَکَم اِصلاحِ حال اور باہمی مصالحت کا اِرادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں اِمداد فرمادیں گے اور میاں بیوی میں اِتفاق پیدا کر دیں گے۔

اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں:-

اوّل تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حَکَم اگر نیک نیت ہوں اور دِل سے چاہیں کہ باہم صلح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی اِمداد ہوگی، کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے، اور ان کے ذریعہ دونوں

میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق ومحبت پیدا فرمادیں گے، اس کے نتیجہ سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جہاں باہمی مصالحت نہیں ہو پاتی تو دونوں حَکَمین میں سے کسی جانب اِخلاص کے ساتھ صلح جوئی میں کمی ہوتی ہے۔

دُوسری بات اس جملہ سے یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ان دونوں حَکَمین کے بھیجنے کا مقصد میاں بیوی میں صلح کرانا ہے، اس سے زیادہ کوئی کام حَکَمین کے بھیجنے کے مقصد میں شامل نہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ فریقین رضامند ہو کر انہیں دونوں حَکَموں کو اپنا وکیل، مختار یا ثالث بنادیں، اور یہ تسلیم کرلیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دوگے ہمیں منظور ہوگا، اس صورت میں یہ دونوں حَکَم کلی طور پر ان کے معاملہ کے فیصلہ میں مختار ہوجائیں گے، دونوں طلاق پر متفق ہوجائیں تو طلاق ہوجائے گی، دونوں مل کر خلع وغیرہ کی کوئی صورت طے کردیں تو وہی فریقین اور مرد کی جانب سے دیئے ہوئے اختیار کی بنا پر عورت کو طلاق دے دیں تو فریقین کو ماننا پڑے گی، سلف میں حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی یہی تحقیق ہے۔ (رُوح المعانی وغیرہ) [1]

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے سامنے ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، اس میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ ان دونوں حَکَموں کو اَز خود کوئی اِختیار بجز صلح کرانے کے نہیں ہے، جب تک فریقین ان کو کلی اِختیار نہ دے دیں۔ یہ واقعہ سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی اس طرح مذکور ہے:-

ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حَکَم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرّر کریں، جب یہ حَکَم تجویز کردیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟ سن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہوجاؤ تو ایسا ہی کرلو، اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہوسکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اِتفاق ہوجائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو۔ یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حَکَم قانونِ اِلٰہی کے موافق جو فیصلہ کردیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف، مجھے منظور ہے۔

لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حَکَم کو یہ اِختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کردیں۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں، تمہیں بھی ان حَکَمین کو ایسا ہی اِختیار دینا چاہئے جیسا عورت نے دے دیا۔ [2]

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۲۵، ۲۶ [2] السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۷ ص:۳۰۵

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدینؒ نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حَکَمین کا بااختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو بااختیار بنوایا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حَکَمین کا بااختیار ہونا اَمرِ شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضامند کرنے کی کوشش خود اس کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حَکَمین بااختیار نہیں ہوتے، ہاں! میاں بیوی ان کو مختار بنادیں تو بااختیار ہوجاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا، جس کے ذریعہ عدالت وحکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ برادریوں کی پنچایت میں ہوسکتا ہے۔

دُوسرے نزاعات میں بھی حَکَم کے ذریعہ مصالحت کرائی جائے

حضراتِ فقہاء نے فرمایا ہے کہ باہمی صلح کرانے کے لئے دو حَکَموں کے بھیجنے کی یہ تجویز صرف میاں بیوی کے جھگڑوں میں محدود نہیں، بلکہ دُوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور لینا چاہئے، خصوصاً جبکہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز و رشتہ دار ہوں، کیونکہ عدالتی فیصلوں سے وقتی جھگڑا تو ختم ہوجاتا ہے، مگر وہ فیصلے دِلوں میں کدورت وعداوت کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرمادیا تھا کہ:-

رُدُّوا الْقَضَاءَ بَيْنَ ذَوِي الْأَرْحَامِ حَتّٰى يَصْطَلِحُوْا فَإِنَّ فَصْلَ الْقَضَاءِ يُوْرِثُ الضَّغَائِنَ۔

(معین الحکّام) [1]

''رِشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں واپس کردو تاکہ وہ خود برادری کی اِمداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ دِلوں میں کینہ وعداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔''

فقہائے حنفیہ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب "معین الحکام" میں اور ابنِ شحنہ نے "لسان الحکام" میں اس فرمانِ فاروقی کو ایسے پنچائتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رِشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت وحکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دِلوں میں کدورت پیدا کردیا

[1] معين الحكام، الباب الرابع، فصل في سيرة القاضي في الأحكام ج:۱ ص:۵۷

کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے، کیونکہ باہمی کدورت اور عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ہے، اس لئے حکام اور قضاۃ کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کرلیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔

غرض ان دو آیتوں میں انسان کی خانگی اور عائلی زندگی کا ایک ایسا جامع اور مکمل نظام ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر اس پر پورا عمل ہو جائے تو دنیا کے اکثر جھگڑے اور جنگ وجدال مٹ جائیں، مرد اور عورتیں سب مطمئن ہو کر اپنی خانگی زندگی کو ایک جنت کی زندگی محسوس کرنے لگیں اور خانگی جھگڑوں سے جو قبائلی اور پھر جماعتی اور ملکی جھگڑے اور جنگیں کھڑی ہو جاتی ہیں ان سب سے امن ہو جائے۔

آخر میں پھر اس عجیب وغریب قرآنی نظام محکم پر ایک اجمالی نظر ڈالئے جو اس نے گھریلو جھگڑوں کے ختم کرنے کے لئے دنیا کو دیا ہے:-

۱- گھر کا جھگڑا گھر ہی میں تدریجی تدبیروں کے ساتھ چکا دیا جائے۔

۲- یہ صورت ممکن نہ رہے تو حکام یا برادری کے لوگ دو حکموں کے ذریعہ ان میں مصالحت کرا دیں تاکہ گھر میں نہیں تو خاندان ہی کے اندر محدود رہ کر جھگڑا ختم ہو سکے۔

۳- جب یہ بھی ممکن نہ رہے تو آخر میں معاملہ عدالت تک پہنچے، وہ دونوں کے حالات ومعاملات کی تحقیق کرکے عادلانہ فیصلہ کرے۔

آخر آیت میں اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾ فرما کر دونوں حکموں کو بھی متنبہ فرما دیا کہ تم کوئی بے انصافی یا کج روی کرو گے تو تم کو بھی ایک علیم وخبیر سے سابقہ پڑنا ہے، اس کو سامنے رکھو۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ

اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ، بے شک اللہ کو

لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا۔ جو کہ بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

بخل اور چھپاتے ہیں جو اُن کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے، اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لئے

عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ

عذاب ذلت کا۔ اور وہ لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کے دکھانے کو اور ایمان نہیں لاتے

بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر، اور جس کا ساتھی ہوا شیطان تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نیز رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب والے پڑوسی، دور والے پڑوسی، ساتھ بیٹھے (یا ساتھ کھڑے) ہوئے شخص اور راہ گیر کے ساتھ اور اپنے غلام باندیوں کے ساتھ بھی (اچھا برتاؤ رکھو)۔ بیشک اللہ کسی اِترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۳۶﴾ ایسے لوگ جو خود بھی کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی تلقین کرتے ہیں، اور اللہ نے ان کو اپنے فضل سے جو کچھ دے رکھا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ اور ہم نے ایسے ناشکروں کے لئے ذلیل کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور وہ لوگ جو اپنے مال لوگوں کو دِکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں، اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ روزِ آخرت پر۔ اور شیطان جس کا ساتھی بن جائے تو وہ بدترین ساتھی ہوتا ہے۔ ﴿۳۸﴾

ربطِ آیات

سورۂ نساء کی تفسیر میں آپ دیکھتے آئے ہیں کہ اس سورت میں حقوق العباد کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، شروع سورت سے یہاں تک عام انسانی حقوق کی اہمیت کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا اہتمام اور ان میں کوتاہی پر سزا، وعید اور اس دُنیا میں جو اُن کی دو صنف ضعیف یعنی بچوں اور عورتوں کے ساتھ ظلم رَوا رکھا گیا اور ظالمانہ رسمیں اختیار کی گئیں ان کی اِصلاح کا، اور پھر وراثت کے حقوق کا بیان آیا ہے، اس کے بعد والدین اور دُوسرے رشتہ داروں اور تعلق داروں اور پڑوسیوں اور عام اِنسانوں کے حقوق کا کچھ تفصیلی بیان آرہا ہے، اور چونکہ ان حقوق کو علیٰ سبیل الکمال وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اور قیامت کے ساتھ عقیدہ دُرست رکھتا ہو، نیز بخل، کبر اور رِیا سے بھی بچتا ہو، اس لئے کہ یہ اُمور بھی اَدائے حقوق میں مانع ہوتے ہیں، اس لئے ان آیات میں توحید اور ترغیب و ترہیب کے کچھ مضامین اِرشاد فرمائے، اور شرک، اِنکارِ قیامت، عصیانِ رسول اور بخل وغیرہ اَخلاقِ ذمیمہ کی مذمت بھی ذِکر فرمائی۔

خلاصۂ تفسیر

اور تم اللہ کی عبادت اِختیار کرو (اس میں توحید بھی آگئی) اور اس کے ساتھ کسی چیز کو (خواہ وہ اِنسان ہو یا غیر انسان عبادت میں یا ان کی خاص صفات میں، اِعتقاد میں) شریک مت کرو اور (اپنے) والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور (دُوسرے) اہلِ قرابت کے ساتھ بھی، اور یتیموں کے ساتھ بھی، اور غریب غرباء کے ساتھ بھی، اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور دُور والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور ہم مجلس کے ساتھ بھی (خواہ وہ مجلس دائمی ہو جیسے سفرِ طویل کی رفاقت اور کسی مباح کام میں شرکت، یا عارضی ہو جیسے سفرِ قصیر، یا اِتفاقی جلسہ میں شرکت) اور راہ گیر کے ساتھ بھی (خواہ وہ تمہارا خاص مہمان ہو یا نہ ہو) اور ان (غلام لونڈیوں) کے ساتھ بھی جو (شرعاً) تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں (غرض ان سب سے خوش معاملگی کرو جس کی تفصیل شرع نے دُوسرے موقع پر بتلادی ہے، اور جو لوگ ان حقوق کو اَدا نہیں کرتے اکثر اس کے کئی سبب ہیں، یا تو ان کے مزاج میں تکبر ہے، کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اور کسی کی طرف اِلتفات ہی نہیں کرتے، اور یا ان کی طبیعت میں بخل غالب ہے کہ کسی کو دیتے دِلاتے جان نکلتی ہے، اور یا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِعتقاد نہیں کہ آپ کے اَحکام کو اور اَدائے حقوق کے ثواب کے وعدوں کو اور اِتلافِ حقوق کے عذاب کی وعیدوں کو صحیح نہیں سمجھتے، اور یہ کفر ہے، اور یا ان کی عادت نمائش اور نام و نمود کی ہے، اس لئے جہاں نمود ہو وہاں دیتے دلاتے ہیں گو حق نہ ہو،

اور جہاں نمود نہ ہو وہاں ہمت نہیں ہوتی گو حق ہو، اور یا ان کو سرے سے خدا تعالیٰ ہی کے ساتھ عقیدہ نہیں، یا وہ قیامت کے قائل نہیں، اور یہ بھی کفر ہے، اس لئے اسی ترتیب سے جو ان اُمور کا اِنفراداً یا اِجتماعاً اِرتکاب کرتے ہیں ان کا حال بھی سن لو کہ) بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو (دِل میں) اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے) شیخی کی باتیں کرتے ہوں، جو کہ بخل کرتے ہوں اور دُوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں (خواہ زبان سے یا اس طرح سے کہ ان کو دیکھ کر دُوسرے یہی تعلیم پاتے ہیں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے (اس سے مراد یا مال و دولت ہے جبکہ بلا مصلحت حفاظت کے محض بخل کی وجہ سے چھپاوے کہ اہلِ حقوق ان سے توقع ہی نہ کریں، یا مراد علمِ دِین ہے کہ یہود اَخبارِ رِسالت کو چھپایا کرتے تھے، پس بخل بھی عام ہو جاوے گا، پس اس میں بخلاء و منکرینِ رِسالت دونوں آ گئے) اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے (جو نعمتِ مال یا نعمتِ بعثتِ رسول کی حق شناسی نہ کریں) اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے، اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دِکھلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دِن (یعنی قیامت کے دن) پر اِعتقاد نہیں رکھتے (ان کا بھی یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت نہیں) اور (بات یہ ہے کہ) شیطان جس کا مصاحب ہو (جیسا ان مذکور لوگوں کا ہوا ہے) تو وہ اس کا بُرا مصاحب ہے (کہ ایسا مشورہ دیتا ہے جس میں انجامِ کار سخت ضرر ہو)۔

معارف و مسائل

حقوق کے بیان سے پہلے توحید کا ذِکر کیوں؟

حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اِطاعت و عبادت اور توحید کا مضمون اس طرح اِرشاد فرمایا گیا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا یعنی ”اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ ٹھہراؤ۔“

بیانِ حقوق سے پہلے مضمونِ عبادت اور توحید کو ذِکر کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ کا خوف اور اس کے حقوق کا اِہتمام نہ ہو تو اس سے دُنیا میں اور کسی کے حقوق کے اِہتمام کی کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے؟ برادری، سوسائٹی کی شرم یا حکومت کے قانون سے بچنے کے لئے ہزاروں راہیں ڈھونڈ لیتا ہے، وہ چیز جو اِنسان کو اِنسانی حقوق کے اِحترام پر حاضر و غائب مجبور کرنے والی ہے وہ صرف خوفِ خدا اور تقویٰ ہے، اور یہ خوف و تقویٰ صرف توحید ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اس لئے مختلف تعلقات اور رِشتہ داروں کے حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید و عبادت کی یاد دہانی مناسب تھی۔

توحید کے بعد والدین کے حقوق کا ذِکر

اس کے بعد تمام رِشتہ داروں اور تعلق والوں میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کا بیان فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنے حقوق کے متصل والدین کے حقوق کو بیان فرما کر اس طرف بھی اِشارہ کر دیا کہ حقیقت اور اصل کے اِعتبار سے تو سارے اِحسانات و اِنعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، لیکن ظاہری اسباب کے اِعتبار سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ اِحسانات اِنسان پر اس کے والدین کے ہیں، کیونکہ عام اسباب میں وہی اس کے وجود کا سبب ہیں، اور آفرینش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک جتنے کٹھن مراحل ہیں ان سب میں بظاہر اسباب ماں باپ ہی اس کے وجود اور پھر اس کے بقا و اِرتقا کے ضامن ہیں، اسی لئے قرآنِ کریم میں دُوسرے مواقع میں بھی ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و اِطاعت کے متصل بیان فرمایا گیا ہے، ایک جگہ اِرشاد ہے:-

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ (لقمان:۱۴)

''یعنی میرا شکر کرو اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔''

دُوسری جگہ اِرشاد ہے:-

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (البقرۃ:۸۳)

ان دونوں آیتوں میں والدین کے معاملہ میں یہ نہیں فرمایا کہ ان کے حقوق ادا کرو، یا ان کی خدمت کرو، بلکہ لفظ ''اِحسان'' لایا گیا، جس کے عام مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسبِ ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کریں، اور یہ بھی داخل ہے کہ جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق جسمانی خدمات انجام دیں، یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو میں سخت آواز یا بہت زور سے نہ بولیں جس سے ان کی بے ادبی ہو، کوئی ایسا کلمہ نہ کہیں جس سے ان کی دِل شکنی ہو، اُن کے دوستوں اور تعلق والوں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے والدین کی دِل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کے لئے جو صورتیں اِختیار کرنی پڑیں وہ سب کریں، یہاں تک کہ اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو جب بھی اولاد کے لئے بدسلوکی کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس وصیتیں فرمائی تھیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے، دُوسرے یہ کہ والدین کی نافرمانی یا دِل آزاری نہ کرو اگرچہ وہ یہ حکم دیں کہ تم اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دو۔ (مسندِ احمد) [1]

[1] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۰۶۰ حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات میں جس طرح والدین کی اِطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکیدات وارِد ہیں، اسی طرح اس کے بے اِنتہا فضائل اور درجاتِ ثواب بھی مذکور ہیں۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو، اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے۔ [۱]

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔ [۲]

''شعب الایمان'' میں بیہقی نے روایت کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا اپنے والدین کا مطیع و فرمانبردار ہو، جب وہ اپنے والدین کو عزّت و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو ہر نظر میں اس کو حجِ مقبول کا ثواب ملتا ہے۔ [۳]

بیہقی ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دِل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دُنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔ [۴]

قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

آیت میں والدین کے بعد عام ذَوِی الْقُرْبٰی یعنی تمام رِشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید آئی ہے، قرآنِ کریم کی ایک جامع اور مشہور آیت میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى یعنی ''اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں سب کے ساتھ اِنصاف اور حسنِ سلوک کا اور رِشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا۔'' جس میں رشتہ داروں کی حسبِ اِستطاعت مالی اور جانی خدمت بھی داخل ہے اور ان سے ملاقات وخبر گیری بھی۔

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں فقیروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور اگر اپنے ذِی رحم رِشتہ داروں کو دِیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں، ایک صدقہ کا دُوسرا صلہ رحمی کا، یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا۔ (مسندِ احمد، نسائی، ترمذی) [۵]

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب من احب إلخ ج:۱ ص:۲۷۷، وصحیح مسلم ج:۲ ص:۳۱۵ کتاب البر والصلة إلخ، باب صلة الرحم إلخ۔

[۲] جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین ج:۲ ص:۱۲

[۳] شعب الإیمان، باب الخامس والخمسون رقم الحدیث:۷۸۵۶

[۴] شعب الإیمان للبیهقی، باب الخامس والخمسون رقم الحدیث:۷۸۹۰

[۵] مسند احمد، حدیث سلمان بن عامر رضی الله عنه رقم الحدیث:۱۵۶۳۶ وسنن النسائی، کتاب الزکاة، باب الصدقة علی الأقارب ج:۱ ص:۳۶۱۔ وجامع الترمذی، ابواب الزکاة، باب ما جاء فی الصدقة علی ذی القرابة ج:۱ ص:۱۴۲، ۱۴۳

آیت مذکورہ میں اوّل والدین کے حقوق کی تاکید فرمائی پھر عام رشتہ داروں کی۔

یتیم اور مسکین کا حق

تیسرے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ یتیموں اور مساکین کے حقوق کا مفصل بیان اگرچہ شروع سورت میں آچکا ہے، مگر اس کی یاددہانی رشتہ داروں کے ضمن میں فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ لاوارث بچوں اور بے کس لوگوں کی امداد و اعانت کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھیں جیسا اپنے رشتہ داروں کے لئے کرتے ہیں۔

پڑوسی کا حق

چوتھے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی اور پانچویں نمبر میں: وَالْجَارِ الْجُنُبِ "جار" کے معنی پڑوسی کے ہیں، اس آیت میں دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک "جَارِ ذِی الْقُرْبٰی" دُوسرے "جَارِ جُنُبِ" ان دو قسموں کی تفسیر و تشریح میں صحابہ کرامؓ کے مختلف اقوال ہیں۔

عام مفسرین نے فرمایا کہ "جَارِ ذِی الْقُرْبٰی" سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمہارے مکان کے متصل رہتا ہے، اور "جَارِ جُنُبِ" سے وہ پڑوسی مراد ہے جو تمہارے مکان سے کچھ فاصلہ پر رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "جَارِ ذِی الْقُرْبٰی" سے وہ شخص مراد ہے جو پڑوسی بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس طرح اس میں دو حق جمع ہوگئے، اور "جَارِ جُنُبِ" سے مراد وہ ہے جو صرف پڑوسی ہے رشتہ دار نہیں،[1] اس لئے اس کا درجہ پہلے سے مؤخر رکھا گیا۔

بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ "جَارِ ذِی الْقُرْبٰی" وہ پڑوسی ہے جو اسلامی برادری میں داخل اور مسلمان ہے، اور "جَارِ جُنُبِ" سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔

الفاظِ قرآن ان سب معانی کو محتمل ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجہ میں فرق ہو جانا اَمرِ معقول ہے، اور معتبر ہے، اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا غیر، مسلم ہو یا غیر مسلم، بہرحال اس کا حق ہے بقدرِ استطاعت کے امداد و اعانت اور خبر گیری لازم ہے۔

البتہ جس کا حق علاوہ پڑوسی کے دُوسرا بھی ہے وہ دُوسرے پڑوسیوں سے درجہ میں مقدم ہے، ایک حدیث میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واضح فرمادیا، ارشاد فرمایا کہ "بعض پڑوسی وہ ہیں جن کا صرف ایک حق ہے، بعض وہ

[1] تفسیر ابن ابی حاتم تحت هذه الآیة رقم الحدیث: ۵۳۳۵ و۵۳۳۸، و شعب الإیمان رقم الحدیث: ۹۲۰۴ فصل فیما یقول العاطس إلخ۔

ہیں جن کے دوحق ہیں، اور بعض وہ جن کے تین ہیں، ایک حق والا پڑوسی وہ غیر مسلم ہے جس سے کوئی رِشتہ داری بھی نہیں، دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلمان بھی ہے، تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی اور رِشتہ دار بھی۔" (ابن کثیر) [۱]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ جبریلِ امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کی رعایت و اِمداد کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رِشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کردیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم) [۲]

ترمذی اور مسندِ احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی محلّہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔ [۳]

مسندِ احمد کی ایک حدیث میں اِرشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ [۴]

ہم نشین کا حق

چھٹے نمبر میں اِرشاد فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ اس کے لفظی معنی "ہم پہلو ساتھی" کے ہیں، جس میں رفیقِ سفر بھی داخل ہے جو ریل میں، جہاز میں، بس میں، گاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔

شریعتِ اسلام نے جس طرح نزدیک و دُور کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق واجب فرمائے، اسی طرح اس شخص کا بھی حقِ صحبت لازم کردیا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم و غیر مسلم اور رِشتہ دار و غیر رِشتہ دار سب برابر ہیں، اس کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو اِیذا نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دِل آزاری ہو، کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دُھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں، اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہوجائے۔

قرآنِ کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے جھگڑے ختم ہوجائیں، ہر شخص

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۳۰۰، ومجمع الزوائد رقم الحديث:۱۳۵۳۶

[۲] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الوصاية بالجار ج:۲ ص:۸۸۹، وصحيح مسلم كتاب البر والصلة، باب الوصية بالجار إلخ ج:۲ ص:۳۲۹

[۳] جامع الترمذي، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في حق الجار ج:۱ ص:۱۶ ومسند احمد، مسند عبدالله بن عمرو رضي الله عنهما رقم الحديث:۶۲۷۸

[۴] مسند احمد، اول مسند عمر بن الخطاب رضي الله عنه رقم الحديث:۳۶۷

اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے، اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں، دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔

بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ صاحب بالجنب میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک ہے، صنعت مزدوری میں، دفتر کی ملازمت میں، سفر میں، حضر میں۔ (رُوح المعانی)[1]

راہ گیر کا حق

ساتویں نمبر میں اِرشاد فرمایا: وَابْنِ السَّبِيْلِ لا یعنی راہ گیر، اس سے مراد وہ شخص ہے جو دورانِ سفر آپ کے پاس آجائے، یا آپ کا مہمان ہو جائے، چونکہ اس اجنبی شخص کا کوئی تعلق والا یہاں نہیں ہے، تو قرآن نے اس کے اسلامی، بلکہ اِنسانی تعلق کی رعایت کر کے اس کا حق بھی آپ پر لازم کر دیا، کہ بقدرِ وسعت واستطاعت اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

غلام، باندی اور ملازموں کا حق

آٹھویں نمبر میں اِرشاد فرمایا: وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ جس سے مراد مملوک غلام اور باندیاں ہیں، ان کا بھی یہ حق لازم کر دیا گیا کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کریں، استطاعت کے موافق کھلانے پلانے، پہنانے میں کوتاہی نہ کریں، اور نہ ان کی طاقت سے زیادہ کام اُن پر ڈالیں۔

اگرچہ الفاظِ آیت کا صریح مدلول مملوک اور غلام اور باندیاں ہیں، لیکن اِشتراکِ علت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات کی بنا پر یہ اَحکام نوکروں اور ملازموں پر بھی حاوی ہیں کہ ان کا بھی یہی حق ہے کہ مقررّہ تنخواہ اور کھانا وغیرہ دینے میں بخل اور دیر نہ کریں، اور ان کی طاقت سے زیادہ اُن پر کام نہ ڈالیں۔

حقوق میں کوتاہی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دِلوں میں تکبر ہو

آخرِ آیت میں اِرشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿٣٦﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو تکبر اور دُوسروں پر اپنی بڑائی جتانے والا ہو۔''

آیت کا یہ آخری جملہ پچھلے تمام اِرشادات کا تکملہ ہے کہ پچھلے آٹھ نمبروں میں جن لوگوں کے حقوق کی تاکید آئی ہے اس میں کوتاہی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دِلوں میں تکبر اور فخر وغرور ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۴ ص:۴۸

تکبر اور جاہلی تفاخر کی وعید میں بہت سی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں:-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِيْمَانٍ وَّلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اَحَدٌ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)[1]

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جہنم میں (ہمیشہ کے لئے) نہیں جائے گا جس کے دِل میں رائی کے دانہ کے برابر اِیمان ہو، اور جنت میں ایسا کوئی شخص نہیں جاسکے گا جس کے دِل میں رائی کے دانہ کے مقدار تکبر ہو۔''

ایک اور حدیث جس میں کبر کی تعریف بھی مذکور ہے:-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ، فَقَالَ رَجُلٌ: اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنًا، قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)[2]

''حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوسکے گا جس کے دِل میں ذرّہ برابر تکبر ہو۔ حاضرین میں سے ایک آدمی نے سوال کیا: لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں، ان کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں اور جمال کو پسند بھی فرماتے ہیں، تکبر نام ہے حق رَدّ کرنے کا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا۔''

اس کے بعد اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ میں بیان ہے کہ جو لوگ متکبرین ہوتے ہیں وہ حقوقِ واجبہ میں بھی بخل کرتے ہیں، اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے اور دُوسروں کو بھی اپنے قول و عمل سے اس بُری صفت کو اِختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

آیت میں ''بخل'' کا لفظ آیا ہے، جس کا اِطلاق عرفِ عام میں حقوقِ مالیہ کے اندر کوتاہی کرنے پر ہوتا ہے، لیکن آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بخل کا لفظ عام معنی میں اِستعمال کیا گیا ہے، جو بخل بالمال اور بخل بالعلم دونوں کو شامل ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الآداب ج:۲ ص:۴۳۳، باب الغضب والکبر۔

[2] بحوالۂ بالا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یہودِ مدینہ کے حق میں نازل ہوئی تھی، یہ لوگ بہت زیادہ مغرور تھے، اِنتہا درجہ کے کنجوس تھے، مال خرچ کرنے میں بھی بخل کرتے تھے، اور اس علم کو بھی چھپاتے تھے جو انہیں اپنی اِلہامی کتابوں سے حاصل ہوا تھا، ان کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت تھی، اور آپ کی علامات کا بھی ذِکر تھا، لیکن یہود نے ان سب کا یقین کر لینے کے بعد بھی بخل سے کام لیا، نہ خود اس علم کے تقاضے پر عمل کیا اور نہ دُوسروں کو بتلایا کہ وہ عمل کرتے۔

آگے فرمایا کہ ایسے لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے مال و دولت میں بھی بخل کرتے ہیں اور علم و ایمان کے معاملہ میں بھی بخیل ہیں، ایسے لوگ نعمتِ خداوندی کے ناسپاس ہیں اور ان کے لئے اہانت آمیز عذاب تیار کرلیا گیا ہے۔

اِنفاق کی فضیلت اور بخل کی مذمت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ يَوْمٍ يُّصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَيَقُوْلُ الْاٰخَرُ: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا۔ (بخاری ومسلم) [۱]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے: اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما۔ اور دُوسرا کہتا ہے: اے اللہ! بخیل کو (مال و دولت کی) تباہی سے ہمکنار کر۔''

عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَنْفِقِيْ وَلَا تُحْصِيْ فَيُحْصِي اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِي اللّٰهُ عَلَيْكِ وَارْضَخِيْ مَا اسْتَطَعْتِ۔ (بخاری ومسلم) [۲]

''حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اسماء! خیر کے راستے میں خرچ کیا کر اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کردے گا، اور اِنفاق سے بچنے کے لئے بہت زیادہ حفاظت نہ برتو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا شروع کردے گا، اور کم از کم جو تجھ سے ہوسکے اس کے دینے سے دریغ نہ کر۔''

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلسَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِّنَ اللّٰهِ، قَرِيْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، قَرِيْبٌ مِّنَ النَّاسِ، بَعِيْدٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِّنَ اللّٰهِ، بَعِيْدٌ

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللہ تعالیٰ فأمّا من اعطی إلخ ج:۱ ص:۱۹۴، وصحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب مثل المنفق الممسک ص:۳۲۸

[۲] صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ فیما استطاع ج:۱ ص:۱۹۳، وصحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الإنفاق إلخ ج:۱ ص:۳۳۱

مِّنَ الْجَنَّةِ، بَعِيْدٌ مِّنَ النَّاسِ، قَرِيْبٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْجَاهِلُ السَّخِيُّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيْلٍ۔ (ترمذی) [1]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سخی اللہ سے بھی قریب ہے، جنت سے بھی قریب ہے، اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے، اور جہنم کی آگ سے دُور ہے، اور بخیل اللہ سے بھی دُور ہے، جنت سے بھی دُور ہے، لوگوں سے بھی دُور ہے، اور آگ سے قریب ہے، اور جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو اَدا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اِہتمام کرتا ہو) اس کنجوس سے بہتر ہے جو عبادت گزار ہو۔''

وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ: اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ۔ (ترمذی) [2]

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو عادتیں کسی مؤمن میں جمع نہیں ہوتیں: بخل اور بداَخلاقی۔''

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ سے متکبرین کی ایک دُوسری صفت بتلادی کہ یہ لوگ اللہ کے راستے میں خود بھی خرچ نہیں کرتے، اور دُوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، البتہ لوگوں کے دِکھانے کو خرچ کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ یہ لوگ اللہ اور آخرت کے دِن پر اِیمان نہیں رکھتے، اس لئے اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو شیطان کے ساتھی ہیں، لہٰذا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو اُن کے ساتھی شیطان کا ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوقِ واجبہ میں کوتاہی کرنا، بخل کرنا معیوب ہے، اسی طرح لوگوں کو دِکھانے کے لئے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے، وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے دِکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عنداللہ مقبول نہیں ہوتا، اور حدیث میں اسے شرک قرار دِیا گیا ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِيْهِ مَعِیَ غَيْرِیْ تَرَكْتُهٗ وَشِرْكَهٗ۔ [3]

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی

---

[1] جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی السخاء ج:۲ ص:۱۷

[2] جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی البخیل ج:۲ ص:۱۷ [3] صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب تحریم الریاء ج:۲ ص:۴۱۱

دُوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے، تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں، اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔''

وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ۔ (احمد بحواله مشکوٰۃ)[1]

''شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس نے نماز پڑھی دِکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دِکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دِکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا۔''

عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ؟ قَالَ: اَلرِّيَاءُ۔ (احمد بحواله مشکوٰۃ)[2]

''محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرکِ اصغر کا ہے، صحابہؓ نے پوچھا: شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ریا۔''

اور بیہقی کی روایت میں یہ بھی اِضافہ ہے کہ قیامت کے دن جب اعمالِ صالحہ کا ثواب تقسیم ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ریا کرنے والوں سے فرمائیں گے:-

''ان لوگوں کے پاس چلے جاؤ جن کو دِکھانے کے لئے تم دُنیا میں نیک عمل کرتے تھے، اور دیکھ لو کہ کیا ان کے پاس تمہارے اعمال کا ثواب اور اس کی جزا ہے۔''[3]

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ط

اور کیا نقصان تھا ان کا اگر اِیمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دِن پر اور خرچ کرتے اللہ کے دیئے ہوئے میں سے،

[1] مسند احمد، حديث شداد بن اوس رضى الله عنه رقم الحديث: ١٦٥١٧

[2] مسند احمد، حديث محمود بن لبيد رضى الله عنه رقم الحديث: ٢٢٥٢٣

[3] شعب الإيمان للبيهقي، الخامس والأربعون من شعب الإيمان رقم الحديث: ٦٥٦٣

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ

اور اللہ کو ان کی خوب خبر ہے۔ بے شک اللہ حق نہیں رکھتا کسی کا ایک ذرّہ برابر، اور اگر

تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا

نیکی ہو تو اس کو دُونا کر دیتا ہے اور دیتا ہے اپنے پاس سے بڑا ثواب۔ پھر کیا حال ہوگا جب بلاویں گے ہم

مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ؕ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ہر اُمت میں سے اَحوال کہنے والا اور بلاویں گے تجھ کو ان لوگوں پر اَحوال بتانے والا۔ اس دِن آرزو کریں گے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ

وہ لوگ جو کافر ہوئے تھے اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ برابر ہوجاویں زمین کے، اور نہ چھپا سکیں گے

اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ ع ع ۶

اللہ سے کوئی بات۔

آسان ترجمۂ قرآن

بھلا ان کا کیا بگڑ جاتا اگر یہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لے آتے، اور اللہ نے ان کو جو رِزق عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ (نیک کاموں میں) خرچ کر دیتے؟ اور اللہ کو ان کا حال خوب معلوم ہے ﴿۳۹﴾ اللہ ذرّہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور اگر کوئی نیکی ہو تو اسے کئی گنا کر دیتا ہے، اور خود اپنے پاس سے عظیم ثواب دیتا ہے ﴿۴۰﴾ پھر (یہ لوگ سوچ رکھیں کہ) اس وقت (ان کا) کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے، اور (اے پیغمبر!) ہم تم کو اِن لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں گے؟ ﴿۴۱﴾ جن لوگوں نے کفر اَپنا رکھا ہے اور رسول کے ساتھ نافرمانی کا رویہ اِختیار کیا ہے، اُس دن وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش انہیں زمین (میں دھنسا کر اُس) کے برابر کر دیا جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔ ﴿۴۲﴾

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں اِنکارِ خدا، اِنکارِ آخرت، اور بخل وغیرہ کی مذمت مذکور تھی اور ان آیات میں خدا و آخرت پر ایمان اور اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب مذکور ہے، اور آخر میں مواقفِ حشر کا بیان کر کے ان لوگوں کو اَنجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور نہ نیک عمل کرتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جاوے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دِن (یعنی قیامت) پر ایمان لے آویں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دِیا ہے اس میں سے کچھ (اخلاص کے ساتھ) خرچ کرتے رہا کریں (یعنی کچھ بھی ضرر نہیں ہر طرح نفع ہی نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ ان (کے نیک و بد) کو خوب جانتے ہیں (پس ایمان و اِنفاق پر ثواب دیں گے اور کفر وغیرہ پر عذاب) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرّہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے (کہ کسی کا ثواب مارلیں یا بے وجہ عذاب دینے لگیں جو کہ ظاہراً ظلم ہے) اور (بلکہ وہ تو ایسے رحیم ہیں کہ) اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا (کر کے ثواب دیں گے، جیسا کہ دُوسری آیت میں وعدہ مذکور ہے) اور (اس ثوابِ موعود کے علاوہ) اپنے پاس سے (بلا معاوضۂ عمل بطورِ انعام اور) اَجرِ عظیم (الگ) دیں گے، سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہر ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر (جن کا آپ سے سابقہ ہوا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر لاویں گے (یعنی جن لوگوں نے خدائی اَحکام دُنیا میں نہ مانے ہوں گے، ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام کے اِظہارات سنے جاویں گے، جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے سب ظاہر کر دیں گے، اس شہادت کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہو کر سزا دی جائے گی، اُوپر فرمایا تھا کہ اس وقت کیا حال ہوگا، آگے اس حال کو خود بیان فرماتے ہیں کہ) اس روز (یہ حال ہوگا کہ) جن لوگوں نے (دُنیا میں) کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش (اس وقت) ہم زمین کے پیوند ہو جاویں (تاکہ اس رُسوائی اور آفت سے محفوظ رہیں) اور (گواہی کے علاوہ خود وہ اِقراری مجرم بھی ہوں گے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا (جو ان سے دُنیا میں صادر ہوئی تھیں) اِخفا نہ کر سکیں گے (پس دونوں طور پر فردِ قرارداد جرم ان پر لگادی جائے گی)۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں فرمایا: وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ یعنی ان کو کیا نقصان پہنچ جائے اور کیا مصیبت پیش آجائے

اگر یہ لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کریں، یہ سب آسان کام ہیں، ان کے اختیار کرنے میں کچھ بھی تکلیف نہیں، پھر کیوں نافرمان بن کر آخرت کی تباہی اپنے سر لے رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اعمالِ حسنہ کا ثواب اور جزائے خیر میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں فرماتے، بلکہ اپنی طرف سے اس میں اور اضافہ فرمادیتے ہیں، اور آخرت میں چند در چند ثواب بڑھا کر نوازیں گے، اور اپنی طرف سے ثوابِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک نیکی کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور اس کے علاوہ مختلف بہانوں سے اِضافہ در اِضافہ ہوتا رہتا ہے، بعض روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب بیس لاکھ گنا تک زیادہ ہوجاتا ہے، اور اللہ کی ذات تو کریم ذات ہے، وہ اپنی بے پایاں رحمت سے اتنا بڑھا کردے دیتے ہیں کہ حساب وشمار میں بھی نہیں آتا، وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ (البقرۃ:۲۶۱) اس اَجرِ عظیم کا کیا تصوّر کیا جاسکتا ہے جو بارگاہِ رَبّ العزّت سے ملتا ہے وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۴۰ -

آیت میں جو لفظ ذَرَّۃٍ آیا ہے، اس کا ایک ترجمہ تو معروف ہی ہے، جو ماقبل میں گزر چکا، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ ذرّہ لال رنگ کی سب سے چھوٹی چیونٹی کو کہا جاتا ہے، اہلِ عرب کم وزن اور حقیر ہونے میں اس کو بطورِ مثال پیش کیا کرتے تھے۔

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ سے میدانِ آخرت کے اِستحضار کی طرف توجہ دِلائی گئی ہے، اور کفارِ قریش کی توبیخ بھی مقصود ہے۔

ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب میدانِ حشر میں ہر ہر اُمت کا نبی اپنی اُمت کے نیک وبداَعمال پر بطورِ گواہ پیش ہوگا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی اُمت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے، اور بطورِ خاص ان کفار ومشرکین کے متعلق خدائی عدالت میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے کھلے کھلے معجزات دیکھ کر بھی تکذیب کی، اور آپ کی وحدانیت اور میری رسالت پر اِیمان نہ لائے۔

بخاری شریف میں رِوایت ہے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: مجھے قرآن سناؤ! حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں حالانکہ قرآن آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں پڑھو! میں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کردی، اور جب فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ پر پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ اب بس کرو، اور جب میں نے آپ کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ [1]

[1] صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب قول المقرئ إلخ ج:۲ ص:۷۵۵

علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت سے آخرت کا منظر متحضر ہوگیا، اور اپنی اُمت کے کوتاہ عمل اور بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا اس لئے آنسو مبارک جاری ہوگئے۔

فائدہ:۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ زمانۂ رسالت میں موجود کفار و منافقین کی طرف ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ قیامت تک کی پوری اُمت کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے اعمال آپ پر پیش ہوتے رہتے ہیں۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ اُمتوں کے انبیاء اپنی اپنی اُمت پر بطورِ گواہ پیش ہوں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی اُمت کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ قرآنِ کریم کے اس اُسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی اُمت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآنِ کریم میں اس کا اور اس کی شہادت کا بھی ذکر ہوتا، اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوّت کی دلیل بھی ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں میدانِ آخرت میں کافروں کی بدحالی کا ذکر ہے، کہ یہ لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش! ہم زمین کا پیوند بن گئے ہوتے، کاش! زمین پھٹ جاتی اور ہم اس میں دھنس کر مٹی بن جاتے، اور وقت کی پوچھ گچھ اور عذاب وحساب سے نجات پا جاتے۔

میدانِ حشر میں جب کفار دیکھیں گے کہ تمام جانور ایک دُوسرے کے مظالم کا بدلہ لینے دینے کے بعد مٹی بنا دیئے گئے تو ان کو حسرت ہوگی اور تمنا کریں گے کہ کاش! ہم بھی مٹی ہوجاتے، جیسا کہ سورۂ نبأ میں فرمایا: وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

آخر میں فرمایا: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ یعنی یہ کفار اپنے عقائد و اعمال سے متعلق کچھ بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے، ان کے ہاتھ پیر اقرار کریں گے، انبیاء علیہم السلام گواہی دیں گے اور اعمال ناموں میں بھی سب کچھ موجود ہوگا۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ قرآنِ کریم میں ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ کفار کچھ بھی نہ چھپائیں گے، اور دُوسری جگہ یہ ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الانعام) کہ ہم نے شرک نہیں کیا۔ بظاہر ان دو آیتوں میں تعارض ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ ہوگا یوں کہ جب شروع میں کفار یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے سوا جنت میں کوئی جاتا ہی نہیں تو وہ یہ طے کرلیں گے کہ ہمیں اپنے شرک اور اعمالِ بد کا انکار ہی کردینا چاہئے، ہوسکتا ہے اس طرح ہم نجات پاجائیں، لیکن اس انکار کے بعد خود ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے، اور چھپانے کا جو مقصود انہوں نے بنایا تھا اس میں بالکل ناکام ہوجائیں گے، اس وقت سب اقرار کرلیں گے، اس لئے فرمایا: وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ کچھ بھی نہیں چھپا سکیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا

اے ایمان والو! نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ سمجھنے لگو

مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ

جو کہتے ہو، اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک کہ غسل کرلو، اور اگر تم

مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ

مریض ہو یا سفر میں یا آیا ہے کوئی شخص تم میں جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے

فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ

پھر نہ ملا تم کو پانی تو ارادہ کرو زمین پاک کا پھر ملو اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو،

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

بے شک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو، اور جنابت کی حالت میں بھی جب تک غسل نہ کرلو (نماز جائز نہیں) اِلّا یہ کہ تم مسافر ہو (اور پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو)۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو، اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا (اس مٹی سے) مسح کرلو۔ بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا بڑا بخشنے والا ہے۔ ۝۴۳

شانِ نزول

ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ شراب کی حرمت سے پہلے ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن

عوف رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ کرامؓ کی دعوت کر رکھی تھی جس میں مے نوشی کا بھی انتظام تھا، جب یہ سب حضرات کھا پی چکے تو مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام بنادیا گیا، ان سے نماز میں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کی تلاوت میں بوجہ نشہ کے سخت غلطی ہوگئی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، [1] جس میں تنبیہ کردی گئی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ (یعنی ایسی حالت میں نماز مت پڑھو) کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو (اس وقت تک نماز مت پڑھو، مطلب یہ ہے کہ ادائے نماز تو اپنے اوقات میں فرض ہے اور یہ حالت ادائے نماز کے منافی ہے، پس اوقاتِ صلوٰۃ میں نشہ کا استعمال مت کرو، کبھی تمہارے منہ سے نماز میں کوئی کلمہ خلاف نہ نکل جائے) اور حالتِ جنابت میں بھی (یعنی جبکہ غسل فرض ہو) باستثناء تمہارے مسافر ہونے کی حالت کے (کہ اس کا حکم عنقریب آتا ہے، نماز کے پاس مت جاؤ) یہاں تک کہ غسل کرلو (یعنی غسلِ جنابت شرائط صحتِ نماز سے ہے، اور یہ حکم یعنی جنابت کے بعد بدون غسل نماز نہ پڑھنا حالت عدمِ عذر میں ہے) اور اگر تم (کچھ عذر رکھتے ہو مثلاً) بیمار ہو (اور پانی کا استعمال مضر ہو جیسا کہ آگے آتا ہے) یا حالتِ سفر میں ہو (جو اُوپر مستثنیٰ ہوا ہے کہ اس کا حکم بھی آوے گا، یعنی اور پانی نہیں ملتا، جیسا آگے آتا ہے تو ان دونوں عذروں سے تیمّم کی اجازت آتی ہے، اور جوازِ تیمّم کچھ انہی مذکور عذروں یعنی سفر و مرض کے ساتھ خاص نہیں بلکہ خواہ تم کو خاص یہ عذر ہوں) یا (یہ کہ عذر خاص نہ ہوں یعنی نہ تم مریض ہو نہ مسافر، بلکہ ویسے ہی کسی کا وضو یا غسل ٹوٹ جاوے اس طرح سے کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانے کے) استنجے سے (فارغ ہوکر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو اور) پھر (ان ساری صورتوں میں خواہ مرض و سفر کے عذر کی صورت ہو یا نہ مرض ہو نہ سفر ویسے وضو اور غسل کی ضرورت ہو) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ تو اس وجہ سے کہ مرض میں اس سے ضرر ہوتا ہو، خواہ اس لئے کہ وہاں پانی ہی موجود نہیں، خواہ سفر ہو یا نہ ہو) تو (ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمّم کرلیا کرو (یعنی اس زمین پر دو بار ہاتھ مار کر) اپنے چہروں اور ہاتھوں پر (ہاتھ) پھیر لیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں (اور جس کی ایسی عادت ہوتی ہے وہ آسان حکم دیا کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آسان حکم دے دیئے کہ تم کو تکلیف و تنگی نہ ہو)۔

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ النساء ج:۲ ص:۱۳۲

معارف و مسائل

شراب کی حرمت کے تدریجی اَحکام

شریعتِ اسلامیہ کو حق تعالیٰ نے ایک خاص اِمتیاز یہ دیا ہے کہ اس کے اَحکام کو سہل اور آسان کر دیا ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ شراب نوشی عرب کی پُرانی عادت تھی، اور پوری قوم اس عادت میں مبتلا تھی، بجز مخصوص حضرات کے جن کی طبیعت ہی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا سلیم بنا دیا تھا کہ وہ اس خبیث چیز کے پاس کبھی نہیں گئے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ نبوّت سے پہلے آپ نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ عادت کسی چیز کی بھی ہو اس کا چھوڑنا اِنسان پر بڑا مشکل ہوتا ہے، خصوصاً شراب اور نشہ کی عادت تو اِنسان کی طبیعت پر ایسا قبضہ کر لیتی ہے کہ اس سے نکلنا آدمی اپنے لئے موت سمجھنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شراب نوشی اور نشہ کرنا حرام تھا، اور اِسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو اس سے بچانا مقصود و مطلوب تھا، مگر یکایک اس کو حرام کر دیا جاتا تو لوگوں پر اس حکم کی تعمیل سخت مشکل ہو جاتی، اس لئے اِبتداءً اس پر جزوی پابندی عائد کی گئی، اور اس کے خراب اثرات پر تنبیہ کر کے ذہنوں کو اس کے چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا، چنانچہ اِبتداءً اس آیت میں صرف یہ حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، جس کا حاصل یہ تھا کہ نماز کے وقت نماز کا اَدا کرنا تو فرض ہے، اوقاتِ نماز میں شراب اِستعمال نہ کی جائے، جس سے مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ ایسی خراب چیز ہے جو اِنسان کے لئے نماز سے مانع ہے، بہت سے حضرات نے تو اسی وقت سے اس کے چھوڑنے کا اِہتمام کر لیا، اور دُوسرے حضرات بھی اس کی خرابی اور بُرائی کو سوچنے لگے، آخرکار سورۂ مائدہ کی آیت: ۹۰ میں شراب کے ناپاک اور حرام ہونے کا قطعی حکم آ گیا اور ہر حال میں شراب پینا حرام ہو گیا۔

مسئلہ:- جس طرح نشہ کی حالت میں نماز حرام ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب نیند کا غلبہ ایسا ہو کہ آدمی اپنی زبان پر قابو نہ رکھے تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنا دُرست نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اِرشاد ہے:-

اِذَا نَعَسَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوۃِ فَلْیَرْقُدْ حَتّٰی یَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّهٗ لَا یَدْرِیْ لَعَلَّهٗ یَسْتَغْفِرُ فَیَسُبَّ نَفْسَهٗ [1] (قرطبی)

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب الوضوء من النوم إلخ ج:۱ ص:۳۴

"اگر تم میں سے کسی کو نماز میں اُونگھ آنے لگے تو اسے کچھ دیر کے لئے سو جانا چاہئے تا کہ نیند کا اثر چلا جائے، ورنہ نیند کی حالت میں وہ سمجھ نہیں سکے گا اور بجائے دُعا و استغفار کے اپنے آپ کو گالی دینے لگ جائے گا۔"

تیمّم کا حکم ایک اِنعام ہے جو اس اُمت کی خصوصیت ہے

اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وضوء و طہارت کے لئے ایسی چیز کو پانی کے قائم مقام کر دیا جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین اور مٹی ہر جگہ موجود ہے۔ حدیث میں ہے کہ یہ سہولت صرف اُمتِ محمدیہ کو عطا کی گئی ہے۔ تیمّم کے ضروری مسائل فقہ کی کتابوں اور اُردو کے رسالوں میں بکثرت چھپے ہوئے ہیں ان کو دیکھ لیا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب سے خرید کرتے ہیں گمراہی

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ

اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بہک جاؤ راہ سے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے دُشمنوں کو،

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا

اور اللہ کافی ہے حمایتی، اور اللہ کافی ہے مددگار۔ بعضے لوگ یہودی

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ

پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور نہ مانا، اور کہتے ہیں کہ سن

غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا

نہ سنایا جائیو، اور کہتے ہیں: رَاعِنَا موڑ کر اپنی زبان کو اور عیب لگانے کو دِین میں، اور اگر وہ کہتے:

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ

ہم نے سنا اور مانا اور سن اور ہم پر نظر کر، تو بہتر ہوتا اُن کے حق میں اور دُرست لیکن لعنت کی اُن پر

اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو کتاب (یعنی تورات کے علم) میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا، کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ (کس طرح) گمراہی مول لے رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستے سے بھٹک جاؤ ﴿۴۴﴾ اور اللہ تمہارے دُشمنوں کو خوب جانتا ہے، اور رکھوالا بننے کے لئے بھی اللہ کافی ہے، اور مددگار بننے کے لئے بھی اللہ کافی ہے۔ ﴿۴۵﴾ یہودیوں میں سے کچھ وہ ہیں جو (تورات) کے الفاظ کو ان کے موقع محل سے ہٹا ڈالتے ہیں، اور اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر اور دِین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں: "سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" اور "اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" اور "رَاعِنَا" حالانکہ اگر وہ یہ کہتے کہ "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" اور "اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا" تو ان کے لئے بہتر اور راست بازی کا راستہ ہوتا، لیکن ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے، اس لئے تھوڑے سے لوگوں کے سوا وہ ایمان نہیں لاتے۔ ﴿۴۶﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی دیکھنے کے قابل ہیں دیکھو تو تعجب کرو) جن کو کتاب (اللہ یعنی تورات کے علم) کا ایک بڑا حصہ ملا ہے (یعنی تورات کا علم رکھتے ہیں باوجود اس کے) کہ وہ لوگ گمراہی (یعنی کفر) کو اِختیار کر رہے ہیں اور (خود تو گمراہ ہوئے ہی تھے مگر وہ) یوں چاہتے ہیں کہ تم (بھی) راہ (راست) سے (علیحدہ ہو کر) بے راہ ہو جاؤ (یعنی طرح طرح کی تدبیریں اس کی کرتے ہیں جیسا کہ تیسرے پارہ کے آخر اور چوتھے کے شروع میں کچھ ذِکر ہو بھی چکا ہے) اور (تم کو اگر ان لوگوں کی اب تک خبر نہ ہو تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) تمہارے (ان) دُشمنوں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے تم کو بتلا دیا سو تم ان سے بچتے رہو) اور (ان کا حال مخالفت کا سن کر زیادہ فکر میں بھی نہ پڑ جانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تمہارا) کافی رفیق ہے (کہ تمہاری مصلحتوں کی رعایت رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ (تمہارے لئے) کافی حامی ہے

(کہ ان کی مضرتوں سے تمہاری حفاظت کرے گا اور) یہ لوگ (جن کا ذکر ہو چکا ہے) یہودیوں میں سے ہیں (اور ان کا گمراہی کو اختیار کرنا جو اُوپر آچکا ہے یہ ہے کہ) کلام (الٰہی یعنی توراۃ) کو اس کے مواقع (اور محل) سے (لفظاً یا معنیً) دُوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور (ایک گمراہی ان کی جس میں دھوکے سے دُوسرے سادہ ذہن شخص کا پھنس جانا بھی ممکن ہے یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتے وقت) یہ کلمات کہتے ہیں (جو آگے مذکور ہوتے ہیں، ان کلمات کے دو دو معنی ہیں، ایک اچھے اور ایک بُرے، وہ لوگ بُرا مطلب لیتے تھے اور دُوسروں پر ظاہر کرتے تھے کہ ہم اچھے مطلب سے کہتے ہیں، اور اس سے کسی مسلمان کا دھوکے میں آکر بعضے ایسے ہی کلمات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرنا بعید نہ تھا، چنانچہ سورۂ بقرہ کے رُکوع نمبر ۱۳ (آیت: ۱۰۴) میں مؤمنین کو لفظ رَاعِنَا سے ممانعت فرمائی گئی ہے، پس اس اعتبار سے یہود کا ان کلمات کو کہنا ایک گونہ دُوسروں کو گمراہ کرنا بھی ہے، گو لفظاً ہی ہو، پس اس میں وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا کا لفظ جو کہ اُوپر آیا ہے بیان بھی ہو گیا، جیسا کہ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا میں بیان تھا اَلَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا کا اور يُحَرِّفُوْنَ میں بیان تھا يَشْتَرُوْنَ کا، اُن کلمات میں سے ایک یہ ہے) سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (اس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ ہم نے سن لیا اور مانا نہیں، اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ "آپ کا ارشاد ہم نے سن لیا اور کسی آپ کے مخالف کا قول جو کہ ہم کو بہکاتا تھا نہیں مانا" اور بُرا مطلب ظاہر ہے کہ ہم نے آپ کی بات کو سن تو لیا مگر ہم عمل نہ کریں گے) اور (دُوسرا کلمہ یہ ہے) اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ تم ہماری بات سنو اور خدا کرے تم کو کوئی بات سنائی نہ جاوے، اس کا اچھا مطلب تو یہ کہ تم کو کوئی مخالف اور رنج دہ بات نہ سنائی جاوے، بلکہ آپ کا ایسا اقبال رہے کہ جو بات فرمائیں سب اس کے جواب میں موافق ہی بات آپ کو سنائیں، اور بُرا مطلب یہ ہے کہ تم کو کوئی موافق اور مسرّت بخش بات نہ سنائی جائے بلکہ آپ جو بات کہیں اس کا جواب مخالف ہی آپ کے کان میں پڑے) اور (تیسرا کلمہ یہ ہے) رَاعِنَا (اس کے دونوں اچھے اور بُرے مطلب سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں کہ اچھے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری رعایت کیجئے اور بُرے معنی لغتِ یہود میں دشنام ہے، غرض ان کلمات کو) اس طور پر (کہتے ہیں) کہ اپنی زبانوں کو (لہجۂ توقیر سے لہجۂ تحقیر کی طرف) پھیر کر اور (دِل سے) دِین میں طعنہ زنی (اور تحقیر ہی) کی نیت سے (وجہ یہ ہے کہ نبی کے ساتھ طعن و استہزاء عین دِین کے ساتھ طعن و تمسخر ہے) اور اگر یہ لوگ (بجائے دو معنی دینے والے الفاظ کے) یہ کلمات کہتے (بجائے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کے) سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا) اور (بجائے اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ کے صرف) اِسْمَعْ (جس کے معنی خالی یہ ہیں کہ آپ سن لیجئے) اور (بجائے رَاعِنَا کے) اُنْظُرْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمایئے، اور یہ کلمات معنیً شرارت سے پاک ہیں تو اگر یہ کلمات کہتے) تو یہ بات اُن کے لئے بہتر (اور نافع بھی) ہوتی اور (حقیقت میں بھی) موقع کی بات تھی مگر (انہوں نے تو ایسے نفع اور موقع کی بات کہی ہی نہیں، بلکہ وہی بیہودہ بات بکتے رہے، اس لئے ان کو یہ تکلیف پہنچی کہ) ان کو

خدا تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب (جس میں یہ کلمات بھی آ گئے اور بھی ان کے سب اقوال و افعالِ کفریہ داخل ہو گئے، پس ان سب کفریات کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو) اپنی رحمت (خاصہ) سے دُور پھینک دیا اب وہ ایمان نہ لاویں گے ہاں مگر تھوڑے سے آدمی (بوجہ اس کے کہ وہ ایسی حرکتوں سے دُور رہے وہ دُوریٔ رحمتِ خاصہ سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ ایمان بھی لے آئے جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں مواقعِ تقویٰ کا بیان تھا، جس میں زیادہ تر ذِکر باہمی معاملات کا تھا، درمیان میں کچھ اَحکام عبادت نماز اور متعلقات کے ذِکر کر دیئے گئے، جو اِنسان میں خدا کا خوف اور فکرِ آخرت پیدا کرتے اور معاملات کی دُرستی کو آسان کر دیتے ہیں۔ مذکورہ آیات سے مخالفین کے ساتھ معاملات کا ذِکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہود کی شرارت کا علاج اور مسلمانوں کو ان الفاظ و عنوان میں بھی ادب کی رعایت کی تلقین کی گئی ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

اے کتاب والو! اِیمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ

پہلے اس سے کہ ہم مٹا ڈالیں بہت سے چہروں کو پھر اُلٹ دیں ان کو پیٹھ کی طرف یا لعنت کریں ان پر جیسے ہم نے لعنت کی

اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

ہفتہ کے دِن والوں پر، اور اللہ کا حکم تو ہو کر ہی رہتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اہلِ کتاب! جو (قرآن) ہم نے اب نازل کیا ہے، جو تمہارے پاس پہلے سے موجود کتاب کی تصدیق بھی کرتا ہے، اس پر اِیمان لے آؤ، قبل اس کے کہ ہم کچھ چہروں کو مٹا کر انہیں گدی جیسا بنا دیں، یا ان پر ایسی پھٹکار ڈال دیں

جیسی پھٹکار ہم نے سبت والوں پر ڈالی تھی۔ اور اللہ کا حکم ہمیشہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ (۴۷)

خلاصۂ تفسیر

اے وہ لوگو جو کتاب (توراۃ) دیئے گئے ہو! تم اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے (اور تم کو اس پر ایمان لانے سے وحشت نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ہم نے اس کو) ایسی حالت پر (نازل فرمایا) کہ وہ سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تمہاری اصل کتاب کے لئے وہ مصدق ہے، باقی تحریف کا حصہ اس سے الگ ہے، سو تم قرآن پر) اس (امر غیر یقینی کے ہونے) سے پہلے پہلے (ایمان لے آؤ) کہ ہم (تمہارے) چہروں (پر کے نقش و نگار یعنی آنکھ ناک وغیرہ) کو بالکل مٹا ڈالیں اور ان (چہروں) کو ان کی اُلٹی جانب (یعنی گدی) کی طرح (صفاچٹ) بنادیں یا ان (ایمان نہ لانے والوں) پر ہم ایسی (خاص طور کی) لعنت کریں جیسی لعنت ان ہفتہ والوں پر کی تھی (جو یہود میں گزر چکے ہیں، جن کا ذِکر سورۂ بقرہ میں آچکا ہے، یعنی اُن کی طرح اِن کو بھی بندر کی شکل بنادیں) اور اللہ تعالیٰ کا (جو) حکم (صادر ہو جاتا ہے وہ) پورا ہی ہو کر رہتا ہے (سو اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان نہ لانے پر اگر اس مسخ کا حکم کر دیں گے، پھر یہ ضروری ہو جائے گا، لہٰذا تم کو ڈرنا چاہئے اور ایمان لے آنا چاہئے)۔

معارف ومسائل

فائدہ نمبر ۱: - (قولہ تعالیٰ) فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ (اُلٹ دیں ان کو پیٹھ کی طرف) اُلٹنے میں دونوں اِحتمال ہیں کہ چہرے کے نقش و نگار کو مٹا کر پورے چہرے کو پیٹھ کی جانب اُلٹ دیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چہرے کو گدی کی طرح سپاٹ کر دیں، یعنی چہرے کو گدی کی طرف نہ پھیریں بلکہ گدی کے مانند سپاٹ اور صاف کر دیں۔ (مظہری، رُوح المعانی) [۱]

فائدہ نمبر ۲: - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طمس و مسخ کب ہوا؟ بعض نے کہا کہ یہ عذاب قیامت سے قبل یہود پر ہوگا، بعض نے کہا یہ عذاب اس لئے واقع نہیں ہوا کہ ان میں سے بعض لوگ اِیمان لے آئے تھے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سرے سے وہ سوال ہی واقع نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طمس و مسخ کا عذاب واقع ہوگا، بلکہ اِحتمال ہے، یعنی اگر ان کے جرم کو دیکھا جائے تو وہ اس سزا کے مستحق ہیں اور اگر عذاب نہ دیں تو یہ ان کی رحمت ہے۔ [۲]

---

[۱] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۳۶، وروح المعانی تحت هذه الآية ج:۴ ص:۴۸

[۲] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۲۲

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ

بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے، اور بخشتا ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے،

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ

اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا اس نے بڑا طوفان باندھا۔ کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو

يُزَكُّوْنَ أَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہے، اور اُن پر ظلم نہ ہوگا تاگے برابر۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ إِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع

دیکھ! کیسا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ، اور کافی ہے یہی گناہ صریح۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اور اس سے کمتر ہر بات کو جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے وہ ایسا بہتان باندھتا ہے جو بڑا زبردست گناہ ہے۔ ﴿۴۸﴾ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ بتاتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (اس عطا میں) ان پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ ﴿۴۹﴾ دیکھو یہ لوگ اللہ پر کیسے کیسے جھوٹے بہتان باندھتے ہیں، اور کھلا گناہ ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے۔ ﴿۵۰﴾

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ ہمیشہ دائمی سزا میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلاسزا) وہ گناہ بخش دیں گے، (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا، اب وہ سزا دائمی بھی نہ رہے گی)

اور (وجہ اس شرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا (جو اپنے عظیم ہونے کی وجہ سے قابلِ مغفرت نہیں)۔

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی تعجب کے قابل ہیں) جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں (ان کے بتلانے سے کچھ نہیں ہوتا) بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بتلا دیں (یہ البتہ قابلِ اعتبار ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن میں مؤمن کو مقدس بتلا چکے ہیں، جیسے سورۂ سَبِّحِ اسْمَ میں اَلْاَشْقٰی یعنی کافر کے مقابلے میں مؤمن کی نسبت فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾، پس وہی مقدس ہوگا نہ کہ کفر کرنے والے جیسے یہود ہیں) اور (ان یہود کو قیامت میں اس جھوٹے دعوے کا جس کا سبب کفر کو ایمان سمجھنا ہے، جو سزا ہوگی اس سزا میں) ان پر تاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا (یعنی وہ سزا ان کے جرم سے زیادہ نہیں ہے، بلکہ ایسے جرم پر ایسی ہی سزا لائق ہے، ذرا) دیکھ لو (اس دعوے میں) یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں (کیونکہ جب وہ باوجود کفر کے اللہ کے ہاں مقبول ہونے کے مدعی ہیں تو اس سے صاف لازم آتا ہے کہ کفر اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ محض تہمت ہے، اس لئے کہ تمام شرائع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمادی ہے کہ کفر ہمارے نزدیک سخت ناپسند اور مردود ہے) اور یہی بات (کہ خدا پر تہمت لگائی جائے) صریح جرم ہونے کے لئے کافی ہے (پھر کیا ایسی صریح بڑی بات پر ایسی سزا کچھ ظلم وزیادتی ہے)۔

معارف و مسائل

شرک کی تعریف اور اس کی چند صورتیں

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھنا یہ "شرک" ہے، اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں:-

علم میں شریک ٹھہرانا:- یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے۔ نجومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا، یا کسی بزرگ کے کلام میں فال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا، یا کسی کو دُور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی، یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اِشراک فی التصرف:- یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا:- کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا، کسی کے نام کی منّت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دُوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا، کسی کے رُوبرو رُکوع

کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دُنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھنا اور کسی مہینے کو منحوس سمجھنا وغیرہ۔

اپنی مدح سرائی اور عیوب سے پاک ہونے کا دعویٰ جائز نہیں

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ یہود اپنے آپ کو مقدس بتلاتے تھے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا اِن لوگوں کو دیکھو جو اپنی پاکی بیان کررہے ہیں، ان پر تعجب کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنی یا دُوسروں کی پاکی بیان کرنا جائز نہیں ہے، یہ ممانعت تین وجہ سے ہے:-

۱- اپنی مدح کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، تو حقیقت میں ممانعت کبر سے ہوئی۔

۲- یہ کہ خاتمہ کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ تقویٰ وطہارت پر ہوگا یا نہیں، اس لئے اپنے آپ کو مقدس بتلانا خلافِ خوفِ الٰہی ہے، چنانچہ ایک روایت میں حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس وقت چونکہ میرا نام بَرَّہ تھا (جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک) میں نے وہی بتلایا، تو آپ نے فرمایا: "لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ، سَمُّوْهَا زَيْنَبَ" (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)[۱] یعنی "تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو، کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ تم میں سے کون پاک ہے، پھر برہ کے بجائے آپ نے زینب نام رکھا۔" (مظہری)

۳- ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات اس دعوے سے لوگوں کو یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ یہ آدمی اللہ کے ہاں اس لئے مقبول ہے کہ یہ تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے، حالانکہ یہ جھوٹ ہے، کیونکہ بہت سے عیوب بندہ میں موجود ہوتے ہیں۔ (بیان القرآن)[۲]

مسئلہ:- اگر مذکورہ عوارض نہ ہوں تو نعمت کے اِظہار کے طور پر اپنی صفت بیان کرنے کی اِجازت ہے۔ (بیان القرآن)[۳]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب کا جو مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الاسامی ج:۲ ص:۴۰۷

[۲] تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۲۳

[۳] بحوالۂ بالا۔

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

اور کہتے ہیں کافروں کو کہ یہ لوگ زیادہ راہِ راست پر ہیں مسلمانوں سے۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ۭ

یہ وہی ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ نے، اور جس پر لعنت کرے اللہ نہ پاوے گا تو اس کا کوئی مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو کتاب (یعنی توراۃ کے علم) میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا، کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ (کس طرح) بتوں اور شیطان کی تصدیق کررہے ہیں اور کافروں (یعنی بت پرستوں) کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مؤمنوں سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں۔ ﴿۵۱﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پھٹکار ڈال رکھی ہے، اور جس پر اللہ پھٹکار ڈال دے، اس کے لئے تم کوئی مددگار نہیں پاؤ گے ﴿۵۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (الٰہی یعنی توراۃ کے علم) کا ایک حصہ ملا ہے (پھر باوجود اس کے) وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں (کیونکہ مشرکین کا دِین بت پرستی اور شیطان کی پیروی تھا، جب ایسے دِین کو اچھا بتلایا تو بت اور شیطان کی تصدیق لازم آئی) اور وہ لوگ (یعنی اہلِ کتاب) کفار (یعنی مشرکین) کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت ان مسلمانوں کے زیادہ راہِ راست پر ہیں (یہ تو انہوں نے صراحۃً ہی کہا تھا) یہ لوگ (جنہوں نے کفر کے طریقہ کو اِسلامی طریقہ سے افضل بتلایا) وہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنایا ہے (اسی ملعون ہونے کا تو اثر ہے کہ ایسے بے باک ہوکر کفریات بک رہے ہیں) اور خدا تعالیٰ جس کو ملعون بنادے اس کا (عذاب کے وقت) کوئی حامی نہ پاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ اس پر ان کو آخرت میں یا دُنیا میں بھی سخت سزا ہوگی، چنانچہ دُنیا میں بعضے قتل، بعضے قید، بعضے ذلیل رعایا ہوئے اور آخرت میں جو ہونے والا ہے وہی ہوگا)۔

ربطِ آیات

پچھلی آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ الخ سے یہود کی قبائح اور بُری خصلتوں کا

ذکر چل رہا ہے، اِن آیات کا تعلق بھی انہی کے ذِکرِ قبائح سے ہے۔

معارف ومسائل

"اَلْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ" سے کیا مراد ہے؟

اُوپر کی آیت نمبر ۵۱ میں دولفظ "اَلْجِبْتِ" اور "الطَّاغُوْتِ" کا ذِکر کیا گیا ہے، ان سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے اس بارے میں متعدّد اَقوال ہیں، حضرت ابنِ عباس، ابنِ جبیر اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ "جِبْت" حبشی لغت میں "ساحر" کو کہتے ہیں، اور "طاغوت" سے مراد "کاہن" ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جِبْتُ" سے مراد "سحر" ہے اور "طاغوت" سے مراد "شیطان" ہے، مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو "طاغوت" کہا جاتا ہے۔

اِمام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ مالک بن انس رضی اللہ عنہ کا قول زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے، اِرشاد ہے: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶) [۱] لیکن ان متعدّد اَقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں، اس طرح کہ اصل میں "جِبْتُ" تو بت ہی کا نام تھا، لیکن بعد میں اس کا اِستعمال اللہ کے سوا دُوسری عبادت کی جانے والی چیزوں پر بھی ہونے لگا۔ (رُوح المعانی) [۲]

مذکورہ آیات کا شانِ نزول

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے سردار حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف اپنی ایک جماعت کو جنگِ اُحد کے بعد لے کر مکہ میں قریش کے ساتھ ملنے آئے، یہود کا سردار کعب بن اشرف، ابوسفیان کے پاس آیا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا، اہلِ مکہ نے کعب بن اشرف سے کہا: تم ایک دھوکا دینے والی قوم ہو، اگر تم واقعی اپنے قول میں سچے ہو تو ہمارے ان دو بتوں (جبت اور طاغوت) کے سامنے سجدہ کرو۔

چنانچہ اس نے قریش کو مطمئن کرنے کے لئے ایسا ہی کیا، اس کے بعد کعب نے قریش سے کہا کہ تیس آدمی تم میں سے اور تیس آدمی ہم میں سے سامنے آئیں، تاکہ ربِّ کعبہ کے ساتھ اس چیز کا عہد کریں کہ ہم سب مل کر محمد (صلی اللہ

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۵ ص:۲۴۹

[۲] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۸۸

علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں گے۔

کعب کی اس تجویز کو قریش نے پسند کیا، اور اس طرح سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر دیا، اس کے بعد ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تم اہلِ علم ہو، تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے، لیکن ہم بالکل جاہل ہیں، اس لئے آپ ہمارے متعلق بتائیں کہ ہم حق پر چلنے والے ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

کعب نے پوچھا کہ تمہارا دِین کیا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ہم حج کے لئے اپنے اُونٹوں کو ذبح کرتے ہیں اور ان کا دُودھ پلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، اپنے خویش واقرباء کے تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، اور بیت اللہ کا طواف اور عمرہ کرتے ہیں، اس کے برخلاف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آبائی دِین کو چھوڑ دیا ہے، وہ اپنوں سے علیحدہ ہو چکا ہے، اور اس نے ہمارے قدیم دِین کے خلاف اپنا ایک نیا دِین پیش کیا ہے۔

ان باتوں کو سن کر کعب بن اشرف نے کہا کہ تم لوگ حق پر ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (معاذ اللہ) گمراہ ہو چکا ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر ان کے دجل وفریب کی مذمت کی۔ (رُوح المعانی) [1]

نفسانی خواہشات بعض اوقات آدمی کو دِین وایمان سے محروم کر دیتی ہیں

کعب بن اشرف یہودیوں کا ایک ممتاز عالم تھا جو خدا پر بھی عقیدہ رکھتا تھا اور اسی کی عبادت کرتا تھا، لیکن جب اس کے دِل ودِماغ پر نفسانی خواہشات کا بھوت سوار ہوا تو اس نے مسلمانوں کے خلاف قریش سے اِلحاق کرنا چاہا، قریشِ مکہ نے اس کے ساتھ ملنے کی یہ شرط لگائی کہ وہ ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ کرے، اس نے اس کو بھی گوارا کرلیا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے، اس نے اپنے مذہب کے خلاف قریش کی شرط کو تو پورا کیا لیکن اپنے مذہبی عقائد کو قائم رکھنے کے لئے ان سے علیحدگی اِختیار کرنا گوارا نہ کیا، قرآنِ عزیز نے ایک دُوسرے مقام پر اسی قسم کا واقعہ بلعم باعوراء کے بارے میں بیان کیا ہے، اِرشاد ہے: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ (الاعراف)

مفسرین نے لکھا ہے کہ بلعم بن باعوراء ایک جلیل القدر عالم اور صاحبِ تصرف درویش تھا، لیکن جب اس نے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ناپاک تدبیریں کرنی شروع کیں تو ان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن خود مرد ُود اور گمراہ ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا محض علم کچھ نافع نہیں ہوسکتا جب تک کہ صحیح معنی میں اس کا اِتباع نہ ہو، اور محض دُنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی سے مکمل اِجتناب نہ ہو، ورنہ آدمی اپنے مذہب جیسی عزیز چیز کو بھی اپنی خواہشات کی بھینٹ

---

[1] روح المعانی تحت ھذہ الآیة ج:۴ ص:۸۸

چڑھانے سے نہیں بچتا۔ آج کل بھی بعض لوگ اس قسم کے ہیں جو مادّی اور سیاسی اَغراض ومقاصد کے حصول کے لئے اپنے حق مسلک کو آسانی سے چھوڑ دیتے ہیں، اور لا دِینی عقائد ونظریات کو اِسلام کا لباس پہنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، نہ ان کو خدا کے عہد ومیثاق کی کچھ پروا ہوتی ہے، اور نہ آخرت کا خوف، یہ سب کچھ صحیح اور حق مسلک کو چھوڑ کر شیطان کے اِشاروں پر چلنے سے ہوتا ہے۔

اللہ کی لعنت دُنیا اور آخرت میں رُسوائی کا سبب ہے

لعنت نام ہے اللہ کی رحمت سے دُوری کا، اور اِنتہائی رُسوائی اور ذِلت کا، جس پر اللہ کی لعنت ہو وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا، ان کے بارے میں اتنی سخت وعید آئی ہے کہ فرمایا: مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾ (الاحزاب) ''جن پر اللہ کی لعنت ہے وہ جہاں کہیں بھی ملیں اُن کی گردن اُڑائی جائے'' یہ تو ان کی دُنیاوی رُسوائی ہے، اور آخرت کی رُسوائی تو اس سے بھی سخت ہوگی۔

اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿٥٢﴾ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، اب غور طلب یہ بات ہے کہ اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

ایک حدیث میں اِرشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود دینے والے، سود کھانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت کی ہے، اور وہ سب گناہ میں برابر ہیں۔ (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)[1]

ایک دُوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَلْعُوْنٌ مَّنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ" (رواہ رزین بحوالہ مشکوٰۃ)[2] ''یعنی جو آدمی لوط (علیہ السلام) کی قوم کے جیسا عمل کرے وہ لعنتی ہے۔'' (یعنی مرد سے بدفعلی کرنے والا) پھر اِرشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سارق (چور) پر لعنت بھیجتا ہے جو اَنڈے اور رَسّی جیسی حقیر چیز کی چوری تک سے گریز نہیں کرتا، جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)[3]

ایک اور حدیث میں اِرشاد ہے:-

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الربا ج:۲ ص:۲۷ ومشکوٰۃ، کتاب البیوع باب الربا ج:۱ ص:۲۴۴

[2] مشکوٰۃ، کتاب الحدود، باب قطع السرقہ ج:۲ ص:۳۱۳

[3] صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب لعن السارق إلخ ج:۲ ص:۱۰۰۳۔ وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد السرقة ونصابها ج:۲ ص:۶۴

لَعَنَ اللّٰهُ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ۔ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ) [۱]

''اللہ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر، اور اُن عورتوں پر جو اپنے جسم کو گودنے والی (یعنی سوئی کے ناکے سے جسم میں سوراخ کر کے سرمہ ڈالتی ہیں تاکہ زینت ہو) یا گدوانے والی ہیں، اور ایسے ہی تصویر کھینچنے والوں پر لعنت کی ہے۔''

ایک دُوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں شراب پر اور اس کے پینے والے پر، پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے، خریدنے والے، اس کے نچوڑنے والے، اس کے اُٹھانے والے اور منگوانے والے سب پر۔ (رواہ ابوداود، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ) [۲]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِرشاد فرماتے ہیں کہ چھ آدمی ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت بھیجی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے، اور ہر نبی مستجاب الدعوات ہوتا ہے، وہ چھ آدمی یہ ہیں:-

۱- اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا، ۲- اور وہ شخص جو جبر وقہر سے اِقتدار حاصل کر کے اس آدمی کو عزّت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہو، اور جس کو اللہ نے عزّت عطا کی ہو اس کو ذلیل کرے، ۳- اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا، ۴- اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنے والا، ۵- میری اولاد میں وہ آدمی جو محرمات کو حلال کرنے والا ہو، ۶- اور میری سنت کو چھوڑنے والا۔ (رواہ البیہقی فی المدخل بحوالہ مشکوٰۃ) [۳]

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَيْهِ'' [۴] ''یعنی جو کوئی نامحرم پر بُری نظر ڈالے اور جس کے اُوپر نظر ڈالے (بشرطیکہ جس پر بُری نظر پڑی ہے اس کے اِرادہ و اِختیار کو اس میں دخل ہو) ان پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ يَلْبَسُ لُبْسَةَ الْمَرْاَةِ وَالْمَرْاَةَ تَلْبَسُ لُبْسَةَ الرَّجُلِ'' ''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا سا لباس پہنے اور ایسی عورت پر لعنت کی جو مرد کا سا لباس پہنے۔'' (مشکوٰۃ) [۵]

---

۱ صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب من لعن المصور ج:۲ ص:۸۸۱

۲ مشکوٰۃ، کتاب البیوع ج:۱ ص:۲۴۲، وسنن ابی داوٗد، کتاب الأشربۃ، باب العصیر للخمر ج:۲ ص:۵۱۷

۳ مشکوٰۃ، کتاب الإیمان، باب الایمان بالقدر ج:۱ ص:۲۲

۴ مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ إلخ ج:۲ ص:۲۷۰

۵ مشکوٰۃ، کتاب اللباس، باب الترجل ج:۲ ص:۳۸۳

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ امْرَاَةً تَلْبَسُ النَّعْلَ، قَالَتْ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)[۱]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے عرض کیا کہ ایک عورت (مردانہ) جوتا پہنتی ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں کے طور طریق اِختیار کرے۔''

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَقَالَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ۔ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ)[۲]

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اُن مردوں پر جو عورتوں کی طرح شکل وصورت بنا کر ہیجڑے بنیں، اور لعنت کی ان عورتوں پر جو شکل وصورت میں مردانہ پن اِختیار کریں، اور ارشاد فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔''

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:-

لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ۔[۳]

''یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے والیوں پر اور گودوانے والیوں پر اور جو (ابرو یعنی بھووں کے بال) چنتی ہیں (کہ بھویں باریک ہوجائیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو حسن کے لئے دانتوں کے درمیان کشادگی کرتی ہیں جو اللہ کی خلقت کو بدلنے والی ہیں۔''

لعنت کے اَحکام

لعنت جس قدر بُری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عائد کی گئی ہیں، کسی مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے، اور کافر پر بھی صرف اُس صورت میں کی جاسکتی ہے جبکہ اس کا کفر پر مرنا یقینی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات اس کے متعلق یہ ہیں:-

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی لباس النساء إلخ ج:۲ ص:۵۶۲ ومشکوٰۃ، کتاب اللباس، باب الترجل ج:۲ ص:۳۸۳

[۲] صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب إخراج المتشبهين ج:۲ ص:۸۷۴، ومشکوٰۃ، کتاب اللباس، باب الترجل ج:۲ ص:۳۸۰

[۳] صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب المتفلجات للحسن ج:۲ ص:۸۷۸

حدیث میں ہے:-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْبَذِيِّ۔ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)[1]

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مؤمن وہ نہیں ہے جوطعنہ باز اور لعنت باز ہو، اور نہ ہی بدگو۔''

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا لَعَنَ شَيْـًٔا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ اِلَى السَّمَآءِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ دُوْنَهَا، ثُمَّ تَهْبِطُ اِلَى الْاَرْضِ فَتُغْلَقُ اَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَاْخُذُ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا فَاِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ اِلَى الَّذِیْ لُعِنَ فَاِنْ كَانَ لِذٰلِكَ اَهْلًا وَاِلَّا رَجَعَتْ اِلٰى قَائِلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)[2]

''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جب بندہ کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، جس پر آسمان کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، پھر وہ زمین کی طرف اُترتی ہے تو زمین کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، (یعنی زمین اس لعنت کو قبول نہیں کرتی) پھر دائیں بائیں گھومتی ہے جب کہیں اس کو راستہ نہیں ملتا تو جس پر لعنت کی گئی ہے اس کے پاس پہنچتی ہے، اگر وہ واقعی لعنت کا مستحق ہے تو اس پر پڑتی ہے، ورنہ پھر اپنے کہنے والے پر پڑ جاتی ہے۔''

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ الرِّيْحُ رِدَائَهٗ فَلَعَنَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَلْعَنْهَا فَاِنَّهَا مَاْمُوْرَةٌ وَّاِنَّهٗ مَنْ لَّعَنَ شَيْـًٔا لَيْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ص:۴۱۳)[3]

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ہوا نے ایک آدمی کی چادر اُڑالی تو اس نے ہوا پر لعنت کی، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس پر لعنت نہ کر، اس لئے کہ وہ اللہ کی جانب سے

---

[1] جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی اللعنة ج:۲ ص:۱۹ ومشکوٰة، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان والغيبة إلخ ج:۲ ص:۴۱۳

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اللعن ومشکوٰة کتاب الآداب، باب حفظ اللسان والغيبة إلخ ج:۲ ص:۴۱۳

[3] مشکوٰة، کتاب الآداب ج:۲ ص:۴۱۳ باب حفظ اللسان والغيبة إلخ۔

مامور ہے، اور (یاد رکھئے) کہ جو آدمی ایسی چیز پر لعنت کرے جس کی وہ مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت اس کے کہنے والے ہی پر لوٹتی ہے۔"

مسئلہ:- کسی معین شخص کے بارے میں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی ہے، اس پر لعنت جائز نہیں، اگرچہ وہ فاسق ہی ہو۔ اسی اُصول کی بنا پر یزید پر لعنت کرنے سے علامہ شامیؒ نے منع کیا ہے، لیکن معین کافر پر جس کی موت کفر پر ہونے کا یقین ہو مثلاً ابوجہل، ابولہب پر جائز ہے۔ (شامی) [۱]

مسئلہ:- کسی کا نام لئے بغیر اس طرح لعنت کرنا جائز ہے کہ ظالموں پر یا جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

مسئلہ:- لغۃً لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دُور ہونے کے ہوتے ہیں، شرعاً کفار کے حق میں اس کے معنی اللہ کی رحمت سے بعید ہونے کے ہیں، اور مؤمنین کے حق میں اَبرار (صلحاء) کے درجہ سے نیچے گرنے کے ہیں (نقلہ الشامی عن القهستانی) [۲] اس لئے کسی مسلمان کے لئے اس کے نیک عمل کم ہوجانے کی دُعا بھی جائز نہیں۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾

کیا ان کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ

یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر جو دیا ہے ان کو اللہ نے اپنے فضل سے، سو ہم نے تو دی ہے

اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ

ابراہیم کے خاندان کو کتاب اور علم، اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت۔ پھر ان میں سے کسی نے اس کو مانا

وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

اور کوئی اس سے ہٹا رہا، اور کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ۔

---

[۱] شامی، کتاب النکاح، باب الرجعة مطلب في حكم لعن العصاة ج:۳ ص:۴۱۶
[۲] بحوالۂ بالا۔

آسان ترجمۂ قرآن

تو کیا ان کو (کائنات کی) بادشاہی کا کچھ حصہ ملا ہوا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگوں کو گٹھلی کے شگاف کے برابر بھی کچھ نہ دیتے۔ ﴿۵۳﴾ یا یہ لوگوں سے اس بنا پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا فضل (کیوں) عطا فرمایا ہے؟ سو ہم نے تو اِبراہیم کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی تھی اور انہیں بڑی سلطنت دی تھی۔ ﴿۵۴﴾ چنانچہ ان میں سے کچھ ان پر اِیمان لائے اور کچھ نے ان سے منہ موڑ لیا۔ اور جہنم ایک بھڑکتی آگ کی شکل میں (ان کافروں کی خبر لینے کے لئے) کافی ہے۔ ﴿۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

ہاں کیا ان کے پاس کوئی حصہ ہے سلطنت کا سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے یا دُوسرے آدمیوں سے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں سو (آپ کو ایسی چیز مل جانا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ) ہم نے (پہلے سے) حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے خاندان (والوں) کو کتاب (آسمانی) بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (چنانچہ بنی اِسرائیل میں بہت سے انبیاء گزرے ہیں، بعض انبیاء سلاطین بھی ہوئے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام وحضرت داؤد علیہ السلام وحضرت سلیمان علیہ السلام، اور حضرت داؤد علیہ السلام وحضرت سلیمان علیہ السلام کا کثیر الازدواج ہونا بھی معلوم ومشہور ہے اور یہ سب اولادِ اِبراہیم میں ہیں، سو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اولادِ اِبراہیم سے ہیں، تو آپ کو اگر یہ نعمتیں وعطیات مل گئے تو تعجب کی کیا بات ہے) سو (ان انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی جو کہ خاندانِ اِبراہیم علیہ السلام سے گزر چکے ہیں جو لوگ موجود تھے) ان میں سے بعضے تو اس (کتاب وحکمت) پر اِیمان لائے، اور بعضے ایسے تھے کہ اس سے رُوگرداں ہی رہے (پس اگر آپ کی رِسالت وقرآن پر بھی آپ کے زمانہ کے بعضے لوگ اِیمان نہ لائیں تو کوئی رنج کی بات نہیں) اور (ان کفار ومعرضین کو اگر دُنیا میں سزا کم بھی ہو یا نہ ہو تو کیا ہوا ان کے لئے آخرت میں) دوزخ کی آتشِ سوزاں (سزا) کافی ہے۔

معارف ومسائل

یہودیوں کے حسد کرنے پر شدید مذمت

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم وفضل اور جاہ وجلال عطا کیا تھا، اس پر یہودی جلتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۵۳ و ۵۴ میں ان کے اسی حسد وبغض کی شدید مذمت کی ہے اور ان کے حسد کو نامعقول قرار دیتے ہوئے دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک وجہ آیت نمبر ۵۳ میں بیان کی، اور دُوسری آیت نمبر ۵۴ میں، لیکن دونوں کا حاصل ایک ہے یعنی تمہارا حسد کس بات پر ہے، اگر اس پر ہے کہ اصل صاحبِ سلطنت تم ہو، تمہاری ہی سلطنت ان کو مل گئی، اس کا غلط ہونا تو کھلا ہوا ہے کہ تم سلطنت سے خود محروم ہو، اور تمہیں کچھ حصہ سلطنت کا مل جاتا تو تم ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دیتے، اور اگر تمہارا حسد اس پر ہے کہ گو سلطنت ہمارے پاس سے ان کے پاس نہیں گئی پھر بھی ان کو کیوں ملی، ان کو سلطنت سے کیا علاقہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ بھی انبیاء کے خاندان سے ہیں، جن میں سلطنت پہلے سے ہوتی آئی ہے، اس لئے کسی اجنبی جگہ سلطنت نہیں آئی، لہٰذا تمہارا حسد کرنا نامعقول ہے۔

حسد کی تعریف، حکم اور اس کی مضرتوں کا بیان

علامہ نوویؒ شارحِ مسلم، حسد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: "اَلْحَسَدُ تَمَنِّيْ زَوَالِ النِّعْمَةِ" (مسلم ج:۲) یعنی "دُوسرے آدمی کی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا حسد کہلاتا ہے"[۱] اور یہ حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ۔ (مسلم)[۲]

"تم آپس میں بغض اور حسد نہ کرو، اور نہ ہی ایک دُوسرے سے پشت پھیرو، بلکہ اللہ کے بندے

---

[۱] شرح صحیح مسلم للنووی ج:۲ ص:۳۱۶

[۲] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والأدب، باب تحریم التحاسد إلخ ج:۲ ص:۳۱۵

اور بھائی بن جاؤ، اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے۔"

ایک دُوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ (رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)[۱]

"تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

عَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ اَلْحَسَدَ وَالْبَغْضَآءَ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔ (رواہ احمد والترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)[۲]

"حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تمہاری طرف (بھی) پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد ہے، اور بغض ایسی خصلت ہے جو مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دِین کو مونڈ دیتی ہے۔"

حسد خواہ دُنیاوی کمال پر ہو یا دِینی کمال پر، دونوں حرام ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول "اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ" سے اَمرِ اوّل کی طرف اِشارہ معلوم ہوتا ہے، اور "اَلْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" سے امرِ ثانی کی طرف۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ

بے شک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے آگ میں، جس وقت جل جائے گی

جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

کھال اُن کی تو ہم بدل دیویں گے ان کو اور کھال تاکہ چکھتے رہیں عذاب، بے شک اللہ ہے

۱ مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب ما ینھی عنه من التھاجر إلخ ج:۲ ص:۴۲۸

۲ حوالۂ بالا۔

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ

زبردست حکمت والا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک البتہ ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ

جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ، ان کے لئے وہاں عورتیں ہیں

مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

ستھری اور ان کو ہم داخل کریں گے گھن کی چھاؤں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا ہے ہم انہیں آگ میں داخل کریں گے۔ جب بھی ان کی کھالیں جل جل کر پک جائیں گی، تو ہم انہیں ان کے بدلے دُوسری کھالیں دے دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ بیشک اللہ صاحب اقتدار بھی ہے، صاحب حکمت بھی ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان کو ہم ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں ان کے لئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے۔ ﴿۵۷﴾

خلاصۂ تفسیر

بلاشک جو لوگ ہماری آیات (و احکام) کے منکر ہوئے (ہم ان کو) عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے (اور وہاں ان کی برابر یہ حالت رہے گی کہ) جب ایک دفعہ ان کی کھال (آگ سے) جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دُوسری (تازی) کھال پیدا کر دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب ہی بھگتے رہیں (کیونکہ پہلی کھال میں جلنے کے بعد

شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس میں اِدراک واِحساس نہ رہے اس لئے شبہ قطع کرنے کے لئے یہ سنادیا) بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (کہ وہ ایسی سزا دے سکتے ہیں اور) حکمت والے ہیں (اس لئے باوجود قدرت کے جلی ہوئی کھال کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں، پھر بھی کسی حکمت سے بدل دیا جیسے کہ ایک حکمت کا بیان ابھی ہوا ہے) اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اُن کے واسطے اُن (باغوں) میں پاک صاف بیبیاں ہوں گی اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ (کی جگہ) میں داخل کریں گے۔

معارف ومسائل

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ان کی کھال جل چکے گی تو اس کو تبدیل کیا جائے گا، اور یہ کام اتنی سرعت سے ہوگا کہ ایک ساعت میں سو مرتبہ کھال تبدیل کی جائے گی۔

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:-

تَاْكُلُ النَّارُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ اَلْفَ مَرَّةٍ كُلَّمَا اَكَلَتْهُمْ قِيْلَ لَهُمْ عُوْدُوْا فَيَعُوْدُوْنَ كَمَا كَانُوْا۔(اخرجہ البیہقی عن الحسن بحوالہ مظہری ج:۲) [1]

"آگ ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی، جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت پر لوٹ جاؤ، پس وہ لوٹ جائیں گے۔"

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اَهْوَنَ اَهْلِ النَّارِ عَذَابًا رَجُلٌ فِيْ اَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَتَانِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهٗ كَمَا يَغْلِي الْمِرْجَلُ بِالْقُمْقُمِ۔ (رواه البخاری ومسلم بحوالہ الترغیب والترهیب) [2]

---

[1] شعب الإیمان للبیهقی رقم الحدیث: ۴۱۹

[2] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار ج:۲ ص:۹۷۱، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شفاعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم إلخ ج:۱ ص:۱۱۵، والترغیب والترهیب رقم الحدیث: ۳۶۸۵

"نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اہلِ جہنم میں سب سے کم عذاب کے اِعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چنگاریاں ہوں گی جن کی وجہ سے اس کا دِماغ ہانڈی کی طرح کھولتا ہوگا۔"

"اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ" کی تفسیر

حاکم نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی عورتیں پاک ہوں گی، یعنی وہ حیض وبال وبراز اور ناک سے بہنے والی کدورت سے پاک ہوں گی۔ [۱]

حضرت مجاہدؒ نے مذکورہ چیزوں پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بچے پیدا کرنے اور ناپاک نطفہ سے بھی پاک ہوں گی۔ (مظہری) [۲]

ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝۵۷ ظل کے بعد ظلیل کا لفظ ذِکر کر کے اِشارہ کر دیا کہ وہ سایہ ہمیشہ رہنے والا ہوگا اور گھنا سایہ ہوگا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "شَمْسٌ شَامِسٌ" اور "لَيْلٌ لَيْئِلٌ" اس سے اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جنت کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی ہوں گی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً يَّسِيْرُ الرَّاكِبُ فِيْ ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ مَّا يَقْطَعُهَا اِقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ: وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔ (متفق عليه، بحواله مظهری)۔ [۳]

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تحقیق جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ کو ایک سوار سو سال میں بھی طے نہ کر سکے گا، اگر آپ چاہیں تو یہ آیت وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ پڑھیں۔"

ربیع بن انسؒ نے ظِلًّا ظَلِيْلًا کی تفسیر میں فرمایا: "هُوَ ظِلُّ الْعَرْشِ الَّذِیْ لَا يَزُوْلُ" یعنی وہ سایہ عرش کا سایہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہوگا۔

---

[۱] تفسير ابن ابی حاتم رقم الحديث: ۳۳۳۰

[۲] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۴۶

[۳] صحيح البخاری، كتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة ج: ۱ ص: ۴۶۱، وصحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها إلخ ج: ۲ ص: ۳۷۸

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ

بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو

بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے، اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو، بے شک اللہ

كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا

ہے سننے والا دیکھنے والا۔ اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو

الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ

رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے

وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ

اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر، یہ بات اچھی ہے

ع ۸ ۹ ۵ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع

اور بہت بہتر ہے اس کا انجام۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بیشک اللہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ ﴿۵۸﴾ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم

میں سے جولوگ صاحبِ اِختیار ہوں، اُن کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اِختلاف ہوجائے تو اگر واقعی تم اللہ اور یومِ آخرت پر اِیمان رکھتے ہو تو اُسے اللہ اور رسول کے حوالے کردو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔ (۵۹)

خلاصۂ تفسیر

(اے اہلِ حکومت خواہ تھوڑوں پر حکومت ہو خواہ بہتوں پر) بے شک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہنچادیا کرو اور (تم کو) یہ (بھی حکم دیتے ہیں) کہ جب (محکوم) لوگوں کا تصفیہ کیا کرو (ایسے حقوق میں جو اُن میں باہم ایک دُوسرے کے ذمہ ہیں) تو عدل (اِنصاف) سے تصفیہ کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے (دُنیا کے اِعتبار سے بھی کہ اس میں اِستحکامِ حکومت ہے اور آخرت کے اِعتبار سے بھی کہ موجبِ قرب وثواب ہے) بلاشک اللہ تعالیٰ (تمہارے اقوال کو جو دربارۂ امانت وتصفیہ تم سے صادر ہوتے ہیں) خوب سنتے ہیں (اور تمہارے افعال کو جو اس باب میں تم سے واقع ہوتے ہیں) خوب دیکھتے ہیں (تو اگر کمی وکوتاہی کروگے مطلع ہوکر تم کو سزا دیں گے، یہ خطاب تو حکام کو ہوا، آگے محکومین کو اِرشاد ہے کہ) اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا مانو (اور یہ حکم تو تمہارے اور حکام سب کے لئے عام ہے) اور تم (مسلمانوں) میں جو لوگ اہلِ حکومت ہیں ان کا بھی (کہنا مانو اور یہ حکم خاص ہے تم محکومین کے ساتھ) پھر (اگر ان کے اَحکام کا اللہ اور رسول کے کہے ہوئے کے خلاف نہ ہونا محکوم وحاکم دونوں کے اِتفاق معتبر سے ثابت ہو تو خیر اس میں تو حکام کی اطاعت کروگے ہی اور) اگر (ان کے اَحکام میں سے) کسی امر میں تم باہم اِختلاف کرنے لگو (کہ یہ اللہ ورسول کے کہے ہوئے کے خلاف ہے یا نہیں) تو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو آپ سے پوچھ کر اور بعد آپ کی وفات کے اَئمۂ مجتہدین وعلمائے دِین سے رُجوع کرکے) اس اَمر کو (کتاب) اللہ اور (سنتِ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف حوالہ کرلیا کرو (اور ان حضرات سے جیسا فتویٰ ملے اس پر سب محکوم وحکام عمل کرلیا کرو) اگر تم اللہ پر اور یومِ قیامت پر اِیمان رکھتے ہو (کیونکہ اس اِیمان کا مقتضا یہی ہے کہ یومِ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی دارو گیر سے جو کہ مخالفت کرنے پر ہونے والی ہے ڈریں) یہ اُمور (جو مذکور ہوئے، اِطاعت اللہ کی، رسول کی، اُولی الامر کی، حوالہ کرنا تنازعات کا کتاب وسنت کی طرف) سب (دُنیا میں بھی) بہتر ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کا انجام خوشتر ہے (کیونکہ دُنیا میں امن وراحت اور آخرت میں نجات وسعادت ہیں)۔

معارف ومسائل

آیات کا شانِ نزول

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ کعبہ کی خدمت اِسلام سے پہلے بھی بڑی عزّت سمجھی جاتی تھی، اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزّز وممتاز مانے جاتے تھے، اسی لئے بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت سے اَیامِ حج میں حجاج کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، جس کو ''سقایہ'' کہا جاتا تھا۔ اسی طرح اور بعض خدمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُوسرے چچا ابوطالب کے سپرد تھیں، اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقرّرہ ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے متعلق تھا۔

عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے، اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ایک روز رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے تشریف لائے، (اس وقت تک عثمان بن طلحہؓ اِسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے) انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر جانے سے روکا اور اِنتہائی ترشی دِکھائی، آپ نے بڑی بُردباری کے ساتھ ان کے سخت کلمات کو برداشت کیا، پھر فرمایا: اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، جبکہ مجھے اِختیار ہوگا کہ جس کو چاہوں سپرد کردوں۔ عثمان بن طلحہؓ نے کہا کہ اگر ایسا ہوگیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہوجائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، اس وقت قریش آباد اور عزّت والے ہوجائیں گے۔ آپ یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اس کے بعد جب میں نے اپنے دِل کو ٹٹولا تو مجھے یقین سا ہوگیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہوکر رہے گا، میں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا اِرادہ کرلیا، لیکن میں نے اپنی قوم کے تیور بدلے ہوئے پائے، وہ سب کے سب مجھے سخت ملامت کرنے لگے، اس لئے میں اپنے اِرادہ کو پورا نہ کرسکا۔ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلاکر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی، میں نے پیش کردی۔

بعض روایات میں ہے کہ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کنجی لے کر بیت اللہ کے اُوپر چڑھ گئے تھے، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے زبردستی کنجی ان کے ہاتھ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی۔ بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز اَدا کرنے کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو پھر کنجی مجھ کو واپس کرتے

ہوئے فرمایا کہ لو اب یہ کنجی ہمیشہ تمہارے ہی خاندان کے پاس قیامت تک رہے گی، جو شخص تم سے یہ کنجی لے گا وہ ظالم ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی دُوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ کنجی لے لے، اسی کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلہ میں تمہیں جو مال مل جائے اس کو شرعی قاعدہ کے موافق اِستعمال کرو۔

عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں کنجی لے کر خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا: کیوں عثمان! جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟ اب مجھے وہ بات یاد آ گئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے فرمائی تھی کہ ایک روز تم یہ کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، میں نے عرض کیا کہ بے شک آپ کا اِرشاد پورا ہوا، اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ (مظہری، بروایت ابنِ سعد) [۱]

حضرت فاروقِ اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی: "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا" اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی، ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اُس وقت جوفِ کعبہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر کنجی ان کے سپرد کی، کیونکہ عثمان بن طلحہؓ نے جب یہ کنجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی تو یہ کہہ کر دی تھی کہ "میں یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔"

اگرچہ ضابطہ سے اُن کا یہ کہنا صحیح نہ تھا، بلکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہر طرح کا اِختیار تھا کہ جو چاہیں کریں، لیکن قرآن کریم نے صورتِ امانت کی بھی رعایت فرمائی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہدایت کی کہ کنجی عثمانؓ ہی کو واپس فرمادیں، حالانکہ اس وقت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت "سقایہ" اور "سدانہ" ہمارے پاس ہے، یہ کنجی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرمادیجئے، مگر آیتِ مذکورہ کی ہدایت کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست رَدّ کر کے کنجی عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو واپس فرمائی۔ (تفسیر مظہری) [۲]

یہاں تک آیت کے شانِ نزول پر کلام تھا، اور اس پر سب کا اِتفاق ہے کہ آیت کا شانِ نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ ہوا کرتا ہے، لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری اُمت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اب اس کے معنی اور مطلب ملاحظہ کیجئے:۔

اِرشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا یعنی "اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے

---

[۱] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۴۶ تا ۱۴۸

[۲] بحوالۂ بالا۔

مستحقین کو پہنچایا کرو۔'' اس حکم کا مخاطب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمان ہوں، اور یہ بھی اِحتمال ہے کہ خاص اُمراء وحکام مخاطب ہوں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو کسی امانت کا امین ہے، اس میں عوام بھی داخل ہیں اور حکام بھی۔

ادائے امانت کی تاکید

حاصل اس اِرشاد کا یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں کوئی امانت ہے اس پر لازم ہے کہ یہ امانت اس کے اہل و مستحق کو پہنچادے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے امانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوگا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ اِرشاد نہ فرمایا ہو:-

لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ۔ [۱]

''یعنی جس میں امانت داری نہیں اس میں اِیمان نہیں، اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دِین نہیں۔'' (یہ روایت بیہقیؒ نے ''شعب الایمان'' میں نقل کی ہے)

خیانت نفاق کی علامت ہے

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتاتے ہوئے ایک علامت یہ بتلائی کہ جب امانت اُس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔ [۲]

امانت کی قسمیں

اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآنِ حکیم نے لفظ ''امانات'' بصیغۂ جمع اِستعمال فرمایا، جس میں اِشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں، جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذِکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمتِ بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔

حکومت کے مناصب اللہ کی امانتیں ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام

[۱] شعب الإیمان للبیهقی رقم الحدیث: ۴۱۸۴

[۲] صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق ج:۱ ص:۱۰ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق ج:۱ ص:۵۶

اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے، بلکہ اُن پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لئے اپنے دائرۂ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔

کسی منصب پر غیر اہل کو بٹھانے والا ملعون ہے

پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی وتعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کئے ہوئے دے دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہوجائے۔ (جمع الفوائد ص:۳۲۵)

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دُوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول کی اور سب مسلمانوں کی۔[۱] آج جہاں نظامِ حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کردینے کا نتیجہ ہے، کہ تعلقات اور سفارشوں اور رشتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل اور ناقابل لوگ عہدوں پر قابض ہوکر خلقِ خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظامِ حکومت برباد ہوجاتا ہے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: "اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ" یعنی "جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کردی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو۔" یہ ہدایت صحیح بخاری، کتاب العلم میں ہے۔[۲]

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے لفظ "امانات" بصیغۂ جمع لاکر اس کی طرف اشارہ کردیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دُوسرے شخص کے پاس بطورِ امانت رکھا ہو، بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

---

[۱] کنز العمال، حرف الخاء رقم الحدیث: ۱۴۹۱۹

[۲] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من سئل علمًا إلخ ج:۱ ص:۱۴

اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ۔ [۱]

''یعنی مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔''

مطلب یہ ہے مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے، ان کی اجازت کے بغیر اس کو دُوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" [۲] یعنی ''جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔'' اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر جانتے ہوئے خلاف مشورہ دے دیا تو اَمانت میں خیانت کا مرتکب ہوگیا۔ اسی طرح کسی نے آپ سے اپنا راز کہا تو وہ اس کی امانت ہے، بغیر اس کی اجازت کے کسی سے کہہ دینا خیانت ہے، آیتِ مذکورہ میں ان سب امانتوں کا حق ادا کرنے کی تاکید ہے۔

یہاں تک پہلی آیت کے اِبتدائی جملہ کی تفسیر تھی۔ آگے پہلی آیت کے دُوسرے جملہ کی تفسیر ہے: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ یعنی ''جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو عدل واِنصاف کے ساتھ کیا کرو۔'' ظاہر یہ ہے کہ اس کا خطاب حکام واُمراء کو ہے جو خصومات ومقدمات کا فیصلہ کیا کرتے ہیں، اور اُسی کے قرینہ سے بعض حضرات نے پہلے جملہ کا مخاطب بھی حکام واُمراء کو قرار دیا ہے، اگرچہ پہلے جملہ کی طرح اس میں بھی گنجائش اس کی موجود ہے کہ حکام وعوام دونوں اس خطاب میں شامل ہوں، کیونکہ عوام میں اکثر فریقین کسی کو ثالث بناکر فیصلہ کردیا کرتے ہیں، اسی طرح جھگڑوں کا فیصلہ کرنا عوام میں بھی پایا جاسکتا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اوّل نظر میں ان دونوں جملوں کے مخاطب حکام واُمراء ہی معلوم ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مخاطبِ اوّل حکام واُمراء ہیں، اور ثانیاً یہ خطاب ہر اس شخص کے لئے بھی ہے جس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں اور جس کو کسی مقدمہ کا ثالث بنادیا جائے۔

اس جملہ میں حق تعالیٰ نے بَيْنَ النَّاسِ فرمایا، "بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ" یا "بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" نہیں فرمایا، اس میں اِشارہ فرمادیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب اِنسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اور دوست ہوں یا دُشمن، اپنے ہم وطن، ہم رنگ، ہم زبان ہوں یا غیر، فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہوکر جو بھی حق واِنصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں۔

عدل واِنصاف امنِ عالم کا ضامن ہے

غرض آیت کے پہلے جملہ میں ادائے امانات کا حکم ہے، اور دُوسرے میں عدل واِنصاف کا، ان میں اَدائے

---

[۱] سنن ابی داؤد، كتاب الأدب، باب في نقل الحديث ج:۲ ص:۲۶۸

[۲] سنن ابی داؤد، كتاب الأدب، باب في المشورة ج:۲ ص:۲۹۹

امانات کو مقدم کیا گیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پورے ملک میں عدل و انصاف کا قیام اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، کہ جن کے ہاتھ میں ملک کا اِقتدار ہے وہ پہلے ادائے امانات کا فریضہ صحیح طور پر ادا کریں، یعنی حکومت کے عہدوں پر صرف انہی لوگوں کو مقرّر کریں جو صلاحیتِ کار اور امانت و دیانت کی رُو سے اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ بہتر نظر آئیں، دوستی اور تعلقات یا محض سفارشات یا رِشوت کو اس میں راہ نہ دیں، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ نااہل ناقابل یا خائن اور ظالم لوگ عہدوں پر قابض ہو جائیں گے، پھر اگر اَربابِ اِقتدار دِل سے بھی یہ چاہیں کہ ملک میں عدل و انصاف کا رِواج ہو تو ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا، کیونکہ یہ عہدہ دارانِ حکومت ہی حکومت کے ہاتھ اور پیر ہیں، جب یہ خائن یا ناقابل ہوئے تو عدل و انصاف قائم کرنے کی کیا راہ ہے؟

اس آیت میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں حق جل شانہٗ نے حکومت کے عہدوں کو بھی امانت قرار دے کر اوّل تو یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنا چاہئے جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر، مسکین پر رحم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں، یا کسی رِشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لئے کسی شخص کی امانت اس کو دے دینا دُرست نہیں، اسی طرح حکومت کے عہدے جن کے ساتھ عام خلقِ خدا تعالیٰ کا کام متعلق ہوتا ہے یہ بھی امانتیں ہیں، اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اپنی صلاحیتِ کار اور قابلیت و اِستعداد کے اِعتبار سے بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں، اور دیانت اور امانت کے اِعتبار سے بھی سب میں بہتر ہوں، ان کے سوا کسی دُوسرے کو یہ عہدہ سپرد کر دیا تو یہ امانت ادا نہ ہوئی۔

علاقائی اور صوبائی بنیادوں پر حکومت کے مناصب سپرد کرنا اُصولی غلطی ہے

اس کے ساتھ قرآنِ حکیم کے اس جملہ نے اُس عام غلطی کو بھی دُور کر دیا جو اکثر ممالک کے دستوروں میں چل رہی ہے کہ حکومت کے عہدوں کو باشندگانِ ملک کے حقوق قرار دے دیا ہے۔

اور اس اُصولی غلطی کی بنا پر یہ قانون بنانا پڑا کہ حکومت کے عہدے تناسبِ آبادی کے اُصول پر تقسیم کئے جائیں، ہر صوبۂ ملک کے لئے کوٹے مقرّر ہیں، ایک صوبہ کے کوٹہ میں دُوسرے صوبہ کا آدمی نہیں رکھا جا سکتا، خواہ وہ کتنا ہی قابل اور امین کیوں نہ ہو، اور اس صوبہ کا آدمی کتنا ہی غلط کار نااہل ہو، قرآنِ حکیم نے صاف اعلان فرما دیا کہ یہ عہدے کسی کا حق نہیں بلکہ امانتیں ہیں جو صرف اہلِ امانت ہی کو دی جا سکتی ہیں، خواہ وہ کسی صوبہ اور کسی خطہ کے رہنے والے ہوں، البتہ کسی خاص علاقہ اور صوبہ پر حکومت کے لئے اسی علاقہ کے آدمی کو ترجیح دی جا سکتی ہے کہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کام کی صلاحیت اور امانت میں اس پر پورا اطمینان ہو۔

دستورِ مملکت کے چند زرّیں اُصول

اس طرح اس مختصر آیت میں دستورِ مملکت کے چند بنیادی اُصول آگئے جو مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- اوّل یہ کہ آیت کے پہلے جملہ کو اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ سے شروع فرما کر اس طرف اِشارہ کر دیا کہ اصل اَمر اور حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، سلاطینِ دُنیا سب اس کے مأمور ہیں، اس سے ثابت ہوا ہے کہ ملک میں اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

۲- دُوسرے یہ کہ حکومت کے عہدے باشندگانِ ملک کے حقوق نہیں جن کو تناسبِ آبادی کے اُصول پر تقسیم کیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی امانتیں ہیں جو صرف ان کے اہل اور لائق لوگوں کو دیئے جاسکتے ہیں۔

۳- تیسرے یہ کہ زمین پر اِنسان کی حکمرانی صرف ایک نائب وامین کی حیثیت سے ہوسکتی ہے، وہ ملک کی قانون سازی میں ان اُصول کا پابند رہے گا جو حاکمِ مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلا دیئے گئے ہیں۔

۴- چوتھے یہ کہ حکام واُمراء کا فرض ہے کہ جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آئے تو نسل و وطن اور رنگ و زبان یہاں تک کہ مذہب و مسلک کا اِمتیاز کئے بغیر عدل و اِنصاف کا فیصلہ کریں۔

اس آیت میں دستورِ مملکت کے زرّیں اُصول بتلا کر آخر میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو نصیحت کی ہے وہ بہت ہی اچھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی سنتا ہے، اور جو بولنے اور فریاد کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے حالات کو خود دیکھتا ہے، اس لئے اس کے بتلائے اور بنائے ہوئے اُصول ہی ایسے ہیں جو ہمیشہ ہر ملک میں اور ہر دور میں قابلِ عمل ہوسکتے ہیں، اِنسانی دِماغوں کے بنائے اُصول و دستور صرف اپنے ماحول کے اندر محدود ہوا کرتے ہیں، اور تغیرِ حالات کے بعد ان کا بدلنا ناگزیر ہوتا ہے، جس طرح پہلی آیت کے مخاطب حکام واُمراء تھے دُوسری آیت میں عوام کو مخاطب فرما کر اِرشاد فرمایا کہ اے اِیمان والو! تم اللہ کی اور رسول کی اور اپنے اُولی الامر کی اِطاعت کرو۔

اُولی الاَمر کون لوگ ہیں؟

''اُولی الاَمر'' لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام و اِنتظام ہو، اسی لئے حضرت ابنِ عباس، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ رضی اللہ عنہم، مفسرینِ قرآن نے ''اُولی الاَمر'' کے مصداق علماء وفقہاء کو قرار دیا ہے کہ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، اور نظامِ دِین ان کے ہاتھ میں ہے۔

اور ایک جماعتِ مفسرین نے جن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ ''اُولی الاَمر'' سے مراد حکام اور اُمراء ہیں جن کے ہاتھ میں نظامِ حکومت ہے۔

اور تفسیر ابنِ کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ لفظ دونوں طبقوں کو شامل ہے،[1] یعنی علماء کو بھی اور حکام واُمراء کو بھی، کیونکہ نظام اَمر انہی دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس آیت میں ظاہراً تین کی اِطاعتوں کا حکم ہے، اللہ، رسول، اُولی الاَمر، لیکن قرآن کی دُوسری آیات نے واضح فرمادیا کہ حکم واطاعت دراصل صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (الانعام:۵۷) مگر اس کے حکم اور اس کی اِطاعت کی عملی صورت چار حصوں میں منقسم ہے۔

حکم اور اِطاعت کی تین عملی صورتیں

ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمادیا، اور اس میں کسی تفصیل وتشریح کی حاجت نہیں، جیسے شرک وکفر کا اِنتہائی جرم ہونا، ایک اللہ وحدہٗ کی عبادت کرنا، اور آخرت اور قیامت پر یقین رکھنا، اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری برحق رسول ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو فرض سمجھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو براہِ راست اَحکامِ ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلاواسطہ حق تعالیٰ کی اِطاعت ہے۔

دُوسرا حصہ اَحکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات وتشریحات کی ضرورت ہے، ان میں قرآنِ کریم اکثر ایک مجمل یا مبہم حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح وتفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل وتشریح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کے ذریعہ فرماتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے، اگر اس تفصیل وتشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اِصلاح فرمادی جاتی ہے، اور بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکمِ اِلٰہی کا ترجمان ہوتا ہے۔

اس قسم کے اَحکام کی اِطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اِطاعت ہے لیکن ظاہری اِعتبار سے چونکہ یہ اَحکام صریح طور پر قرآن نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اُمت کو پہنچے ہیں، اس لئے ان کی اِطاعت ظاہری اِعتبار سے اِطاعتِ رسول ہی کہلاتی ہے، جو حقیقت میں اِطاعتِ اِلٰہی کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اِعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے پورے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اِطاعتِ رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔

تیسرا درجہ اَحکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث میں، یا ذخیرۂ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے اَحکام میں علمائے مجتہدین قرآن وسنت کے منصوصات اور زیرِغور مسئلہ کے نظائر میں غور وفکر

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۳۴۵، وتفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۵۱، ۱۵۲

کرکے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں، ان اَحکام کی اِطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اِعتبار سے قرآن وسنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اِطاعتِ خداوندی ہی کی ایک فرد ہے، مگر ظاہری سطح کے اِعتبار سے یہ فقہی فتاویٰ کہلاتے ہیں، اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔

اسی تیسری قسم میں ایسے اَحکام بھی ہیں جن میں کتاب وسنت کی رُو سے کوئی پابندی عائد نہیں، بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اِختیار ہے جس طرح چاہیں کریں، جن کو اِصطلاح میں ''مباحات'' کہا جاتا ہے، ایسے اَحکام میں عملی اِنتظام حکام واُمراء کے سپرد ہے کہ وہ حالات اور مصالح کے پیشِ نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں، مثلاً شہر کراچی میں ڈاک خانے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں؟ ریلوے کا نظام کس طرح ہو؟ آبادکاری کا اِنتظام کن قواعد پر کیا جائے؟ یہ سب مباحات ہیں، ان کی کوئی جانب نہ واجب ہے نہ حرام بلکہ اِختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دے دیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا، اس لئے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

آیتِ مذکورہ میں اُولوالامر کی اِطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے، اس لئے اس آیت کی رُو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی اُمور میں حکام واُمراء کی اِطاعت واجب ہوگئی۔

یہ اِطاعت بھی درحقیقت اللہ جل شانہٗ کے اَحکام ہی کی اِطاعت ہے، لیکن ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ اَحکام نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں، بلکہ ان کا بیان یا علماء کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے، اس لئے اس اطاعت کو تیسرا نمبر جداگانہ قرار دے کر اُولوالامر کی اِطاعت کا نام رکھا گیا۔ اور جس طرح منصوصاتِ قرآن میں قرآن کا اِتباع اور منصوصاتِ رسول میں رسول کا اِتباع لازم وواجب ہے، اسی طرح غیر منصوص فقہی چیزوں میں فقہاء کا، اور اِنتظامی اُمور میں حکام واُمراء کا اِتباع واجب ہے، یہی مفہوم ہے اِطاعتِ اُولی الامر کا۔

خلافِ شرع کاموں میں اَمیر کی اِطاعت جائز نہیں

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس کام کو اِرشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرو تو عدل واِنصاف کے ساتھ کرو، اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اُولی الامر کی اِطاعت کی تعلیم دی، اس سے اِشارہ اس بات کی طرف کردیا کہ امیر اگر عدل پر قائم رہے تو اس کی اِطاعت واجب ہے، اور اگر وہ عدل واِنصاف کو چھوڑ کر خلافِ شرع اَحکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اِطاعت نہیں کی جائے گی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: ''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ'' [۱] یعنی ''مخلوق کی ایسی اِطاعت جائز نہیں جس سے خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔''

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ ج:۲ ص:۳۱۹

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اِرشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی عدل و اِنصاف کو قائم رکھنے کی طاقت اور صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کو قاضی بھی نہیں بننا چاہئے، کیونکہ حکم بالعدل بھی ایک امانت ہے، جس کی حفاظت کمزور اور نااہل آدمی نہیں کرسکتا، چنانچہ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرّر فرمالیں، تو آپ نے جواب میں اِرشاد فرمایا کہ:-

يَا اَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَّإِنَّهَا اَمَانَةٌ وَّإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَّنَدَامَةٌ إِلَّا مَنْ اَخَذَ بِحَقِّهَا وَاَدّٰى الَّذِيْ عَلَيْهِ فِيْهَا۔ (رواه مسلم بحواله مظهرى) [۱]

''اے ابوذر! آپ ضعیف آدمی ہیں، اور منصب ایک امانت ہے، جس کی وجہ سے قیامت کے دن اِنتہائی ذِلت اور رُسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کردیا ہو (یعنی وہ ذِلت سے بچ جائے گا)۔''

عادل آدمی اللہ کا محبوب ترین بندہ ہے

ایک حدیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ عادل اللہ کا محبوب اور قریب ترین اِنسان ہے، اور ظالم اللہ کی رحمت اور نظرِ کرم سے دُور ہوتا ہے۔ [۲]

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ سب سے پہلے اللہ کے سایہ کے نیچے کون جائے گا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس بات کا زیادہ علم ہے، تو پھر آپ نے اِرشاد فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے جب حق آجائے تو فوراً قبول کرلیتے ہیں، اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو مال کو خرچ کرتے ہیں، اور جب وہ فیصلہ کرتے ہیں تو ایسا عادلانہ کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے لئے کرتے۔ [۳]

اِجتہاد اور قیاس کا ثبوت

قولہ تعالیٰ: فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اگر تمہارا کسی امر کے بارے میں اِختلاف ہوجائے تو تم اللہ اور رسول کی جانب رُجوع کرو۔

[۱] صحيح مسلم، كتاب الامارة باب كراهة الامارة إلخ ج:۲ ص:۱۲۱

[۲] اس کی ہم معنی حدیث سنن ترمذی، ابواب الأحكام عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الإمام العادل (ج:۱ ص:۲۴۸) میں موجود ہے۔

[۳] مسند احمد حديث السيّدة عائشة رضى الله عنها رقم الحديث:۲۳۲۴۳

کتاب وسنت کی طرف رُجوع کرنے کی دوصورتیں ہیں، ایک یہ کہ کتاب وسنت کے احکامِ منصوصہ کی جانب رُجوع کیا جائے، دُوسری صورت یہ ہے کہ اگر احکامِ منصوصہ موجود نہیں ہیں تو ان کے نظائر پر قیاس کرکے رُجوع کیا جائے گا، فَرُدُّوْهُ کے الفاظ عام ہیں جو دونوں صورتوں کو شامل ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اُترا تیری طرف اور جو اُترا

مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ

تجھ سے پہلے چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں شیطان کی طرف اور حکم ہوچکا ہے ان کو کہ

يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

اس کو نہ مانیں، اور چاہتا ہے شیطان کہ ان کو بہکاکر دُور جاڈالے۔ اور جب ان کو کہے کہ

تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ

آؤ اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے اُتارا اور رسول کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ ہٹتے ہیں تجھ سے

صُدُوْدًا ۝۶۱ؕ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ

رُک کر۔ پھر کیا ہو جبکہ اُن کو پہنچے مصیبت اپنے ہاتھوں کے کئے ہوئے سے پھر

جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖۗ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲

آویں تیرے پاس قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر بھلائی اور ملاپ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو اُن کے دِل میں ہے، سو تو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ

اور ان سے کہہ اُن کے حق میں بات کام کی۔ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں

بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ

اللہ کے فرمانے سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا بُرا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اُس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اُس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر اِنکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے ﴿۶۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اُتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف، تو تم ان منافقوں کو دیکھو گے کہ وہ تم سے پوری طرح منہ موڑ بیٹھتے ہیں ﴿۶۱﴾ پھر اُس وقت ان کا کیا حال بنتا ہے جب خود اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے؟ اُس وقت یہ آپ کے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھلائی کرنے اور ملاپ کرا دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ﴿۶۲﴾ یہ وہ ہیں کہ اللہ ان کے دِلوں کی ساری باتیں خوب جانتا ہے۔ لہٰذا تم انہیں نظر انداز کر دو، انہیں نصیحت کرو، اور ان سے خود ان کے بارے میں ایسی بات کہتے رہو جو دِل میں اُتر جانے والی ہو۔ ﴿۶۳﴾ اور ہم نے کوئی رسول اس کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور جب اِن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اگر یہ اُس وقت تمہارے پاس آ کر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت کی دُعا کرتے تو یہ اللہ کو بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان پاتے۔ ﴿۶۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو (زبان سے تو) دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) اس کتاب پر بھی اِیمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (یعنی توراۃ کیونکہ اس میں منافقین کا بیان ہے، اور اکثر منافقین یہود میں سے تھے، مطلب یہ کہ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح ہم توراۃ کو مانتے ہیں اسی طرح قرآن کو بھی مانتے ہیں، یعنی اسلام کے مدعی ہیں، پھر اس پر حالت یہ ہے کہ) اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شرع کی طرف مقدمہ لے جانے کے لئے شیطان سکھلاتا ہے، پس اس پر عمل کرنا ایسا ہے جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمہ لے گئے) حالانکہ (اس سے دو اَمر مانع موجود ہیں ایک یہ کہ) ان کو (شریعت کی جانب سے) یہ حکم ہوا کہ اس (شیطان) کو نہ مانیں (یعنی اِعتقاداً وعملاً اس کی مخالفت کریں) اور (دُوسرا مانع یہ کہ) شیطان (ان کا ایسا دُشمن اور بدخواہ ہے کہ) ان کو (راہِ حق سے) بھٹکا کر بہت دُور لے جانا چاہتا ہے (پس باوجود ان دونوں امروں کے جن کا مقتضا یہ ہے کہ شیطان کے کہنے پر عمل نہ کریں، پھر بھی اس کی موافقت کرتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور (آؤ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (کہ آپ اس حکم کے موافق فیصلہ فرمادیں) تو آپ (اس وقت) منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ (کے پاس آنے) سے پہلوتہی کرتے ہیں پھر کیسی جان کو بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو (اس مصیبت سے) پہلے کر چکے تھے (مراد اس حرکت سے شرع کو چھوڑ کر دُوسری جگہ مقدمہ لے جانا ہے، اور مصیبت سے مراد جیسے قتل یا خیانت ونفاق کا کھل جانا اور بازپُرس ہونا، یعنی اس وقت سوچ پڑتی ہے کہ اس حرکت کی کیا تأویل کریں جس میں پھر سرخرو ہیں) پھر (تأویل سوچ کر) آپ کے پاس آتے ہیں، خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ (ہم جو دُوسری جگہ چلے گئے تھے) ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا سوا اس کے کہ (معاملہ کے دونوں فریق کی) کوئی بھلائی (کی صورت) نکل آوے اور (ان میں) باہم موافقت (مصالحت) ہو جاوے (مطلب یہ کہ قانون تو شرع ہی کا حق ہے ہم دُوسری جگہ شرع کو ناحق سمجھ کر نہیں گئے تھے، لیکن بات یہ ہے کہ قانونی فیصلے میں تو صاحبِ حق کو حاکم رعایت کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا اور باہمی فیصلہ میں اکثر رعایت کرادی جاتی ہے، یہ وجہ تھی ہمارے دُوسری جگہ جانے کی، اور قصۂ قتل میں تأویل اس مقتول کے فعل کی ہوگی جس سے مقصود اپنی براءت یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر دعویٔ قتل بھی ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کی اس تأویل کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ (نفاق وکفر) ان کے دِلوں میں ہے (کہ اس کفر ونفاق وعدمِ رضا بحکمِ شرعی ہی کی وجہ سے یہ لوگ دُوسری جگہ جاتے ہیں اور وقتِ معین پر اس کی سزا بھی پالیں

گے) سو (مصلحت یہی ہے کہ) آپ (علمِ خداوندی ومؤاخذۂ خداوندی پر اکتفا فرما کر) ان سے تغافل کر جایا کیجئے (یعنی کچھ مؤاخذہ نہ فرمایئے) اور (ویسے اپنے منصبِ رسالت کے اقتضا سے) ان کو نصیحت فرماتے رہئے (کہ ان حرکتوں کو چھوڑ دو) اور ان سے خاص ان کی ذات (کی اصلاح) کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے (تا کہ ان پر حجت قائم اور تمام ہو جائے، پھر نہ مانیں تو وہ جانیں) اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکمِ خداوندی (جو کہ اطاعتِ رُسل کے باب میں فرمایا ہے) ان کی اطاعت کی جائے (پس اوّل تو ان لوگوں کو شروع ہی سے اطاعت کرنا واجب تھی) اور اگر (خیر شامتِ نفس سے حماقت ہی ہوگئی تھی تو) جس وقت (یہ گناہ کر کے) اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت (ندامت کے ساتھ) آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے پھر (حاضر ہو کر) اللہ تعالیٰ سے (اپنے اس گناہ کی) معافی چاہتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی) ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توبہ قبول فرما لیتے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

پہلی آیات میں تمام معاملات میں اللہ اور رسول کے اَحکام کی طرف رُجوع کرنے کا حکم تھا، اگلی ان آیات سے خلافِ شرع قوانین کی طرف رُجوع کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

آیات کا شانِ نزول

ان آیات کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ''بشر'' نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا، یہودی نے کہا کہ چل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس، ان سے فیصلہ کرائیں۔ مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی، کعب بن اشرف یہود کا ایک سردار اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا سخت دُشمن تھا، یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے۔ مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے، اس میں کسی کی رُورعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں، اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لئے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، اس لئے جانتا تھا کہ آپ کا

فیصلہ میرے خلاف ہوگا، اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ انجام ہوا کہ دونوں اس پر راضی ہوگئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوکر آپ ہی سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں۔ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اسی کے حق میں فیصلہ دے دیا، اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا ناکام کردیا، اس لئے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور ایک نئی راہ نکالی کہ کسی طرح یہودی کو اس بات پر راضی کرلیا جائے کہ ہم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ کرانے چلیں، یہودی نے اس کو قبول کرلیا، راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہرکیف یہ دونوں اب حضرت فاروقِ اعظمؓ کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے سامنے پورا واقعہ بیان کردیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں، مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں، اور آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اِقرار کیا، حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا: اچھا ذرا ٹھہرو! میں آتا ہوں، گھر میں تشریف لے گئے، اور ایک تلوار لے کر آئے، اور اس منافق کا کام تمام کردیا، اور فرمایا: ”جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو، اس کا یہی فیصلہ ہے۔“ (یہ واقعہ رُوح المعانی میں بروایت ثعلبی وابنِ ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے) [1]

اور عامۂ مفسرین نے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد منافق مقتول کے وارثوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ دعویٰ بھی دائر کردیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بغیر دلیلِ شرعی کے مار ڈالا ہے، اور اس کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے اس کے کفرِ قولی و عملی کی تاویلیں پیش کیں، آیتِ متذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی اصل حقیقت اور اس شخصِ مقتول کا منافق ہونا ظاہر فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بَری کردیا۔

اس سلسلہ میں اور بھی چند وقائع منقول ہیں، جن میں کچھ لوگوں نے شرعی فیصلہ چھوڑ کر کسی کاہن یا نجومی کا فیصلہ قبول کرلیا تھا، ہوسکتا ہے کہ آیتِ متذکرہ ان سب کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

اب آیات کی تفسیر دیکھئے، پہلی آیت میں اِرشاد ہوا کہ اس شخص کو دیکھو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں پچھلی کتابوں توراۃ اور اِنجیل پر بھی اِیمان لایا تھا اور جو کتاب (قرآن) آپ پر نازل ہوئی اس پر بھی اِیمان لاتا ہوں، یعنی پہلے اہلِ کتاب میں داخل تھا، پھر مسلمانوں میں داخل ہوگیا، لیکن یہ مسلمانوں میں داخل ہونا محض زبانی ہے، دِل میں وہی کفر بھرا ہوا ہے، جس کا

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۶۷

ظہور جھگڑے کے وقت اس طرح ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر یہودی سردار کعب بن اشرف کی طرف رُجوع کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واضح اور حق فیصلہ دے دیا تو اس پر راضی نہ ہوا۔

لفظ ''طاغوت'' کے لغوی معنی سرکشی کرنے والے کے ہیں اور عرف میں شیطان کو ''طاغوت'' کہا جاتا ہے، اس آیت میں کعب بن اشرف کی طرف مقدمہ لے جانے کو شیطان کی طرف لے جانا قرار دیا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ کعب بن اشرف خود ایک شیطان تھا، اور یا اس وجہ سے کہ شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر خلافِ شرع فیصلہ کی طرف رُجوع کرنا شیطان ہی کی تعلیم ہوسکتی ہے، اس کا اِتباع کرنے والا گویا شیطان ہی کے پاس اپنا مقدمہ لے گیا ہے، اسی لئے آخرِ آیت میں ہدایت فرمادی کہ جو شخص شیطان کی پیروی کرے گا تو شیطان اس کو دُور دراز کی گمراہی میں مبتلا کردے گا۔

دُوسری آیت میں بتلادیا کہ باہمی خصومت اور جھگڑے کے وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شرعی فیصلہ سے اِعراض کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا، ایسا کام کرنے والا منافق ہی ہوسکتا ہے، اور جب اس منافق کا کفر عملاً اس طرح کھل گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا اس کو قتل کرنا صحیح ہوگیا، کیونکہ اب وہ منافق نہ رہا بلکہ کھلا کافر ہوگیا، اس لئے اِرشاد فرمایا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ جب اُن سے کہا جائے کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے، اور اس کے رسول کی طرف، تو یہ منافقین آپ کی طرف آنے سے رُک جاتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان تأویلاتِ باطلہ کا غلط ہونا واضح کیا ہے جو شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر غیر شرعی فیصلہ کی طرف رُجوع ہونے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناحق سمجھ کر نہیں چھوڑا، اور دُوسروں کے فیصلوں کو اس کے بالمقابل حق سمجھ کر اِختیار نہیں کیا، بلکہ بعض مصالح کی بنا پر ایسا کیا، مثلاً یہ مصلحت تھی کہ آپ کے پاس تو قانونی فیصلہ ہوتا، جس میں باہمی مصالحت اور رواداری کا کوئی سوال نہیں تھا، ہم مقدمہ کو دُوسری جگہ اس لئے لے گئے کہ ان دونوں فریق کے لئے کوئی بھلائی کی صورت نکل آئے اور دونوں میں مصالحت کرادی جائے۔

یہ تأویلیں ان لوگوں نے اس وقت پیش کیں جبکہ ان کا راز کھل گیا، اور خباثت اور نفاق ظاہر ہوگیا، ان کا آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا، غرض جب ان کے اعمالِ بد کے نتیجہ میں ان پر رُسوائی یا قتل کی مصیبت پڑ گئی، تو قسمیں کھا کر تأویلیں کرنے لگے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرمادیا کہ یہ اپنی قسموں اور تأویلوں میں جھوٹے ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا اپنے کفر ونفاق کی وجہ سے کیا ہے۔ اِرشاد فرمایا کہ جب ان پر اپنے اعمالِ بد کے نتیجہ میں کوئی مصیبت پڑ جاتی ہے، مثلاً خیانت ونفاق ظاہر ہوکر رُسوائی ہوگئی، یا اس کے نتیجہ میں قتل کا واقعہ پیش آیا، تو اس وقت یہ لوگ آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دُوسرے کے پاس مقدمہ لے جانے کا سبب کفر

یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ناحق سمجھنا نہیں تھا، بلکہ ہمارا مقصد احسان و توفیق تھا، یعنی فریقین کے لئے کوئی بھلائی اور مصالحت کی راہ تلاش کرنا مقصود تھا۔

چوتھی آیت میں اس کا جواب آیا کہ ان کے دلوں میں جو کفر و نفاق ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف اور باخبر ہیں، ان کی تاویلیں غلط اور قسمیں جھوٹی ہیں، اس لئے آپ ان کے عذر کو قبول نہ فرمائیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ رَدّ فرما دیں، کیونکہ اس منافق کا کفر واضح ہو چکا تھا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان منافقین کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیر خواہانہ نصیحت فرمائیں، جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، یعنی آخرت کا خوف دِلا کر ان کو مخلصانہ اسلام کی طرف دعوت دیں یا دُنیوی سزا کا ذِکر کر دیں کہ اگر تم نفاق سے باز نہ آئے تو کسی وقت نفاق کھل جائے گا، تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا جو بشر منافق کا ہوا۔

پانچویں آیت میں اوّل تو ایک عام ضابطہ بتلایا کہ ہم نے جو رسول بھیجا وہ اسی لئے بھیجا کہ سب لوگ فرمانِ خداوندی کے موافق اس کے اَحکام کی اِطاعت کریں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص رسول کے اَحکام کی مخالفت کرے اس کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کیا جائے گا، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو عمل کیا وہ صحیح ہوا، اس کے بعد ان کو خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا ہے کہ یہ لوگ تاویلاتِ باطلہ اور جھوٹی قسموں کے بجائے اپنے قصور کا اِعتراف کر لیتے اور آپ کے پاس حاضر ہو کر خود بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی مغفرت کی دُعا کرتے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی توبہ قبول فرما لیتے۔

اس جگہ قبولِ توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُعائے مغفرت کرنے کی شرط غالباً اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوّت پر حملہ کیا، اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کر کے آپ کو اِیذا پہنچائی، اس لئے ان کے جرم کی توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اِستغفار کو شرط کر دیا گیا۔

یہ آیت اگرچہ خاص واقعۂ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لئے دُعائے مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دُنیوی حیات کے زمانے میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا، اور قبر شریف کے پاس آ کر گر گیا، اور زار زار روتے ہوئے آیتِ مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا

کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار، رسول کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول اس کے لئے دُعائے مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دُعا کریں۔ اُس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے یہ آواز آئی: "قَدْ غُفِرَ لَكَ" یعنی مغفرت کر دی گئی۔ (بحرِ محیط) [۱]

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

سو قسم ہے تیرے رَبّ کی! وہ مؤمن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو اُن میں اُٹھے، پھر

لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

نہیں، (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصل نہ بنائیں، پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دِلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس کے آگے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دیں ﴿۶۵﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر قسم ہے آپ کے رَبّ کی! یہ لوگ (جو صرف زبانی اِیمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں، عنداللہ) اِیمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ آپ سے (اور آپ نہ ہوں تو آپ کی شریعت سے) فیصلہ کرا دیں پھر (جب آپ تصفیہ کر دیں تو) اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دِلوں میں (اِنکار کی) تنگی نہ پاویں اور (اس فیصلہ کو) پورا پورا (ظاہر سے، باطن سے) تسلیم کر لیں۔

[۱] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۴ ص:۱۸۰

معارف و مسائل

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا کفر ہے

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علوِ مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت جو بے شمار آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہے اس کی واضح تشریح بیان فرمائی ہے، اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن یا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ٹھنڈے دِل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دِل میں بھی اس فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائی جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رسول خود اُمت کے حاکم اور ہر پیش آنے والے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے ذمہ دار ہیں، آپ کی حکومت اور آپ کا فیصلہ کسی کے حَکَم بنانے پر موقوف نہیں، پھر اس آیت میں مسلمانوں کو حَکَم بنانے کی تلقین اس لئے فرمائی گئی ہے کہ حکومت کے مقرّر کردہ حاکم اور اس کے فیصلہ پر تو بہت سے لوگوں کو اِطمینان نہیں ہوا کرتا، جیسا اپنے مقرّر کردہ ثالث یا حَکَم پر ہوتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف حاکم نہیں، بلکہ رسولِ معصوم بھی ہیں، رحمۃ للعالمین بھی ہیں، اُمت کے شفیق و مہربان باپ بھی ہیں، اس لئے تعلیم یہ دی گئی کہ جب بھی کسی معاملہ میں یا کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو فریقین کا فرض ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم بنا کر اس کا فیصلہ کرائیں اور پھر آپ کے فیصلہ کو دِل و جان سے تسلیم کر کے عمل کریں۔

اختلافات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم بنانا آپ کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں

حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اِرشادِ قرآنی پر عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کے بعد آپ کی شریعتِ مطہرہ کا فیصلہ خود آپ ہی کا فیصلہ ہے، اس لئے یہ حکم قیامت تک اس طرح جاری ہے کہ آپ کے زمانۂ مبارک میں خود بلاواسطہ آپ سے رُجوع کیا جائے، اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رُجوع کیا جائے جو درحقیقت آپ ہی کی طرف رُجوع ہے۔

چند اہم مسائل

اوّل یہ کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنے ہر جھگڑے اور ہر مقدمہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر

مطمئن نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو قتل کرڈالا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور پھر معاملہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا، اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حضرت عمرؓ پر دعویٰ کردیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بلاوجہ قتل کردیا، جب یہ اِستغاثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوا تو بے ساختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا: "مَا كُنْتُ اَظُنُّ اَنَّ عُمَرَ يَجْتَرِءُ عَلٰى قَتْلِ رَجُلٍ مُؤْمِنٍ"[1] (یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ عمر کسی مردِ مؤمن کے قتل کی جرأت کریں گے)۔ اس سے ثابت ہوا کہ حاکمِ اعلیٰ کے پاس اگر کسی ماتحت حاکم کے فیصلہ کی اپیل کی جائے تو اس کو اپنے حاکمِ ماتحت کی جانب داری کے بجائے اِنصاف کا فیصلہ کرنا چاہئے، جیسا اس واقعہ میں آیت نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اِظہارِ ناراضی فرمایا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حقیقت کھل گئی کہ اس آیت کی رُو سے وہ شخص مؤمن ہی نہیں تھا۔

دُوسرا مسئلہ اس آیت سے یہ نکلا کہ لفظ فِيْمَا شَجَرَ صرف معاملات اور حقوق کے ساتھ متعلق نہیں، عقائد اور نظریات اور دُوسرے نظری مسائل کو بھی حاوی ہے (بحرِ محیط)۔[2] اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب بھی کسی مسئلہ میں باہم اِختلاف کی نوبت آئے تو باہم جھگڑتے رہنے کے بجائے دونوں فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رُجوع کرکے مسئلہ کا حل تلاش کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہو، اس کے کرنے سے دِل میں تنگی محسوس کرنا بھی ضعفِ اِیمان کی علامت ہے، مثلاً جہاں شریعت نے تیمّم کرکے نماز پڑھنے کی اِجازت دی وہاں تیمم کرنے پر جس شخص کا دِل راضی نہ ہو، وہ اس کو تقویٰ نہ سمجھے بلکہ اپنے دِل کا روگ سمجھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی متقی نہیں ہوسکتا، جس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اِجازت دی اور خود بیٹھ کر اَدا فرمائی، اگر کسی شخص کا دِل اس پر راضی نہ ہو اور ناقابلِ برداشت محنت ومشقت اُٹھا کر کھڑے ہی ہوکر نماز اَدا کرے، تو وہ سمجھ لے کہ اس کے دِل میں روگ ہے، ہاں معمولی ضرورت یا تکلیف کے وقت اگر رُخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کے مطابق دُرست ہے، مگر مطلقاً شرعی رُخصتوں سے تنگ دِلی محسوس کرنا کوئی تقویٰ نہیں، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اِنَّ اللهَ تَعَالٰى يُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰى رُخَصُهٗ كَمَا يُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰى عَزَائِمُهٗ۔[3]

"یعنی اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمتوں پر عمل کرنے سے خوش ہوتے ہیں، اسی طرح رُخصتوں پر عمل

---

[1] [2] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۱۸۰

[3] المعجم الأوسط للطبرانی رقم الحدیث:۸۲۶۳ باب من بقیة اول اسمه میم۔

کرنے کو بھی پسند فرماتے ہیں۔"

عام عبادات واذکار واوراد، درود وتسبیح میں سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا معمول رہا، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ کا جس پر عمل رہا، مسلمانوں کا فرض ہے کہ حدیث کی مستند روایات سے اس کو معلوم کر کے اسی کو اپنا لائحہ عمل بنائیں۔

ایک اہم فائدہ

گزشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے صرف مصلح اور اَخلاقی رہبر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عادل حاکم بھی تھے، پھر حاکم بھی اس شان کے کہ آپ کے فیصلہ کو اِیمان وکفر کا معیار قرار دِیا گیا، جیسا کہ بشر منافق کے واقعہ سے ظاہر ہے، اس چیز کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں متعدّد مقامات پر اپنی اِطاعت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِطاعت کو بھی لازمی قرار دِیا ہے، اِرشاد ہوتا ہے: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی "تم اللہ کی اِطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اِطاعت کرو۔"

ایک دُوسری جگہ اِرشاد فرمایا: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء:۸۰) یعنی "جو رسول کی اطاعت کرے اس نے درحقیقت اللہ کی اِطاعت کی۔"

ان آیات میں غور کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ حاکمیت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے، جس کی عملی صورت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس اپنا قانون بھیجا، تاکہ آپ مقدمات کے فیصلے اسی کے مطابق کرسکیں، چنانچہ اِرشاد ہوتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (النساء:۱۰۵) یعنی "ہم نے آپ پر کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دِکھلائے اور سمجھائے۔"

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ

اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان یا چھوڑ نکلو اپنے گھر

مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

تو ایسا نہ کرتے مگر تھوڑے ان میں سے، اگر یہ لوگ کریں وہ جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ اُن کے حق میں بہتر ہو

وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾

اور زیادہ ثابت رکھنے والا دِین میں۔ اور اس وقت البتہ دیں ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب،

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

اور چلاویں ان کو سیدھی راہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر ہم ان کے لئے یہ فرض قرار دے دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی اس پر عمل نہ کرتا۔ اور جس بات کی انہیں نصیحت کی جارہی ہے اگر یہ لوگ اس پر عمل کر لیتے تو ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا، اور اُن میں خوب ثابت قدمی پیدا کر دیتا ﴿۶۶﴾ اور اُس صورت میں ہم انہیں خود اپنے پاس سے یقیناً اجرِ عظیم عطا کرتے ﴿۶۷﴾ اور اُنہیں ضرور بالضرور سیدھے راستے تک پہنچا دیتے ﴿۶۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات (بطور اَحکامِ مقصودہ کے) فرض کر دیتے کہ تم خود کشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے (جو مؤمن کامل ہوتے) اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا (اس سے ثابت ہوا کہ کمالِ اِطاعت کرنے والے کم ہوتے ہیں) اور اگر یہ (منافق) لوگ جو کچھ ان کو (اِطاعتِ رسول بجان و دِل کی) نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے (دُنیا میں تو بوجہ اِستحقاق ثواب کے) بہتر ہوتا اور (نیز باعتبار تکمیلِ دِین کے ان کے) اِیمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا (کیونکہ تجربے سے ثابت ہوا کہ دِین کا کام کرنے سے خود باطنی کیفیت اِعتقاد ویقین کو ترقی ہوتی ہے) اور اس حالت میں (جبکہ عمل سے خیریت اور تثبیتِ دِین حاصل ہو جاتی تو آخرت میں) ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اَجرِ عظیم عنایت فرماتے، اور ہم ان کو (جنت کا) سیدھا راستہ بتلا دیتے (کہ بے روک ٹوک جنت میں داخل ہوں جو کہ اَجرِ عظیم ملنے کا مقام ہے)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

جس واقعہ کی بنا پر یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئیں، وہ بشر منافق کا معاملہ تھا، جس نے اپنے جھگڑے کے فیصلہ کے لئے پہلے کعب بن اشرف یہودی کو تجویز کیا، پھر مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، اور آپ کا فیصلہ چونکہ اس کے خلاف تھا، اس پر راضی نہ ہوا، دوبارہ فیصلہ کرانے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، اس واقعہ کی جب مدینہ میں شہرت ہوئی تو یہود نے مسلمانوں کو عار دِلائی کہ تم کیسے لوگ ہو کہ جس کو رسول مانتے ہو اور اس کے اِتباع کے دعوے دار ہو، مگر اس کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے، دیکھو یہودیوں کو ان کے گناہ کی توبہ کے سلسلہ میں یہ حکم ملا تھا کہ تم اس میں ایک دُوسرے کو قتل کرو ہم نے تو اس شدید حکم کی تعمیل بھی کی، یہاں تک کہ ہمارے ستر ہزار آدمی مارے گئے، اگر تمہیں کوئی ایسا حکم دے دیا جاتا تو کیا کرتے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ یعنی ان منافقین کا یا عام لوگوں کا جن میں کافر و مؤمن سب داخل ہیں یہی حال ہے کہ اگر ان کو بنی اسرائیل کی طرح کوئی سخت حکم خودکشی یا ترکِ وطن کا دے دیا جاتا تو ان میں سے بہت کم آدمی اس حکم کی تعمیل کرتے۔

اس میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ ہے جو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا شریعتِ رسول کو چھوڑ کر کسی دُوسری طرف لے جاتے ہیں، اور یہودی کے طعن کا جواب بھی ہے کہ یہ حال منافقین کا ہے پکے مسلمانوں کا نہیں، اور شاہد اس کا یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اللہ نے ہمیں اس آزمائش میں نہیں ڈالا، صحابی کا یہ کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ میری اُمت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دِلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے زیادہ جما ہوا ہے۔ ابنِ وہبؒ کا بیان ہے کہ یہ کلمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر یہ حکم نازل ہوتا تو خدا کی قسم میں سب سے پہلے اپنے آپ اور اپنے اہلِ بیت کو اس پر قربان کر دیتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ حکم خودکشی یا ترکِ وطن کا اللہ کی طرف سے آجاتا تو ابنِ اُمِّ عبد یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود ضرور اس پر عمل کرتے، اور رہا دُوسرا معاملہ ترکِ وطن کا تو صحابہ کرامؓ نے اس پر تو عمل کر کے دِکھلا دیا کہ اپنے وطن مکہ اور اپنی تمام جائیدادوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر مدینہ

طیبہ کی طرف ہجرت اختیار کرلی۔

آخرِ آیت میں فرمایا کہ یہ کام اگرچہ مشکل ہے، لیکن اگر وہ ہمارے فرمان کے مطابق اس کو مان لیں تو انجامِ کار یہی ان کے لئے بہتر ہوگا، اور یہ عمل ان کے ایمان کو اور مضبوط کردے گا اور ہم اس پر ان کو ثوابِ عظیم عطا کریں گے، اور ان کو سیدھی راہ پر چلائیں گے۔

اس کے بعد آخری آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والوں کے درجاتِ عظیمہ کا بیان ہے، جس میں ان کو یہ بشارت دے دی گئی ہے کہ یہ لوگ جنت میں انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صلحاء کے ساتھ ہوں گے۔

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے اور اس کی تفصیل انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے چار درجات جن کا اس آیت میں ذکر ہے ان کی تشریح اور جنت میں ان کے ساتھ ہونے کی تفسیر ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا

مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ

کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں، اور اچھی ہے ان کی

رَفِيْقًا ۝۶۹ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰ ع ۹

رفاقت۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں! ۝۶۹ یہ فضیلت اللہ کی طرف سے ملتی ہے، اور (لوگوں کے حالات سے) پوری طرح باخبر ہونے کے لئے اللہ کافی ہے۔ ۝۷۰

خلاصۂ تفسیر

اور جو شخص (ضروری اَحکام میں بھی) اللہ ورسول کا کہنا مان لے گا (گو تکثیرِ طاعات سے کمال حاصل نہ کر سکے) تو ایسے اشخاص بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) اِنعام (دِین وقرب وقبول کا) فرمایا ہے، یعنی انبیاء (علیہم السلام)، اور صدیقین (جو کہ انبیاء کی اُمت میں سب سے زیادہ رُتبہ کے ہوتے ہیں، جن میں کمالِ باطنی بھی ہوتا ہے جن کو عرف میں اولیاء کہا جاتا ہے) اور شہداء (جنہوں نے دِین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی) اور صلحاء (جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی، جن کو نیک بخت، دِین دار کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جس کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور مطیع کی ان کے ساتھ رفاقت ثابت ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ اِطاعت کا یہ ثمرہ ہوا کہ اس کو ایسے رفیق ملے) یہ (معیت اور رفاقت ان حضرات کے ساتھ محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے (یعنی عمل کا اَجر نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ جو درجہ اُس عمل کا مقتضا تھا وہاں سے آگے نہ جاسکتا، پس یہ بطور اِنعام کے ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک عمل کو اور اس کے مقتضا کو، اور اس مقتضا سے زائد مناسب اِنعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس اِنعام میں بھی تفاوت ہوگا، کسی کو ان حضرات سے بار بار قرب ہوگا، کسی کو گاہ بگاہ وعلیٰ ھٰذا، واللہ اعلم)۔

ربطِ آیات

اُوپر اللہ ورسول کی اِطاعت پر خاص مخاطبین سے اَجرِ عظیم کا وعدہ تھا، اب ان آیات میں بطور قاعدہ کلیہ کے اللہ اور اس کے رسول کی اِطاعت پر عام وعدہ کا ذِکر ہے۔

معارف ومسائل

جنت کے درجات اعمال کے اِعتبار سے ہوں گے

جو لوگ ان تمام چیزوں پر عمل کریں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، ان تمام چیزوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے تو عمل کے اِعتبار سے ان کے مختلف درجات ہوں گے، اوّل درجہ کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت کے مقاماتِ عالیہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، اور دُوسرے درجہ کی لوگوں کو اُن لوگوں کے ساتھ جگہ عطا فرمائیں گے جو اَنبیاء کے

بعد ہیں، جن کو صدیقین کہا جاتا ہے، یعنی وہ اجلہ صحابہؓ جنھوں نے بغیر کسی جھجک اور مخالفت کے اوّل ہی اِیمان قبول کرلیا، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پھر تیسرے درجہ کے حضرات شہداء کے ساتھ ہوں گے، شہداء وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال قربان کردیا، پھر چوتھے درجہ کے حضرات صلحاء کے ساتھ ہوں گے، اور صلحاء وہ لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں اعمالِ صالحہ کے پابند ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور مقبول ہیں جن کے چار درجے بتلائے گئے ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

شانِ نزول

یہ آیت ایک خاص واقعہ کی بنا پر نازل ہوئی ہے جس کو امامِ تفسیر حافظ ابنِ کثیرؒ نے متعدّد اَسانید سے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرے دِل میں آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اپنی بیوی سے بھی، اپنی اولاد سے بھی، بعض اَوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی زیارت کرلوں تب سکون ہوتا ہے، اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دُنیا سے آپ کی وفات ہوجائے اور مجھے بھی موت آجائے گی تو میں جانتا ہوں کہ آپ جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ درجاتِ عالیہ میں ہوں گے، اور مجھے اوّل تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں، اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ سے بہت نیچے ہوگا، مین وہاں آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوگئی: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ [1] اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بشارت سنادی کہ اِطاعت گزاروں کو جنت میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا، یعنی درجاتِ جنت میں تفاضل اور اعلیٰ ادنیٰ ہونے کے باوجود باہم ملاقات ومجالست کے مواقع ملیں گے۔

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۳۵۴

جنت میں ملاقات کی چند صورتیں

جس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دُوسرے کو دیکھیں گے جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں بروایت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت اپنی کھڑکیوں میں اپنے سے اُوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں گے جیسے دُنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو۔[1]

اور یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کے لئے آیا کریں گے، جیسا کہ ابنِ جریرؒ نے بروایت ربیعؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں یہ اِرشاد فرمایا کہ اُونچے درجات والے نیچے درجات کی طرف اُتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور مجالست ہوا کرے گی۔[2]

اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کے لئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اِجازت ہو۔ اس آیت کی بنا پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن[3] اسلمی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزارتے تھے، ایک رات تہجد کے وقت کعب اسلمیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لاکر رکھیں، تو آپ نے خوش ہوکر فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو؟ کعب اسلمیؓ نے عرض کیا: میں جنت میں آپ کی صحبت چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا: اور کچھ؟ تو انہوں نے عرض کیا: اور کچھ نہیں، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو "اَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ"، یعنی تمہارا مقصد حاصل ہوجائے گا لیکن اس میں تم بھی میری مدد اس طرح کرو کہ کثرت سے سجدے کیا کرو، یعنی نوافل کی کثرت کرو۔[4]

مسندِ احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اور میں پانچ وقت کی نماز کا بھی پابند ہوں، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں، اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرجائے وہ انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا، بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔[5]

---

۱ مسند احمد رقم الحدیث: ۱۰۷۷۴ مسند ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔

۲ تفسیر الطبری تحت ھذہ الآیۃ ج:۸ ص:۵۳۴

۳ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حضرت کعب بن اسلمی کے بیٹے ربیعہ بن کعب الاسلمی کا ہے۔ ۱۲ محمد رفیع عثمانی ۲۳/۴/۱۴۳۸ھ

۴ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل السجود والحث علیہ ج:۱ ص:۱۹۳

۵ تفسیر ابن کثیر بحوالہ مسند احمد تحت ھذہ الآیۃ ج:۲ ص:۳۵۵

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ۔ [۱]

''یعنی وہ بیوپاری جو سچا اور امانت دار ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

قرب کی شرط محبت ہے

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت آپ کے ساتھ محبت کرنے سے حاصل ہوگی، چنانچہ صحیح بخاری میں طرقِ متواترہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے، مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں پہنچا؟ آپ نے فرمایا: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' [۲] یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو دُنیا میں کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس حدیث سے، [۳] کیونکہ اس حدیث نے ان کو یہ بشارت دے دی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے والے محشر اور جنت میں بھی حضور کے ساتھ ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کسی رنگ و نسل پر موقوف نہیں

طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حبشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہم سے حسنِ صورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوّت و رِسالت میں بھی، اب اگر میں بھی اس چیز پر اِیمان لے آؤں جس پر آپ اِیمان رکھتے ہیں اور وہی عمل کروں جو آپ کرتے ہیں، تو کیا میں بھی جنت میں آپ کے ساتھ ہوسکتا ہوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ضرور (تم اپنی حبشیانہ بدصورتی سے نہ گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جنت میں کالے رنگ کے حبشی سفید اور حسین ہوجائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چمکیں گے، اور جو شخص ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ'' کا قائل ہو اس کی فلاح و نجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوجاتی ہے، اور جو شخص ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ'' پڑھتا ہے اس کے نامۂ اَعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ما جاء فی التجار إلخ ج:۱ ص:۲۲۹

[۲] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب علامة حب الله عز وجل ج:۲ ص:۹۱۱

[۳] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، اخبار الرجل الرجل بمحبته إیاه ج:۲ ص:۲۹۸

یہ سن کر مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حسنات کی اتنی سخاوت ہے تو ہم پھر کیسے ہلاک ہو سکتے یا عذاب میں کیسے گرفتار ہو سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: (یہ بات نہیں) حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں بعض آدمی اتنا عمل اور حسنات لے کر آئیں گے کہ اگر ان کو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ بھی ان کے بوجھ کا تحمل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلہ میں جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں اور ان سے موازنہ کیا جاتا ہے تو اِنسان کا عمل ان کے مقابلہ میں ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازیں۔

اس حبشی کے سوال و جواب ہی پر سورۂ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾ (الدہر) حبشی نے حیرت سے سوال کیا: یا رسولِ اللہ! میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جن کو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟

آپ نے فرمایا: ''ہاں ضرور'' یہ سن کر حبشی نومسلم نے رونا شروع کیا، یہاں تک کہ روتے روتے وہیں جان دے دی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کی تجہیز و تکفین فرمائی۔ [1]

درجات کی تفصیل

آیت کی تفسیر مع شانِ نزول اور متعلقہ تشریحات کے بیان ہو چکی، اب ایک بات قابلِ غور باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جن لوگوں پر اِنعام ہے ان کے چار درجے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ درجے کس اِعتبار سے ہیں، اور ان چار درجوں میں باہمی نسبت اور فرق کیا ہے، اور کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص میں جمع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

حضراتِ مفسرین نے اس بارے میں مختلف اقوال اور طویل تفصیل لکھی ہے، بعض نے فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتے ہیں، اور یہ سب صفات متداخلہ کی طرف ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم میں جس کو ''نبی'' فرمایا گیا ہے اس کو ''صدیق'' وغیرہ کے القاب بھی دیئے گئے ہیں، حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے متعلق اِرشاد ہے: اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ (مریم)۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ (آل عمران) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق: وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ (آل عمران) آیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم و معنی کے اِعتبار سے یہ چار صفات اور درجات الگ الگ ہیں، لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مفسر، محدث، فقیہ، مؤرّخ اور متکلم مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو مفسر بھی ہوں، محدث بھی، فقیہ بھی اور مؤرّخ و متکلم بھی، یا جس طرح ڈاکٹر،

[1] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۳۴۱۹

انجینئر، پائلٹ مختلف صفات ہیں، مگر یہ سب کسی ایک شخص میں بھی جمع ہوسکتی ہیں۔

البتہ عرفِ عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہوجاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے عامۂ مفسرین نے فرمایا کہ ''صدیقین'' سے مراد اَجلہ صحابہ، اور ''شہداء'' سے شہدائے اُحد اور ''صالحین'' سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔

اور اِمام راغب اصفہانیؒ نے ان چاروں درجات کو مختلف درجات قرار دیا ہے، تفسیر بحرِ محیط، رُوح المعانی اور مظہری میں بھی یہی مذکور ہے، [1] یعنی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ وادنیٰ مقرّر فرمائے ہیں، اور عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کے درجہ سے پیچھے نہ رہیں، علمی اور عملی جدوجہد کے ذریعہ ان درجات تک پہنچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوّت ایک ایسا مقام ہے جو جدوجہد سے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن انبیاء کی معیت پھر بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ اِمام راغبؒ نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جن کو قوتِ اِلٰہیہ کی اِمداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب سے دیکھ رہا ہو، اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق اِرشاد فرمایا: اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا یَرٰى ﴿۱۲﴾ (النجم)

''صدیقین'' کی تعریف

دُوسرا درجہ صدیقین کا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دُور سے دیکھ رہا ہو۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کرسکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائقِ اِیمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے۔ اس دیکھنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مراد اسی قسم کی رُویت ہے کہ ان کی معرفت علمی مثل دیکھنے کے ہے۔

''شہداء'' کی تعریف

تیسرا درجہ شہداء کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے رَبِّ کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔

اور حدیث "اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" میں بھی اسی قسم کی رُویت مراد ہوسکتی ہے۔

---

[1] روح المعانی تحت هذه الآیة ج:۴ ص:۱۲۲

"صالحین" کی تعریف

چوتھا درجہ صالحین کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید و اِتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دُور سے دیکھے، اور حدیث میں: "فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ" وارِد ہوا ہے، اس میں بھی رُؤیت کا یہی درجہ مراد ہوسکتا ہے۔ اِمام راغب اصفہانیؒ کی اس کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ یہ درجات معرفتِ رَبّ کے درجات ہیں، اور معرفت کے مختلف درجات کی بنا پر مختلف مدارج ہیں۔ بہرحال آیت کا مضمون صاف ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بشارت دِی گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اِطاعت کرنے والے درجاتِ عالیہ کے رہنے والوں کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ یہ محبت ہم سب کو نصیب کرے، آمین۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾

اے ایمان والو! لے لو اپنے ہتھیار پھر نکلو جدی جدی فوج ہوکر یا سب اِکٹھے،

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ

اور تم میں بعض ایسا ہے کہ البتہ دیر لگادے گا، پھر اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو کہے:

قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ

اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں نہ ہوا ان کے ساتھ۔ اور اگر تم کو پہنچا فضل

مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ

اللہ کی طرف سے تو اس طرح کہنے لگے گا کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی: اے کاش! کہ میں ہوتا

مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ

ان کے ساتھ تو پاتا بڑی مراد۔ سو چاہئے لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ

دُنیا کی زندگی آخرت کے بدلے، اور جو کوئی لڑے اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے یا غالب ہووے

فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۷۴

تو ہم دیویں گے اس کو بڑا ثواب

آسان ترجمۂ قرآن

اے اِیمان والو! (دُشمن سے مقابلے کے وقت) اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ رکھو، پھر الگ الگ دستوں کی شکل میں (جہاد کے لئے) نکلو، یا سب لوگ اِکٹھے ہوکر نکل جاؤ ۷۱ اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ضرور ہوگا جو (جہاد میں جانے سے) سستی دِکھائے گا، پھر اگر (جہاد کے دوران) تم پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ کہے گا کہ اللہ نے مجھ پر بڑا اِنعام کیا کہ میں اِن لوگوں کے ساتھ موجود نہیں تھا ۷۲ اور اگر اللہ کی طرف سے کوئی فضل (یعنی فتح اور مالِ غنیمت) تمہارے ہاتھ آئے تو وہ کہے گا — گویا تمہارے اور اس کے درمیان کبھی کوئی دوستی تو تھی ہی نہیں — کہ "کاش میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتا تو بہت کچھ میرے بھی ہاتھ لگ جاتا!" ۷۳ لہٰذا اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دُنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچ دیں۔ اور جو اللہ کے راستے میں لڑے گا، پھر چاہے قتل ہو جائے یا غالب آجائے، (ہر صورت میں) ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے۔ ۷۴

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! (کافروں کے مقابلہ میں) اپنی تو اِحتیاط رکھو (یعنی ان کے داؤ گھات سے بھی ہوشیار رہو اور مقاتلہ کے وقت سامان، ہتھیار، ڈھال اور تلوار سے بھی دُرست رہو) پھر (ان سے مقاتلہ کے لئے) متفرق طور پر یا مجتمع طور پر (جیسا موقع ہو) نکلو اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعضے منافقین بھی شامل ہو رہے ہیں) بعضا بعضا شخص ایسا ہے (مراد اس سے منافق ہے) جو (جہاد سے) ہٹتا ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا (جیسے شکست وغیرہ) تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہوکر) کہتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا (نہیں تو مجھ پر بھی مصیبت آتی) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح وغنیمت)

تو ایسے طور پر (خود غرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں (مال کے فوت ہونے پر تأسف کر کے) کہتا ہے: ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی لوگوں کا شریکِ حال ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی (کہ مال و دولت لاتا اور خود غرضی اور بے تعلقی اس کہنے سے ظاہر ہے ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی کامیابی پر بھی تو خوش ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنا افسوس کرنے بیٹھ جائے اور اس کی خوشی کا نام بھی نہ لے، اللہ تعالیٰ اس شخص کے حق میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی مفت نہیں ملتی اگر اس کا طالب ہے) تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اِعلائے کلمۃ اللہ کی نیت سے جو کہ موقوف ہے ایمان واخلاق پر، یعنی مسلمان و مخلص بن کر) ان (کافر) لوگوں سے لڑے جو آخرت (چھوڑ کر اس) کے بدلے دُنیوی زندگی کو اِختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی اس شخص کو اگر فوزِ عظیم کا شوق ہے تو دِل دُرست کرلے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، تیغ وسنان کے سامنے سینہ سپر بنے، دیکھو فوزِ عظیم ہاتھ آتا ہے یا نہیں، اور یوں کیا کوئی دِل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی مصیبت جھیلے سچی کامیابی اس کی ہے، کیونکہ دُنیا کی کامیابی اوّل تو حقیر، پھر کبھی ہے کبھی نہیں، کیونکہ اگر غالب آگئے تو ہے ورنہ نہیں) اور (آخرت کی کامیابی جو کہ ایسے شخص کے لئے موعود ہے ایسی ہے کہ عظیم بھی اور پھر ہر حالت میں ہے کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ (مغلوب ہوجائے حتیٰ کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آجائے ہم (ہر حالت میں) اس کو (آخرت کا) اَجرِ عظیم دیں گے (جو کہ فوزِ عظیم کہنے لائق ہے)۔

ربطِ آیات

اس سے قبل اللہ اور رسول کی اِطاعت کا ذِکر تھا، آگے ان آیات سے فرمانبرداروں کو اِحیائے دِین اور اِعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ (قرطبی) [1]

معارف ومسائل

فوائدِ مُہمّہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ الخ اس آیت کے پہلے حصہ میں جہاد کرنے کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا گیا، اور دُوسرے حصہ میں اِقدامِ جہاد کا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی جس کو متعدّد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ ظاہری اسباب کو اِختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں اسلحہ کی فراہمی کا حکم تو دے دیا گیا، لیکن یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اس کی وجہ سے تم

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۵ ص:۲۷۳

یقیناً ضرور محفوظ ہی رہوگے، اس سے اِشارہ اس بات کی طرف کردیا گیا کہ اسباب کا اِختیار کرنا صرف اِطمینانِ قلب کے لئے ہوتا ہے، ورنہ ان میں فی نفسہٖ نفع ونقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے، جیسے اِرشاد ہے:-

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ (التوبۃ:۵۱)

''یعنی اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ ہم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو ہمارے لئے مقدّر ہوچکی ہے۔''

۱- اس آیت میں پہلے تو جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا گیا، اس کے بعد اس کے لئے نکلنے کا نظم بتلایا گیا، جس کے لئے دو جملے ذِکر کئے گئے، یعنی: فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ﴿۷۱﴾ ثبات، ثُبَۃٌ کی جمع ہے، جس کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں، جس کو فوجی دستہ (سریہ) کہتے ہیں، یعنی اگر تم جہاد کے لئے نکلو تو اکیلے اور تنہا نہ نکلو، بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں نکلو، یا ایک کثیر جَمِیْعًا لشکر کی صورت میں جاؤ، کیونکہ اکیلے لڑنے کے لئے جانے میں نقصان کا قوی اِحتمال ہوتا ہے، اور دُشمن ایسے موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھالیتا ہے۔

یہ تعلیم تو جہاد کے موقع کے لئے مسلمانوں کو دِی گئی ہے، لیکن عام حالات میں بھی شریعت کی یہی تعلیم ہے، کہ اکیلے سفر نہ کیا جائے، چنانچہ ایک حدیث میں تنہا مسافر کو ایک شیطان کہا گیا، اور دو مسافروں کو دو شیطان اور تین کو جماعت فرمایا گیا۔ [۱]

اسی طرح ایک دُوسری حدیث میں اِرشاد ہے:-

خَیْرُ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةٌ، وَخَیْرُ السَّرَایَا اَرْبَعُ مِائَةٍ، وَخَیْرُ الْجُیُوْشِ اَرْبَعَةُ آلَافٍ۔ (رواہ الطبرانی بحوالہ مشکوٰۃ) [۲]

''یعنی بہترین ساتھی چار ہیں، اور بہترین فوجی دستہ چار سو کا ہے، اور بہترین لشکر چار ہزار کا ہے۔''

۲- وَاِنَّ مِنْكُمْ اِلـخ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مؤمنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ مؤمنین کی نہیں ہوسکتیں، اس لئے علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے خطاب میں ان کو مؤمنین کی ایک جماعت کہا گیا ہے۔ [۳]

---

[۱] المستدرک للحاکم رقم الحدیث: ۲۴۵۱ حدیث عبداللہ بن یزید الأنصاری رضی اللہ عنہ۔

[۲] مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، باب آداب السفر ج:۲ ص:۳۳۹

[۳] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۵ ص:۲۷۶

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ

اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مرد

وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ

اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں: اے ربّ ہمارے! نکال ہم کو اس بستی سے

الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ

کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ، اور کردے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی حمایتی، اور کردے ہمارے واسطے اپنے پاس سے

نَصِيْرًا ۗ ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

مددگار۔ جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، اور جو کافر ہیں

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ

سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں، سو لڑو تم شیطان کے حمائیتیوں سے، بے شک

كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ ع

فریب شیطان کا سست ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے مسلمانو!) تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ اللہ کے راستے میں اور اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو یہ دُعا کر رہے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لائیے جس کے باشندے ظلم توڑ رہے ہیں، اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کر دیجئے، اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کر دیجئے" ﴿۷۵﴾ جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ طاغوت کے راستے

میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا (اے مسلمانو!) تم شیطان کے دوستوں سے لڑو۔ (یاد رکھو کہ) شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔ ﴿۷۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو (باوجودیکہ اس کا قوی داعی موجود ہے، کیونکہ یہ جہاد) اللہ کی راہ میں (ہوتا ہے، یعنی اِعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے جس کا اِہتمام ضروری ہے) اور (اس اِعلائے دِین کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ) کمزور (ایمان دار) وں کی خاطر سے (بھی لڑنا ضرور ہے تاکہ کفار کے پنجۂ ستم سے رہائی پائیں) جن (بیچاروں) میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو (کفار سے تنگ و پریشان ہوکر) دُعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (کسی طرح) اس بستی سے (یعنی مکہ سے جو ہمارے لئے جیل خانہ بنا ہوا ہے) باہر نکال، جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں (کہ ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے) اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے (کہ ہماری حمایت کر کے ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑا دے) جو لوگ پکے اِیمان دار ہیں (وہ تو ان اَحکام کو سن کر) اللہ کی راہ میں (یعنی غلبۂ اِسلام کے قصد سے) جہاد کرتے ہیں، اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں (یعنی غلبۂ کفر کے قصد سے) لڑتے ہیں، (اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں نصرت اللہ کی طرف سے اِیمان داروں کو ہوگی، جب اِیمان داروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے) تو (اے اِیمان دارو!) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جو کہ اللہ کی مدد سے محروم ہیں) جہاد کرو، (اور گو وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں لیکن) واقع میں (وہ شیطانی تدبیریں ہیں کہ شیطان ان کفری تدبیروں کا حکم کرتا ہے) شیطانی تدبیر (خود) لچر ہوتی ہے (کیونکہ اس میں غیبی اِمداد نہیں ہوتی، اور کبھی چندروزہ غلبہ ہو جانا تو ان کو چندروزہ مہلت اور ڈھیل دینا ہے، تو غیبی اِمداد جو مؤمنین کے ساتھ ہے وہ تدبیر اس کا کیا مقابلہ کرے گی)۔

خلاصہ یہ کہ داعی بھی ہے اور وعدۂ نصرت بھی ہے، پھر کیا عذر ہے؟ اس لئے مکرّر تاکید کی گئی۔

معارف ومسائل

مظلوم کی فریادرسی اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے

مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی ضعف اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے، اور بعد

میں کافروں نے بھی ان کو جانے سے روک دیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کر دیں، تاکہ یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں، ان حضرات میں سے بعضوں کے نام بھی تفاسیر میں مذکور ہیں، مثلاً ابن عباسؓ اور ان کی والدہؓ، سلمہ بن ہشامؓ، ولید بن ولیدؓ، اور ابوجندل بن سہلؓ (قرطبی) [1] یہ حضرات اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے ان کے ظلم وستم کو جھیلتے اور سہتے رہے، اور اِسلام پر بڑی مضبوطی سے جمے رہے، البتہ اللہ تعالیٰ سے ان مصائب سے نجات کی دُعائیں انہوں نے برابر جاری رکھیں، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاد کر کے ان کو کفار کے جبر وتشدّد سے چھٹکارا دِلوائیں۔

اس آیت میں مؤمنین نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی تھی، ایک یہ کہ ہم کو اس قریہ سے نکالیں (یہاں قریہ سے مراد مکہ ہے) دُوسری یہ کہ ہمارے لئے کوئی ناصر اور مددگار بھیج دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دونوں باتیں قبول فرمائی ہیں، اس طرح کہ بعض کو وہاں سے نکلنے کے مواقع میسر کئے، جس سے ان کی پہلی بات پوری ہوئی، بعض اسی جگہ رہے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسیدؓ کو ان کا متولّی مقرّر کیا، جنہوں نے مظلومین کو ان کے ظالمین سے نجات دِلائی، اس طرح سے اُن کی دُوسری بات بھی پوری ہوگئی، اس آیت میں صاف لفظوں میں حکمِ قتال دینے کے بجائے قرآن نے یہ الفاظ اِختیار کئے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ جن میں اس طرف اِشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال وجہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ ہے، جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا تمام مصائب کا بہترین علاج ہے

آیت يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا سے یہ بتلایا گیا کہ حکمِ قتال کا ایک سبب ان کمزور مسلمان مردوں اور عورتوں کی دُعا تھی جس کی قبولیت مسلمان کو حکمِ جہاد دے کر کی گئی، اور ان کی مصائب کا فوری خاتمہ ہوگیا۔

جنگ تو سب کرتے ہیں مگر اس سے مؤمن اور کافر کے مقاصد الگ الگ ہیں

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ اس آیت میں بتلایا گیا کہ مؤمنین اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مؤمن کی جدوجہد کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دُنیا میں خدا کا قانون رائج ہو، اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے، اور اس کا قانون خالص اِنصاف پر مبنی ہے، اور جب اِنصاف کی حکومت قائم ہوگی تو اَمن قائم رہے گا، دُنیا کے اَمن کے لئے یہ ضروری ہے کہ دُنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے، لہٰذا کامل مؤمن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے یہی مقصد ہوتا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۲۷۹

لیکن اس کے مقابلہ میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو، اور طاغوتی قوتیں برسرِ اِقتدار آئیں تا کہ دُنیا میں کفر وشرک خوب چمکے اور چونکہ کفر وشرک شیطان کی راہیں ہیں، اس لئے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

شیطان کی تدبیر ضعیف ہے

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ اس آیت میں بتلایا گیا کہ شیطانی تدابیر لچر اور کمزور ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ مؤمنین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لہٰذا مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں سے لڑنے میں کوئی تأمل نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ان کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے، اور کافروں کو شیطان کی تدبیر کوئی فائدہ نہ دے گی۔

چنانچہ جنگِ بدر میں ایسا ہی ہوا کہ پہلے شیطان کافروں کے سامنے لمبی ڈینگیں مارتا رہا، اور اس نے کافروں کو مکمل یقین دِلایا کہ: لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ آج کے دِن تم لوگوں کو کوئی مغلوب نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ (الانفال:۴۸) (میں تمہارا مددگار رہوں) میں اپنے تمام لاؤلشکر کے ساتھ تمہاری مدد کو آؤں گا، جب جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اگرچہ آگے بڑھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حمایت میں فرشتے آپہنچے ہیں تو اس نے اپنی تدبیر کو ناکام پا کر اُلٹے پاؤں بھاگنا شروع کردیا، اور اپنے دوستوں یعنی کافروں سے کہا: اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ (الانفال) "میں تم لوگوں سے بَری ہوں، اس لئے کہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں (یعنی فرشتوں کا لشکر) میں اللہ سے ڈرتا ہوں، کیونکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔" (مظہری)[1]

اس آیت میں شیطان کی تدبیر کو جو ضعیف کہا گیا ہے اس کے لئے اسی آیت سے دو شرطیں بھی مفہوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ آدمی جس کے مقابلہ میں شیطان تدبیر کر رہا ہے مسلمان ہو، اور دُوسری یہ کہ اس کا کام محض اللہ ہی کے لئے ہو، کوئی دُنیوی نفسانی غرض نہ ہو، پہلی شرط اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اور دُوسری یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ سے معلوم ہوتی ہے، اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی فوت ہو جائے تو پھر ضروری نہیں کہ شیطان کی تدبیر اس کے مقابلہ میں کمزور ہو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "جب تم شیطان کو دیکھو تو بغیر کسی خوف وخدشہ کے اس پر حملہ کردو" اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ (احکام القرآن للسیوطی)[2]

---

۱ تفسیر المظھری ج:۲ ص:۱۶۵

۲ وتفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۵۶۵۵

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو

الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ

زکوٰۃ، پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے

كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ

جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی زیادہ ڈر، اور کہنے لگے: اے ربّ ہمارے! کیوں فرض کی ہم پر لڑائی؟

لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ

کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدّت تک؟ کہہ دے کہ فائدہ دُنیا کا تھوڑا ہے، اور آخرت بہتر ہے

لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ

پرہیزگار کو، اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک تاگے برابر۔ جہاں کہیں تم ہوگے موت تم کو آپکڑے گی

وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ

اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں میں، اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں یہ

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ

اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر ان کو پہنچے کچھ بُرائی تو کہیں یہ تیری طرف سے ہے، کہہ دے کہ یہ سب

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

اللہ کی طرف سے ہے، سو کیا حال ان لوگوں کا ہرگز نہیں لگتے کہ سمجھیں کوئی بات۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ز وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ط

جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے، اور جو تجھ کو بُرائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے،

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

اور ہم نے تجھ کو بھیجا پیغام پہنچانے والا لوگوں کو اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے (مکی زندگی میں) کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کر رکھو، اور نماز قائم کیے جاؤ اور زکوۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے ایک جماعت (دُشمن) لوگوں سے ایسی ڈرنے لگی جیسے اللہ سے ڈرا جاتا ہے، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنے لگی، اور ایسے لوگ کہنے لگے کہ "اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جنگ کیوں فرض کردی، تھوڑی مدّت تک ہمیں مہلت کیوں نہیں دی؟" کہہ دو کہ دُنیا کا فائدہ تو تھوڑا سا ہے، اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اس کے لئے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا ﴿۷۷﴾ تم جہاں بھی ہوگے (ایک نہ ایک دن) موت تمہیں جا پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو۔ اور اگر ان (منافقوں) کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر ان کو کوئی بُرا واقعہ پیش آجاتا ہے تو (اے پیغمبر!) وہ (تم سے) کہتے ہیں کہ یہ بُرا واقعہ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ کہہ دو کہ ہر واقعہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ یہ کوئی بات سمجھنے کے نزدیک تک نہیں آتے؟ ﴿۷۸﴾ تمہیں جو کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو وہ محض اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور جو کوئی بُرائی پہنچتی ہے، وہ تو تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے، اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ (اس بات کی) گواہی دینے کے لئے کافی ہے۔ ﴿۷۹﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (قبل نزول حکم جہاد تو جنگ کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ) ان کو (منع کرنے کے لئے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رہو اور (جو جو حکم تم کو ہو چکے ہیں اس میں لگے رہو مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی اور یا) پھر ان پر جہاد کرنا فرض کردیا گیا تو کیا

حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (طبعًا) لوگوں سے (مخالف) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کردیں گے) جیسا (کوئی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دُشمن کا ڈَر طبعی ہے، اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقلی حالت سے شدید ہوتی ہے، دُوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی اُمیدِ رحمت بھی تو ہے، اور کافر دُشمن سے تو ضرر کا خوف ہی خوف ہے، اور چونکہ یہ خوف طبعی تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، اور (یا حکم قتال کو ملتوی کرنے کی تمنا میں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دِل سے اور خدا تعالیٰ کے علم میں قولِ نفسی قولِ لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے (ابھی سے) ہم پر جہاد کیوں فرض کردیا ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدّت مہلت دے دی ہوتی (ذرا بےفکری سے اپنی ضروریات پوری کرلیتے اور چونکہ یہ عرض کرنا بطور اعتراض یا انکار کے نہ تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ دُنیا سے فائدہ اُٹھانا (جس کے لئے تم مہلت کی تمنا کرتے ہو) محض چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے لئے سامانِ آخرت کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے اُن کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو اور اگر جہاد بھی نہ کیا تو وقتِ معین پر موت سے بچ جاؤ گے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ) تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں موت آدبائے گی اگرچہ پختہ مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو (غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مر کر دُنیا کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ بلکہ عقل کی بات یہ ہے کہ "چند روزے جہد کن باقی بخند") اور اگر ان (منافقین) کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح و کامیابی) تو کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ (اتفاقاً) ہوگئی (ورنہ مسلمانوں کی بےتدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر ان کی کوئی بُری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت وقتل) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ (کی اور مسلمانوں کی بےتدبیری) کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرما دیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں بلکہ) سب کچھ (نعمت ونقمت) اللہ ہی کی طرف سے ہے (گو ایک بلاواسطہ اور ایک بواسطہ جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے بلاواسطہ اعمال ہے اور نقمت یعنی مصیبت اللہ کے عدل سے بواسطۂ اعمالِ سیئہ عباد کے ہے پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو واقع میں اعمالِ سیئہ کا اس میں دخل ہے، جیسا اُحد میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے اگر آدمی

ذرا بھی غور کرے تو خوش حالی کے قبل کوئی نیک عمل اس درجہ کا نہ پاوے گا محض فضل ہی ثابت ہوگا، اور بدحالی کے قبل ضرور کوئی عملِ بد پائے گا، جس کی سزا اس سے زیادہ ہوتی، جب یہ ایسی ظاہر بات ہے) تو ان (حماقت شعار) لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے (اور سمجھیں گے تو کیا اور وہ تفصیل اس اِجمالی جوابِ مذکور کی یہ ہے کہ) اے اِنسان! تجھ کو جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے (فضل) ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی (اعمالِ بد کے) سبب سے ہے (پس اس بدحالی کو شریعت کے اَحکام پر عمل کرنے کا نتیجہ کہنا یا شارع کی طرف اس کی نسبت کرنا پوری جہالت ہے، جیسا منافقین جہاد اور اِمام الجہاد کی طرف اس کی نسبت کرتے تھے) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور (اگر کوئی منافق، کافر اِنکار کرے تو اس کے اِنکار سے نفی نبوّت کی کب ہو سکتی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (آپ کی رِسالت کے) گواہ کافی ہیں (جنہوں نے قولی اور فعلی شہادت دی ہے، قولی تو مثلاً یہی کلمہ وَاَرْسَلْنٰكَ اور فعلی یہ کہ معجزات جو دلیل اِثباتِ نبوّت میں آپ کو عطا فرمائے)۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ الخ مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستایا کرتے تھے، مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رُخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں، آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے تھے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں، بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے، اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ، کیونکہ جب تک آدمی اِطاعتِ خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیفِ جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان دینا بہت دُشوار ہوتا ہے، اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا، پھر ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو جہاد کا حکم ہوا تو ان کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی، مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، یا اس سے بھی زیادہ، اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدّت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (رُوح المعانی) [1]

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۸۵

حکم جہاد نازل ہونے پر مسلمانوں کی طرف سے التوائے حکم کی تمنا کس وجہ سے ہوئی؟

حکم جہاد پر مسلمانوں کی طرف سے مہلت کی تمنا درحقیقت کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ ایک لطف آمیز شکایت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ عادۃً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کو انتہائی تنگی و تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں، اس لئے ایسے وقت میں انتقام لینا زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن آرام وراحت کے وقت اس کی طبیعت لڑائی کی طرف آمادہ نہیں ہوتی، یہ ایک بشری تقاضا ہے، چنانچہ یہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو اس وقت کفار کی ایذاؤں سے تنگ آکر جہاد کے حکم کی تمنا کررہے تھے، لیکن مدینہ میں آکر جب ان کو سکون و آرام نصیب ہوا تو ایسی صورت میں جب قتال کا حکم ہوا تو اس وقت ان کا پُرانا جذبہ کم ہو چکا تھا اور ان کے دِلوں میں وہ جوش وخروش باقی نہیں رہا تھا، اس لئے انہوں نے محض ایک تمنا کی کہ اگر اس وقت جہاد کا حکم نہ ہوتا تو بہتر تھا، اس تمنا کو اعتراض پر محمول کرکے ان مسلمانوں کی طرف معصیت کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، یہ تقریر اس صورت میں ہے جبکہ انہوں نے شکایت کا اظہار زبان سے بھی کیا ہو، لیکن اگر زبان سے نہیں کیا محض ان کے دِل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا ہو تو وساوسِ قلبی کو شریعت نے معصیت ہی شمار نہیں کیا، یہاں یہ دونوں اِحتمال ہیں، اور آیت کے لفظ قَالُوْا سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انہوں نے زبان سے اِظہار کردیا تھا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دِل میں کہا ہو (بیان القرآن ملخصاً)۔[1] بعض مفسرین کے نزدیک آیات کا تعلق مؤمنین سے نہیں ہے بلکہ منافقین سے ہے، اس صورت میں کسی قسم کا اِشکال نہیں۔ (تفسیر کبیر)[2]

اِصلاحِ ملک سے اِصلاحِ نفس مقدم ہے

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اللہ تعالیٰ نے پہلے نماز اور زکوٰۃ کے اَحکام کو بیان فرمایا، جو اِصلاحِ نفس کا سبب ہیں، اور اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اِصلاحِ ملک کا سبب ہے، یعنی اس کے ذریعہ سے ظلم وستم کا اِستیصال کیا جاتا ہے اور ملک میں امن وامان قائم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو دُوسروں کی اِصلاح سے پہلے اپنی اِصلاح کرنی چاہئے، چنانچہ درجہ کے اِعتبار سے بھی قسم اوّل کا حکم فرضِ عین ہے اور ثانی کا فرضِ کفایہ ہے، جس سے اِصلاحِ نفس کی اہمیت اور اس کا مقدم ہونا ظاہر ہے۔ (مظہری)[3]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۳۵

[2] التفسير الكبير للرازی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۲۸۸

[3] تفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۶۵

دُنیا اور آخرت کی نعمتوں میں فرق

آیت میں دُنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو اَفضل اور بہتر کہا گیا ہے، اس کی مندرجہ ذیل چند وجوہ ہیں:-

۱- دُنیا کی نعمتیں قلیل ہیں اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔

۲- دُنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہیں اور آخرت کی باقی رہنے والی ہیں۔

۳- دُنیا کی نعمتوں کے ساتھ طرح طرح کی پریشانیاں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں ان کدورتوں سے پاک ہیں۔

۴- دُنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں ہے، اور آخرت کی نعمتیں ہر متقی کو یقیناً ملیں گی۔ (تفسیر کبیر) [1]

وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ لَهٗ
مِنَ اللّٰهِ فِيْ دَارِ الْمَقَامِ نَصِيْبُ
فَإِنْ تُعْجِبِ الدُّنْيَا رِجَالًا فَإِنَّهَا
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّالزَّوَالُ قَرِيْبُ

''یعنی اس ناپائیدار دُنیا میں ایسے شخص کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائیدار گھر یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ ہو، پھر اگر دُنیا کچھ لوگوں کو فریفتہ کرے تو آگاہ رہیں کہ یہ دُنیا تو متاعِ قلیل ہے، اور اس کا زوال وناپید ہونا بہت قریب ہے، یعنی اِدھر آنکھ بند ہوئی اور اُدھر آخرت سامنے آئی۔''

ایک عبرت ناک واقعہ

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ الخ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ جہاد سے رُکنے والوں کے اس شبہ کا اِزالہ کر دیا کہ شاید جہاد سے جان بچا کر موت سے بھی بچ سکتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ موت ایک دن آ کر رہے گی، خواہ تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں موت آئے گی، جب یہ بات ہے تو تمہارا جہاد سے منہ پھیرنا بیکار ہے۔

حافظ ابنِ کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرت ناک واقعہ بروایت ابن جریرؒ وابن ابی حاتمؒ عن مجاہدؒ لکھا ہے کہ پہلی اُمتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضعِ حمل کا وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لئے بھیجا، وہ دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے پوچھا کہ یہ عورت

---

[1] التفسیر الکبیر للرازی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۵ ص:۲۸۸

کیا جنی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ آپ یاد رکھئے یہ لڑکی سو مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر ایک مکڑی سے مرے گی۔ ملازم یہ سن کر واپس ہوا اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، اور سوچا کہ اب یہ مرگئی ہے تو بھاگ گیا۔ مگر پیچھے لڑکی کی ماں نے ٹانکے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ لڑکی جوان ہوگئی، اور خوب صورت اتنی تھی کہ اُس شہر میں وہ بے مثال تھی۔ اور اس ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی، اور کافی عرصے تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑھیا ملی، تو اس سے ذِکر کیا کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ خوب صورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس عورت نے کہا کہ فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوبصورت نہیں ہے، آپ اسی سے شادی کرلیں۔ آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کرلی، تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک لڑکی کا میں پیٹ چاک کرکے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا، یہ سن کر وہ بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنا پیٹ دِکھایا جس پر نشان موجود تھا، یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں، ایک یہ کہ تو سو مردوں سے زِنا کرے گی، اس پر عورت نے اِقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں، مرد نے کہا: تعداد سو ہے، دُوسری بات یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کرایا، جس میں مکڑی کے جالے کا نام تک نہ تھا، ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکڑی نظر آئی، عورت بولی کیا مکڑی یہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا: ہاں! اس پر وہ فوراً اُٹھی اور کہا کہ اس کو تو میں فوراً مار دُوں گی، یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پاؤں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔

مکڑی تو ہلاک ہوگئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں، جو اس کی موت کا پیغام بن گئیں۔ (ابنِ کثیر) [1]

یہ عورت صاف ستھرے شان دار محل میں اچانک ایک مکڑی کے ذریعہ ہلاک ہوگئی، اس کے بالمقابل کتنے ایسے آدمی ہیں کہ عمر بھر جنگوں اور معرکوں میں گزار دی، وہاں موت نہ آئی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو اِسلام کے سپاہی اور جرنیل معروف و مشہور ہیں، اور ''سیف اللہ'' ان کا لقب ہے، پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے اور ہزاروں کافروں کو تہہِ تیغ کیا، ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا، اور ہمیشہ یہی دُعا کرتے تھے کہ میری موت عورتوں کی طرح چارپائی پر نہ ہو، بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدانِ جنگ میں ہو، لیکن آخر کار ان کی موت بستر پر ہی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کا نظام قادرِ مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے، جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر ایک

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۳۶۱

لکڑی کے ذریعہ ماردے اور بچانا چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بچالے۔

پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے خلاف نہیں

"وَ لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ" اس آیت میں کہا گیا کہ موت تم کو بہر کیف پہنچ کر رہے گی، اگر چہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رہنے سہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لئے مضبوط وعمدہ گھر تعمیر کرنا نہ خلافِ توکل ہے اور نہ خلافِ شرع۔ (قرطبی) [1]

اِنسان کو نعمت محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے

"مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ" یہاں حَسَنَۃٍ سے مراد نعمت ہے۔ (مظہری) [2]

اس آیت سے اِشارہ اس بات کی طرف کردیا کہ اِنسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنا ہی عبادت کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے، پھر اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، ان کو محدود عبادات اور طاعات سے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ ہماری عبادت بھی رَبّ العالمین کی بادشاہت کے شایانِ شان نہ ہو۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

مَا اَحَدٌ یَّدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا بِرَحْمَۃِ اللّٰہِ، قِیْلَ: وَلَا اَنْتَ؟ قَالَ: وَلَا اَنَا۔ (متفق علیہ، بحوالہ مظھری) [3]

"یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا، راوی نے عرض کیا آپ بھی نہیں جائیں گے؟ فرمایا: ہاں میں بھی نہیں۔"

مصیبت انسان کے شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے

"وَمَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ" یہاں سَیِّئَۃٍ سے مراد مصیبت ہے۔ (مظہری) [4]

مصیبت کی تخلیق اگر چہ اللہ ہی کرتا ہے لیکن اس کا سبب خود اِنسان کے اعمالِ بد ہوتے ہیں، اب اگر یہ انسان کافر

---

[1] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۵ ص:۲۸۳

[2] تفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۶۸

[3] تفسیر المظھری ج:۲ ص:۱۶۸۔ دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل ج:۲ ص:۹۵۷ وصحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ إلخ باب لن یدخل أحد الجنۃ إلخ ج:۲ ص۳۷۶

[4] تفسیر المظھری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۶۸

ہے تو اس کے لئے دُنیا میں جو مصیبت پیش آتی ہے، یہ اس کے لئے اس عذاب کا ایک معمولی سا نمونہ ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر وہ مؤمن ہے تو اس کے لئے مصائب و تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ ہو کر نجاتِ آخرت کا سبب ہو جاتی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا مِنْ مُّصِيْبَةٍ تُصِيْبُ الْمُسْلِمَ اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا عَنْهُ حَتّٰى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا۔ (ترمذی بحوالہ مظہری)[1]

''یعنی کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو کسی مسلمان کو پہنچے، مگر وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اس کے پاؤں میں چبھتا ہے۔''

ایک دُوسری حدیث میں اِرشاد فرمایا:-

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰى اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُصِيْبُ عَبْدًا نُكْبَةٌ فَمَا فَوْقَهَا وَمَا دُوْنَهَا اِلَّا بِذَنْبٍ وَّمَا يَعْفُوْ اَكْثَرُ۔ (ترمذی بحوالہ مظہری)[2]

''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کو جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے، اور بہت گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت تمام عالم کے لئے عام ہے

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رِسالت پورے عالم کے اِنسانوں کے لئے عام ہے، خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تا قیامت پیدا ہوں۔ (مظہری)[3]

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا، اور جو اُلٹا پھرا تو ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۗ ﴿۸۰﴾

ان پر نگہبان۔

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ النساء ج:۲ ص:۱۳۴

[2] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورۃ الشوریٰ ج:۲ ص:۱۶۱

[3] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۶۸

آسان ترجمۂ قرآن

جو رسول کی اِطاعت کرے، اس نے اللہ کی اِطاعت کی، اور جو (اِطاعت سے) منہ پھیر لے تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا (کہ تمہیں ان کے عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے) ﴿۸۰﴾

خلاصۂ تفسیر

جس شخص نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اِطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اِطاعت کی (اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عقلاً بھی واجب ہے، پس آپ کی اِطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص (آپ کی اِطاعت سے) رُوگردانی کرے سو (آپ کچھ غم نہ کیجئے کیونکہ ہم نے) آپ کو (بطور ذمہ داری کے) ان کا نگراں کر کے نہیں بھیجا (کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں، بلکہ آپ کا فرض پیغام پہنچا دینے سے پورا ہو جاتا ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ کفر کریں تو آپ پر کسی باز پُرس کا اندیشہ نہیں، آپ بے فکر رہیں)۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ ۡ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ

اور کہتے ہیں: قبول ہے، پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے ان میں سے رات کو

غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ

اس کے خلاف جو تجھ سے کہہ چکے تھے، اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں، سو تو تغافل کر ان سے

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿۸۱﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ

اور بھروسہ کر اللہ پر، اور اللہ کافی ہے کارساز۔ کیا غور نہیں کرتے قرآن میں،

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿۸۲﴾

اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ (منافق لوگ سامنے تو) اطاعت کا نام لیتے ہیں، مگر یہ تمہارے پاس سے باہر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کے وقت تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے، اور یہ رات کے وقت جو مشورے کرتے ہیں، اللہ وہ سب لکھ رہا ہے۔ لہٰذا تم ان کی پرواہ مت کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور اللہ تمہاری حمایت کے لئے بالکل کافی ہے ﴿۸۱﴾ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلافات پاتے۔ ﴿۸۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (منافق) لوگ (آپ کے احکام سن کر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اُٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف اِلتفات (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے، اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں، (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا) کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تاکہ اس کا کلامِ الٰہی ہونا واضح ہوجائے) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس (کے مضامین) میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے واقعیات سے اور حدِ اعجاز سے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف و تفاوت ہوتا تو مضامینِ کثیرہ میں اختلافات کثیرہ ہوتے، حالانکہ ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، پس لامحالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا)۔

معارف و مسائل

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت

کی گئی ہے جو دو رُخی پالیسی رکھتے ہیں، زبان سے کچھ کہتے ہیں، دِل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

پیشوا کے لئے ایک اہم ہدایت

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ جب منافقین آپ کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لئے مشورے کرتے، اس سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی کہ ان کی پروانہ کیجئے، آپ اپنا کام اللہ کے بھروسہ پر کرتے رہیں، کیونکہ وہ آپ کے لئے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دُشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کے اُلٹے سیدھے اِلزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے رُوپ میں دُشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم واِستقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رُخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو اِن شاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

تدبرِ قرآن

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ اس آیت سے اللہ تعالیٰ قرآن میں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس میں چند چیزیں قابلِ غور ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ فرمایا، "اَفَلَا يَقْرَءُوْنَ" نہیں فرمایا، اس سے بظاہر ایک لطیف اِشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ وہ اگر گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں تو ان کو اس کے معانی ومضامین میں کوئی اِختلاف نظر نہیں آئے گا، اور یہ مفہوم تدبر کے عنوان سے ہی ادا ہوسکتا ہے، صرف تلاوت اور قراءت جس میں تدبر اور غور وفکر نہ ہو اس سے بہت سے اِختلافات نظر آنے لگتے ہیں، جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دُوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر اِنسان اس کے مطالب میں غور کرے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اِماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے ہے، صحیح نہیں ہے، البتہ تدبر وتفکر کے درجات علم وفہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ائمۂ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا، عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلیدِ کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے

کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہوسکے تو کوئی مستند ومعتبر تفسیر کا مطالعہ کریں، اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں، اور ماہر علماء سے رُجوع کریں۔

قرآن وسنت کی تفسیر وتشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اِجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کے لئے شرائط ہیں

آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر وتفکر کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ تدبر کے درجات متفاوت اور ہر ایک کا حکم الگ ہے، مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآنِ حکیم سے دُوسرے مسائل کا اِستخراج کیا جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے تاکہ وہ نتائج کا اِستخراج صحیح کرسکے، اور اس اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا، جن اوصاف وشرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکالے گا، اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اِعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج ومعالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اِجارہ داری کیوں قائم کردی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک اِنسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔

یا کوئی عقل سے کورا اِنسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینئروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اِعتراض اُٹھانے لگے کہ قانونِ ملک کی تشریح وتعبیر پر صرف ماہرینِ قانون ہی کی اِجارہ داری کیوں قائم کردی گئی؟ میں بھی عاقل وبالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کرسکتا ہوں، اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم وفنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اُٹھاؤ، پھر بلاشبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو۔ لیکن یہی بات اگر قرآن وسنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جائے تو اس پر علماء کی اِجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں؟ کیا قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کرنے کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا پوری دُنیا میں ایک قرآن وسنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح وتعبیر کرنے کا حق حاصل ہے خواہ اس نے قرآن وسنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں؟

قیاس کا ثبوت

اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن وسنت میں نہ ملے تو انہی میں غور وفکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے اور اسی عمل کو اصطلاح میں ''قیاس'' کہتے ہیں۔ (قرطبی) [1]

اختلافِ کثیر کی تشریح

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ اختلافِ کثیرہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مضمون میں اختلاف ہوتا تو مضامینِ کثیرہ کا اختلاف بھی کثیر ہو جاتا (بیان القرآن)۔ [2] لیکن یہاں کسی ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بشر کے کلام میں یہ یکسانیت کہاں، نہ کسی جگہ فصاحت وبلاغت میں کمی، نہ توحید وکفر اور حلال وحرام کے بیان میں تناقض اور تفاوت، پھر غیب کی اطلاعات میں بھی نہ کوئی خبر ایسی ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو، نہ نظمِ قرآن میں کہیں یہ فرق کہ بعض فصیح ہو اور بعض رکیک، ہر بشر کی تقریر وتحریر پر ماحول کا اثر ہوتا ہے، اطمینان کے وقت کلام اور طرح کا ہوتا ہے، پریشانی کے وقت دوسری طرح کا ہے، مسرّت کے وقت اور رنگ ہوتا ہے اور رنج کے وقت دوسرا، لیکن قرآن ہر قسم کے تفاوت اور تناقض سے پاک ہے اور بالاتر ہے، اور یہی کلامِ الٰہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ

اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر اس کو پہنچا دیتے

اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ

رسول تک اور اپنے حاکموں تک تو تحقیق کرتے اس کو جو اُن میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کی،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۲۹۰

[2] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۳۷

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ان کو کوئی بھی خبر پہنچتی ہے، چاہے وہ امن کی ہو یا خوف پیدا کرنے والی، تو یہ لوگ اسے (تحقیق کے بغیر) پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس (خبر) کو رسول کے پاس یا اصحابِ اختیار کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی کھوج نکالنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے۔ اور (مسلمانو!) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے (۸۳)

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان کو کسی اَمر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ امر موجب) امن ہو یا (موجب) خوف (مثلاً کوئی لشکر مسلمانوں کا کسی جگہ جہاد کے لئے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی، یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی، یہ خوف کی خبر ہے) تو اس (خبر) کو (فوراً) مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا مصلحتِ انتظامیہ کے خلاف ہوتا ہے) اور اگر (بجائے خود مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو (حضرات اکابر صحابہؓ) ان میں ایسے اُمور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے اُوپر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت و غلط اور قابلِ تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو اُن میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں (جیسا ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اُڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا؟ آگے اَحکامِ مذکورہ سنانے کے بعد جو سرتاسر متضمن مصالح دُنیویہ واُخرویہ ہیں بطور منّت کے مسلمانوں کو اِرشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا، اپنا پیغمبر بھیجا، یہ اگر) نہ ہوتا تو تم سب کے سب (ضررِ دُنیوی واُخروی اختیار کر کے) شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو بدولت عقلِ سلیم خداداد کے کہ وہ بھی ایک خاص فضل و رحمت ہے اس سے محفوظ رہتے ورنہ زیادہ تباہی میں پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جن کی معرفت ایسے مصالح کے اَحکام آتے ہیں برخلاف مذکورہ منافقین کے بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اور پوری اطاعت کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

شانِ نزول

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهٖ ابنِ عباس، ضحاک اور ابو معاذ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور حضرت حسنؒ اور دُوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (رُوح المعانی) [۱]

علامہ ابنِ کثیرؒ نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شانِ نزول میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ذِکر کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے، تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذِکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، چنانچہ آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ إلخ۔ (تفسیر ابنِ کثیر) [۲]

بے تحقیق باتوں کا اُڑانا گناہ اور بڑا فتنہ ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" [۳] یعنی "کسی اِنسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کردے۔"

ایک دُوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ حَدَّثَ بِحَدِيْثٍ وَّهُوَ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنِ" [۴] یعنی "جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔" (تفسیر ابنِ کثیر)

---

[۱] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۹۳
[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۳٦٦
[۳] صحیح مسلم، مقدمة باب النهی عن الحديث بكل ما سمع
[۴] صحیح مسلم، مقدمة باب وجوب الرواية عن الثقات ج:۱ ص:٦

اُولوا الامر کون لوگ ہیں؟

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ الخ استنباط، اصل میں کنویں کی تہہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں، کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو "ماءِ مستنبط" کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا۔ (قرطبی)[1]

اُولوا الامر کی تعیین میں متعدّد اقوال ہیں، حضرت حسن، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اُمراء اور حکام مراد ہیں، ابوبکر جصاصؒ ان دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ اُولی الامر کا اِطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اُولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اُولی الامر اپنے لفظی معنی کے اِعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو، اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا کام یہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک جبر وتشدّد سے، وہ تو صرف اہلِ حکومت ہی کر سکتے ہیں، دُوسری صورت اِعتقاد و اِعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے، جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اِختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، اور اَز رُوئے شرع ان پر ان کے اَحکام کی اِطاعت واجب بھی ہے، لہٰذا اس وجہ سے ان پر بھی اُولوا الامر کا اِطلاق صحیح ہے۔ (احکام القرآن للجصاص)[2]

اس بحث کی مزید تفصیل آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء:۵۹) کے تحت بھی گزر چکی ہے۔

مسائلِ جدیدہ میں قیاس واِجتہاد عوام کے لئے تقلیدِ ائمہ کا ثبوت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے اَحکام اِجتہاد وقیاس کے اُصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائلِ جدیدہ کے حل میں اگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو ان کی جانب رُجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رُجوع کرو، کیونکہ وہ اَحکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیتِ تامہ رکھتے ہیں۔

اس بیان سے چند اُمور مستفاد ہوئے ہیں:-

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۵ ص:۲۹۱، ۲۹۲

[2] احکام القرآن للجصاص، سورۃ النساء، باب في طاعة أولي الأمر ج:۲ ص:۴۴۳

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدمِ نص کی صورت میں رُجوع کیا جائے گا۔

دُوسرے یہ کہ اَحکام اللہ کی دو قسمیں ہیں: بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں، اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں، جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اِجتہاد اور قیاس کے ذریعے اِستنباط کریں۔

چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔(احکام القرآن للجصاص) [۱]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِستنباط و اِستدلال کے مکلّف تھے

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ اَحکام کے اِستنباط کے مکلّف تھے، اس لئے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رُجوع کرنے کا حکم دیا گیا، ایک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور دُوسرے اُولوا الامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا: لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ اور یہ حکم عام ہے، جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی اِستنباطِ اَحکام کی مکلّف تھی۔(احکام القرآن للجصاص) [۲]

فوائدِ مُہمّہ

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دُشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اُڑاؤ بلکہ جو اہلِ علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رُجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کر کے جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائلِ حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ آیت وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ میں دُشمن کا کوئی ذِکر نہیں ہے، لہٰذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دُشمن سے ہے، اسی طرح مسائلِ حوادث سے بھی، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اِختیار کرے، دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا اِحتمال رہتا ہے، تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہلِ اِستنباط کی طرف رُجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔(احکام القرآن للجصاص ملخصًا) [۳]

---

[۱] احكام القرآن، سورة النساء، باب في طاعة اولى الأمر ج:۲ ص:۴۴۴

[۲] أحكام القرآن ، سورة النساء، باب وجوب طاعة الرسول ج:۲ ص:۴۵۸

[۳] احكام القرآن، سورة النساء، باب وجوب طاعة الرسول ج:۲ ص:۴۵۹

اجتہاد و استنباط غلبۂ ظن کا فائدہ دیتا ہے، علم یقینی کا نہیں

استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطا ہونے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظنِ غالب حاصل ہو جاتا ہے، جو عمل کے لئے کافی ہے۔(احکام القرآن للجصاص وتفسیر کبیری) [1]

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

سو تو لڑ اللہ کی راہ میں، تو ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کا اور تاکید کر مسلمانوں کو،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا

قریب ہے کہ اللہ بند کردے لڑائی کافروں کی اور اللہ بہت سخت ہے لڑائی میں

وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

اور بہت سخت ہے سزا دینے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

لٰہذا (اے پیغمبر!) تم اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ تم پر اپنے سوا کسی اور کی ذمہ داری نہیں ہے، ہاں مؤمنوں کو ترغیب دیتے رہو۔ کچھ بعید نہیں کہ اللہ کافروں کی جنگ کا زور توڑ دے۔ اور اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ﴿۸۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوئی) پس آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے (اور اگر فرضاً کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے کیونکہ) آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دے دیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ

[1] احکام القرآن بحوالۂ بالا۔

ہیں، نہ تو باز پُرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ مذکور ہو چکی اور نہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے جس کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے (اور یہ اُمید دِلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے زورِ جنگ کو روک دیں گے (اور ان کو مغلوب کر دیں گے) اور (گو یہ بڑے زوردار نظر آتے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ زورِ جنگ میں (ان سے بمدارج بے شمار) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

معارف ومسائل

شانِ نزول

جب غزوۂ اُحد شوال میں ہو چکا تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدے کے موافق بدر میں مقابلے کے لئے جانا چاہا (جس کو مؤرّخین بدرِ صغریٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہی خبروں کی وجہ سے جانے میں کچھ تأمل کیا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کچے مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اے رسول! تم تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کرو، اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے، اس ہدایت کو پاتے ہی آپ ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدرِ صغریٰ کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوۂ اُحد کے بعد ہوا تھا، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفارِ قریش کے دِل میں رُعب اور خوف ڈال دیا، اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا، اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اِرشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ (قرطبی، مظہری) [1]

قرآنی اَحکام کا حسنِ اُسلوب

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ الخ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ تنِ تنہا جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جائیے، کوئی دُوسرا آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دُوسرے جملہ میں یہ بھی اِرشاد فرما دیا کہ دُوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ سے باز پُرس نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ تنِ تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہو سکتا تھا اس کے اِزالہ کے لئے فرمایا کہ اس کی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۵ ص:۲۹۳، وتفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۷۱، ۱۷۲

کافروں کی جنگ کو روک دے، اور ان کو مرعوب و مغلوب کردے، اور آپ کو تنہا ہی کامیاب کردے، پھر اس کے بعد اس کامیاب ہونے پر دلیل بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے ساتھ ہے جس کی قوتِ جنگ اور زورِ جنگ ان کافروں سے بدر جہا زیادہ ہے تو پھر کامیابی بھی یقیناً آپ ہی کی ہے، پھر اسی شدّتِ بأس کے ساتھ اپنی سزا کی شدّت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا دُنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہرحال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوّت و طاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً

جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے ایک حصہ اور جو کوئی سفارش کرے

سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

بُری بات میں اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے، اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اور جب تم کو دُعا دیوے کوئی تو تم بھی دُعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو اُلٹ کر، بے شک اللہ ہے

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ

النصف

ہر چیز کا حساب کرنے والا۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، بے شک تم کو جمع کرے گا

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع

قیامت کے دن اس میں کچھ شبہ نہیں، اور اللہ سے سچی کس کی بات؟

آسان ترجمۂ قرآن

جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے، اور جو کوئی بُری سفارش کرتا ہے اسے اس بُرائی میں سے حصہ ملتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔ ﴿۸۵﴾ اور جب تمہیں کوئی شخص سلام کرے تو تم اسے اس سے بھی

بہتر طریقے پر سلام کرو، یا (کم از کم) انہی الفاظ میں اس کا جواب دے دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے ﴿٨٦﴾ اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ تمہیں ضرور بالضرور قیامت کے دن اکٹھا کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ بات کا سچا ہو؟ ﴿٨٧﴾

خلاصۂ تفسیر

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و مقصود دونوں مشروع ہوں) اس کو اُس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بُری سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و غرض غیر مشروع ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں) اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ویسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر) حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے، اور یوں اپنے فضل سے معاف کر دیں وہ اور بات ہے) اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں، اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے)۔

معارف و مسائل

سفارش کی حقیقت اور اس کے اَحکام اور اَقسام

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً إلخ اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بُری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا، اور یہ بھی بتلا دیا کہ نہ ہر سفارش بُری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور بُری سفارش کرنے والے کو عذاب کا، آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ نَصِيْبٌ کا لفظ آیا ہے، اور بُری سفارش کے ساتھ كِفْلٌ کا، اور لغت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی کسی چیز کا ایک حصہ، لیکن عرفِ عام میں لفظ ''نصیب'' اچھے حصہ کے لئے بولا جاتا ہے، اور لفظ ''کفل'' اکثر بُرے حصے کے لئے اِستعمال کرتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اچھے حصہ کے لئے بھی لفظ ''کفل'' اِستعمال ہوا ہے جیسے قرآنِ کریم میں كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (الحدید:٢٨) اِرشاد ہے۔

''شفاعت'' کے لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ ''شفعہ'' عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے، اوراس کے بالمقابل لفظ ''وتر'' بمعنی طاق اِستعمال کیا جاتا ہے، اس لئے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالبِ حق کے ساتھ اپنی قوّت ملا کراس کو قوی کر دیا جائے، یا بے کس اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کراس کو جوڑا بنا دیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت وسفارش کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دُوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچا دیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلافِ حق سفارش کرنا یا دُوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعتِ سیئہ یعنی بُری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اِجبار کا اِستعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اسی لئے وہ بھی شفاعتِ سیئہ میں داخل ہے۔

اب خلاصۂ مضمون آیتِ مذکورہ کا یہ ہوگیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور اسی طرح جو کسی ناجائز کام کے لئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔

حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا محروم کا کام کردے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا، اسی طرح سفارش کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش مؤثر اور کامیاب بھی ہو، بلکہ اس کو بہرحال اپنا حصہ ملے گا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: ''اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ'' (رواہ البزار[1] عن ابن مسعود والطبرانی عنہ وعن سہل بن سعد بحوالہ مظہری) یعنی ''جو شخص کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کردے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو۔''

اسی طرح ابنِ ماجہ[2] کی ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ اَعَانَ عَلٰى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ آيِسٌ مِّنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ (مظہری)

---

[1] مسند البزار رقم الحدیث: ۱۷۴۲ والمعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۵۹۴۵

[2] سنن ابن ماجۃ، ابواب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ج:۱ ص:۱۸۸

''یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں ایک کلمے سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم و مایوس ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے، اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ لفظ ''مقیت'' کے معنی لغت کے اعتبار سے قادر و مقتدر کے بھی ہیں، اور حاضر و نگراں کے بھی، اور روزی تقسیم کرنے والے کے بھی، اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، عمل کرنے والے اور سفارش کرنے والے کی جزا یا سزا اس کے لئے دُشوار نہیں۔

اور دُوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں و حاضر ہے، اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کر رہا ہے، محض لوجہ اللہ کسی بھائی کی اِمداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رِشوت کے اس سے حاصل کرنا ہے۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے، جتنا کسی کے لئے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا، کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا، بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا، البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے کہ وہ ایک کمزور کی اِعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

كَانَ اللّٰهُ فِيْ عَوْنِ عَبْدِهٖ مَا دَامَ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ۔ [۱]

''یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی اِمداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی اِمداد میں لگا رہے۔''

اسی بنا پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَا شَآءَ۔ [۲]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الإجتماع علی التلاوۃ إلخ ج:۲ ص:۳۴۵- وسنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب النصیحۃ والمعونۃ للمسلم ج:۲ ص:۶۷۲

[۲] صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب تعاون المؤمنین بعضھم بعضًا ج:۲ ص:۸۹۰

''یعنی تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب ملے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔''

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجبِ ثواب ہونا بیان فرمایا ہے، وہیں یہ بھی بتلایا کہ سفارش کی حد یہی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک پہنچانے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو، آگے وہ سفارش مانی جائے یا نہ مانی جائے، اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو، اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے۔ اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہئے۔ حدیث کے آخری جملہ میں: ''وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَا شَآءَ'' کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کامیاب ہو، بلکہ اس ثواب وعذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے، آپ نے شفاعتِ حسنہ کر دی تو ثواب کے مستحق ہو گئے، اور شفاعتِ سیئہ کر دی تو عذاب کے مستوجب بن گئے، خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر ''بحرِ محیط'' اور ''بیان القرآن'' وغیرہ میں مَنْ يَّشْفَعْ میں لفظ مِّنْهَا کو سببیہ قرار دے کر اس کی طرف اِشارہ بتلایا ہے، اور تفسیر مظہری میں اِمامِ تفسیر مجاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ملے گا، اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو۔[1] اور یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی دُوسرے اِنسان کے پاس جو سفارش کی جائے، اس کا بھی یہی اُصول ہونا چاہئے کہ سفارش کر کے آدمی فارغ ہو جائے، اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جیسا کہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ اس نے جو اپنے شوہر مغیثؓ سے طلاق حاصل کر لی ہے اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کر لے، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے۔ بریرہؓ جانتی تھیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ اُصول کوئی ناگواری نہ ہوگی، اس لئے صاف عرض کر دیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی، آپ نے خوش دِلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔[2]

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعثِ اجر وثواب تھی۔ آج کل لوگوں نے جو اس کا حلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی، بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو

---

[1] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۷۲

[2] صحيح البخاری، كتاب الطلاق، باب شفاعة النبی صلی اللہ عليه وسلم إلخ ج:۲ ص:۷۹۵

ناراض ہوتے ہیں، بلکہ دُشمنی پر آمادہ ہوجاتے ہیں، حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہوجائے، اکراہ واجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے، اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کسی کے حق پر زبردستی قبضہ کرلے، وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد وخود مختار تھا، آپ نے اس کو مجبور کرکے اس کی آزادی سلب کرلی، اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کے لئے کسی دُوسرے کا مال چرا کر اس کو دے دیا جائے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رِشوت ہے اور حرام ہے

جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رِشوت ہے، حدیث میں اس کو سُحت وحرام فرمایا ہے،[۱] اس میں ہر طرح کی رِشوت داخل ہے، خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعتِ حسنہ وہ ہے جس کا منشا کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہنچانا یا مضرّت اور نقصان سے بچانا ہو، اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دُنیوی جوڑ توڑ کے لئے نہ ہو، بلکہ محض اللہ کے لئے کمزور کی رعایت مقصود ہو، اور اس سفارش پر کوئی رِشوت مالی یا جانی نہ لی جائے، اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین ومقرّر ہے۔[۲]

تفسیر بحرِ محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا بھی شفاعتِ حسنہ میں داخل ہے اور دُعا کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے۔[۳] ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے کوئی دُعائے خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے: "وَلَكَ بِمِثْلٍ" یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔[۴]

سلام اور اِسلام

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ إلخ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور اس کے جواب کے آداب بتلائے ہیں۔

لفظ "تحیہ" کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو

"تحیہ" کے لفظی معنی ہیں کسی کو "حَيَّاكَ اللهُ" کہنا، یعنی "اللہ تم کو زندہ رکھے" قبل اَز اِسلام عرب کی عادت تھی

[۱] مؤطا مالك رقم الحديث: ۱۱۹۸، كتاب المساقاة، باب ما جاء في المساقاة۔

[۲] تفسير كشاف تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۴۴۰

[۳] تفسير البحر المحيط تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۲۱۳

[۴] صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء إلخ، باب فضل الدعاء للمسلمين ج: ۲ ص: ۳۵۱

کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دُوسرے "حَیَّاکَ اللّٰہُ" یا "اَنْعَمَ اللّٰہُ بِکَ عَیْنًا" یا "اَنْعِمْ صَبَاحًا" وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرزِ تحیہ کو بدل کر "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کہنے کا طریقہ جاری کیا، جس کے معنی ہیں "تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو۔"

ابن عربیؒ نے "احکام القرآن" میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، اور "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کے معنی ہیں کہ "اَللّٰہُ رَقِیْبٌ عَلَیْکُمْ" یعنی "اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔"[1]

اسلامی سلام تمام دُوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے

دُنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رِواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اِظہارِ محبت کے لئے کہیں، لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دُوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اِظہارِ محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حقِ محبت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں، پھر دُعا بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں، بلکہ حیاتِ طیبہ کی دُعا ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اِظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دُوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اِذن کے نہیں پہنچا سکتا، اس معنی کے اِعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے اور اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دِلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھی کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے ضمن میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مأمون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو کا میں محافظ ہوں۔

ابنِ عربیؒ نے اَحکامِ القرآن میں اِمام ابنِ عیینہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

اَتَدْرِیْ مَا السَّلَامُ؟ یَقُوْلُ اَنْتَ آمِنٌ مِّنِّیْ۔[2]

"یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مأمون رہو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے: ۱-اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذِکر ہے، ۲-تذکیر بھی، ۳-اپنے بھائی مسلمان سے اِظہارِ تعلق و محبت بھی، ۴-اس کے لئے بہترین دُعا بھی، ۵-اور اس سے یہ معاہدہ

---

[1] احکام القرآن لابن العربی، سورۃ النساء، مسئلۃ معنی قولہ تعالیٰ اَوْ رُدُّوْهَا ج:۲ ص:۴۲۸

[2] احکام القرآن لابن العربی بحوالۂ بالا۔

بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد وارِد ہے:-

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ (الحديث) [۱]

''یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔''

کاش! مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کرے، بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اِختیار کرے، تو شاید پوری قوم کی اِصلاح کے لئے یہی کافی ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رِواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اَجر و ثواب بیان فرمائے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

''تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتے جب تک مؤمن نہ ہو، اور تمہارا اِیمان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک آپس میں ایک دُوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرلو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہوجائے گی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔'' [۲]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلادو، اور سلام کو عام کرو، خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔ (صحیحین) [۳]

مسندِ احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں اِبتدا کرے۔ [۴]

مسندِ بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اُتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک

---

[۱] صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم إلخ ج:۱ ص:۶

[۲] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان انه لا يدخل الجنة إلخ ج:۱ ص:۵۴

[۳] صحيح البخاری، كتاب الايمان، باب اطعام الطعام من الإسلام ج:۱ ص:۶، وصحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تفاضل الإسلام إلخ ج:۱ ص:۴۸

[۴] مسند احمد رقم الحديث:۲۱۱۶۸- حديث ابی امامة الباهلی رضی الله عنه وجامع الترمذی، ابواب الإستئذان إلخ، باب ما جاء فی فضل الذی يبدأ بالسلام ج:۲ ص:۹۹ وسنن ابی داوٗد، كتاب الأدب، باب فی فضل من بدأ السلام ج:۲ ص:۷۰۶

بلند مقام حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام، یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دِلائی، اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔ [۱]

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے۔(طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرۃ) [۲]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اِرشادات کا صحابہ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا۔ یہ روایت مؤطا اِمام مالکؒ میں طفیل بن اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ [۳]

قرآن مجید کی جو آیت اُوپر ذِکر کی گئی ہے اس میں اِرشاد یہ ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو۔ اس کی تشریح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" آپ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" پھر ایک صاحب آئے اور انہوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" آپ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا: "وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه" پھر ایک صاحب آئے انہوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه" آپ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وَعَلَيْكَ" اِرشاد فرمایا، ان کے دِل میں شکایت پیدا ہوئی، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، پہلے جو حضرات آئے آپ نے اُن کے جواب میں کئی کلمات دُعا کے اِرشاد فرمائے، اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کی تو آپ نے "وَعَلَيْكَ" پر اِکتفا فرمایا، آپ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اِضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے، اس لئے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اِکتفا کر لیا۔ اس روایت کو ابنِ جریرؒ اور ابنِ ابی حاتمؒ نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ [۴]

حدیثِ مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیتِ مذکورہ

---

[۱] مسند بزار رقم الحدیث: ۱۷۷۱، والمعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۰۲۳۸

[۲] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۳۳۴

[۳] مؤطا مالک باب جامع السلام رقم الحدیث: ۱۵۱۷

[۴] تفسیر الطبری لابن جریر تحت ھٰذہ الآیۃ رقم الحدیث: ۱۰۰۴۴

میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا: ''السلام علیکم'' تو آپ جواب دیں ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' اور اس نے کہا: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو آپ جواب میں کہیں: ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔

دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے، اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں، اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے جو کسی کام میں مخل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے، اسی لئے ایک صاحب نے اپنے اِبتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے اور زیادتی سے اِحتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: "إِنَّ السَّلَامَ قَدِ انْتَهٰى إِلَى الْبَرَكَةِ" (مظهری عن البغوی) [۱] یعنی ''سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے'' اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے۔ (ومثله عن ابن کثیر) [۲]

تیسری بات حدیثِ مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی اداء بالمثل کے حکم میں حکمِ قرآنی: اَوْ رُدُّوْهَا کی تعمیل کے لئے کافی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کلمہ پر اِکتفا فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری) [۳]

مضمونِ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذرِ شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہگار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اِختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دُوسرے یہ کہ بعینہٖ انہی الفاظ سے جواب دے دیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم واجب صراحۃً بتلا دیا گیا ہے، لیکن اِبتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے؟ اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے، مگر اِذَا حُيِّيْتُمْ میں اس کے حکم کی طرف بھی اِشارہ موجود ہے، کیونکہ اس لفظ کو بصیغۂ مجہول بغیر تعیین فاعل ذِکر کرنے میں اِشارہ ہوسکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادۃً سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسندِ احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرّب وہ شخص ہے جو سلام کی اِبتدا کرے۔ [۴]

---

[۱] تفسیر البغوی تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲۵۷ وموطا مالك رقم الحديث:۱۵۱۳ باب العمل فی السلام۔

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۲ ص:۳۶۹

[۳] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۷۳

[۴] قد مرّ تخریجه۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں، ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنتِ مؤکدہ سے کم نہیں، تفسیر ''بحرِ محیط'' میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: ''اَلسَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَّالرَّدُّ فَرِيْضَةٌ'' یعنی ''ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔'' [1]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکمِ قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جوابِ سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ بھی مختصر طور پر ملاحظہ کر لیجئے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے، اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گزریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتدا کریں۔ [2]

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کے لئے بھی برکت ہوگی، اور اس کے گھر والوں کے لئے بھی۔ [3]

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے، [4] اور جس طرح اوّل ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رُخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے، ترمذی، ابوداؤد میں یہ حکم بروایت قتادہ وابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جو اُوپر بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں، جو شخص نماز پڑھ رہا ہے، اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسدِ نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے، یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے یا انسانی ضروریات استنجا وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

اختتامِ مضمون پر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں'' جن میں انسان اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جوابِ سلام کے سب اُمور داخل ہیں، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لیں گے۔

پھر فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ یعنی ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کو

---

[1] تفسير البحر المحيط تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۱۴

[2] صحيح البخاري، كتاب الإستئذان، باب تسليم الراكب على الماشي ج:۲ ص:۹۲۱، وصحيح مسلم، كتاب السلام، باب يسلم الراكب على الماشي ج:۲ ص:۲۱۲

[3] جامع الترمذي، ابواب الإستئذان، باب ما جاء في تسليم الراكب إلخ ج:۲ ص:۹۹

[4] سنن ابي داؤد، كتاب الأدب، باب في الرجل يفارق الرجل إلخ ج:۲ ص:۷۰۶

معبود جانو، اور جو کام کرو اس کی عبادت کی نیت سے کرو، وہ تم کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس روز سب کے بدلے عنایت فرمائیں گے، قیامت کا وعدہ اور جزا و سزا کی خبر سب حق ہے۔" وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملے میں دو فریق ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو اُلٹ دیا بسبب ان کے اعمال کے، کیا تم چاہتے ہو

اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا اللہ نے، اور جس کو گمراہ کرے اللہ ہرگز نہ پاوے گا تو اس کے لئے کوئی راہ۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ

چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ، سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ

حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ

یہاں تک کہ وطن چھوڑ آویں اللہ کی راہ میں، پھر اگر اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو

حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

جہاں پاؤ، اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ

مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ

حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

تنگ ہو گئے ہیں دِل ان کے تمہاری لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے بھی، اور اگر اللہ چاہتا

لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا

تو ان کو تم پر زور دے دیتا تو ضرور لڑتے تم سے، سو اگر یک سو رہیں وہ تم سے پھر تم سے نہ لڑیں اور پیش کریں

اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ

تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ۔ اب تم دیکھو گے ایک اور قوم کو

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ

جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی قوم سے بھی، جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ

تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں، پھر اگر وہ تم سے یک سو نہ رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح

وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ

اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ، اور اُن پر

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۲

ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ بن گئے؟ حالانکہ انہوں نے جیسے کام کئے ہیں ان کی بنا پر اللہ نے ان کو اوندھا کر دیا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ایسے شخص کو ہدایت پر لاؤ جسے اللہ (اس کی خواہش کے مطابق) گمراہی میں مبتلا کر چکا؟ اور جسے اللہ گمراہی میں مبتلا کر دے، اس کے لئے تم ہرگز کبھی کوئی بھلائی کا راستہ نہیں پا سکتے (۸۸) یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کو اپنا لیا ہے، اسی طرح تم بھی کافر بن کر سب برابر ہو جاؤ۔ لہٰذا (اے مسلمانو!) تم

ان میں سے کسی کو اُس وقت تک دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کے راستے میں ہجرت نہ کرلے۔ چنانچہ اگر وہ (ہجرت سے) اِعراض کریں تو ان کو پکڑو، اور جہاں بھی انہیں پاؤ، انہیں قتل کردو، اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست بناؤ، نہ مددگار۔ (۸۹) ہاں وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جن کے اور تمہارے درمیان کوئی (صلح کا) معاہدہ ہے، یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ ان کے دِل تمہارے خلاف جنگ کرنے سے بھی بیزار ہوں، اور اپنی قوم کے خلاف جنگ کرنے سے بھی ـــــ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا، تو وہ تم سے ضرور جنگ کرتے ـــــ چنانچہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تم سے جنگ نہ کریں، اور تم کو امن کی پیشکش کر دیں تو اللہ نے تم کو ان کے خلاف کسی کارروائی کا کوئی حق نہیں دیا (۹۰) (منافقین میں) کچھ دُوسرے لوگ تمہیں ایسے ملیں گے جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ (مگر) جب کبھی ان کو فتنے کی طرف واپس بلایا جائے، وہ اس میں اوندھے منہ جاگرتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ لوگ تم سے (جنگ کرنے سے) علیحدگی اِختیار نہ کریں، اور نہ تمہیں امن کی پیشکش کریں، اور نہ اپنے ہاتھ روکیں، تو ان کو بھی پکڑو، اور جہاں کہیں انہیں پاؤ، انہیں قتل کرو۔ ایسے لوگوں کے خلاف اللہ نے تم کو کھلا کھلا اِختیار دے دیا ہے۔ (۹۱)

خلاصۂ تفسیر

تین مختلف گروہوں کا بیان اور اُن کے اَحکام

پہلے فرقہ کا بیان

(جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم (اِختلافِ رائے کرکے) دو گروہ ہوگئے (کہ ایک گروہ ان کو اَب بھی مسلمان کہتا ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) اُلٹا پھیر دیا ان کے (بد) عمل کے سبب (وہ بدعمل اِرتداداً دارُالاسلام کو باوجود قدرت کے چھوڑ دینا ہے، جو کہ اس وقت مثل ترکِ اِقرار بالاسلام کے علامت کفر کی تھی اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہ ہوئے تھے، اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ جن کو اس ترکِ دارُالاسلام کا علامتِ کفر ہونا معلوم نہیں) اس کا اِرادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جبکہ ان لوگوں نے گمراہی اِختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ عزمِ فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مؤمن گمراہ کو جو ہدایت یافتہ مؤمن کہتے ہو یہ تمہارے لئے جائز نہیں) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے

(پس ان لوگوں کو مؤمن نہ کہنا چاہئے اور بھلا وہ خود کیا مؤمن ہوں گے ان کے غلوفی الکفر کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدا نہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ سو (ان کی جب یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی کے جواز کے لئے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیلِ اسلام کے لئے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو اَب اِقرار بالشہادتین کا ہے، اور تکمیلِ اِسلام کی قید اس لئے ہے کہ خالی دارُ الاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہلِ تجارت بھی آجاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آویں، یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ جامع اِقرار و ہجرت کے ہو جاویں، اور رہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اِعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لئے ہے یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں اِستعانت بلکہ الگ تھلگ رہو)۔

دُوسرے فرقہ کا بیان

مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمہارے ساتھ مصالحت سے رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ بواسطہ صلح ہو یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہو جاتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے، (جیسے بنو مدلج، کہ ان سے صلح ہوئی تو ان کے ہم عہد بھی اس اِستثنا میں آ گئے تو بنو مدلج بدرجہ اَولیٰ مستثنیٰ ہوئے) یا (دُوسرا طریق یہ ہے کہ بلا واسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ) خود تمہارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دِل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منقبض ہو (اس لئے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، پس دونوں طریقوں میں جس طریق سے کوئی مصالحت رکھے وہ حکمِ مذکور پکڑنے اور قتل سے مستثنیٰ ہیں) اور (تم ان لوگوں کی درخواست صلح میں اللہ تعالیٰ کا اِحسان مانو کہ ان کے دِل میں تمہاری ہیبت ڈال دی ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط (اور دلیر) کر دیتا، پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر خدا تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچا لیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے معاملہ سلامت روی کا رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کئی لفظ تاکید کے لئے فرمادیئے) تو (اس حالتِ صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اِجازت نہیں دی)۔

تیسرے فرقہ کا بیان

بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہوگی) کہ (براہِ دھوکا) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (اور ساتھ ہی اس کے) جب کبھی ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے) شرارت (وفساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں، اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب مثل سابق کے ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے اُن کا قتل کرنا ظاہر ہے، اور وہ حجت ان کا نقضِ عہد ہے)۔

معارف ومسائل

مذکورہ آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے، جن کے متعلق دو حکم مذکور ہیں، واقعات ان فرقوں کے مندرجہ روایات سے واضح ہوں گے۔

پہلی روایت:- عبد بن حمیدؒ نے مجاہدؒ سے روایت کیا کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے، اور حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسبابِ تجارت لانے کا بہانہ کر کے پھر مکہ چل دیئے اور پھر نہ آئے۔ ان کے بارے میں مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے کہا یہ مؤمن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ میں بیان کر دیا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کا منافق کہنا بایں معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے، دِل سے ایمان نہ لائے تھے، اور منافقین کو قتل نہ کئے جاتے تھے لیکن جب ہی تک کہ اپنا کفر چھپاتے تھے، اور ان لوگوں کا اِرتداد ظاہر ہو گیا تھا، اور جنہوں نے مسلمان کہا شاید حسنِ ظن کی وجہ سے کہا ہو، اور ان کے دلائلِ اِرتداد میں کچھ تأویل کر لی ہوگی، اور اس تأویل کی بنیاد رائے محض ہوگی، جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہوگی اس لئے معتبر نہیں رکھی گئی۔

دُوسری روایت:- ابنِ ابی شیبہؒ نے حسنؒ سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے بعد واقعہ بدر و اُحد کے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آ کر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو تکمیلِ صلح کے لئے وہاں بھیج دیا، مضمونِ صلح یہ تھا:-

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے، اور قریش مسلمان ہو جائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے، اور جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں۔''[1]

اس پر یہ آیت وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ الیٰ قولہ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ نازل ہوئی۔

تیسری روایت:- حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ آیت سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں جن کا ذِکر ہے، مراد ان سے قبیلۂ اسد اور غطفان ہیں، کہ مدینہ میں آئے اور ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندر اور عقرب (بچھو) پر ایمان لائے ہیں، اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دِین پر ہیں۔[2]

اور ضحاکؒ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہی حالت بنی عبدالدار کی نقل کی ہے، پہلی اور دُوسری روایت ''رُوح المعانی'' اور تیسری ''معالم'' میں ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت مثل پہلی روایت والوں کے ہوئی کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہوگیا، اسی لئے ان کا حکم مثل عام کفار کے ہے، یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے قتال نہ کیا جائے اور مصالحت نہ ہونے کی صورت میں قتال کیا جائے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے باب میں دُوسری آیت یعنی فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ میں گرفتار کرنے اور قتل کا حکم اور تیسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ الخ میں مصالحت میں ان کا اِستثنا موجود ہے جن کی مصالحت کا ذِکر دُوسری روایت میں ہے، اور تاکید استثنا کے لئے پھر فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ کی تصریح کر دی۔

اور تیسری روایت والوں کے باب میں چوتھی آیت یعنی سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الخ میں بیان فرمادیا کہ اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ مقاتلہ کرتے ہیں تو تم ان سے جہاد کرو، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کریں تو ان سے قتال نہ کیا جائے۔ (بیان القرآن)[3]

خلاصہ یہ کہ یہاں تین فرقوں کا ذِکر فرمایا گیا:-

---

۱ مصنف ابن ابی شیبة ج:۸ ص:۴۵۸

۲ تفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۲۶۰

۳ تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۴۱، ۱۴۲

۱- جو ہجرت کہ شرطِ اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، یا کرنے کے بعد دارُالاسلام سے نکل کر دارُالحرب میں چلے جائیں۔

۲- مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کرلیں، یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کرلیں۔

۳- جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کرلیں، اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہوجائیں، اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فریق کا حکم عام کفار کی مانند ہے، دُوسرا فریق قتل اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہے، تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان آیتوں کے کل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدمِ صلح کے وقت قتال، اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

ہجرت کی مختلف صورتیں اور اَحکام

قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ الخ [۱] ابتدائے اسلام میں ہجرت دارالکفر سے تمام مسلمانوں پر فرض تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنے سے منع کیا ہے جو اس فرض کے تارک ہوں، پھر جب مکہ فتح ہوا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ" (رواہ البخاری) [۲] یعنی "جب مکہ فتح ہوکر دارُالاسلام بن گیا تو اَب وہاں سے ہجرت فرض نہ رہی۔" یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت شرطِ ایمان تھی، اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔

ہجرت کی دُوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی، جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے: "لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ"، یعنی "ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے۔" (صحیح بخاری) [۳]

علامہ عینیؒ شارحِ بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے: "اَنَّ الْمُرَادَ بِالْهِجْرَةِ الْبَاقِيَةِ هِيَ هَجْرُ السَّيِّئَاتِ" یعنی "اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے۔" [۴] جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ"، یعنی "مہاجر وہ ہے جو اُن تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو

---

[۱] ہجرت سے متعلقہ بحث کے لئے تفسیر آیت نمبر ۱۰۰ سورۂ نساء دیکھئے۔

[۲] صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب لا هجرة بعد الفتح ج:۱ ص:۴۳۳

[۳] یہ حدیث بندہ کو صحیح بخاری میں نہیں ملی، البتہ سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت میں یہ حدیث ہے ج:۱ ص:۳۳۵

[۴] عمدة القاری ج:۱ ص:۷۷

اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔'' (بحوالہ مرقاۃ جلد اوّل) [۱]

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے: ۱- دین کے لئے ترکِ وطن کرنا، جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا وطن مکہ ترک کر کے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔ ۲- گناہوں کا چھوڑنا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۹﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے طلبِ نصرت حرام ہے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاہی تو آپ نے فرمایا: "اَلْخَبِيْثُ لَا حَاجَةَ لَنَا بِهِمْ" یعنی ''یہ خبیث قوم ہے اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں۔'' (مظہری) [۲]

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے، اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ

تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی اور خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کردیں،

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ

پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی،

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے، تو خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو

وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ

اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی، پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو مہینے کے برابر

---

[۱] مرقاۃ، کتاب الصلاۃ، باب الإمامة، ومسند احمد، مسند عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ رقم الحدیث: ۲۵۲۲

[۲] تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۷۹

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا

گناہ بخشوانے کو اللہ سے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو

مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب۔

آسان ترجمۂ قرآن

کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی دُوسرے مسلمان کو قتل کرے، اِلَّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر بیٹھے تو اس پر فرض ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور دِیت (یعنی خوں بہا) مقتول کے وارثوں کو پہنچائے، اِلَّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ اور اگر مقتول کسی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو جو تمہاری دُشمن ہے، مگر وہ خود مسلمان ہو، تو بس ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا فرض ہے، (خوں بہا دینا واجب نہیں)۔ اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جو (مسلمان نہیں، مگر) ان کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہے، تو بھی یہ فرض ہے کہ خوں بہا اس کے وارثوں تک پہنچایا جائے، اور ایک مسلمان غلام کو آزاد کیا جائے۔ ہاں اگر کسی کے پاس غلام نہ ہو تو اس پر فرض ہے کہ دو مہینے تک مسلسل روزے رکھے۔ یہ توبہ کا طریقہ ہے جو اللہ نے مقرّر کیا ہے، اور اللہ علیم و حکیم ہے ﴿۹۲﴾ اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب نازل کرے گا اور لعنت بھیجے گا، اور اللہ نے اس کے لئے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۹۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو (ابتداءً) قتل کرے لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر (شرعاً) ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا (واجب) ہے اور خوں بہا

(بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں بقدر حصص میراث) حوالہ کردی جائے (اور جس کے کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال قائم مقام ورثہ کے ہے) مگر یہ کہ وہ لوگ (اس خوں بہا کو) معاف کردیں (خواہ کل یا بعض اتنی ہی معاف ہو جاوے گی) اور اگر وہ (مقتول خطأً) ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں (یعنی حربی ہیں اور انہی میں کسی وجہ سے رہتا تھا) اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا، اور دِیت اس لئے نہیں کہ اگر ورثہ اس مقتول کے مسلمان ہیں تب تو وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہ ہونے کے باعث مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دِیت بیت المال کا حق ہوتی، اور دارُ الحرب سے دارُ الاسلام کے بیت المال میں ترکہ لایا نہیں جاتا) اور اگر وہ (مقتول خطأً) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ (صلح یا ذمہ کا) ہو (یعنی ذِمی یا مصالح ومستأمن ہو) تو خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کردی جاوے، (کیونکہ کافر کافر کا وارث ہوتا ہے) اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا) پھر (جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنے دام ہوں کہ خرید سکے) تو (اس کے ذمہ بجائے اس آزاد کرنے کے) متواتر (یعنی لگاتار) دو ماہ کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرّر ہوئی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ مشروع ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (اپنے علم وحکمت سے مصلحت کے مناسب اَحکام مقرّر فرمائے ہیں، گو ہر جگہ حکمت بندے کو معلوم نہ ہو) اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہتا (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی، بلکہ اِیمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوں گے، اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دُور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزائے دوزخ) کا سامان کریں گے۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات

اُوپر سے قتل وقتال کا ذِکر چلا آرہا ہے، اور کل صورتیں اِبتداءً قتل کی آٹھ ہیں، کیونکہ مقتول چار حال سے خالی نہیں ہے، یا مؤمن ہے، یا ذمی، یا مصالح ومستأمن ہے یا حربی ہے۔ اور قتل دو طرح کا ہے یا عمداً یا خطأً۔ پس اس اِعتبار سے کل صورتیں قتل کی آٹھ ہوئیں، اوّل مؤمن کا قتلِ عمد، دوم مؤمن قتلِ خطا، سوم ذِمی کا قتلِ عمد، چہارم ذِمی کا قتلِ خطا، پنجم مصالح کا

قتلِ عمد، ششم مصالح کا قتلِ خطا، ہفتم حربی کا قتلِ عمد، ہشتم حربی کا قتلِ خطا۔

ان صورتوں میں بعض کا حکم تو اُوپر معلوم ہو چکا، بعض کا آگے مذکور ہے، اور بعض کا حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ صورتِ اُولیٰ کا حکم دُنیوی یعنی وجوبِ قصاص سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، اور حکم اُخروی آگے آیت وَمَنْ يَّقْتُلْ میں آتا ہے۔ اور صورتِ دوم کا بیان قول اللہ تعالیٰ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ (الیٰ قولہ) وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ میں آتا ہے۔ اور صورتِ سوم کا حکم حدیث دار قطنی[1] میں ہے کہ ذِمی کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے قصاص لیا (اخرجه الزيلعي في تخريج الهداية)۔[2] صورتِ چہارم کا ذکر قول اللہ تعالیٰ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ میں آتا ہے۔ صورتِ پنجم کا ذکر اُوپر کے رُکوع قول اللہ تعالیٰ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ میں آچکا ہے۔ صورتِ ششم کا حکم صورتِ چہارم کے ساتھ ہی مذکور ہے، کیونکہ میثاق عام ہے جو وقتی اور دائمی دونوں کو شامل ہے، پس ذِمی و مستامن دونوں آگئے۔ درمختار کی کتاب الدیات کے شروع میں مستامن کی دِیت کے وجوب کی تصحیح کی ہے۔ صورتِ ہفتم و ہشتم کا حکم خود جہاد کی مشروعیت سے اُوپر معلوم ہو چکا ہے، کیونکہ جہاد میں اہلِ حرب قصداً مقتول ہوتے ہیں، اور خطا کا جواز بدرجۂ اُولیٰ ثابت ہوگا۔ (بیان القرآن)[3]

قتل کی تین قسمیں اور ان کا شرعی حکم

پہلی قسم: عمد:- جو ظاہراً قصد سے ایسے آلہ کے ذریعے سے واقع ہو جو آہنی یا تفریقِ اجزاء میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا بانس یا دھار والا پتھر وغیرہ۔

دُوسری قسم: شبہ عمد:- جو قصداً تو ہو مگر ایسے آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاء میں تفریق ہو سکتی ہو۔

تیسری قسم: خطأ:- یا تو قصد وظن میں کہ دُور سے آدمی کو شکاری جانور یا کافر حربی سمجھ کر نشانہ لگادیا، یا فعل میں کہ نشانہ تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جا لگا، اس میں خطا سے مراد غیر عمد ہے، پس دُوسری، تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں، دونوں میں دِیت بھی ہے، اور گناہ بھی ہے، مگر ان دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔ دِیت دُوسری قسم کی سو اُونٹ ہیں، چار قسم کے، یعنی ایک ایک قسم کے پچیّس پچیّس، اور دِیت تیسری قسم کی سو اُونٹ ہیں، پانچ قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے بیس بیس، البتہ اگر دِیت میں نقد دیا جائے تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی یا ایک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ

[1] سنن دارقطني رقم الحديث:١٩٠

[2] نصب الراية ج:٥ ص:١٣٣

[3] بيان القرآن تحت هذه الآية ج:٢ ص:١٤٤

دُوسری قسم میں زیادہ ہے بوجہ قصد کے، اور تیسری قسم میں کم صرف بے اِحتیاطی کا (کذا فی الهدایة)۔[۱] چنانچہ تحریر رقبہ کا وجوب ونیز لفظ توبہ بھی اس پر دال ہے، اور حقیقت ان تینوں کی دُنیا میں جاری ہونے والے اَحکامِ شرعیہ کے اِعتبار سے ہے، اور گناہ کے اِعتبار سے عمد وغیر عمد ہونا، اس کا مدار قلبی قصد واِرادہ پر ہے، جس پر وعیدِ آئندہ کا مدار ہے، وہ خدا کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ اس اِعتبار سے قسمِ اوّل غیر عمد ہوجاوے اور قسم ثانی عمد ہوجاوے۔

مسئلہ:- یہ مقدارِ مذکور دِیت کی جب ہے کہ مقتول مرد ہو، اور اگر عورت ہو تو اس کی نصف ہے۔ (کذا فی الهدایة)[۲]

مسئلہ:- دِیت مسلم اور ذِمی کی برابر ہے، قولِ رسول علیہ السلام ہے: "دِيَـةُ كُـلِّ ذِىْ عَهْـدٍ فِىْ عَهْـدِهٖ اَلْفُ دِيْنَارٍ۔" (كذا في الهداية، أخرجه ابوداوٗد في مراسيله)[۳]

مسئلہ:- کفارہ یعنی تحریر رقبہ یا روزے رکھنا خود قاتل کو اَدا کرنا پڑتا ہے، اور دِیت قاتل کے اہلِ نصرت پر ہے، جن کو شرع کی اِصطلاح میں "عاقلہ" کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)[۴]

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور اَنصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے، کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ اس میں قاتل کے اولیاء بھی قصوروار ہوتے ہیں کہ انہوں نے اس کو اس قسم کی بے اِحتیاطی کرنے سے روکا نہیں، اور دِیت کے خوف سے آئندہ وہ لوگ اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے۔

مسئلہ:- کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہیں، لفظ "رقبہ" عام ہے، البتہ ان کے اعضاء سالم ہونے چاہئیں۔

مسئلہ:- دِیت مقتول کی شرعی ورثہ میں تقسیم ہوگی، اور جو اَپنا حصہ معاف کردے گا اس قدر معاف ہوجائے گی، اور اگر سب نے معاف کردیا سب معاف ہوجائے گی۔

مسئلہ:- جس مقتول کا کوئی وارثِ شرعی نہ ہو اس کی دِیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دِیت ترکہ ہے، اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔ (بیان القرآن)[۵]

مسئلہ:- اہلِ میثاق (ذِمی یا مستأمن) کے باب میں جو دِیت واجب ہے ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ہے جب

---

[۱] الهداية، كتاب الجنايات ج:۴ ص:۵۵۸

[۲] الهداية، كتاب الديات ج:۴ ص:۵۸۲

[۳] المراسيل لأبي داوٗد، رقم الحديث:۲۴۳، باب دية كل ذي عهد إلخ۔

[۴] بيان القرآن تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۴۵

[۵] بيان القرآن ج:۲ ص:۱۴۶

اس ذِمی یا مستأمن کے اہل موجود ہوں، اور اگر اس کے اہل نہ ہوں، یا وہ اہل مسلمان ہوں اور مسلمان کافر کا وارث ہو نہیں سکتا، اس لئے وہ بجائے نہ ہونے کے ہے، تو اگر وہ ذِمی ہے تو اس کی دِیت بیت المال میں داخل کی جائے گی، کیونکہ ذِمی لاوارث کا ترکہ جس میں دِیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے (کما فی الدر المختار)[1] ورنہ واجب نہ ہوگی۔ (بیان القرآن)[2]

مسئلہ:- روزے میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہا ہو تو ازسرِنو رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض کی وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا۔

مسئلہ:- اگر کسی عذر سے روزہ پر قدرت نہ ہو تو قدرت تک توبہ کیا کرے۔

مسئلہ:- قتلِ عمد میں یہ کفارہ نہیں، توبہ کرنا چاہئے۔ (بیان القرآن)[3]

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا

اے ایمان والو! جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کرلیا کرو اور مت کہو

لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ

اس شخص کو کہ جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں، تم چاہتے ہو اسباب دُنیا کی زندگی کا

فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں، تم بھی تو ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا

فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ

سو اَب تحقیق کرلو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔ برابر نہیں بیٹھ رہنے والے

[1] الدر المختار، کتاب المعاقل ج:۶ ص:۶۳۶

[2] بیان القرآن ج:۲ ص:۱۴۶

[3] بحوالۂ بالا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ

مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں، اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے

وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

اور جان سے، اللہ نے بڑھادیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے بیٹھ رہنے والوں پر

دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

درجہ، اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا، اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے

اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اجرِ عظیم میں۔ جو کہ درجے ہیں اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے اور مہربانی ہے، اور اللہ ہے

ع ۱۴ ۵ ۱۰ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع

بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو تحقیق سے کام لیا کرو، اور جو شخص تم کو سلام کرے تو دُنیوی زندگی کا سامان حاصل کرنے کی خواہش میں اس کو یہ نہ کہو کہ "تم مؤمن نہیں ہو" کیونکہ اللہ کے پاس مالِ غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ نے تم پر فضل کیا۔ لہٰذا تحقیق سے کام لو۔ بیشک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۹۴﴾ جن مسلمانوں کو کوئی معذوری لاحق نہ ہو اور وہ (جہاد میں جانے کے بجائے گھر میں) بیٹھ رہیں وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔ جو لوگ اپنے مال وجان سے جہاد کرتے ہیں ان کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے۔ اور اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا

ہے۔ اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر بڑی فضیلت دے کر بڑا ثواب بخشا ہے ﴿۹۵﴾ یعنی خاص اپنے پاس سے بڑے درجے اور مغفرت اور رحمت! اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۹۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو ہر کام کو (قتل یا اور کچھ ہو) تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے (علامات) اِطاعت (کی) ظاہر کرے (جیسا کلمہ پڑھنا یا مسلمانوں کے طرز پر سلام کرنا) یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو (دِل سے) مسلمان نہیں (محض اپنی جان بچانے کو جھوٹ موٹ اظہارِ اسلام کرتا ہے) اس طور پر کہ تم دُنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو، کیونکہ خدا کے پاس (یعنی ان کے علم وقدرت میں تمہارے لئے) بہت غنیمت کے مال ہیں (جو تم کو جائز طریقوں سے ملیں گے اور یاد تو کرو کہ) پہلے (ایک زمانہ میں) تم بھی ایسے ہی تھے (کہ تمہارے اِسلام کے قبول کا مدار صرف تمہارا دعویٰ واظہار تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر اِحسان کیا (کہ اس ظاہری اِسلام پر اکتفا کیا گیا اور باطنی جستجو پر موقوف نہ رکھا) سو (ذرا) غور (تو) کرو بے شک اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (کہ بعد اس حکم کے کون اس پر عمل کرتا ہے کون نہیں کرتا ثواب میں) برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں (یعنی جہاد میں نہ جاویں) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے (یعنی مالوں کو خرچ کر کے اور جانوں کو حاضر کر کے) جہاد کریں (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے اور (یوں بوجہ فرضِ عین نہ ہونے کے گناہ ان بیٹھنے والوں پر بھی نہیں بلکہ بوجہ اِیمان اور دُوسرے فرائضِ عین کے بجالانے کے) سب سے (یعنی مجاہدین سے بھی قاعدین سے بھی) اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا (یعنی جنت کا آخرت میں) وعدہ کر رکھا ہے اور (اُوپر جو اِجمالاً کہا گیا ہے کہ مجاہدین کا بڑا درجہ ہے اس کی تعیین یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مجاہدین (مذکورین) کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اَجرِ عظیم دیا ہے (وہ درجہ یہی اجرِ عظیم ہے اس اِجمال کی تفصیل فرماتے ہیں) یعنی (بوجہ اعمالِ کثیرہ کے جو مجاہد سے صادر ہوتے ہیں ثواب کے) بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور (گناہوں کی) مغفرت اور رحمت (یہ سب اَجرِ عظیم کی تفصیل ہوئی) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں قتلِ مؤمن پر سخت وعید فرمائی ہے، آگے یہ فرماتے ہیں کہ اَحکامِ شرعیہ کے جاری ہونے میں مؤمن کے مؤمن ہونے کے لئے صرف ظاہری اسلام کافی ہے، جو شخص اسلام کا اظہار کرے اس کے قتل سے ہاتھ روکنا واجب ہے، اور محض شک وشبہ کی وجہ سے باطن کی تفتیش کرنا اور اَحکامِ اسلامیہ کے جاری کرنے میں اس کے یقینی ایمان کے ثبوت کا منتظر رہنا جائز نہیں، جیسا بعض صحابہؓ سے بعض غزوات میں اس قسم کی لغزش واقع ہوئی کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، لیکن بعض حضراتِ صحابہؓ نے ان کی علاماتِ اسلام کو کذب پر محمول کر کے قتل کر ڈالا، اور مقتول کا مالِ غنیمت لے لیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا اِنسداد فرمایا، اور چونکہ اس وقت تک صحابہؓ کو یہ مسئلہ واضح طور پر معلوم نہ تھا اس لئے صرف فہمائش پر اِکتفا کیا، اور اس فعل پر اُن کے لئے کوئی وعید نازل نہیں فرمائی۔ (بیان القرآن)

مسلمان سمجھنے کے لئے علاماتِ اسلام کافی ہیں باطن کی تفتیش جائز نہیں

مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ بغیر تحقیق کے اس کے قول کو نفاق پر محمول کرے، اس آیت کے نزول کا سبب کچھ ایسے واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کرامؓ سے اس بارے میں لغزش ہوگئی تھی۔

چنانچہ ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قبیلۂ بنوسلیم کا ایک آدمی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ملا جبکہ یہ حضرات جہاد کے لئے جارہے تھے، یہ آدمی اپنی بکریاں چرا رہا تھا، اس نے حضراتِ صحابہؓ کو سلام کیا، جو عملاً اس چیز کا اِظہار تھا کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرامؓ نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان و مال بچانے کے لئے یہ فریب کیا ہے کہ مسلمانوں کی طرح سلام کر کے ہم سے بچ نکلے، چنانچہ انہوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اس کی بکریوں کو مالِ غنیمت قرار دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اِسلامی طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے، اور اس کے مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر حاصل نہ کرو۔ (ابن کثیر) [1]

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دُوسری روایت ہے جس کو بخاری نے مختصراً اور بزار نے مفصلاً

[1] جامع الترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورۃ النساء ج:۲ ص:۱۳۲، ومسند احمد رقم الحدیث:۲۵۰۶ مسند عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ مجاہدین کا بھیجا، جن میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بھی تھے، جب وہ موقع پر پہنچے تو سب لوگ بھاگ گئے، صرف ایک شخص رہ گیا، جس کے پاس بہت مال تھا، اس نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کہا: "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" مگر حضرت مقدادؓ نے یہ سمجھ کر کہ دِل سے نہیں کہا بلکہ محض جان و مال بچانے کے لئے کلمۂ اسلام پڑھ رہا ہے اس کو قتل کر دیا، حاضرین میں سے ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے بُرا کیا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی شہادت دی تھی، میں اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو اس واقعہ کا ذِکر کروں گا، جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا، آپ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو بلا کر سخت تنبیہ فرمائی، اور فرمایا کہ بروزِ قیامت تمہارا کیا جواب ہوگا جب کلمہ "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" تمہارے مقابلے میں دعوے دار ہوگا، اس واقعے پر یہ آیت نازل ہوئی: [1] وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔

مذکورہ آیت کے بارے میں ان دو واقعات کے علاوہ دُوسرے واقعات بھی منقول ہیں، لیکن محققین اہلِ تفسیر نے فرمایا کہ ان روایات میں تعارض نہیں ہوسکتا کہ یہ چند واقعات مجموعی حیثیت سے نزول کا سبب ہوئے ہوں۔

آیت کے الفاظ میں اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ ارشاد ہے، اس میں لفظ "سلام" سے اگر اِصطلاحی سلام مراد لیا جائے تب تو پہلا واقعہ اس کے ساتھ زیادہ چسپاں ہیں، اور اگر "سلام" کے لفظی معنی سلامت اور اِطاعت کے لئے جائیں تو یہ سب واقعات اس میں برابر ہیں، اسی لئے اکثر حضرات نے "سلام" کا ترجمہ اس جگہ "اِطاعت" کا کیا ہے۔

واقعہ کی تحقیق کے بغیر فیصلہ کرنا جائز نہیں

اس آیتؔ کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام بے تحقیق محض گمان پر نہ کریں، اِرشاد ہے: اِذَا ضَرَبْتُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا یعنی "جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو" محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے، اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذِکر کی گئی کہ یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے، یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دُوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے، ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اِقدام جائز نہیں، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: "سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔" (بحر محیط) [2]

دُوسرے جملہ یعنی تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں اسی روگ کی اِصلاح ہے، جو اس غلطی پر اِقدام کرنے کا باعث ہوا، یعنی دُنیا کی دولت مالِ غنیمت حاصل ہونے کا خیال۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا إلخ ج:۲ ص:۶۶۰۔ وتفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۳ ص:۲۳۷

[2] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۳ ص:۲۳۷

آگے یہ بھی بتلا دیا کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے اموالِ غنیمت بہت سے مقرّر اور مقدّر کر رکھے ہیں، تم اموال کی فکر میں نہ پڑو۔ اس کے بعد ایک اور تنبیہ فرمائی کہ ذرا اس پر بھی تو نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اِسلام و اِیمان کا اِعلان نہیں کر سکتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر اِحسان کیا کہ کفار کے نرغے سے نجات دے دی، تو اِسلام کا اِظہار کیا، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکرِ اِسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقۃً پہلے سے اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اِظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اِسلامی لشکر کو دیکھ کر اِظہار کیا، یا کہ شروع میں جب تم نے کلمۂ اِسلام کو پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہا تو اس وقت تمہیں مسلمان قرار دینے کے لئے شریعت نے یہ قید نہیں لگائی تھی کہ تمہارے دِلوں کو ٹٹولیں، اور دِل میں اِسلام کا ثبوت ملے تب تمہیں مسلمان قرار دیں، بلکہ صرف کلمۂ اِسلام پڑھ لینے کو تمہارے مسلمان قرار دینے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا، اسی طرح اب جو تمہارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے اس کو بھی مسلمان سمجھو۔

اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب

اس آیتِ کریمہ سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہو، خواہ کلمہ پڑھ کر یا کسی اور اسلامی شعار کا اِظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا اِنتظار نہ کریں کہ وہ دِل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اِسلام کا اِظہار کیا ہے۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہوگا، فرض کرلو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوّث ہے، پھر بھی اس کو اِسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اسی لئے اِمامِ اعظمؒ نے فرمایا: "لَا نُكَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ" یعنی "ہم اہلِ قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے۔" بعض روایاتِ حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو، خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بد عمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے، اس وقت تک اس کے اِقرارِ اِسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اِخلاص یا نفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔

لیکن جو شخص اِظہارِ اِسلام اور اِقرارِ ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلماتِ کفر بھی بکتا ہے، یا کسی بت کو سجدہ کرتا ہے، یا اِسلام کے کسی ایسے حکم کا اِنکار کرتا ہے جس کا اِسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے، یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا

ہے، جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا وغیرہ، وہ بلاشبہ اپنے اعمالِ کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائے گا، آیتِ مذکورہ میں لفظ "تَبَيَّنُوْا" سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ یہود ونصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مؤمن یا مسلمان کہتے تھے، اور مسیلمہ کذاب جس کو باجماعِ صحابہ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمۂ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے ساتھ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحبِ وحی کہتا تھا، جو نصوصِ قرآن وسنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بنا پر اس کو مرتد قرار دیا گیا، اور اس کے خلاف باجماعِ صحابہ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہوگیا کہ ہر کلمہ گو اہلِ قبلہ کو مسلمان سمجھو، اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے؟ اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہارِ ایمان کے ساتھ خلافِ ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو، بشرطیکہ اس کا خلافِ ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو، اور اس میں کوئی دُوسرے احتمال یا تأویل کی راہ نہ ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لفظ "کلمہ گو" یا "اہلِ قبلہ" یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعیٔ اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول وفعل کا مرتکب نہ ہو۔

جہاد سے متعلق چند احکام

دُوسری آیت یعنی لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں چند احکامِ جہاد کو بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ بغیر کسی معذوری کے شریکِ جہاد نہیں ہوتے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جو اللہ کی راہ میں اپنے جان ومال سے جہاد کرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو غیر مجاہدین پر درجہ میں فضیلت اور برتری دی ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق یعنی مجاہدین وغیر مجاہدین سے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہوا ہے، جنت ومغفرت دونوں کو حاصل ہوں گی، فرق درجات کا رہے گا۔

علمائے تفسیر نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے کہ بعض لوگ اس کو ادا کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہوجاتے ہیں، بشرطیکہ جو لوگ جہاد میں مشغول ہیں وہ اُس جہاد کے لئے کافی ہوں، اور اگر وہ کافی نہیں تو ان کے قرب وجوار کے مسلمانوں پر فرضِ عین ہوجائے گا کہ مجاہدین کی مدد کریں۔

فرضِ کفایہ کی تعریف

"فرضِ کفایہ" شریعت میں ایسے ہی فرائض کو کہا جاتا ہے جن کی ادائیگی ہر فردِ مسلم پر ضروری نہیں بلکہ بعض کا کرلینا کافی ہے، اور عموماً قومی اور اجتماعی کام اسی درجہ میں ہیں، علومِ دینیہ کی تعلیم وتبلیغ بھی ایسا ہی فرض ہے، کچھ لوگ اس میں

مشغول ہوں اور وہ کافی بھی ہوں تو دُوسرے مسلمان اس فریضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، لیکن جہاں کوئی بھی مشغول نہ ہو تو سب گنہگار رہوتے ہیں۔

نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین بھی ایک قومی چیز ہے کہ ایک بھائی اپنے دُوسرے مسلمان بھائی کا حق ادا کرتا ہے، اور اس کا حکم بھی یہی ہے۔ مساجد اور مدارس بنانا اور دُوسرے رفاہِ عامہ کے کام سرانجام دینا اسی حکم میں داخل ہیں، یعنی بعض مسلمان کرلیں تو باقی سبکدوش ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر وہ اَحکام جو اِجتماعی اور قومی ضرورتوں سے متعلق ہیں، ان کو شریعتِ اِسلام نے فرضِ کفایہ ہی قرار دیا ہے، تاکہ تقسیمِ عمل کے اُصول پر تمام فرائض کی ادائیگی ہوسکے، کچھ لوگ جہاد کا کام انجام دیں، کچھ تعلیم و تبلیغ کا، کچھ دُوسری اِسلامی یا اِنسانی ضروریات مہیا کرنے کا۔

اس آیت میں وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ فرما کر ان لوگوں کو بھی مطمئن فرمادیا ہے جو جہاد کے علاوہ دُوسری دِینی ضرورتوں میں مشغول ہیں، لیکن یہ حکم عام حالات میں ہے، جبکہ کچھ لوگوں کا جہاد اِسلام دُشمنوں کی مدافعت کے لئے کافی ہو، اور اگر ان کا جہاد کافی نہ رہے اور ان کو مزید کمک کی ضرورت ہو تو اوّل قرب و جوار کے مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے آس پاس کے لوگوں پر فرضِ عین ہوجاتا ہے، اور وہ بھی کافی نہ رہیں تو دُوسرے مسلمانوں پر یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس میں شریک ہو۔

تیسری آیت میں بھی انہی درجاتِ فضیلت کا بیان ہے جو مجاہدین کو دُوسروں پر حاصل ہیں۔

مسئلہ:- لنگڑے، لنجے، اندھے، بیمار اور دیگر معذورِ شرعی لوگوں پر جہاد فرض نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ

وہ لوگ کہ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ وہ بُرا کر رہے ہیں اپنا، کہتے ہیں ان سے فرشتے: تم کس حال میں تھے؟

قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً

وہ کہتے ہیں: ہم تھے بے بس اس ملک میں، کہتے ہیں فرشتے: کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ

فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں، سو ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور وہ بہت بُری جگہ پہنچے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً

مگر جو ہیں بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں میں سے جو نہیں کرسکتے کوئی تدبیر

وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ

اور نہ جانتے ہیں کہیں کا راستہ، سو ایسوں کو اُمید ہے کہ اللہ معاف کرے،

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ

اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا۔ اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پاوے گا

فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُھَاجِرًا

اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش، اور جو کوئی نکلے اپنے گھر سے ہجرت کرکے

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ

اللہ اور رسول کی طرف پھر آپکڑے اس کو موت تو مقرّر ہوچکا اس کا ثواب اللہ کے ہاں،

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۴

اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور اسی حالت میں فرشتے ان کی رُوح قبض کرنے آئے تو بولے: ’’تم

کس حالت میں تھے؟'' وہ کہنے لگے کہ ''ہم تو زمین میں بے بس بنا دیئے گئے تھے۔'' فرشتوں نے کہا: ''کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟'' لہٰذا ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ نہایت بُرا انجام ہے ﴿۹۷﴾ البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے (اس انجام سے مستثنیٰ ہیں) جو (ہجرت کی) کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور نہ (نکلنے کا) کوئی راستہ پاتے ہیں ﴿۹۸﴾ چنانچہ پوری اُمید ہے کہ اللہ ان کو معاف فرما دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا بہت بخشنے والا ہے ﴿۹۹﴾ اور جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور بڑی گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکلے، پھر اسے موت آ پکڑے، تب بھی اس کا ثواب اللہ کے پاس طے ہو چکا، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۰۰﴾

خلاصۂ تفسیر

بے شک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے (باوجود قدرت ہجرت کے پھر ہجرت کے تارک ہو کر) اپنے کو گنہگار کر رکھا تھا تو (اس وقت) وہ (فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دِین کے) کس (کس) کام میں تھے (یعنی دِین کے کیا کیا ضروری کام کیا کرتے تھے) وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنی بود و باش کی) سرزمین میں محض مغلوب تھے (اس لئے بہت سی ضروریاتِ دِین پر عمل نہ کر سکتے تھے، یعنی ان فرائض کے ترک میں معذور تھے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہ کر سکتے تھے تو) کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکِ وطن کر کے اس (سے کسی دُوسرے حصہ) میں چلا جانا چاہئے تھا (اور وہاں جا کر فرائض کو اَدا کر سکتے تھے، اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور جرم ان کا ثابت ہو جائے گا) سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور جانے کے لئے وہ بُری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے (واقع میں ہجرت پر بھی) قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ راستہ سے واقف ہیں، سو ان کے لئے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (جن لوگوں کے لئے ہجرت مشروع ہے ان میں سے) جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دِین کے لئے) ہجرت کرے گا تو اس کو رُوئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور (اِظہارِ دِین کی) بہت گنجائش (ملے گی، پس اگر ایسی جگہ پہنچ گیا تو دُنیا میں بھی اس سفر اور اِظہار سے کامیابی ظاہر ہے) اور (اگر اِتفاق سے یہ مذکور کامیابی نہ ہوئی تب بھی آخرت کی کامیابی میں تو کوئی تردّد نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ و رسول (کے دِین کے ظاہر کر سکنے کے موقع) کی طرف ہجرت کروں گا پھر (مقصد کے حاصل کرنے سے پہلے) اس کو موت آ پکڑے، تب بھی اس کا ثواب (جس کا وعدہ ہجرت

کرنے پر ہے) ثابت ہو گیا (جو وعدہ کی وجہ سے ایسا ہے جیسے) اللہ کے ذمہ (گو ابھی اس سفر کو ہجرت نہیں کہہ سکتے، لیکن صرف اچھی نیت سے اس کے شروع کر دینے پر پورا صلہ عطا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (اس ہجرت کی برکت سے گو وہ ناتمام رہے بہت سے گناہ معاف فرما دیں گے جیسا حدیث میں ہجرت کی فضیلت آئی ہے کہ ہجرت سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور) بڑے رحمت والے ہیں (کہ عمل کو اچھی نیت سے شروع کرنے ہی سے عمل کے پورا ہونے کے برابر ثواب عنایت فرماتے ہیں)۔

معارف و مسائل

"ہجرت" کی تعریف

ان چار آیتوں میں ہجرت کے فضائل، برکات اور اَحکام کا بیان ہے۔ لغت میں "ہجرت" ہجران اور ہجر کے معنی ہیں کسی چیز سے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ دینا، اور محاوراتِ عامہ میں "ہجرت" کا لفظ ترکِ وطن کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، اِصطلاحِ شرع میں دارُ الکفر کو چھوڑ کر دارُ الاسلام میں چلے جانے کو "ہجرت" کہتے ہیں۔ (رُوح المعانی) [1]

اور مُلّا علی قاریؒ نے شرحِ مشکوٰۃ میں فرمایا کہ کسی وطن کو دِینی وجوہ کی بنا پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے۔ (مرقاۃ) [2]

سورۂ حشر کی آیت نمبر ۸ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ اَمْوَالِھِمْ جو مہاجرین صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہونے والے مسلمان جو دارُ الکفر سے بیزاری کے سبب باختیارِ خود اس طرف آئے ہیں یا جن کو غیر مسلموں نے محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیا ہے، یہ سب لوگ شرعی معنی کے اِعتبار سے مہاجر ہیں، البتہ جو تجارتی ترقی یا ملازمت کی سہولتوں کی نیت سے منتقل ہوئے وہ شرعاً مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں۔

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

---

[1] روح المعانی، سورۃ النساء رقم الآیۃ ۸۹ ج:۴ ص:۱۷۳

[2] مرقاۃ، خطبۃ الکتاب ج:۱ ص:۱۰۹

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ [1]

''یعنی مہاجر وہ ہے جو اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔''

سواس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:-

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ [2]

''یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں۔''

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دُوسروں کو اِیذا نہ پہنچائے، اسی طرح سچا اور کامیاب مہاجر وہی ہے جو صرف ترکِ وطن کر کے فارغ نہ ہو جائے، بلکہ جتنی چیزیں شریعت نے حرام و ناجائز قرار دی ہیں ان سب کو بھی چھوڑ دے۔

اپنے دِل کو بھی بدل جامۂ اِحرام کے ساتھ

ہجرت کے فضائل

قرآنِ کریم میں جس طرح جہاد کے متعلق آیات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح ہجرت کا ذِکر بھی قرآنِ کریم کی اکثر سورتوں میں متعدّد مرتبہ آیا ہے، سب آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ ہجرت میں تین قسم کے مضامین ہیں، اوّل ہجرت کے فضائل، دُوسرے اس کی دُنیاوی اور اُخروی برکات، تیسرے باوجود قدرت کے دارُالکفر سے ہجرت نہ کرنے پر وعیدیں۔

پہلے مضمون یعنی ہجرت کے فضائل کی ایک آیت سورۂ بقرہ میں ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

''یعنی وہ جو اِیمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔''

دُوسری آیت سورۂ توبہ میں ہے:-

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون إلخ ج:۱ ص:۶

[2] بحوالۂ بالا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰

''یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد اِختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑے درجہ میں ہیں، اور یہی لوگ کامیاب بامراد ہیں۔''

اور تیسری آیت یہی سورۂ نساء کی ہے:-

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ

''یعنی جو شخص اللہ اور رسول کے لئے اپنے گھر سے بہ نیت ہجرت نکل کھڑا ہوا پھر اس کو راستہ ہی میں موت آگئی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہوگیا۔''

یہ آیت بعض روایات[1] کے مطابق حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہجرتِ حبشہ کے زمانہ میں نازل ہوئی، یہ مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی نیت پر نکلے تھے، راستہ میں ان کو سانپ نے کاٹ لیا، جس سے ان کی موت واقع ہوگئی، بہرحال ان تینوں آیتوں میں دارُ الکفر سے ہجرت کی ترغیب اور اس کے بڑے فضائل کا بیان واضح طور پر آگیا۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: "اَلْھِجْرَۃُ تَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَھَا" یعنی ''ہجرت ان سب گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔''[2]

ہجرت کی برکات

برکات کے متعلق سورۂ نحل کی ایک آیت میں اِرشاد ہے:-

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَـنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱ۙ

''یعنی جن لوگوں نے اللہ کے لئے ہجرت کی بعد اس کے کہ اُن پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دُنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش! یہ لوگ سمجھ لیتے۔''

---

[1] تفسیر ابن ابی حاتم تحت هٰذه الآية رقم الحديث:۵۹۲۳

[2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب كون الإسلام يهدم ما كان قبله وكذا الهجرة إلخ ج:۱ ص:۷۶

سورۂ نساء کی چار آیتیں جو اُوپر لکھی گئی ہیں ان میں سے چوتھی آیت کا بھی تقریباً یہی مضمون ہے، جس میں ارشاد ہے:-

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً

''یعنی جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ پائے گا زمین میں جگہ بہت اور کشائش۔''

آیت کا لفظ ''مُـرَاغَـمْ'' مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دُوسری زمین کی طرف منتقل ہونا، اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی ''مُرَاغَمْ'' کہہ دیا جاتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں ہجرت کی برکاتِ ظاہرہ وباطنہ کا بیان ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کے لئے ہجرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے دُنیا میں راہیں کھول دیتے ہیں اور اس کو دُنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیتے ہیں اور آخرت کے ثواب ودرجات تو وہم وگمان سے بالاتر ہیں۔

اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاہدؒ نے رزقِ حلال سے اور حسن بصریؒ نے عمدہ مکان سے، اور بعض دُوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزّت وشرف سے کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، چنانچہ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان، وطن کی عزّت وشرف سے زیادہ عزّت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عراقی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لئے اپنے وطن مصر کو چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر وطن ملک شام کا عطا فرمایا، اور پھر مصر بھی ان کو مل گیا، ہمارے آقا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اللہ ورسول کے لئے مکہ چھوڑا تو مہاجرین کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہوا، ہر طرح کی عزّت وغلبہ اور راحت وثروت عطا ہوئی، ہجرت کے ابتدائی دور میں چند روزہ تکلیف ومشقت کا اعتبار نہیں، اُس عبوری دور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں، اور ان کی کئی نسلوں میں جاری رہیں اسی کا اعتبار ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کے فقر وفاقہ کے جو واقعات تاریخ میں مشہور ہیں، وہ عموماً ہجرت کے ابتدائی دور کے ہیں، یا وہ فقرِ اختیاری کے ہیں کہ انہوں نے دُنیا ومال ودولت کو پسند ہی نہیں کیا، اور جو حاصل ہوا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیا، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حال یہی تھا کہ آپ کا فقر وفاقہ محض اختیاری تھا، آپ نے غنا ومال داری کو اختیار نہیں فرمایا، اور اس کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال میں فتحِ خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب

اہل وعیال کے گزارہ کا کافی انتظام ہوگیا تھا۔ اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سب کا یہی حال تھا کہ مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا تھا، لیکن اسلامی ضرورت پیش آنے پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا پورا مال لاکر پیش کردیا، اُمّ المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جو کچھ وظیفہ ملتا وہ سب فقراء ومساکین میں تقسیم کرکے خود فقیرانہ زندگی گزارتی تھیں، اسی وجہ سے ان کا لقب ''اُمّ المساکین'' ہوگیا تھا، اور اس کے باوجود اغنیا صحابہؓ جنہوں نے بڑی مقدار میں مال وجائیداد چھوڑی ان کی مقدار بھی صحابہ کرامؓ میں کم نہیں، بہت سے حضراتِ صحابہؓ ایسے بھی تھے جو اپنے وطن مکہ مکرمہ میں مفلس ونادار تھے، ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مال ودولت اور ہر طرح کی رفاہیت عطا فرمائی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایک صوبے کے والی بنادیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ اُتارا کرتے تھے، اور اپنے نفس کو خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ ابوہریرہ! تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا، اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی، اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو تو پیدل ان کے ساتھ چلے، اور جب وہ کسی منزل پر اُتریں تو تو ان کے لئے جلانے کی لکڑیاں چن کر لائے، آج اِسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا، تجھ کو اِمام اور اَمیر المؤمنین کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ مہاجرین کے لئے قرآن میں فرمایا ہے اس کو دُنیا نے پورا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، البتہ اسی آیت میں شرط یہ ہے کہ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ (النحل:۴۱) کے مصداق ہوں، دُنیا کے مال ودولت یا حکومت وسلطنت یا عزّت وجاہ کی طلب میں ہجرت نہ کی ہو، ورنہ صحیح بخاری کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو ان کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لئے ہے،[1] یعنی یہ صحیح ہجرت ہے، جس کے فضائل وبرکات قرآن میں مذکور ہیں، اور جس شخص نے کسی مال کی طلب یا کسی عورت کے نکاح کے خیال سے ہجرت کی ہو تو اس کی ہجرت کا معاوضہ وہی چیز ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

آج جو بعض مہاجرین پریشان حال ہیں یا تو ابھی وہ اُس عبوری دور میں ہیں جس میں اِبتدائی ہجرت کے وقت پریشانی پیش آیا کرتی ہے، یا پھر وہ صحیح معنی میں مہاجر نہیں، ان کو اپنی نیت اور حال کی اِصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہئے، نیت اور عمل کی اِصلاح کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی سچائی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب ما جاء ان الأعمال بالنية إلخ ج: ۱ ص:۱۳

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا

اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں کہ کچھ کم کرو

مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ

نماز میں سے اگر تم کو ڈر ہے کہ ستاویں گے تم کو کافر، البتہ کافر

كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ

تمہارے صریح دشمن ہیں۔ اور جب تو ان میں موجود ہو پھر نماز میں کھڑا کرے

فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا

تو چاہئے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ اور ساتھ لے لیویں اپنے ہتھیار، پھر جب یہ سجدہ کریں

فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا

تو ہٹ جاویں تیرے پاس سے اور آوے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ نماز پڑھیں

مَعَكَ وَ لْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

تیرے ساتھ اور ساتھ لیویں اپنا بچاؤ اور ہتھیار، کافر چاہتے ہیں

لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ؕ

کسی طرح تم بے خبر رہو اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی،

وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ

اور تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم کو تکلیف ہو مینہ سے تم بیمار ہو کہ

تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا

اُتار رکھو اپنے ہتھیار، اور ساتھ لے لو اپنا بچاؤ، بے شک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے عذاب

مُّهِيْنًا ۝۱۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ

ذلت کا۔ پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے،

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا

پھر جب خوف جاتا رہے تو دُرست کرو نماز کو، بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے

مَّوْقُوْتًا ۝۱۰۳ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاۗءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ

اپنے مقرّر وقتوں میں۔ اور ہمت نہ ہارو ان کا پیچھا کرنے سے، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی

يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ

بے آرام ہوتے ہیں جس طرح تم ہوتے ہو، اور تم کو اللہ سے اُمید ہے جو اُن کو نہیں،

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۰۴ ع (ركوع ۱۲ / ۱۵)

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب تم زمین میں سفر کرو اور تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ کافر لوگ تمہیں پریشان کریں گے، تو تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرلو۔ یقیناً کافر لوگ تمہارے کھلے دُشمن ہیں ۝۱۰۱ اور (اے پیغمبر!) جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور انہیں نماز پڑھاؤ تو (دُشمن سے مقابلے کے وقت اس کا طریقہ یہ ہے کہ) مسلمانوں کا ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے، اور اپنے ہتھیار ساتھ لے لے۔ پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور

دُوسرا گروہ جس نے ابھی تک نماز نہ پڑھی ہو آگے آجائے، اور وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھے، اور وہ اپنے ساتھ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لے۔ کافر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اِس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے ہتھیار اُتار کر رکھ دو، ہاں اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ لے لو۔ بیشک اللہ نے کافروں کے لئے ذِلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰۲﴾ پھر جب تم نماز پوری کر چکو تو اللہ کو (ہر حالت میں) یاد کرتے رہو، کھڑے بھی بیٹھے بھی، اور لیٹے ہوئے بھی۔ پھر جب تمہیں (دُشمن کی طرف سے) اِطمینان حاصل ہو جائے تو نماز قاعدے کے مطابق پڑھو۔ بیشک نماز مسلمانوں کے ذمے ایک ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے ﴿۱۰۳﴾ اور تم ان لوگوں (یعنی کافر دُشمن) کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دِکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو ان کو بھی اسی طرح تکلیف پہنچی ہے جیسے تمہیں پہنچی ہے، اور تم اللہ سے اُس بات کے اُمیدوار ہو جس کے وہ اُمیدوار نہیں۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک ﴿۱۰۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب تم زمین میں سفر کرو (جس کی مقدار تین منزل ہو) سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا (بلکہ ضروری ہے) کہ تم (ظہر اور عصر اور عشاء کے فرض) نماز (کی رکعات) کو کم کردو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو) اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے (اور اس اندیشہ کی وجہ سے ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلافِ مصلحت سمجھا جاوے، کیونکہ) بلاشبہ کافر لوگ تمہارے صریح دُشمن ہیں۔ اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں (اور اسی طرح آپ کے بعد جو اِمام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جائیں گے تو کوئی دُشمن موقع پا کر حملہ کر بیٹھے گا) تو (ایسی حالت میں) یوں چاہئے کہ (جماعت کے دو گروہ ہو جائیں پھر) ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑے ہو جائیں (اور دُوسرا گروہ نگہبانی کے لئے دُشمن کے مقابل کھڑا رہے تاکہ دُشمن کو دیکھتا رہے) اور وہ لوگ (جو آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہیں وہ بھی مختصر مختصر) ہتھیار لے لیں (یعنی نماز سے پہلے لے کر ہمراہ رکھیں شاید مقابلہ کی ضرورت پڑ جائے تو ہتھیار لینے میں دیر نہ لگے، فوراً قتال کرنے لگیں، گو نماز قتال سے ٹوٹ جائے گی، لیکن گناہ نہیں) پھر جب یہ لوگ (آپ کے ساتھ) سجدہ کر چکیں (یعنی ایک رکعت پوری کرلیں) تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے) تمہارے پیچھے ہو جاویں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور دُوسرے گروہ کے جو کہ اب نماز میں شامل ہوں گے جن کا بیان آگے آتا ہے، یہ پہلا گروہ ان سب کے پیچھے ہو جائے) اور دُوسرا گروہ جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی (یعنی شروع بھی نہیں کی وہ اس پہلے گروہ کی جگہ اِمام کے قریب) آجائے اور آپ کے ساتھ نماز (کی ایک رکعت جو باقی رہی ہے اس کو) پڑھ لیں اور یہ

لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لیں (اور سامان اور ہتھیار ہمراہ لینے کا اس لئے سب کو حکم کیا ہے کہ) کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو تم پر یکبارگی حملہ کر بیٹھیں، (سو ایسی حالت میں اِحتیاط ضروری ہے) اور اگر تم کو بارش (وغیرہ) کی وجہ سے (ہتھیار لے کر چلنے میں) تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اور اس وجہ سے ہتھیار باندھ نہیں سکتے) تو تم کو اس میں (بھی) کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اُتار رکھو اور (پھر بھی) اپنا بچاؤ (ضرور) لے لو، (اور یہ خیال نہ کرو کہ کفار کی دُشمنی کا صرف دُنیا ہی میں علاج کیا گیا ہے بلکہ آخرت میں اس سے بڑھ کر ان کا علاج ہوگا کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزائے اہانت آمیز مہیا کر رکھی ہے، پھر جب تم نماز (خوف) کو اَدا کر چکو تو (بدستور) اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی (یعنی ہر حالت میں حتیٰ کہ عین لڑائی کے وقت بھی اللہ کا ذِکر جاری رکھو دِل سے بھی اور اَحکامِ شرعیہ کے اِتباع سے بھی کہ وہ بھی ذِکر میں داخل ہے، لڑائی میں خلافِ شرعی کوئی کارروائی کرنے سے پرہیز کرو، غرض نماز تو ختم ہوگئی ذِکر ختم نہیں ہوتا، سفر یا خوف کی وجہ سے نماز میں تو تخفیف ہوگئی تھی، لیکن ذِکر اپنی حالت پر ہی ہے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ (یعنی سفر ختم کر کے مقیم ہو جاؤ اور اسی طرح خوف کے ختم ہونے کے بعد بے خوف ہو جاؤ) تو نماز کو (اصلی) قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو (یعنی قصر اور نماز میں مشی وغیرہ چھوڑ دو، کیونکہ وہ بوجہ عارض کے جائز رکھا گیا تھا) یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے (پس فرض ہونے کی وجہ سے ادا کرنا ضرور اور وقت کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے وقت ہی میں ادا کرنا ضرور ہوا، اس لئے کچھ کچھ اس کی شکل وصورت میں تبدیلی کر دی گئی، ورنہ نماز کی صورتِ مقصودہ وہی اصلی صورت ہے، پس سبب کے ختم ہونے کے بعد نماز کی اصلی صورت کی حفاظت لازم ہوگئی) اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں (جبکہ اس کی ضرورت ہے) اگر تم (زخموں سے) تکلیف میں مبتلا ہو تو (کیا ہوا) وہ بھی تو درد میں مبتلا ہیں جیسے تم درد میں مبتلا ہو (تو وہ تم سے زیادہ قوت نہیں رکھتے پھر کاہے کو ڈرتے ہو) اور (تم میں ایک زیادتی ان سے یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی چیزوں کی اُمید رکھتے ہو کہ وہ لوگ (ان کی) اُمید نہیں رکھتے (یعنی ثواب، تو دِل کی قوت میں تم زیادہ ہوئے، اور ضعفِ بدن میں ایک جیسے، تو تم کو زیادہ چست ہونا چاہئے) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (ان کو کفار کا کمزور دِل اور کمزور بدن معلوم ہے) بڑے حکمت والے ہیں (تمہاری قوّتِ برداشت سے زیادہ حکم نہیں فرمایا)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات

اُوپر جہاد اور ہجرت کا ذِکر تھا، چونکہ غالب اَحوال میں جہاد اور ہجرت کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے اور ایسے سفر میں

مخالف کی طرف سے اندیشہ بھی اکثر ہوتا ہے، اس لئے سفر اور خوف کی رعایت سے جو نماز میں بعض خاص سہولتیں اور تخفیفیں کی گئی ہیں آگے ان کا ذکر فرماتے ہیں۔

سفر اور قصر کے اَحکام

مسئلہ:- جو سفر تین منزل سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے۔

مسئلہ:- اور جب سفر ختم کر کے منزل پر جا پہنچے تو اگر وہاں پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کا اِرادہ ہو تب تو وہ حکمِ سفر میں ہے، فرض نماز چارگانہ آدھی پڑھی جائے گی، اور اس کو ''قصر'' کہتے ہیں، اور اگر پندرہ روز یا زیادہ کا رہنے کا ایک ہی بستی میں اِرادہ ہو، تو وہ وطنِ اِقامت ہو جائے گا، وہاں بھی وطنِ اصلی کی طرح قصر نہیں ہوگا، بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔

مسئلہ:- قصر صرف تین وقت کے فرائض میں ہے، اور مغرب اور فجر میں اور سنن و وتر میں نہیں ہے۔

مسئلہ:- سفر میں خوف نہ ہو تو بھی قصر نماز پڑھی جائے گی۔

مسئلہ:- بعض لوگوں کو پوری نماز کی جگہ قصر پڑھنے میں دِل میں گناہ کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ قصر بھی شریعت کا حکم ہے جس کی تعمیل پر گناہ نہیں ہوتا، بلکہ ثواب ملتا ہے۔

مسئلہ:- آیت میں ہے: وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (یعنی جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں) اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اب صلوٰۃِ خوف کا حکم باقی نہیں رہا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات اب ہم میں موجود نہیں، اس لئے کہ یہ شرط اس وقت کے اِعتبار سے بیان کی گئی ہے، کیونکہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی دُوسرا آدمی بلاعذر کے اِمام نہیں بن سکتا، آپ کے بعد اَب جو اِمام ہو وہی آپ کے قائم مقام ہے، اور وہی صلوٰۃِ خوف پڑھائے گا، تمام اَئمہ کے نزدیک صلوٰۃِ خوف کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جاری ہے منسوخ نہیں ہوا۔

مسئلہ:- جیسے آدمی سے خوف کے وقت صلوٰۃِ خوف پڑھنا جائز ہے، ایسے ہی اگر کسی شیر یا اژدہے وغیرہ کا خوف ہو اور نماز کا وقت تنگ ہو اس وقت بھی جائز ہے۔

مسئلہ:- آیت میں دونوں گروہ کے ایک ایک رکعت پڑھنے کا تو ذِکر فرمایا، دُوسری رکعت کا طریقہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو دونوں گروہ نے اپنی ایک ایک رکعت بطورِ خود پڑھ لی، مزید تفصیل احادیث میں ہے۔[1]

---

[1] صحیح البخاری، ابواب صلاۃ الخوف ج:۱ ص:۱۲۹، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورۃ النساء ج:۲ ص:۱۳۳

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ

بے شک ہم نے اُتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو کچھ سمجھاوے تجھ کو اللہ،

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝۱۰۵ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا

اور تو مت ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔ اور بخشش مانگ اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمًا ۝۱۰۶ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

مہربان ہے۔ اور مت جھگڑ ان کی طرف سے جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں، اللہ کو

لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝۱۰۷ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ

پسند نہیں جو کوئی ہو دغاباز گنہگار۔ شرماتے ہیں لوگوں سے اور نہیں شرماتے

مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ

اللہ سے، اور وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ مشورہ کرتے ہیں رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں،

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝۱۰۸ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ

اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے۔ سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ

دُنیا کی زندگی میں، پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے دن یا کون ہوگا

عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝۱۰۹ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

ان کا کارساز۔ اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا بُرا کرے پھر اللہ سے بخشوائے

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ

تو پاوے اللہ کو بخشنے والا مہربان۔ اور جو کوئی کرے گناہ سو کرتا ہے

عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً

اپنے ہی حق میں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور جو کوئی کرے خطا

اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع

یا گناہ پھر تہمت لگاوے کسی بے گناہ پر اس نے اپنے سر دھرا طوفان اور گناہ صریح۔

وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ

اور اگر نہ ہوتا تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر ہی چکی تھی ان میں ایک جماعت کہ تجھ کو بہکادیں،

وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور بہکا نہیں سکتے مگر اپنے آپ کو اور تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور اللہ نے اُتاری

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ

تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا، اور اللہ کا فضل

عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

تجھ پر بہت بڑا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک ہم نے حق پر مشتمل کتاب تم پر اس لئے اُتاری ہے تا کہ تم لوگوں کے درمیان اس طریقے کے مطابق فیصلہ

کرو جو اللہ نے تم کو سمجھا دیا ہے، اور تم خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ بنو ⑩۵ اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ⑩۶ اور کسی تنازعے میں ان لوگوں کی وکالت نہ کرنا جو خود اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں۔ اللہ کسی بھی خیانت کرنے والے گنہگار کو پسند نہیں کرتا ⑩۷ یہ لوگوں سے تو شرماتے ہیں، اور اللہ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ اس وقت بھی ان کے پاس ہوتا ہے جب وہ راتوں کو ایسی باتیں کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں۔ اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ نے اس سب کا اِحاطہ کر رکھا ہے ⑩۸ ارے تمہاری بساط یہی تو ہے کہ تم نے دُنیوی زندگی میں لوگوں سے جھگڑ کر ان (خیانت کرنے والوں) کی حمایت کر لی! بھلا اس کے بعد قیامت کے دن اللہ سے جھگڑ کر کون ان کی حمایت کرے گا، یا کون ان کا وکیل بنے گا؟ ⑩۹ اور جو شخص کوئی بُرا کام کر گزرے یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے، پھر اللہ سے معافی مانگ لے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، بڑا مہربان پائے گا ⑪۰ اور جو شخص کوئی گناہ کمائے، تو وہ اس کمائی سے خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور اللہ پورا علم بھی رکھتا ہے، حکمت کا بھی مالک ہے ⑪۱ اور اگر کوئی شخص کسی غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو، پھر اس کا اِلزام کسی بے گناہ کے ذمے لگا دے، تو وہ بڑا بھاری بہتان اور کھلا گناہ اپنے اُوپر لاد لیتا ہے۔ ⑪۲ اور (اے پیغمبر!) اگر اللہ کا فضل اور رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تم کو سیدھی راہ سے بھٹکانے کا اِرادہ کر ہی لیا تھا۔ اور (درحقیقت) یہ اپنے سوا کسی کو نہیں بھٹکا رہے ہیں، اور یہ تم کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو ان باتوں کا علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے، اور تم پر اللہ کا فضل ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے۔ ⑪۳

خلاصۂ تفسیر

بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی (جس سے) واقع کے موافق (حال معلوم ہوگا) تاکہ آپ (اس واقعہ میں) ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعہ سے) آپ کو (اصل حال) بتلا دیا ہے (وہ وحی یہ ہے کہ واقع میں بشیر چور ہے، اور قبیلہ بنواُبیرق جو اس کے حامی ہیں کاذب ہیں) اور (جب اصل حال معلوم ہوگیا تو) آپ ان خائنوں کی طرف داری کی بات نہ کیجئے (جیسا بنواُبیرق کی اصل خواہش یہی تھی، چنانچہ دُوسرے رُکوع میں آتا ہے: لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ مگر آپ نے ایسا کیا نہ تھا، خود اسی جملہ سے آپ کا اس پر عمل نہ کرنا بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ فضلِ الٰہی نے غلطی سے بچالیا، جس میں ہر غلطی کی نفی ہوگئی اور منع فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فعل ماضی میں واقع ہو چکا ہو، بلکہ اصل فائدہ منع کا یہ ہے کہ آئندہ کے لئے حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے اس کے کرنے سے روکتے ہیں، پس آپ کی حالت اور نہی کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوگا کہ جیسے اب تک طرف داری نہیں کی آئندہ بھی نہ کیجئے، اور یہ انتظامات بھی مکمل نبی کو معصوم رکھنے کے لئے ہیں، اور آیت میں سب کو خائن کہا، حالانکہ خائن سب

نہ تھے، اس لئے کہ جو لوگ خائن نہ تھے وہ بھی خائن کی اعانت کر رہے تھے اس لئے وہ خائن ٹھہرے) اور (لوگوں کے کہنے سے حسنِ ظن کے طور پر آپ نے جو بنو اُبیرق کو دِین دار سمجھ لیا ہے، گو ایسا سمجھنا گناہ تو نہیں، لیکن چونکہ اس میں یہ احتمال تھا کہ آپ کے اتنا فرما دینے سے اہلِ حق اپنا حق چھوڑ دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت رفاعہؓ خاموش ہو کر بیٹھ رہے، لہٰذا یہ کام نامناسب ہوا، اس لئے اس سے) آپ اِستغفار فرمایئے (کہ آپ کی شان عظیم ہے اتنا امر بھی آپ کے لئے قابلِ اِستغفار ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحمت والے ہیں، اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے (جیسا وہ لوگ آپ سے چاہتے تھے) جو کہ (لوگوں کی خیانت اور نقصان کر کے باعتبار وبال وضرر کے درحقیقت) اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے (بلکہ اس کو مبغوض رکھتے ہیں) جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنے والا ہو (جیسا کہ تھوڑے خیانت کرنے والے کو بھی محبوب نہیں رکھتے، لیکن چونکہ بشیر کا بڑا خائن ہونا بتلانا مقصود ہے، اس لئے یہ صیغہ مبالغہ کا لایا گیا) جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ (اپنی خیانت کو) آدمیوں سے تو (شرما کر) چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ (مثل ہر وقت کے) اس وقت (بھی) ان کے پاس ہے جبکہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو کے متعلق تدبیریں کیا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے (علمی) اِحاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہاں (جو بشیر وغیرہ کی حمایت میں بعض اہلِ محلّہ جمع ہو کر آئے تھے وہ سن لیں کہ) تم ایسے ہو کہ تم نے دُنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں سو (یہ بتلاؤ کہ) خدا تعالیٰ کے رُوبرو قیامت کے دن ان کی طرف سے کون جواب دہی کرے گا، یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا (یعنی نہ کوئی زبانی جواب دہی کر سکے گا نہ کوئی عملی دُرستی مقدمہ کی کر سکے گا) اور (یہ خائنین اگر اب بھی توبہ موافق قاعدۂ شرعیہ کے کر لیتے تو معافی ہو جاتی، کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) جو شخص کوئی (متعدی) بُرائی کرے یا (صرف) اپنی جان کا ضرر کرے (یعنی ایسا گناہ نہ کرے جس کا اثر دُوسروں تک پہنچتا ہو اور) پھر اللہ تعالیٰ سے (حسبِ قاعدۂ شرعیہ) معافی چاہے (جس میں بندوں کے حقوق کو اَدا کرنا یا اُن سے معاف کرانا بھی داخل ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا پائے گا اور (ضرور گنہگاروں کو اس کی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ) جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات ہی کے لئے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (سب کے گناہوں کی ان کو خبر ہے) بڑے حکمت والے ہیں (مناسب سزا تجویز فرماتے ہیں) اور (یہ تو خود گناہ کرنے کا اَنجام ہوا، اور جو کہ دُوسروں پر تہمت لگا دے اس کا حال سنو کہ) جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ پھر (بجائے اس کے کہ خود ہی توبہ کر لینا چاہئے تھی اس نے یہ کام کیا کہ) اس (گناہ) کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دی، سو اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ اپنے (سر کے) اُوپر لاد لیا (جیسا بشیر نے کیا کہ خود تو چوری کی اور ایک نیک بخت بزرگ آدمی لبید کے ذمہ چوری کی تہمت رکھ دی) اور اگر (اس مقدمہ میں) آپ پر (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا

فضل اور رحمت نہ ہو (جو کہ ہمیشہ آپ پر رہتا ہے) تو ان (چالاک) لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا اِرادہ کرلیا تھا (لیکن خدا کے فضل سے ان کی رنگ آمیز باتوں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آئندہ بھی نہ ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں) اور وہ (کبھی آپ کو) غلطی میں نہیں ڈال سکتے، لیکن (اس اِرادہ سے) اپنی جانوں کو (مبتلائے گناہ اور عذاب کے اہل بنا رہے ہیں) اور آپ کو ذرّہ برابر (اس قسم کا) ضرر نہیں پہنچا سکتے اور (آپ کو غلطی سے ضرر پہنچانا کب ممکن ہے جبکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں (جس کے ایک حصہ میں اس قصہ کی اِطلاع بھی دے دی) اور آپ کو وہ وہ (مفید اور عالی) باتیں بتلائی ہیں جو آپ (پہلے سے) نہ جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

اُوپر ظاہری کفار کے معاملات کے ضمن میں چند جگہ منافقین کا ذِکر آیا ہے کہ کفر دونوں میں یکساں ہیں، آگے بھی بعض منافقین کے ایک خاص قصہ کے متعلق مضمون مذکور ہوتا ہے۔ (بیان القرآن) [1]

آیات کا شانِ نزول

مذکورہ سات آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، لیکن عام قرآنی اُسلوب کے مطابق جو ہدایات اس سلسلے میں دِی گئیں وہ مخصوص اس واقعہ کے ساتھ نہیں بلکہ تمام موجودہ اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لئے عام اور بہت اُصولی اور فروعی مسائل پر مشتمل ہیں۔

پہلے واقعہ معلوم کیجئے، پھر اس سے متعلقہ ہدایات اور ان سے نکلنے والے مسائل پر غور کیجئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ میں ایک خاندان ''بنواُبیرق'' کے نام سے معروف تھا، ان میں سے ایک شخص جس کا نام ترمذیؒ اور [2] حاکمؒ کی روایت میں ''بشیر'' ذِکر کیا گیا ہے، اور بغویؒ اور [3] ابنِ جریرؒ کی روایت میں ''طعمہ'' نام بتلایا گیا ہے، اس نے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں نقب لگا کر چوری کرلی۔

ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ شخص درحقیقت منافق تھا، مدینہ میں رہتے ہوئے بھی صحابہ کرامؓ کی توہین میں

[1] بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۵۴

[2] مستدرك للحاكم رقم الحدیث:۸۲۷۸، وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة النساء ج:۲ ص:۱۳۳

[3] تفسیر الطبری تحت هذه الآیة رقم الحدیث:۱۰۴۱۲، وتفسیر البغوی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۲۸۴

اَشعار لکھ کر دُوسروں کے ناموں سے ان کی اِشاعت کیا کرتا تھا۔

اور چوری کی صورت یہ ہوئی کہ ہجرت کے اِبتدائی زمانہ میں عام مسلمان فقر و فاقہ کے ساتھ تنگی سے بسر اوقات کرتے تھے، اور ان کی عام خوراک جو کا آٹا تھا، یا کھجوریں، یا گیہوں کا آٹا جو بہت کم میسر تھا، اور مدینہ میں ملتا بھی نہ تھا۔ ملکِ شام سے جب آتا تو کچھ لوگ مہمانوں کے لئے یا کسی خاص ضرورت کے لئے خرید لیا کرتے تھے۔ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کچھ گیہوں کا آٹا خرید کر ایک بوری میں اپنے لئے رکھ لیا، اسی میں کچھ اسلحہ وغیرہ بھی رکھ کر ایک چھوٹی کوٹھڑی میں محفوظ کر دیا۔ ابن اُبیرق، بشیر، یا طعمہ نے اس کو بھانپ لیا، تو نقب لگا کر یہ بوری نکال لی، حضرت رفاعہؓ نے جب صبح کو یہ ماجرا دیکھا تو اپنے بھتیجے قتادہؓ کے پاس آئے اور واقعہ چوری کا ذِکر کیا، سب نے مل کر محلّہ میں تفتیش شروع کی، بعض لوگوں نے بتایا کہ آج رات ہم نے دیکھا کہ بنواُبیرق کے گھر میں آگ روشن تھی، ہمارا خیال ہے کہ وہی کھانا پکایا گیا ہے، بنواُبیرق کو جب راز فاش ہونے کی خبر ملی تو خود آئے اور کہا کہ یہ کام لبید بن سہلؓ کا ہے، حضرت لبید رضی اللہ عنہ کو سب جانتے تھے کہ مخلص مسلمان اور نیک بزرگ ہیں، ان کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ تلوار کھینچ کر آئے اور کہا کہ چوری میرے سر لگاتے ہو اَب میں تلوار اس وقت تک میان میں نہ رکھوں گا جب تک چوری کی حقیقت واضح نہ ہو جائے۔

بنواُبیرق نے آہستہ سے کہا کہ آپ بے فکر رہیں، آپ کا نام کوئی نہیں لیتا، نہ آپ کا یہ کام ہو سکتا ہے۔ بغویؒ اور ابن جریرؒ کی روایت میں اس جگہ یہ ہے کہ بنواُبیرق نے چوری ایک یہودی کے نام لگائی اور ہوشیاری یہ کی کہ آٹے کی بوری کو تھوڑا سا پھاڑ دیا تھا، جس سے آٹا گرتا رہا اور رفاعہ کے مکان سے یہودی مذکور کے مکان تک اس آٹے کے آثار پائے گئے، شہرت ہونے کے بعد چوری کیا ہوا اسلحہ اور زِرہیں بھی اسی یہودی کے پاس رکھوا دیں، اور تحقیق کے وقت اسی کے گھر سے برآمد ہوئیں، یہودی نے قسم کھائی کہ زرہیں مجھے ابن اُبیرق نے دِی ہیں۔

ترمذی کی روایت اور بغوی کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ بنواُبیرق نے اوّلاً چوری کو لبید بن سہلؓ کے نام لگایا ہو، پھر جب بات بنتی نظر نہ آئی تو اس یہودی کے سر ڈالا ہو، بہر حال اب معاملہ یہودی اور بنواُبیرق کا بن گیا۔

اُدھر حضرت قتادہ اور رفاعہ رضی اللہ عنہما کو مختلف صورتوں سے یہ گمان غالب ہو گیا تھا کہ یہ کارروائی بنواُبیرق کی ہے، حضرت قتادہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا واقعہ اور بسلسلۂ تفتیش بنواُبیرق پر گمان غالب کا ذِکر کر دیا۔ بنواُبیرق کو خبر ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت رفاعہؓ اور قتادہؓ کی شکایت کی، کہ بلا ثبوتِ شرعی چوری ہمارے نام لگا رہے ہیں، حالانکہ مسروقہ مال یہودی کے گھر سے برآمد ہوا ہے، آپ اُن کو روکئے کہ ہمارے نام نہ لگائیں، یہودی پر دعویٰ کریں۔

ظاہری حالات و آثار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اسی طرف رُجحان ہو گیا کہ یہ کام یہودی کا ہے،

بنواُبیرق پر اِلزام صحیح نہیں، یہاں تک کہ بغویؒ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرادہ ہوگیا کہ یہودی پر چوری کی سزا جاری کردی جائے اوراس کا ہاتھ کاٹا جائے۔[۱]

ادھر جب حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا کہ آپ بغیر دلیل اور ثبوت کے ایک مسلمان گھرانے پر چوری کا اِلزام لگارہے ہیں، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس معاملہ سے بہت رنجیدہ ہوئے، اور افسوس کیا کہ کاش میں اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات نہ کرتا، اگرچہ میرا مال بھی جاتا رہتا۔ اسی طرح حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اِرشاد فرمایا تو انہوں نے صبر کیا اور کہا: "وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ"۔

اس معاملہ پر کچھ وقت نہ گزرا تھا کہ قرآنِ کریم کا ایک پورا رُکوع اس بارے میں نازل ہوگیا جس کے ذریعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعہ کی حقیقت منکشف کردی گئی اور ایسے معاملات کے متعلق عام ہدایات دی گئیں۔

قرآنِ کریم نے بنواُبیرق کی چوری کھول دی اور یہودی کو بَری کردیا، تو بنواُبیرق مجبور ہوئے اور مالِ مسروقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا، آپ نے رفاعہ رضی اللہ عنہ کو واپس دِلایا، اور انہوں نے سب اسلحہ کو جہاد کے لئے وقف کردیا۔ ادھر جب بنواُبیرق کی چوری کھل گئی تو بشیر بن اُبیرق مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا، اگر وہ پہلے سے منافق تھا تو اَب کھلا کافر ہوگیا، اور اگر پہلے مسلمان تھا تو اَب مرتد ہوگیا۔

تفسیر ''بحرِ محیط'' میں ہے کہ اللہ اور رسول کی مخالفت کے وبال نے بشیر بن اُبیریق کو مکہ میں بھی چین سے نہ رہنے دیا، جس عورت کے مکان پر جاکر ٹھہرا تھا، اس کو واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے نکال باہر کیا، اسی طرح پھرتے پھرتے آخر اس نے ایک اور شخص کے مکان میں نقب لگائی، تو دِیوار اس کے اُوپر گرگئی، اور وہیں دَب کر مرگیا۔[۲]

یہاں تک تو واقعہ کی پوری تفصیل تھی، اب اس کے متعلق قرآنی ارشادات پر غور کیجئے:-

پہلی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چوری کے واقعہ کی اصل حقیقت بتلاکر اِرشاد فرمایا کہ ہم نے آپ پر قرآن اور وحی اس لئے نازل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو علم ومعرفت آپ کو عطا فرمایا ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں، اور خائنوں کی یعنی بنواُبیرق کی طرف داری نہ کریں۔ اور اگرچہ ظاہری حالات اور قرائن کی بنا پر چوری کے معاملہ میں یہودی کی طرف آپ کا رُجحان کوئی گناہ نہ تھا، مگر تھا تو واقعہ کے خلاف، اس لئے دُوسری آیت میں آپ کو اِستغفار کا حکم دیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت بلند ہے، ان سے اتنی بات بھی پسند نہیں۔

---

[۱] تفسیر البغوی تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۲۸۳

[۲] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۴ ص:۲۵۷

تیسری آیت (یعنی آیت:۱۰۷) میں پھر اس کی تاکید فرمائی کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے آپ کوئی جواب دہی نہ کریں، کیونکہ وہ اللہ کو پسند نہیں۔

چوتھی آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۸) میں ان خیانت کرنے والوں کے بُرے حال اور بیوقوفی کا بیان ہے کہ یہ لوگ اپنے ہی جیسے آدمیوں سے تو شرماتے اور چوری کو چھپاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے، اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ خصوصاً اس واقعہ کو جب انہوں نے باہم مشورہ کر کے یہ رائے قائم کی کہ الزام یہودی پر لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفاعہؓ اور قتادہؓ کی شکایت کرو کہ بلا وجہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں، اور آپ سے اس کی درخواست کرو کہ آپ یہودی کے مقابلہ میں ہماری حمایت فرمائیں۔

پانچویں آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۹) میں بنواُبیرق کی مدد کرنے والے حمائیتیوں کو تنبیہ فرمائی گئی کہ دُنیا میں تو تم نے ان کی حمایت کر لی، مگر معاملہ یہیں تو ختم نہیں ہو جاتا، قیامت میں جب حق سبحانہ وتعالیٰ کی عدالت میں معاملہ پیش ہوگا وہاں کون حمایت کرے گا؟ اس آیت میں ان کو ملامت بھی ہے اور آخرت کا خوف دِلا کر اپنے فعل سے توبہ اور رُجوع کی ترغیب بھی۔

چھٹی آیت (یعنی نمبر ۱۱۰) میں قرآنِ کریم کے عام اُسلوبِ حکیمانہ کے مطابق مجرموں، گناہگاروں کو نااُمیدی سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، جب گنہگار اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو غفور ورحیم پاتا ہے، اس میں اُن لوگوں کو جن سے یہ گناہ سرزد ہوا تھا اس کی ترغیب ہے کہ اب بھی باز آجائیں، اور دِل سے توبہ کر لیں تو کچھ نہیں بگڑا، اللہ تعالیٰ سب معاف فرمائیں گے۔

ساتویں آیتؔ (یعنی ۱۱۱) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اگر یہ لوگ اب بھی تائب نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول یا مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اس کا وبال خود اسی شخص پر ہے۔

آٹھویں آیت (یعنی ۱۱۲) میں ایک عام ضابطہ کی صورت اِرشاد فرمایا کہ جو شخص خود کوئی جرم کرے اور پھر یہ جرم کسی بےقصور اِنسان کے ذمہ لگائے (جیسا کہ اس واقعے میں بنواُبیرق نے چوری خود کی اور اِلزام حضرت لبیدؓ یا یہودی پر لگا دیا) تو اس نے بہت بڑا بہتان اور صریح گناہ اپنے اُوپر لا دلیا۔

نویں آیت (یعنی نمبر ۱۱۳) میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل ورحمت آپ کے ساتھ نہ ہوتی جس نے بذریعہ وحی آپ کو واقعہ کی حقیقت بتلا دی تو یہ لوگ آپ کو غلطی میں مبتلا کر دیتے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ورحمت آپ کے ساتھ ہے، اس لئے وہ ہرگز آپ کو غلطی میں نہیں ڈال سکتے، بلکہ خود ہی گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں، اور آپ کو یہ ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور دانش مندی کی باتیں

نازل فرمائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ الخ اس آیت سے پانچ مسائل ثابت ہوئے، ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مسائل میں جن میں قرآنِ کریم کی کوئی نصِ صریح وارِد نہ ہو اپنی رائے سے اِجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا، اور مہمات کے فیصلوں میں آپ بہت سے فیصلے اپنے اِجتہاد سے بھی فرماتے تھے۔

دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِجتہاد رائے وہی معتبر ہے جو قرآنی اُصول اور نصوص سے مأخوذ ہو، خالص رائے اور خیال معتبر نہیں، اور نہ اس کو شریعت میں اِجتہاد کہا جاسکتا ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِجتہاد دُوسرے ائمۂ مجتہدین کی طرح نہ تھا، جس میں غلطی اور خطا کا اِحتمال ہمیشہ باقی رہتا ہے، بلکہ جب آپ کوئی فیصلہ اپنے اِجتہاد سے فرماتے تو اگر اس میں کوئی غلطی ہوجاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ کو متنبہ فرما کر آپ کے فیصلہ کو صحیح اور حق کے مطابق کرادیتے تھے، اور جب آپ نے کوئی فیصلہ اپنے اِجتہاد سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی چیز نہ آئی تو یہ علامت اس کی تھی کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو پسند اور اس کے نزدیک صحیح ہے۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ قرآن سے سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا سمجھایا ہوا ہوتا تھا، اس میں غلط فہمی کا اِمکان نہ تھا، بخلاف دُوسرے علماء و مجتہدین کے کہ ان کا سمجھا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا ہے، جیسا کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وارِد ہے، اسی وجہ سے جب ایک شخص نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ "فَاحْكُمْ بِمَا اَرَاكَ اللهُ"، تو آپ نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جھوٹے مقدمہ اور جھوٹے دعویٰ کی پیروی یا وکالت کرنا یا اس کی تائید وحمایت کرنا سب حرام ہے۔

توبہ کی حقیقت

اور آیت نمبر ۱۱۰ یعنی وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ الخ سے یہ معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی، یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے، ہر قسم کا گناہ توبہ و اِستغفار سے معاف ہوسکتا ہے، البتہ توبہ و اِستغفار کی حقیقت جاننا ضروری ہے، محض زبان سے "اَسْتَغْفِرُ اللهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ" کہنے کا نام توبہ و اِستغفار نہیں ہے، اسی لئے علماء کا اس پر

اتفاق ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہے اس پر اس کو ندامت بھی نہیں، اور اس کو چھوڑا بھی نہیں، یا آئندہ کے لئے چھوڑنے کا عزم نہیں کیا، اور اس حالت میں زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے تو یہ توبہ کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کے لئے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں: ایک گزشتہ گناہوں پر نادم ہونا، دُوسرے جس گناہ میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا، اور تیسرے آئندہ کے لئے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے ان کو انہی سے معاف کرانا، یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔

اپنے گناہ کا اِلزام دُوسرے پر لگانا دُگنے عذاب کا سبب ہے

اور آیت نمبر ۱۱۲ یعنی وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ الخ سے معلوم ہوا کہ جو شخص گناہ خود کرے اور اس کا اِلزام دُوسرے بے گناہ آدمی پر لگادے، تو اس نے اپنے گناہ کو دُگنا اور نہایت سخت کر دیا، اور عذابِ شدید کا مستحق ہوگیا، ایک تو خود اصل گناہ کا عذاب، دُوسرے اِفترا اور بہتان کا شدید عذاب۔

قرآن وسنت کی حقیقت

آیت نمبر ۱۱۳ یعنی وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ الخ میں کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی داخل فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حکمت جو نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیمات کا، یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کی ہوئی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، اسی لئے داخلِ قرآن نہیں، اور معانی اس کے اور قرآن کے دونوں اللہ ہی کی جانب سے ہیں، اس لئے دونوں پر عمل کرنا واجب ہے۔

اس سے اُس کلام کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی جو بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں "مَتْلو" (جو تلاوت کی جاتی ہے) اور "غیر مَتْلو" (جو تلاوت نہیں کی جاتی)۔ "وحی متلو" قرآن کا نام ہے، جس کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، اور "غیر متلو" حدیثِ رسول کا نام ہے، جن کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ساری مخلوقات سے زائد ہے

دُوسرا مسئلہ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ الخ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے برابر تمام کائنات کا علم محیط نہ تھا، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں، بلکہ جتنا علم حق تعالیٰ عطا فرماتے وہ مل جاتا تھا، ہاں اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم عطا ہوا وہ ساری مخلوقات کے علم سے زائد ہے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ

کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہ کہے صدقہ کرنے کو یا نیک کام کو

اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

یا صلح کرانے کو لوگوں میں، اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کی خوشی کے لئے

فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب۔ اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی

لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى

اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۴

اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگوں کی بہت سی خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی، اِلَّا یہ کہ کوئی شخص صدقے کا یا کسی نیکی کا یا لوگوں کے درمیان اِصلاح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسا کرے گا، ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے ﴿۱۱۴﴾ اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے، اور مؤمنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے، اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کر دیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے، اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

خلاصۂ تفسیر

عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب و برکت) نہیں ہوتی، ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں (اور اس تعلیم و ترغیب کی تکمیل و انتظام کے لئے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں، یا خود ہی صدقہ وغیرہ کی دُوسروں کو خفیہ ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بعض اوقات خفیہ ہی کہنا مصلحت ہوتا ہے، ان کے مشوروں میں البتہ خیر یعنی ثواب اور برکت ہے) اور جو شخص یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے (نہ کہ جاہ و شہرت کی غرض سے) سو ہم اس کو عنقریب اَجرِ عظیم عطا فرمائیں گے اور جو شخص رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق کام ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دِینی) راستہ چھوڑ کر دُوسرے راستہ ہو لیا (جیسا بشیر مرتد ہو گیا حالانکہ اسلام کا حق ہونا اور نیز اس خاص واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا خود اس کی نظر میں حق ہونا معلوم تھا، پھر بھی اسے بدبختی نے گھیرا) تو ہم اس کو (دُنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے جانے کی۔

معارف و مسائل

باہمی مشوروں اور مجلسوں کے آداب

اِرشاد ہے: لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ یعنی لوگوں کے باہمی مشورے اور تدبیریں جو آخرت کی فکر اور اَنجام پر غور سے آزاد ہو کر محض چندروزہ دُنیوی اور وقتی منافع کے لئے ہوا کرتے ہیں ان میں کوئی خیر نہیں۔

آگے اِرشاد فرمایا: إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یعنی ان مشوروں اور سرگوشیوں میں اگر خیر کی کوئی چیز ہوسکتی ہے تو یہ ہے کہ ایک دُوسرے کو صدقہ خیرات کی ترغیب دے یا نیکی کا حکم کرے، یا لوگوں کے آپس میں صلح کرانے کا مشورہ دے، ایک حدیث میں اِرشاد ہے کہ اِنسان کا ہر کلام اس کے لئے مضر ہی ہے، بجز اس کے کہ کلام میں اللہ کا ذِکر ہو یا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر ہو۔

''معروف'' کے معنی ہیں ہر وہ کام جو شریعت میں اچھا سمجھا جائے اور جس کو اہلِ شرع پہچانتے ہوں، اور اس کے مقابل ''منکر'' ہے، یعنی ہر وہ کام جو شریعت میں ناپسندیدہ اور اہلِ شرع میں اوپرا اور اجنبی ہو۔

''امر بالمعروف'' ہر نیکی کے حکم اور ترغیب کو شامل ہے، جس میں مظلوم کی امداد کرنا، حاجت مندوں کو قرض دینا،

گم شدہ کو راستہ بتا دینا وغیرہ سب نیک کام داخل ہیں، اور ''صدقہ'' اور ''اِصلاح بین الناس'' بھی اگرچہ اس میں داخل ہے، لیکن ان کو تخصیص کے ساتھ علیحدہ اس لئے بیان کیا گیا کہ ان دونوں چیزوں کا نفع متعدی ہے، اور ان سے ملت کی اجتماعی زندگی سدھرتی ہے۔

نیز یہ دونوں کام خدمتِ خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں، ایک جلبِ منفعت، یعنی خلق اللہ کو نفع پہنچانا، دُوسرے دفعِ مضرّت، یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا۔ ''صدقہ'' نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اور ''اِصلاح بین الناس'' خلق اللہ کو مضرّت اور نقصان سے بچانے کا اہم عنوان ہے، اس لئے جمہور علمائے تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوٰۃ، صدقاتِ واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی، اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے۔

صلح کرانے کی فضیلت

لوگوں کی باہمی رنجشیں دُور کرنے اور ان کے آپس میں مصالحت و موافقت پیدا کرنے کے متعلق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات نہایت اہم ہیں، آپ نے فرمایا:

''کیا میں تم کو ایسا کام نہ بتلاؤں جس کا درجہ روزے، نماز اور صدقہ میں سب سے افضل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ضرور بتائیے! آپ نے فرمایا کہ وہ کام اِصلاح ذات البین ہے، یعنی دو شخصوں کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اس کو دُور کر کے آپس میں صلح کرانا اور فساد کو ختم کرنا۔'' [1]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ'' [2] یعنی ''لوگوں کے آپس میں جھگڑا، فساد مونڈ دینے والی چیز ہے۔'' پھر اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ: ''یہ جھگڑا سر کو نہیں مونڈتا، بلکہ اِنسان کے دِین کو مونڈ ڈالتا ہے۔''

آیت کے آخر میں ایک اور اہم مضمون یہ اِرشاد فرمایا کہ یہ نیکیاں صدقہ اور امر بالمعروف اور اِصلاح بین الناس اسی وقت معتبر اور مقبول ہو سکتی ہیں، جبکہ ان کو اِخلاص کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کیا جائے، اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

اِجماعِ اُمت حجت ہے

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى الخ (آیت نمبر ۱۱۵) اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اصلاح ذات البین ج:۲ ص:۶۷۳

[2] بحوالۂ بالا۔

دُخولِ جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے، ایک مخالفت رسول، اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفت رسول کفر اور وبالِ عظیم ہے، دُوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اُس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ اجماعِ اُمت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن وسنت کے بیان کردہ اَحکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے اسی طرح اُمت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے، اور اس کی مخالفت گناہِ عظیم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: "يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ" [۱] یعنی" جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے، اور جو شخص جماعتِ مسلمین سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا۔"

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اجماعِ اُمت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید میں ہے؟ آپ نے قرآن سے دلیل معلوم کرنے کے لئے تین روز تک مسلسل تلاوتِ قرآن کو معمول بنایا، ہر روز دن میں تین مرتبہ اور رات میں تین مرتبہ پورا قرآن ختم کرتے تھے، بالآخر یہی مذکورہ آیت ذہن میں آئی، اور اس کو علماء کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجیت پر یہ دلیل کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے،

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ

اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ بہک کر دُور جا پڑا۔ اللہ کے سوا نہیں پکارتے

اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ ۙ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ

مگر عورتوں کو، اور نہیں پکارتے مگر شیطان سرکش کو، جس پر لعنت کی اللہ نے۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ

اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لوں گا تیرے بندوں سے حصہ مقرّرہ، اور ان کو بہکاؤں گا اور ان کو اُمیدیں دِلاؤں گا

[۱] المستدرك للحاكم رقم الحديث: ۳۹۲ كتاب العلم۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ

اور ان کو سکھلاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے کان اور ان کو سکھلاؤں گا کہ بدلیں صورتیں بنائی ہوئی اللہ کی،

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۭ﴿۱۱۹﴾

اور جو کوئی بناوے شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر تو وہ پڑا صریح نقصان میں۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

ان کو وعدہ دیتا ہے اور ان کو اُمیدیں دِلاتا ہے، اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان سو سب فریب ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور نہ پاویں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کی جگہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اور اس سے کمتر ہر گناہ کی جس کے لئے چاہتا ہے بخشش کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، وہ راہِ راست سے بھٹک کر بہت دُور جا گرتا ہے ﴿۱۱۶﴾ اللہ کو چھوڑ کر جن سے یہ دُعائیں مانگ رہے ہیں وہ صرف چند زنانیاں ہیں، اور جس کو یہ پکار رہے ہیں وہ اُس سرکش شیطان کے سوا کوئی نہیں ﴿۱۱۷﴾ جس پر اللہ نے پھٹکار ڈال رکھی ہے، اور اس نے (اللہ سے) یہ کہہ رکھا ہے کہ "میں تیرے بندوں سے ایک طے شدہ حصہ لے کر رہوں گا، ﴿۱۱۸﴾ اور میں انہیں راہِ راست سے بھٹکا کر رہوں گا، اور انہیں خوب آرزوئیں دِلاؤں گا، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیر ڈالیں گے، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے۔" اور جو شخص اللہ کے بجائے شیطان کو دوست بنائے اس نے کھلے کھلے خسارے کا سودا کیا۔ ﴿۱۱۹﴾ وہ تو ان سے وعدے کرتا اور انہیں آرزوؤں میں مبتلا کرتا ہے، جبکہ (حقیقت یہ ہے کہ) شیطان ان سے جو بھی وعدے کرتا ہے، وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۲۰﴾ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، اور ان کو اس سے بچنے کے لئے کوئی راہِ فرار نہیں ملے گی ﴿۱۲۱﴾

خلاصۂ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ سزائے ابدی میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا اب وہ سزائے دائمی بھی نہ رہے گی) اور (وجہ اس شرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ (امرِ حق سے) بڑی دُور کی گمراہی میں جا پڑا (وہ امرِ حق توحید ہے جو عقلاً بھی واجب ہے، اور کارساز کی تعظیم اس کے حقوق میں سے ہے، پس مشرک نے حضرتِ صانع کارساز کی اہانت کی، اس لئے ایسی سزا کا مستحق ہوگا، بخلاف دُوسرے گناہوں کے کہ وہ گمراہی تو ہے مگر توحید کے خلاف اور اس سے بعید نہیں، اس لئے قابلِ مغفرت قرار دیا گیا اور شرک کی طرح دُوسری قسم کے کفر بھی ناقابلِ معافی ہونے میں شریک ہیں، کیونکہ اس میں بھی اِنکار ہوتا ہے صانع کی کسی بتلائی ہوئی بات کا، پس وہ اس کی صفتِ صدق کا اِنکار کرتا ہے، اور بعض کافر خود ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے منکر ہیں، بعض کسی صفت کے منکر ہیں، اور بعض صفت اور ذات دونوں کے منکر ہیں، اور ان میں سے جس کا بھی اِنکار ہو وہ توحید کا اِنکار اور اس سے بعد ہے، پس کفر و شرک دونوں قابلِ معافی نہیں ہیں، آگے مشرکین کی بیوقوفی ان کے مذہبی طریقے میں بیان کرتے ہیں کہ) یہ (مشرک) لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (ایک تو) صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور (ایک) صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ (خدا تعالیٰ کے) حکم سے باہر ہے (اور) جس کو (اس بے حکمی کی وجہ سے) خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت (خاصہ) سے دُور ڈال رکھا ہے، اور جس نے (جس وقت کہ رحمتِ خاصہ سے دُور اور ملعون ہونے لگا) یوں کہا تھا (جس سے اس کی عداوت صاف ظاہر معلوم ہو رہی تھی) کہ میں (پوری کوشش کرنے کا اِرادہ رکھتا ہوں کہ) ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقرّر حصہ اِطاعت کا لوں گا اور (اس حصہ کی تفصیل یہ ہے کہ) میں ان کو (عقائد میں) گمراہ کروں گا اور میں ان کو (خیالات میں) ہوسیں دِلاؤں گا (جس سے گناہ کی طرف میلان ہو اور ان کی مضرت نظر میں نہ رہے) اور میں ان کو (بُرے اعمال کرنے کی) تعلیم دُوں گا جس سے وہ (بتوں کے نام پر) چوپاؤں کے کانوں کو تراشا کریں گے (اور یہ اعمالِ کفریہ میں سے ہے) اور میں ان کو (اور بھی) تعلیم دُوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے (اور یہ اعمالِ فسقیہ میں سے ہے جیسے داڑھی منڈانا، بدن گدوانا وغیرہ) اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بناوے گا (یعنی خدا تعالیٰ کی اِطاعت نہ کرے اور شیطان کی اِطاعت کرے) وہ (شخص) صریح نقصان (وزیان) میں واقع ہوگا (وہ زیان جہنم میں جانا ہے) شیطان ان لوگوں سے (عقائد کے متعلق جھوٹے) وعدے کیا کرتا ہے (کہ تم بےفکر رہو نہ کہیں حساب ہے نہ کتاب

ہے)اور (خیالات میں) ان کو ہوسیں دِلاتا ہے (کہ اس گناہ میں ایسی لذت ہے، اس حرام ذریعہ میں ایسی آمدنی ہے، اور اعمالِ شیطانیہ کا وجود اور لغویت اور مضرّت خود ظاہر ہے) اور شیطان اُن سے صرف جھوٹے (فریب آمیز) وعدے کرتا ہے (کیونکہ واقع میں حساب و کتاب حق ہے اور اس کی ہوسوں کا فریب ہونا تو بہت جلدی کھل جاتا ہے) ایسے لوگوں کا (جو کہ شیطان کی راہ پر چلتے ہیں) ٹھکانا جہنم ہے (اور وہ خسرانِ مبین یہی ہے) اور اس (جہنم) سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے (کہ وہاں جاکر پناہ لیں)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

اُوپر ذِکرِ جہاد میں گو سب مخالفینِ اسلام داخل ہیں، لیکن بیانِ اَحوال میں اب تک یہود اور منافقین کے اَحوال کا بیان ہوا تھا، اور مخالفین میں ایک جماعت بلکہ اوروں سے بڑی مشرکین کی تھی، آگے کچھ ان کے عقائد کی حالت اور طریقۂ مذمت اور اس کی سزا کا مذکور ہے، اور اس مقام پر یہ اس لئے اور زیادہ مناسب ہوگیا کہ اُوپر جس سارق کا قضیہ ذِکر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی ذِکر ہے کہ وہ سارق مرتد تھا، پس اس سے اس کی دائمی سزا کا حال معلوم ہوگیا۔ (بیان القرآن) [1]

پہلی آیت یعنی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ شروع میں سورۂ نساء (آیت ۴۸) میں انہی الفاظ کے ساتھ آچکی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں خاتمۂ آیت پر وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ آیا ہے، اور یہاں وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ وجہ فرق کی ائمۂ تفسیر کی تصریحات کے مطابق یہ ہے کہ پہلی آیت کے مخاطب براہِ راست یہود اہلِ کتاب تھے، جن کو بذریعہ توراۃ توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبیٔ برحق ہونا سب کچھ معلوم تھا، اس کے باوجود وہ شرک میں مبتلا ہوگئے تو گویا اپنے عمل سے انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ توراۃ کی یہی تعلیم ہے جو سراسر اِفترا اور بہتان ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اِرشاد ہوا، اور دُوسری آیت کے مخاطب براہِ راست مشرکینِ مکہ تھے، جن کے پاس اس سے پہلے نہ کوئی کتاب تھی نہ پیغمبر، مگر توحید کے عقلی دلائل بالکل واضح تھے، اور اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے پتھروں کو اپنا معبود بنالینا ادنیٰ عقل والے کے لئے بھی لغو و باطل اور گمراہی تھا، اس لئے یہاں اِرشاد ہوا فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ ۔

---

[1] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۵۶

شرک اور کفر کی سزا کا دائمی ہونا

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدرِ عمل ہونی چاہئے، مشرک اور کافر نے جو جرم کفر اور شرک کا کیا ہے، وہ محدود مدّتِ عمر کے اندر کیا ہے، تو اس کی سزا غیر محدود اور دائمی کیوں ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ کفر و شرک کرنے والا چونکہ اس کو جرم ہی نہیں سمجھتا بلکہ نیکی سمجھتا ہے، اس لئے اس کا عزم و قصد یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے گا، اور جب مرتے دم تک وہ اسی پر قائم رہا، تو اپنے اختیار کی حد تک اس نے جرمِ دائمی کرلیا اس لئے سزا بھی دائمی ہوئی۔

ظلم کی تین قسمیں

ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے، دُوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہوسکے گی، اور تیسری قسم وہ ہے کہ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔

پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دُوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے، اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے۔ (ابنِ کثیر بحوالہ مسند بزار)[۱]

شرک کی حقیقت

شرک کی حقیقت، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے، قرآنِ کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے، نقل کیا ہے:-

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ (الشعراء)

''یعنی قسم خدا کی! ہم کھلی گمراہی میں تھے جبکہ ہم نے تم کو اللہ ربّ العالمین کے برابر قرار دے دیا تھا۔''

ظاہر ہے کہ مشرکین کا بھی یہ عقیدہ تو نہ تھا کہ ہمارے گھڑے ہوئے پتھر اس جہان کے خالق اور مالک ہیں، بلکہ انہوں نے دُوسری غلط فہمیوں کی بنا پر ان کو عبادت میں یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رکھا تھا، یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا (فتح الملہم)۔[۲] معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات: خالق، رازق، قادرِ مطلق، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ میں کسی مخلوق کو اللہ کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۳۲۶

[۲] فتح الملهم، کتاب الایمان، باب الکبائر واکبرها۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے اچھے ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

نہریں رہا کریں ان میں ہی ہمیشہ، وعدہ ہے اللہ کا سچا، اور اللہ سے زیادہ سچا کون؟

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ

نہ تمہاری اُمیدوں پر مدار ہے اور نہ اہلِ کتاب کی اُمیدوں پر، جو کوئی بُرا کام کرے گا اس کی سزا پاوے گا،

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ

اور نہ پاوے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔ اور جو کوئی کام کرے اچھے

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ

مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں

وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ

اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا تل بھر۔ اور اس سے بہتر کس کا دِین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم پر

وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دِینِ ابراہیم پر جو ایک ہی طرف کا تھا، اور اللہ نے بنالیا ابراہیم کو خالص دوست۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸ ع ۱۱ ۱۵

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور سب چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں ہم ان کو ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، اور اللہ سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے؟ (۱۲۲) نہ تمہاری تمنائیں (جنت میں جانے کے لئے) کافی ہیں، نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں۔ جو بھی بُرا عمل کرے گا، اس کی سزا پائے گا، اور اللہ کے سوا اسے اپنا کوئی یار و مددگار نہیں ملے گا (۱۲۳) اور جو شخص نیک کام کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ مؤمن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف برابر بھی ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ (۱۲۴) اور اس سے بہتر کس کا دِین ہوگا جس نے اپنے چہرے (سمیت سارے وجود) کو اللہ کے آگے جھکا دیا ہو، جبکہ وہ نیکی کا خوگر بھی ہو، اور جس نے سیدھے سچے ابراہیم کے دِین کی پیروی کی ہو۔ اور (یہ معلوم ہی ہے کہ) اللہ نے اِبراہیم کو اپنا خاص دوست بنا لیا تھا (۱۲۵) اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ نے ہر چیز کو (اپنی قدرت کے) اِحاطے میں لیا ہوا ہے (۱۲۶)

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اِیمان لائے اور (انہوں نے) اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کرلیں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، خدا تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا؟ نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہلِ کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں بلکہ مدارِ کار اِطاعت پر ہے، پس) جو شخص (اِطاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی بُرا کام کرے گا (خواہ عقائد سے ہو یا اعمال سے) وہ اس کے عوض میں سزا دِیا جاوے گا (اگر وہ بُرائی عقیدۂ کفریہ تک ہے تو سزا دائمی اور یقینی اور اگر اس سے کم ہے تو سزا ہمیشہ کی نہیں) اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مددگار ملے گا (کہ خدا کے عذاب سے اسے چھڑا لے) اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ ان کی کوئی نیکی ضائع کردی جائے) اور (اُوپر جو مؤمن کی قید لگائی گئی ہے اس کا مصداق ہر فرقہ نہیں بلکہ صرف وہ فرقہ ہے جس کا دِین خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے میں سب سے اچھا ہو، اور ایسا فرقہ صرف اہلِ اسلام ہی ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں یہ صفات ہیں: مکمل اِطاعت، اِخلاص، ملتِ اِبراہیم کی پیروی اور) ایسے شخص (کے دِین) سے زیادہ بہتر کس کا دِین ہوگا جو کہ اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے

(یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ دِل سے فرمانبرداری اختیار کی ہو خالی مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو) اور وہ ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں اور (ملتِ ابراہیمی ضرور قابلِ اتباع ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا تھا (تو ظاہر ہے کہ دوست کے طریقہ پر چلنے والا بھی محبوب ومقبول ہوگا، پس طریقۂ اسلام مقبول ہوا، پس اہلِ اسلام ہی مؤمن کے لقب کے مصداق ٹھہرے، اور دُوسرے فرقوں نے ابراہیم کی پیروی کو چھوڑ دیا، کہ اسلام نہ لائے، اس لئے صرف مسلمان ہی ایسے ثابت ہوئے کہ محض امانی یعنی تمناؤں پر ان کا سہارا نہیں، بلکہ اطاعت گزار ہیں، پس کام انہی کا چلے گا) اور (اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری کرنا تو ضروری ہے، کیونکہ ان کی سلطنت وقدرت اور ان کا علم محیط دونوں تام اور مکمل ہیں اور یہی اُمور مدار ہیں وجوبِ اطاعت کے چنانچہ) اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یہ تو کمالِ سلطنت ہوا) اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو (اپنے علم میں) اِحاطہ فرمائے ہوئے ہیں (یہ کمالِ علمی ہوا)۔

معارف ومسائل

مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان ایک مفاخرانہ گفتگو

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ الخ ان آیات میں پہلے ایک مکالمہ اور گفتگو کا ذِکر ہے، جو مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان ہوئی تھی، اور پھر اس مکالمہ پر محاکمہ کیا گیا ہے، فریقین کو صحیح راہِ ہدایت بتلائی گئی، آخر میں اللہ کے نزدیک مقبول اور افضل واعلیٰ ہونے کا ایک معیار بتلا دیا گیا، جس کو سامنے رکھا جائے تو کبھی انسان غلطی اور گمراہی کا شکار نہ ہو۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں ایک مرتبہ کچھ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان مفاخرت کی گفتگو ہونے لگی، اہلِ کتاب نے کہا کہ ہم تم سے افضل واشرف ہیں، کیونکہ ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تم سب سے افضل ہیں، اس لئے کہ ہمارے نبی خاتم النّبیین ہیں، اور ہماری کتاب آخری کتاب ہے، جس نے پہلی سب کتابوں کو منسوخ کردیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ الخ یعنی یہ تفاخر اور تعلّی کسی کے لئے زیبا نہیں، اور محض خیالات اور تمناؤں اور دعووں سے کوئی کسی پر افضل نہیں ہوتا، بلکہ مدار اعمال پر ہے، کسی کا نبی اور کتاب کتنی ہی افضل واشرف ہو اگر وہ عمل غلط کرے گا تو اس کی ایسی سزا پائے گا کہ اس سے بچانے والا اس کو کوئی نہ ملے گا۔

یہ آیت جب نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر بہت شاق ہوئی، امام مسلم، ترمذی، نسائی اور امام احمد رحمہم اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی مَنْ یَّعْمَلْ سُوْۤءًا یُّجْزَ بِهٖ یعنی ''جو کوئی کچھ بُرائی کرے گا اس کی سزا دی جائے گی''، تو ہم سخت رنج وغم اور فکر میں پڑ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس آیت نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، ذرا سی بُرائی بھی ہوگی تو اس کی جزا ملے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فکر میں نہ پڑو، اپنی طاقت وقدرت کے مطابق عمل کرتے رہو، کیونکہ (جس سزا کا یہاں ذِکر ہے ضروری نہیں کہ وہ جہنم ہی کی سزا ہو بلکہ) تمہیں دُنیا میں جو بھی کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ اور بُرائی کی جزا ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بھی کفارۂ گناہ ہے۔ [۱]

اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کو دُنیا میں جو بھی کوئی غم یا تکلیف یا بیماری یا فکر لاحق ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

جامع ترمذی اور تفسیر ابنِ جریر وغیرہ نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْۤءًا یُّجْزَ بِهٖ ان کو سنائی تو ان پر یہ اثر ہوا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا: کیا بات ہے؟ تو صدیقِ اکبرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی بُرائی نہیں کی، اور جب ہر بُرائی کی جزا ملنی ہے تو ہم میں سے کون بچے گا؟ آپ نے فرمایا: اے ابوبکر! آپ اور آپ کے مؤمن بھائی کوئی فکر نہ کریں، کیونکہ دُنیا کی تکالیف کے ذریعے آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ [۲]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہنچتا؟ صدیقِ اکبرؓ نے عرض کیا: بے شک سب چیزیں پہنچتی ہیں، آپ نے فرمایا: بس یہی جزاء ہے تمہارے سیئات کی۔ [۳]

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں ہے جس کو ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ بندہ کو جو بخار یا تکلیف پہنچتی ہے یا کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے مگر دُوسری جیب میں ملے، اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ [۴]

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت دی ہے کہ محض دعووں اور تمناؤں میں نہ لگیں، بلکہ عمل کی

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن إلخ ج:۲ ص:۳۱۸ وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة النساء ج:۲ ض:۱۳۴، ومسند احمد رقم الحدیث: ۷۵۸۹ وسنن النسائی الکبریٰ رقم الحدیث: ۱۱۱۲۲

[۲] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، باب سورة النساء ج:۲ ص:۱۳۴

[۳] مسند احمد رقم الحدیث: ۶۹

[۴] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۶۵۸۶ حدیث السیدة عائشة رضی الله عنها۔

فکر کریں، کیونکہ کامیابی صرف اس سے نہیں کہ تم فلاں نبی یا فلاں کتاب کے نام لینے والے ہو، بلکہ اصل فلاح اس میں ہے کہ اس پر صحیح ایمان اور اس کے مطابق اعمالِ صالحہ کے پابند رہو، ارشاد ہے:-

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۱۲۴) یعنی "جو مرد یا عورت نیک عمل کرے بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ ایمان بھی ہو تو ضرور جنت میں جائے گا اور ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا ملے گا جس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی۔" اس میں اِشارہ فرمایا کہ اہلِ کتاب یا دُوسرے غیر مسلم اگر ان کے اعمال نیک بھی ہوں تو چونکہ ان کا ایمان صحیح نہیں، اس لئے وہ عمل مقبول نہیں، اور مسلمانوں کا چونکہ ایمان بھی صحیح ہے اور عمل بھی نیک ہے، اس لئے وہ کامیاب اور دُوسروں سے افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا ایک معیار

چوتھی آیت میں افضلیت اور مقبولیت عند اللہ کا ایک معیار بتلایا گیا ہے، جس سے اس کا صحیح فیصلہ ہوسکتا ہے کہ کون مقبول ہے اور کون مردُود، اس معیار کے دو جز ہیں، ان میں سے ایک میں بھی خلل آئے تو ساری کوششیں اکارت اور ضائع ہوجاتی ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو دُنیا میں جہاں کہیں کوئی گمراہی یا غلط کاری ہے وہ انہی دو جزؤں میں کسی ایک جزء کے خلل سے پیدا ہوتی ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں موازنہ کریں یا خود مسلمانوں کے فرقوں، جماعتوں اور پارٹیوں میں مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہی دو نقطے ہیں جن میں سے کسی ایک سے ہٹ جانا اِنسان کو ذِلت وضلالت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

اِرشاد فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی اس شخص سے بہتر کسی کا طریقہ نہیں ہوسکتا جس میں دو باتیں پائی جائیں، ایک اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کردے، رِیاکاری یا دُنیاسازی کے لئے نہیں بلکہ اِخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے عمل کرے۔

دُوسرے وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی وہ عمل بھی دُرست طریقے پر کرے۔ امام ابنِ کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دُرست طریقہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل محض خودساختہ طرز پر نہ ہو، بلکہ شریعتِ مطہرہ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایک اِخلاص اور دُوسرے عمل کا دُرست یعنی مطابق شریعت وسنت ہونا، ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط اِخلاص کا تعلق اِنسان کے باطن یعنی قلب سے ہے، اور دُوسری شرط یعنی موافقتِ شرع کا تعلق اِنسان کے ظاہر سے ہے، جب یہ دونوں شرطیں کسی شخص نے پوری

کرلیں تو اس کا ظاہر و باطن دُرست ہوگیا، اور جب اُن میں سے کوئی شرط مفقود ہوئی تو عمل فاسد ہوگیا، اِخلاص نہ رہا تو عملی منافق ہوگیا، اور اِتباعِ شریعت فوت ہوگیا تو گمراہ ہوگیا۔

قوموں کی گمراہی کا سبب اِخلاص یا صحتِ عمل کا فقدان ہے

قوموں اور مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ جتنے بے راہ فرقے اور قومیں دُنیا میں ہیں کسی میں اِخلاص نہیں، اور کسی میں عمل صحیح نہیں، یہی دو گروہ ہیں جن کا ذِکر سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم سے ہٹ جانے والوں کے سلسلہ میں "مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" اور "ضَآلِّيْنَ" کے لفظوں سے بیان کیا گیا ہے، "مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" وہ لوگ ہیں جن میں اِخلاص نہیں، اور "ضَآلِّيْنَ" وہ جن کا عمل دُرست نہیں، پہلا گروہ شہوات کا شکار ہے اور دُوسرا شبہات کا۔

پہلی شرط یعنی اِخلاص کی ضرورت اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عمل کا بے کار ہونا تو عام طور پر سب سمجھتے ہیں، لیکن حسنِ عمل یعنی اِتباعِ شریعت کی شرط پر بہت سے مسلمان بھی نہیں دھیان دیتے، یوں سمجھتے ہیں کہ نیک عمل کو جس طرح چاہو کرلو، حالانکہ قرآن وسنت نے پوری طرح واضح کردیا ہے کہ حسنِ عمل صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اِتباعِ سنت پر موقوف ہے، اس سے کم کرنا بھی جرم ہے، اور اس سے بڑھانا بھی جرم ہے، جس طرح ظہر کی چار کے بجائے تین رکعات پڑھنا جرم ہے، اسی طرح پانچ پڑھنا بھی ویسا ہی جرم و گناہ ہے۔ کسی عبادت میں جو شرط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی ہو، اس میں اپنی طرف سے شرطوں کا اِضافہ یا آپ کی بتلائی ہوئی ہیئت سے مختلف صورت اِختیار کرنا یہ سب ناجائز اور حسنِ عمل کے خلاف ہے، خواہ دیکھنے میں وہ کتنے ہی خوب صورت عمل نظر آئیں۔ بدعات اور محدثات جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گمراہی قرار دیا،[1] اور ان سے بچنے کی تاکیدی ہدایتیں فرمائیں، وہ سب اسی قسم سے ہیں، جاہل آدمی اس کو پورے اِخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور عبادت وثواب جان کر کرتے ہیں، مگر شرعِ محمدی میں اس کا یہ عمل ضائع بلکہ موجبِ گناہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے قرآنِ کریم نے بار بار حسنِ عمل یعنی اِتباعِ سنت کی تاکید فرمائی، سورۂ ملک میں ہے: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط یہاں پر اَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا، "اَكْثَرُ عَمَلًا" نہیں فرمایا، یعنی کثرتِ عمل کا ذِکر نہیں، بلکہ اچھا عمل کرنے کا ذِکر ہے، اور اچھا عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔

قرآنِ کریم کی ایک دُوسری آیت میں اسی حسنِ عمل اور اِتباعِ سنتِ مصطفوی کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (بنی اسرائیل:۱۹) یعنی سعی وعمل ان لوگوں کا مقبول ہے جنہوں نے نیت بھی خالص آخرت کی

[1] چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: "وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة" مشکوٰۃ، باب الإعتصام بالكتاب والسُّنّة ج:۱ ص:۲۷

رکھی ہو اور اس کے لئے سعی بھی کر رہے ہوں، اور جو سعی کر رہے ہیں وہ سعی مناسب بھی ہو، اور سعی مناسب وہی ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اُمت کو بتلائی، اس سے ہٹ کر خواہ سعی میں کمی کی جائے یا زیادتی، دونوں چیزیں سعیٔ مناسب نہیں ہیں، اور سعیٔ مناسب وہی ہے جس کا دُوسرا نام حسنِ عمل ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں: اِخلاص اور حسنِ عمل، اور حسنِ عمل نام ہے اِتباعِ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اِخلاص کے ساتھ حسنِ عمل کرنے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح کیا ہے، اور اس کے متعلق کیا ہدایتیں دی ہیں، ہمارا جو عمل سنت کے طریقہ سے ہٹے گا، نامقبول ہوگا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات وخیرات اور ذِکر اللہ اور دُرود و سلام سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح انجام دیا، اور کس طرح کرنے کے لئے اِرشاد فرمایا ہے۔ آخر آیت میں اِخلاص اور حسنِ عمل کی ایک مثال حضرت اِبراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش کر کے ان کے اِتباع کا حکم دیا گیا اور وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ فرما کر اس کی طرف اِشارہ کر دیا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کے اس مقامِ بلند کا سبب یہی ہے کہ وہ مخلص بھی اعلیٰ درجے کے تھے اور ان کا عمل بھی باشارتِ خداوندی صحیح اور دُرست تھا۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي

اور تجھ سے رُخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی، کہہ دے: اللہ تم کو اِجازت دیتا ہے ان کی اور وہ جو تم کو سنایا جاتا ہے

الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ

قرآن میں سو حکم ہے ان یتیم عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو اُن کے لئے مقرّر کیا ہے اور چاہتے ہو

اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى

کہ ان کو نکاح میں لے آؤ اور حکم ہے ناتواں لڑکوں کا اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں

بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ

اِنصاف پر، اور جو کروگے بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے۔ اور اگر کوئی عورت

خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا

ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی بھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کرلیں آپس میں

صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا

کسی طرح صلح، اور صلح خوب چیز ہے، اور دلوں کے سامنے موجود ہے حرص، اور اگر تم نیکی کرو

وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا

اور پرہیزگاری کرو تو اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے

بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ

عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو، سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے اُدھر میں لٹکتی،

وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا

اور اگر اِصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر دونوں جدا ہو جاویں

يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دے گا اپنی کشائش سے، اور اللہ کشائش والا تدبیر والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اور اس کتاب (یعنی قرآن) کی جو آیتیں جو تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ بھی ان یتیم عورتوں کے بارے میں (شرعی حکم بتاتی ہیں) جن کو تم ان کا مقرر شدہ حق نہیں دیتے، اور ان سے نکاح کرنا بھی چاہتے ہو، نیز کمزور بچوں کے بارے میں بھی (حکم بتاتی ہیں) اور یہ تاکید کرتی ہیں کہ تم یتیموں کی خاطر انصاف قائم کرو۔ اور تم جو بھلائی کا کام کرو گے،

اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے۔ (۱۲۷) اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بیزاری کا اندیشہ ہو تو ان میاں بیوی کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ آپس کے اِتفاق سے کسی قسم کی صلح کرلیں۔ اور صلح کرلینا بہتر ہے۔ اور اِنسانوں کے دِل میں (کچھ نہ کچھ) لالچ کا مادّہ تو رکھ ہی دیا گیا ہے۔ اور اگر اِحسان اور تقویٰ سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۱۲۸) اور عورتوں کے درمیان مکمل برابری رکھنا تو تمہارے بس میں نہیں، چاہے تم ایسا چاہتے بھی ہو، البتہ کسی ایک طرف پورے پورے نہ جھک جاؤ کہ دُوسری کو ایسا بنا کر چھوڑ دو جیسے کوئی بیچ میں لٹکی ہوئی چیز۔ اور اگر تم اِصلاح اور تقویٰ سے کام لوگے تو یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے (۱۲۹) اور اگر دونوں جدا ہو ہی جائیں تو اللہ اپنی (قدرت اور رحمت کی) وسعت سے دونوں کو (ایک دُوسرے کی حاجت سے) بے نیاز کردے گا۔ اللہ بڑی وسعتوں والا، بڑی حکمت والا ہے۔ (۱۳۰)

ربطِ آیات

شروع سورت میں یتیموں اور عورتوں کے خاص اَحکام اور ان کے حقوق ادا کرنے کا وجوب مذکور تھا، کیونکہ جاہلیت میں بعضے ان کو میراث ہی نہ دیتے تھے، بعضے جو مال میراث میں یا اور کسی طور سے ان کو ملتا اس کو ناجائز طور پر کھا جاتے، بعضے ان سے نکاح کرکے ان کو مہر پورا نہ دیتے، اُوپر ان سب کی ممانعت کی گئی تھی، اس پر مختلف واقعات پیش آئے، بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ عورتیں اور بچے فی نفسہٖ قابل میراث کے نہیں، کسی وقتی مصلحت سے یہ حکم چند لوگوں کے لئے ہوگیا ہے، اُمید ہے کہ منسوخ ہوجائے گا، اور بعض اس کے منتظر رہے جب نسخ نہ ہوا تو یہ مشہور ٹھہرا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہئے، اور حاضر ہوکر پوچھا، ابنِ جریرؒ [۱] اور ابن المنذرؒ نے آیت کا سببِ نزول اسی سوال کو نقل کیا ہے، اور اس کے بعد کی آیتوں میں عورتوں سے متعلقہ چند اور مسائل بیان فرمادیئے گئے۔ (بیان القرآن) [۲]

خلاصۂ تفسیر

اور لوگ آپ سے عورتوں (کی میراث اور مہر) کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تم کو (وہی سابق) حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی (تم کو حکم دیتی ہیں) جو کہ (اس کے قبل نازل ہوچکی ہیں اور) اور قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں (کیونکہ قرآن کی تلاوت میں ان کی تلاوت بھی ظاہر ہے کہ ہوا ہی کرتی تھی) جو کہ ان یتیم عورتوں کے باب میں (نازل ہوچکی) ہیں جن (کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے کہ اگر وہ صاحبِ مال

---

[۱] تفسیر الطبری تحت هذه الآیة رقم الحدیث:۱۰۵۴۳

[۲] بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۶۰،۱۶۱

وصاحبِ جمال ہوئیں تو ان سے نکاح کرتے ہو، مگر ان) کو جو (شرع سے) ان کا حق (میراث ومہر کا) مقرر ہے نہیں دیتے ہو اور (اگر صاحبِ جمال نہ ہوئیں، صرف صاحبِ مال ہوئیں تو) ان کے ساتھ (بوجہ خوش جمال نہ ہونے کے) نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو (لیکن بوجہ صاحبِ مال ہونے کے اس خوف سے کہ یہ مال کہیں اور نہ چلا جائے اور کسی سے بھی نکاح نہیں کرنے دیتے) اور (جو آیات کہ) کمزور بچوں کے باب میں (ہیں) اور (جو آیات کہ) اس باب میں (ہیں) کہ یتیموں کی (تمام) کارگزاری (عام اس سے کہ مہر ومیراث کے متعلق ہو یا اور کچھ ہو) اِنصاف کے ساتھ کرو (یہ مضمون ہے ان آیاتِ سابقہ کا، پس وہ آیتیں اپنا مضمون اب بھی تمہارے ذمہ واجب کررہی ہیں اور ان کا حکم بعینہٖ باقی ہے تم انہی کے موافق عمل رکھو) اور جو نیک کام کرو گے (نساء ویتامیٰ کے بارے میں، یا اور اُمور میں بھی) سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (تم کو ان کی جزائے خیر دیں گے اور جانتے تو ہیں غیر خیر کو بھی، لیکن یہاں ترغیب خیر کی مقصود ہے اس لئے تخصیص کی گئی) اور اگر کسی عورت کو (قرائن سے) اپنے شوہر سے غالب اِحتمال بد دِماغی (اور کج ادائی) یا بے پروائی (اور بے رُخی) کا ہو سو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کرلیں (یعنی عورت اگر ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو پورے حقوق ادا کرنا نہیں چاہتا اور اس لئے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے مثلاً نان نفقہ معاف کردے، یا مقدار کم کردے اور اپنی باری معاف کردے تاکہ وہ چھوڑے نہیں، اور شوہر کو بھی جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کرلے) اور (نزاع یا فراق سے تو) یہ صلح (ہی) بہتر ہے اور (ایسی صلح ہوجانا کچھ بعید نہیں کیونکہ) نفوس کو (طبعًا) حرص کے ساتھ اِقتران (واتصال) ہوتا ہے (جب اس کی حرص پوری ہوجاتی ہے راضی ہوجاتا ہے، پس شوہر جب دیکھے گا کہ میری مالی اور جانی آزادی میں جس کی کہ طبعی حرص ہے کچھ خلل نہیں آتا اور مفت میں عورت ملتی ہے تو وہ غالبًا نکاح میں رکھنے پر راضی ہوجائے گا، اور عورت کی حرص نکاح میں رہنے پر خواہ کسی وجہ سے ہو ظاہر ہے کہ سببِ اصلی ہے صلح کا، پس جانبین کی خاص خاص حرص نے اس صلح کی تکمیل کردی) اور (اے مردو!) اگر تم (خود عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ رکھو (اور ان سے حقوق معاف کرانے کے خواہاں نہ ہو) اور ان کے ساتھ (کج ادائی اور بے رُخی کرنے سے) اِحتیاط رکھو تو (تم کو بڑا ثواب ملے کیونکہ) بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اور اعمالِ نیک پر ثواب دیا کرتے ہیں) اور (عادۃً) تم سے یہ تو کبھی نہ ہوسکے گا کہ سب بیبیوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتیٰ کہ رغبتِ قلب میں بھی) گو (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے (اور تم کتنی ہی اس میں کوشش کرو، لیکن چونکہ قلب کا میلان غیر اِختیاری ہے، اس لئے اس پر قدرت نہیں، گو اِتفاقاً بلا اِختیار کہیں برابری ہو ہی جائے تو اس کی نفی آیت میں مقصود نہیں، غرض جب اِختیار میں نہیں تو تم اس کے مکلّف نہیں، لیکن اس کے غیر اِختیاری ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ظاہری حقوق بھی اِختیاری نہ رہیں، بلکہ وہ تو اِختیاری ہیں، جب وہ اِختیاری ہیں) تو (تم پر واجب ہے کہ) تم

بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ (بالکل کا مطلب یہ کہ باطن سے بھی جس میں معذور تھے اور ظاہر سے بھی جس میں مختار ہو، یعنی حقوقِ شرعیہ میں ان سے نشوز و اعراض نہ کرو) جس سے اس (مظلومہ) کو ایسا کردو جیسے کوئی اِدھر نہ اُدھر (یعنی بیچ میں) لٹکی ہو (یعنی نہ تو اس کے حقوق ادا کئے جائیں کہ خاوند والی سمجھی جائے، اور نہ اس کو طلاق دی جائے کہ بے خاوند والی کہی جائے، بلکہ رکھو تو اچھی طرح رکھو) اور (رکھنے کی صورت میں جو زمانۂ ماضی میں کچھ ناگوار معاملات ان سے کئے گئے) اگر (ان معاملات کی فی الحال) اِصلاح کرلو اور (آئندہ زمانہ میں ایسے معاملات سے) اِحتیاط رکھو تو (وہ اُمورِ گزشتہ معاف کردیئے جائیں گے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں، (چونکہ اِصلاح ذنوب متعلقہ بحقوق العباد کی ان عباد کے معاف کرنے سے ہوتی ہے، پس اِصلاح میں یہ معافی بھی آگئی، تو اس کے وقوع کے بعد توبہ شرعاً صحیح ہوگئی اس لئے مقبول ہوگئی) اور اگر دونوں میاں بیوی (میں کسی طرح بھی موافقت نہ ہوئی اور دونوں) جدا ہوجائیں (یعنی خلع یا طلاق ہوجائے) تو (کوئی ان میں سے خواہ مرد اگر اس کی زیادتی ہے یا عورت اگر اس کی کوتاہی ہے، یوں نہ سمجھے کہ بدون میرے اس دُوسرے کا کام ہی نہ چلے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (قدرت) سے (دونوں میں سے) ہر ایک کو (دُوسرے سے) بے اِحتیاج کردے گا (یعنی ہر ایک کا مقدر کام بے دُوسرے کے چل جائے گا) اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں (ہر ایک کے لئے مناسب سبیل نکال دیتے ہیں)۔

معارف و مسائل

اِزدواجی زندگی سے متعلق چند قرآنی ہدایات

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا (الیٰ قولہ) وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ ان تینوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اِزدواجی زندگی کے اس تلخ اور کٹھن پہلو کے متعلق ہدایات دی ہیں جو اس طویل زندگی کے مختلف ادوار میں ہر جوڑے کو کبھی نہ کبھی پیش آہی جاتا ہے، وہ ہے باہمی رنجش اور کشیدگی، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر صحیح اُصول کے ماتحت قابو پانے کی کوشش نہ کی جائے تو نہ صرف زوجین کے لئے دُنیا جہنم بن جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات یہ گھریلو رنجش خاندانوں اور قبیلوں کی باہمی جنگ اور قتل وقتال تک نوبت پہنچادیتی ہے قرآنِ عزیز مرد وعورت دونوں کے تمام جذبات اور اِحساسات کو سامنے رکھ کر ہر فریق کو ایک ایسا نظامِ زندگی بتلانے کے لئے آیا ہے جس پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا گھر دُنیا ہی میں جنت بن جائے گا، گھریلو تلخیاں، محبت و راحت میں تبدیل ہوجائیں گی، اور اگر ناگزیر حالات میں علیحدگی کی نوبت بھی آجائے تو وہ بھی خوشگوار طریقہ، خوش اُسلوبی کے ساتھ ہو، قطع تعلق بھی ایسا ہو کہ عداوت و دُشمنی اور اِیذا رسانی کے

جذبات پیچھے نہ چھوڑے۔

آیت نمبر ۱۲۸ ایسے حالات سے متعلق ہے، جس میں غیر اختیاری طور پر میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں، ہر فریق اپنی جگہ معذور سمجھا جائے، اور باہمی تلخی کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہو جائے کہ باہمی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے گی، جیسے ایک بیوی سے اس کے شوہر کا دِل نہیں ملتا، اور نہ ملنے کے اسباب رفع کرنا عورت کے اختیار میں نہیں، مثلاً عورت بدصورت یا سن رسیدہ بڑھیا ہے، شوہر خوش رُو ہے، تو ظاہر ہے کہ اس میں نہ عورت کا کوئی قصور ہے اور نہ مرد ہی کچھ مجرم کہا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس آیت کے شانِ نزول میں اسی طرح کے چند واقعات ''مظہری'' وغیرہ میں منقول ہیں، ایسے حالات میں مرد کے لئے تو ایک عام قانون قرآنِ کریم نے یہ بتلایا ہے کہ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرۃ:۲۲۹) کہ اس عورت کو رکھنا ہو تو دستور کے مطابق اس کے پورے حقوق ادا کر کے رکھو، اور اگر اس پر قدرت نہیں تو اس کو خوش اُسلوبی سے آزاد کردو، اب اگر عورت بھی آزاد ہونے کے لئے تیار ہے تو معاملہ صاف ہے کہ قطع تعلق بھی خوشگوار انداز میں ہو جائے گا، لیکن اگر ایسے حالات میں عورت کسی وجہ سے آزادی نہیں چاہتی، خواہ اپنی اولاد کے مفاد کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کا کوئی دُوسرا سہارا نہیں، تو یہاں ایک ہی راستہ ہے کہ شوہر کو کسی چیز پر راضی کیا جائے، مثلاً عورت اپنے تمام یا بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑ دے، اور شوہر یہ خیال کرے کہ بہت سے حقوق کے بار سے تو سبکدوشی ہوتی ہے، بیوی مفت میں ملتی ہے اس پر صلح ہو جائے۔

قرآنِ کریم کی اس آیت میں ایک تو اس طرح کی مصالحت کے متوقع ہونے کی طرف رہنمائی اس طرح فرمائی: وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ یعنی ''حرص تمام نفوس کے سامنے دھری رہتی ہے'' ایسی مصالحت میں عورت کو تو یہ حرص ہے کہ مجھے آزاد کر دیا تو اولاد برباد ہو جائے گی، یا میری زندگی دُوسری جگہ تلخ ہوگی، اور شوہر کو یہ لالچ ہے کہ جب عورت نے اپنا کل مہر یا بعض معاف کر دیا اور دُوسرے حقوق کا بھی مطالبہ چھوڑ دیا، تو اَب اس کو رکھنے میں میرے لئے کیا مشکل ہے، اس لئے مصالحت باہمی آسان ہو جائے گی، اس کے ساتھ اِرشاد فرمایا:-

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا یعنی ''اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑائی جھگڑے یا بے رُخی کا خطرہ محسوس کرے تو دونوں میں سے کسی کو گناہ نہیں ہوگا اگر آپس میں خاص شرائط پر صلح کرلیں'' اور گناہ نہ ہونے کے عنوان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ اس معاملے کی صورت بظاہر رِشوت کی سی ہے، کہ شوہر کو مہر وغیرہ کی معافی کا لالچ دے کر اِزدواجی زندگی کا تعلق باقی رکھا گیا ہے، لیکن قرآن کے اس اِرشاد نے واضح کر دیا کہ یہ رِشوت میں داخل نہیں، بلکہ مصلحت میں داخل ہے، جس میں فریقین اپنے کچھ کچھ کا مطالبہ چھوڑ کر کسی درمیانی صورت پر

رضامند ہوجایا کرتے ہیں، اور یہ جائز ہے۔

زوجین کے جھگڑے میں دُوسروں کا دخل بلاضرورت مناسب نہیں

"تفسیر مظہری" میں ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَهُمَا صُلۡحًا فرمایا، یعنی "میاں بیوی دونوں آپس میں کسی صورت پر مصالحت کرلیں" اس میں لفظ بَیۡنَهُمَا سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ میاں بیوی کے معاملات میں بہتر یہ ہے کہ کوئی تیسرا دخیل نہ ہو، یہ دونوں خود ہی آپس میں کوئی بات طے کرلیں، کیونکہ تیسرے کے دخل سے بعض اوقات تو مصالحت ہی ناممکن ہوجاتی ہے، اور ہو بھی جائے تو طرفین کے عیوب تیسرے آدمی کے سامنے بلاوجہ آتے ہیں جس سے بچنا دونوں کے لئے مصلحت ہے۔

مذکورہ آیت کے آخر میں فرمایا: وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۲۸﴾ یعنی ایسے حالات میں جبکہ بیوی سے تمہارا دِل نہیں ملتا، اور اس وجہ سے تم اس کے حقوق ادا کرنا مشکل سمجھ کر آزاد کرنا چاہتے ہو تو گو ضابطہ میں تمہیں آزاد کردینے کا اختیار بھی حاصل ہے، اور آیت کے ابتدائی جملہ کی رُو سے عورت کے کچھ مطالبات چھوڑنے پر صلح کرلینا بھی جائز ہے، لیکن اگر حق تعالیٰ کے خوف کو سامنے رکھ کر احسان سے کام لو اور دِل نہ ملنے کے باوجود اس کے تعلق کو بھی نبھاؤ اور اس کے سب حقوق بھی پورے کرو، تو تمہارا یہ حسنِ عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، جس کا یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس تحمل اور حسنِ عمل کا بدلہ ایسی نعمتوں اور حقوق سے دے گا جس کا تم کوئی تصوّر بھی نہیں کرسکتے، اور شاید اسی وجہ سے یہاں صرف یہ بتلا کر چھوڑ دیا کہ تمہارا یہ حسنِ عمل ہمارے سامنے ہے، اس کا ذِکر نہیں کیا کہ اس کا بدلہ کیا دیں گے؟ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ بدلہ تمہارے وہم و خیال سے بھی زائد ہوگا۔

متعلقہ آیات کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگیا کہ شوہر جب یہ دیکھے کہ کسی وجہ سے اس کا دِل اپنی بیوی سے نہیں ملتا اور اس کے حقوق پورے نہیں ہوتے تو جہاں تک بیوی کے اختیاری معاملات کا تعلق ہے ان کی تو اصلاح کی کوشش کرے، تنبیہ کے لئے عارضی طور پر بے رُخی، زبانی تنبیہ اور بجبوری معمولی مار پیٹ بھی کرنا پڑے تو کرے، جیسا کہ سورۂ نساء کی شروع کی آیات میں گزر چکا ہے، اور اگر ساری کوششوں کے باوجود اصلاح سے مایوس ہوجائے، یا معاملہ کوئی ایسا ہے جس کا دُرست کرنا عورت کے اختیار ہی میں نہیں، تو اَب اس کو قانونِ شرع یہ حق دیتا ہے کہ خوش اُسلوبی کے ساتھ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے طلاق دے کر آزاد کردے، لیکن اگر وہ اس کے تعلق کو اسی حالت میں نبھائے، اپنے حقوق کو نظرانداز اور اس کے حقوق پورے پورے ادا کرے تو یہ اس کے لئے افضل و اعلیٰ اور موجبِ ثوابِ عظیم ہے۔ اس کے بالمقابل اگر معاملہ برعکس ہو کہ مرد حقوقِ واجبہ نہیں ادا کرتا، اس لئے عورت آزادی چاہتی ہے تو اس صورت میں اگر شوہر بھی آزاد کرنے پر راضی

ہے تو معاملہ صاف ہے، عورت کو بھی یہ حق ملتا ہے کہ جب شوہر اَدائے حقوق میں کوتاہی کی بنا پر اس کو آزاد کرنا چاہے تو عورت بھی اپنی آزادی اِختیار کرلے، اور اگر شوہر باختیارِ خود آزاد کرنے پر آمادہ نہیں تو عورت کو حق پہنچتا ہے کہ اسلامی عدالت سے اپنی آزادی کا مطالبہ کر کے آزاد ہوجائے، لیکن اگر وہ شوہر کی بے رُخی اور کج رَوِی پر صبر کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ چھوڑ کر اس کو نبھائے، اور شوہر کے حقوق کو اَدا کرے تو یہ اس کے لئے افضل واعلیٰ اور موجبِ ثوابِ عظیم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف اپنی تکلیف کو دُور کرنے اور اپنا حق وصول کرنے کا فریقین کو قانونی حق قرآنِ کریم نے دے دیا، دُوسری طرف دونوں کو بلند اخلاقی اور اپنے حقوق کے ترک کرنے پر صبر کی تلقین فرما کر یہ ہدایت فرمادی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تعلق کو قطع کرنے سے بچنا چاہئے، اور چاہئے کہ جانبین سے کچھ کچھ حقوق ترک کر کے کسی خاص صورت پر صلح کرلیں۔

اس آیت کے شروع میں تو میاں بیوی کے باہمی اِختلاف کے وقت صلح کا صرف جائز ہونا بتلایا گیا ہے، اور آخرِ آیت میں صلح نہ ہونے کی صورت میں بھی صبر و تحمل کے ساتھ تعلق نبھانے کی تلقین فرمائی گئی ہے، درمیان میں ایک ایسا جملہ اِرشاد فرمایا ہے جس سے مصالحت کا پسندیدہ اور افضل و بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے، اِرشاد ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یعنی ''باہمی مصالحت کرنا بہتر ہے'' اور یہ جملہ ایسے عام عنوان سے بیان فرمایا جس میں زیرِ بحث میاں بیوی کے جھگڑے بھی داخل ہیں، اور دُوسری قسم کے گھریلو اِختلافات بھی، اور تمام دُنیا کے معاملات کے باہمی جھگڑے اور خصومات و مقدمات بھی، کیونکہ الفاظِ قرآن عام ہیں کہ صلح بہتر ہے۔

خلاصۂ مضمون یہ کہ طرفین سے اپنے اپنے پورے مطالبہ پر اَڑے رہنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ طرفین اپنے کچھ مطالبات سے دستبردار ہوکر کسی درمیانی صورت پر رضامندی کے ساتھ مصالحت کرلیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

كُلُّ صُلْحٍ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا صُلْحًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوْ حَرَّمَ حَلَالًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا۔ [1] (رواه الحاكم عن كثير بن عبدالله، تفسير مظهری)

''یعنی مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی مصالحت جائز ہے، بجز اُس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو، اور مسلمانوں کو اپنی مانی ہوئی شرطوں پر قائم رہنا چاہئے، بجز اُن شرائط کے جن کے ذریعہ کسی حلال کو حرام قرار دِیا گیا ہو۔''

مثلاً کسی عورت سے اس بات پر صلح کرلینا جائز نہیں کہ اس کے ساتھ اس کی بہن کو بھی نکاح میں رکھا جائے، کیونکہ

[1] المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، باب الصلح جائز بين المسلمين رقم الحديث: ۷۱۵۹

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا شرعاً حرام ہے، یا اس پر صلح کرے کہ دُوسری بیوی کے حقوق ادا نہ کرے گا، کیونکہ اس میں ایک حلال کو حرام ٹھہرانا ہے۔

اور روایت میں چونکہ عموم کے ساتھ ہر صلح کو جائز قرار دِیا ہے اس عموم سے اِمامِ اعظم رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ نکالا کہ صلح کی سب اقسام جائز ہیں، خواہ اِقرار کے ساتھ ہو جیسے مدعا علیہ یہ اِقرار کرے کہ مدعی کے دعوے کے مطابق میرے ذمہ اس کے ایک ہزار روپے واجب الادا ہیں، پھر مصالحت اس پر ہو جائے کہ مدعی اس میں سے کچھ رقم چھوڑ دے یا اس رقم کے معاوضہ میں اس سے کوئی چیز لے لے، یا مدعا علیہ دعوے کے بارے میں اِقرار و اِنکار کچھ نہ کرے، اور کہے کہ حقیقت میں جو کچھ بھی ہو میں چاہتا ہوں کہ تم اس صورت پر صلح کر لو، یا مدعا علیہ دعوے سے قطعی اِنکار کرے، لیکن انکار کے باوجود جھگڑا قطع کرنے کے لئے کچھ دینے پر راضی ہو جائے اور اس پر صلح ہو جائے، یہ تینوں قسمیں صلح کی جائز ہیں، سکوت اور اِنکار کی صورت میں بعض ائمہ فقہاء کا اِختلاف بھی ہے۔

آخر میں ایک مسئلہ قابلِ ذِکر ہے، جس کا تعلق زوجین کی باہمی مصالحت سے ہے، جس کا ذِکر اس آیت میں کیا گیا ہے وہ یہ کہ اگر کسی عورت نے اپنے بعض حقوق کا مطالبہ ترک کر دینے پر صلح کر لی تو یہ صلح عورت کے اس حق کو تو قطعی طور پر ختم کر دے گی جو بوقتِ صلح شوہر کے ذمہ عائد ہو چکا ہے، جیسے دَینِ مہر کہ وہ شوہر پر اس صلح سے پہلے واجب الادا ہو چکا ہے، لہٰذا جب وہ پورا مہر یا اس کا کوئی جز معاف کر دینے پر صلح کرے تو یہ مہر یا اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا، اس کے بعد اس کو مطالبہ کا حق باقی نہ رہے گا، لیکن جو حقوق ایسے ہیں کہ بوقتِ صلح ان کی ادائیگی شوہر پر واجب ہی نہ تھی، مثلاً آئندہ زمانہ کا نان نفقہ یا حقِ شب باشی جس کا وجوب آنے والے زمانہ میں ہوگا، بالفعل اس کے ذمہ واجب الادا نہیں ہے، ان حقوق کے ترک پر اگر مصالحت کر لی گئی تو عورت کا حقِ مطالبہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ جب اس کا دِل چاہے یہ کہہ سکتی ہے کہ آئندہ میں اپنا یہ حق چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس صورت میں شوہر کو اِختیار ہوگا کہ اس کو آزاد کر دے۔ (تفسیر مظہری وغیرہ)[1]

آخری آیت یعنی وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ میں فریقین کو تسلی دی گئی کہ اگر اِصلاح و مصالحت کی سب کوششیں ناکام ہو کر الگ ہی ہونا پڑے تو اس سے بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دُوسرے سے مستغنی فرما دیں گے، عورت کے لئے کوئی دُوسرا ٹھکانا اور تکفل کا ذریعہ اور مرد کے لئے دُوسری عورت مل جائے گی، اللہ تعالیٰ کی قدرت بڑی وسیع ہے، اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ان میں سے ہر ایک نکاح سے پہلی زندگی پر نظر ڈالے کہ ایک دُوسرے کو پہچانتا بھی نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے جوڑ ملا دیا، آج بھی پھر ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

---

[1] تفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۲ ص:۲۵۶، ۲۵۷

آخرِ آیت میں وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ فرما کر اس بات کو اور پختہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی وسعت ہے، اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے، ممکن ہے کہ اس علیحدگی ہی میں حکمت و مصلحت ہو، جدائی کے بعد دونوں کو ایسے جوڑے مل جائیں کہ دونوں کی زندگی سدھر جائے۔

اُمورِ غیر اِختیاریہ پر مؤاخذہ نہیں

اِزدواجی زندگی کو خوشگوار اور پائیدار بنانے کے لئے قرآنِ عظیم نے مذکورہ آیات میں جو ہدایتیں فریقین کو دِی ہیں ان آیات میں ایک آیت یہ ہے: وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ جس میں فریقین کو ایک خاص ہدایت فرمائی، وہ یہ کہ ایک مرد کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں تو قرآنِ کریم نے سورۂ نساء کے شروع میں اس کو یہ ہدایت دی کہ سب بیویوں میں عدل و مساوات قائم رکھنا اس کے ذمہ فرض ہے، اور جو خیال کرے کہ اس فرض کو میں ادا نہ کرسکوں گا تو اس کو چاہئے کہ ایک سے زائد بیبیاں نہ کرے، اِرشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء:۳) یعنی ''اگر تم کو یہ خطرہ ہو کہ دو بیویوں میں مساوات نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی پر اِکتفا کرو۔''

اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیویوں میں عدل اور برابری کو نہایت تاکیدی حکم قرار دیا ہے، اور اس کی خلاف ورزی پر سخت وعید سنائی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہراتؓ میں برابری اور عدل کا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور ساتھ ہی بارگاہِ جل شانہٗ میں عرض کیا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ۔ [1]

''یعنی اے اللہ! یہ میری منصفانہ تقسیم اور مساوات اس چیز میں ہے جو میرے اِختیار میں ہے، اس لئے جو چیز آپ کے اِختیار میں ہے میرے اِختیار میں نہیں، یعنی قلبی میلان اور رُجحان، اس میں مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمایئے۔''

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا کون ہوسکتا ہے؟ مگر قلبی میلان کو آپ نے بھی اپنے اِختیار سے باہر قرار دِیا، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا۔

سورۂ نساء کی شروع کی آیت کے ظاہری الفاظ سے بیویوں میں مطلقاً مساوات و برابری کا فرض ہونا معلوم ہوتا تھا، جس میں قلبی میلان میں بھی مساوات کرنا داخل ہے، اور یہ معاملہ انسان کے اِختیار میں نہیں، اس لئے سورۂ نساء کی اس آیت میں حقیقتِ حال کی وضاحت فرمادی کہ جن چیزوں پر تمہیں قدرت نہیں ہے ان میں مساوات فرض نہیں ہے، البتہ

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء ج:۱ ص:۲۹۰

برابری اختیاری معاملات میں ہوگی، مثلاً شب باشی، طرزِ معاشرت اور نفقہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اس عنوان سے بیان فرمایا جس سے ایک شریف انسان عمل کرنے پر مجبور ہوجائے، فرمایا:-

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ یعنی ''تمہیں معلوم ہے کہ تم سب بیویوں میں اگر کوشش بھی کرو تو قلبی میلان کے بارے میں مساوات نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں، تو پھر ایسا نہ کرو کہ پورے ہی ایک طرف ڈھل جاؤ، یعنی قلبی میلان تو اس طرف تھا ہی، اور اختیاری معاملات میں بھی اسی کو ترجیح دینے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہوجائے کہ دوسری عورت لٹکی ہی رہ جائے'' یعنی شوہر اس کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اور اس کو آزاد بھی نہ کرے۔

معلوم ہوا کہ اس آیت میں عدل پر کسی کی قدرت نہ ہونے کا جو ذکر ہے وہ قلبی میلان کی برابری ہے جو انسان کے اختیار میں نہیں، اور اس آیت کے الفاظ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ میں خود اس مفہوم کا قرینہ موجود ہے، کیونکہ معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ اگرچہ قلبی میلان میں برابری تمہاری قدرت میں نہیں، مگر بالکل ایک ہی طرف کے نہ ہو رہو، کہ اختیاری معاملات میں بھی اس کو ترجیح دینے لگو۔

اس طرح یہ آیت سورۂ نساء کی پہلی آیت کی تشریح ہوگئی کہ اس کے ظاہری الفاظ سے قلبی میلان میں بھی مساوات کا فرض ہونا معلوم ہو رہا تھا، اس آیت نے کھول دیا کہ یہ بوجہ غیر اختیاری ہونے کے فرض نہیں، بلکہ فرض اُمورِ اختیاریہ میں مساوات ہے۔

اس آیت سے تعدّدِ ازدواج کے خلاف استدلال قطعاً غلط ہے

مذکورہ تفصیل سے ان لوگوں کی غلط فہمی بھی واضح ہوگئی جو ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ شروع سورۂ نساء کی آیت میں یہ حکم دیا کہ اگر چند بیویوں میں مساوات نہ کرسکو تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو، دوسرا نکاح نہ کرو۔ اور اس دوسری آیت نے یہ بتلا دیا کہ دو بیویوں میں مساوات ممکن ہی نہیں، اس لئے نتیجہ یہ نکل آیا کہ دو بیویوں کو نکاح میں رکھنا ہی جائز نہیں۔ اور عجب بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے خود ان دونوں آیتوں کے اندر اس غلط فہمی کے ازالے کا سامان رکھ دیا ہے، دوسری آیت کا قرینہ ابھی گزر چکا ہے، کہ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ کے الفاظ ہیں، اور پہلی آیت میں یہ فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء: ۳) اس میں بطور شرط کے یہ فرمانا کہ ''اگر تمہیں خطرہ ہو'' یہ لفظ کھلا ہوا قرینہ اس کا ہے کہ دو بیویوں میں عدل و برابری ناممکن یا اختیار سے خارج نہیں، ورنہ اس طویل عبارت کی اور پھر وہ بھی دو آیتوں میں کوئی ضرورت ہی نہ تھی، جیسے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ (النساء: ۲۳) والی آیت میں ان عورتوں کی تفصیل دی جن

سے نکاح حرام ہے، اور وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (النساء: ٢٣) فرما کر دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت بتلائی گئی ہے، اسی طرح یہ بھی فرمادیا جاتا کہ ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں رکھنا حرام ہے، اور پھر وَاَنْ تَجْمَعُوْا کے ساتھ بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ کی قید فضول ہو جاتی، اسی ایک ہی جملہ میں یوں فرمادیا جاتا: "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ امْرَاَتَين" یعنی مطلقاً دو عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے، مگر قرآنِ کریم نے اس مختصر کلام کو چھوڑ کر نہ صرف ایک طویل عبارت اِختیار کی بلکہ دو آیتوں میں اس کی تفصیل بیان فرمائی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آیت وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ بھی ایک حیثیت سے اس کا جواز بتلا رہی ہے کہ ایک سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا تو جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ دونوں آپس میں بہنیں نہ ہوں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا

اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور ہم نے حکم دیا ہے

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

پہلے کتاب والوں کو اور تم کو کہ ڈرتے رہو اللہ سے، اور اگر نہ مانو گے

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿١٣١﴾

تو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور اللہ ہے بے پروا سب خوبیوں والا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾

اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور اللہ کافی ہے کارساز۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ

اگر چاہے تو تم کو دُور کردے اے لوگو! اور لے آئے اور لوگوں کو، اور اللہ کو

عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا

یہ قدرت ہے۔ جو کوئی چاہتا ہو ثواب دُنیا کا سو اللہ کے یہاں ہے ثواب دُنیا کا

وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع

اور آخرت کا، اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ ہم نے تم سے پہلے اہلِ کتاب کو بھی اور تمہیں بھی یہی تاکید کی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر اپناؤ گے تو (اللہ کا کیا نقصان ہے؟ کیونکہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ ہر ایک سے بے نیاز اور بذاتِ خود لائق تعریف ہے۔ ﴿۱۳۱﴾ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور کام بنانے کے لئے اللہ ہی کافی ہے ﴿۱۳۲﴾ اگر وہ چاہے تو اے لوگو! تم سب کو (دُنیا سے) لے جائے اور دُوسروں کو (تمہاری جگہ یہاں) لے آئے۔ اللہ اس بات کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ ﴿۱۳۳﴾ جو شخص (صرف) دُنیا کا ثواب چاہتا ہو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ کے پاس دُنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے۔ اللہ ایسا ہے کہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ ﴿۱۳۴﴾

ربطِ آیات

عورتوں اور یتیموں کے اَحکام بیان کرنے کے بعد قرآنی اُسلوب کے مطابق پھر ترغیب و ترہیب کا مضمون اِرشاد فرمایا گیا۔

خلاصۂ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں، (تو ایسے مالک کے اَحکام کا ماننا بہت ہی ضروری ہے) اور (بجا آوری اَحکام کا خطاب خاص تم ہی کو نہیں ہوا بلکہ) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی توراۃ و اِنجیل) ملی تھی اور تم کو بھی (حکم دیا ہے) کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو (جس کو تقویٰ

کہتے ہیں، جس میں تمام اَحکام کی موافقت داخل ہے، اسی لئے اس سورۃ کو تقویٰ سے شروع کر کے اس کی تفصیل میں مختلف اَحکام لائے ہیں) اور (یہ بھی ان کو اور تم کو سنایا گیا کہ) اگر تم ناشکری کرو گے (یعنی اَحکامِ الٰہیہ کی مخالفت کرو گے) تو (خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں ہاں تمہارا ہی ضرر ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی (تو) ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (ایسے بڑے سلطان کا کیا ضرر ہوگا، البتہ ایسے بڑے سلطان کی مخالفت بلاشک مضر ہے) اور اللہ تعالیٰ کسی (کی اِطاعت) کے حاجت مند نہیں (اور) خود اپنی ذات میں محمود (وکامل الصفات) ہیں (پس کسی کی مخالفت سے ان کی صفات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا) اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور (جب وہ ایسے قادر و مختار ہیں تو اپنے اِطاعت گزار بندوں کے لئے وہ) اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (پس ان کی کارسازی کے ہوتے ان کے فرمانبرداروں کو کون ضرر پہنچا سکتا ہے، پس کسی سے ڈرنا نہ چاہئے، اور اللہ تعالیٰ جو تم کو دِین کے کام بتلا رہے ہیں تو تمہاری ہی سعادت کے لئے ورنہ وہ دُوسروں سے بھی کام لے سکتے ہیں، کیونکہ ان کی ایسی قدرت ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اے لوگو! تم سب کو فنا کر دیتا اور دُوسروں کو موجود کر دیتا (اور ان سے کام لے لیتا، جیسا دُوسری آیت میں ہے وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ اِلخ (محمد:۳۸)) اور اللہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں (پھر ایسا جو نہیں کیا تو ان کی عنایت ہے، اِطاعتِ حکم کو غنیمت سمجھ کر سعادت حاصل کرو اور دیکھو دِین کے کام کا اصلی ثمرہ آخرت میں ہے دُنیا میں نہ ملنے سے بددِل نہ ہونا بلکہ) جو شخص (دِین کے کام میں) دُنیا کا معاوضہ چاہتا ہو تو (وہ بڑی غلطی میں ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی ان کی قدرت میں) تو دُنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ (موجود) ہے (جب ادنیٰ اعلیٰ دونوں پر ان کی قدرت ہے، تو اعلیٰ ہی چیز کیوں نہ مانگی جائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (سب کے اقوال اور درخواستوں کو دُنیا کی ہوں یا دِین کی سنتے ہیں، اور سب کی نیتوں کو دیکھتے ہیں، پس طالبانِ آخرت کو ثواب دیں گے، اور طالبانِ دُنیا کو آخرت میں محروم رکھیں گے، پس آخرت ہی کی نیت اور درخواست کرنا چاہئے، البتہ دُنیا کی حاجت مستقل طور پر مانگنا مضائقہ نہیں، لیکن عبادت میں یہ قصد نہ کرے)۔

معارف و مسائل

فوائدِ مُہمّہ

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی ''اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات'' اِس جگہ ان الفاظ کو تین مرتبہ دُہرایا گیا، اوّل سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، دُوسرے سے بے نیازی

اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پروا نہیں اگر تم منکر ہو، تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے کہ اگر تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو تو وہ تمہارے سب کام بنا دے گا۔

تیسری آیت میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دُنیا سے اُٹھالے، اور دُوسرے لوگ مطیع وفرمانبردار پیدا کر دے، اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی خوب ظاہر ہوگئی، اور نافرمانوں کو پوری طرح تہدید اور تخویف بھی ہوگئی۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى

اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف اگرچہ نقصان ہو

اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ

تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا، اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج ہے تو اللہ

اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا

ان کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے، سو تم پیروی نہ کرو دِل کی خواہش کی انصاف کرنے میں، اور اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے بنو، اللہ کی خاطر گواہی دینے والے، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑتی ہو، یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینے کا حکم دیا جارہا ہے) چاہے امیر ہو یا غریب، اللہ دونوں قسم کے لوگوں کا (تم سے) زیادہ خیرخواہ ہے، لہٰذا ایسی نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلنا جو تمہیں انصاف کرنے سے روکتی ہو۔ اور اگر تم توڑ مروڑ کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا (سچی گواہی دینے سے) پہلو بچاؤ گے تو (یاد رکھنا کہ) اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۱۳۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی) اِنصاف پر خوب قائم رہنے والے (اور اِقرار یا شہادت کی نوبت آوے تو) اللہ (کی خوشنودی) کے لئے (سچی) گواہی (اور اِظہار) دینے والے رہو، اگرچہ (وہ گواہی اور اِظہار) اپنی ہی ذات کے خلاف ہو (جس کو اِقرار کہتے ہیں) یا کہ والدین اور دُوسرے رِشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو (اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہئے، تاکہ اس سے بے مروّتی نہ ہو، یا یہ کہ یہ غریب ہے، اس کا کیسے نقصان کردیں، تم گواہی دینے میں کسی کی امیری، غریبی یا نفع ونقصان کو نہ دیکھو، کیونکہ) وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی) اگر اَمیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے (اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دِیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر جب باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے خواہ اس سے وقتی طور پر کچھ نقصان بھی پہنچ جائے تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو) سو تم (اس شہادت میں) خواہشِ نفس کا اِتباع مت کرنا، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم کج بیانی کروگے (یعنی غلط گواہی دوگے) یا پہلوتہی کروگے (یعنی شہادت کو ٹالوگے) تو (یاد رکھنا) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

معارف ومسائل

دُنیا میں انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجنے کا اصل مقصد عدل واِنصاف کا قیام ہے، اسی سے دُنیا کا امن وامان قائم رہ سکتا ہے

سورۂ نساء کی اس آیت میں تمام مسلمانوں کو عدل واِنصاف پر قائم رہنے اور سچی گواہی دینے کی ہدایت کی گئی ہے، اور جو چیزیں قیامِ عدل یا سچی گواہی میں رُکاوٹ ہوسکتی ہیں ان کو نہایت بلیغ انداز میں دُور کیا گیا ہے، اسی مضمون کی ایک آیت نمبر ۸ سورۂ مائدہ میں بھی آنے والی ہے، دونوں کا مضمون بلکہ الفاظ بھی تقریباً مشترک ہیں، اور سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجنے کا اور پھر اُن کے بعد دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجتے رہنے کا، اور ان کے ساتھ بہت سی کتابیں اور صحیفے نازل فرمانے کا اہم مقصد یہی تھا

کہ دُنیا میں اِنصاف اور اس کے ذریعے امن وامان قائم ہو، ہر فردِ اِنسانی اپنے اپنے دائرۂ اِختیار میں اِنصاف کو اپنا شعار بنالے، اور جو سرکش لوگ وعظ و پند اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے عدل و اِنصاف پر نہ آئیں، اپنی سرکشی پر اَڑے رہیں، ان کو قانونی سیاست اور تعزیر و سزا کے ذریعہ اِنصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

سورۂ حدید کی پچیسویں آیت میں اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا ہے:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید:۲۵)

''یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں اِنصاف پر، اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں بڑا رُعب ہے، اور اس سے لوگوں کے کام چلتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بعثتِ انبیاء علیہم السلام اور تنزیلِ کتبِ سماویہ کا سارا نظام اِنصاف ہی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے، رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لئے عمل میں آیا ہے، اور آخر میں لوہا اُتارنے کا ذِکر کرکے اس طرف بھی اِشارہ فرمادیا کہ سب لوگوں کو اِنصاف پر قائم رکھنے کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کافی نہ ہوگی، بلکہ کچھ شریر لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو لوہے کی زنجیروں اور دُوسرے ہتھیاروں سے مرعوب کرکے اِنصاف پر قائم کیا جائے گا۔

عدل و اِنصاف پر قائم رہنا صرف حکومت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر اِنسان اس کا مکلّف ہے

سورۂ حدید کی آیتِ مذکورہ اور سورۂ نساء کی اِس آیت میں اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ سے واضح طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اِنصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر اِنسان اس کا مکلّف و مخاطب ہے کہ وہ خود اِنصاف پر قائم رہے اور دُوسروں کو اِنصاف پر قائم رکھنے کے لئے کوشش کرے، ہاں اِنصاف کا صرف ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ شریر اور سرکش اِنسان جب اِنصاف کے خلاف اَڑ جائیں، نہ خود اِنصاف پر قائم رہیں، نہ دُوسروں کو عدل و اِنصاف کرنے دیں، تو حاکمانہ تعزیر اور سزا کی ضرورت ہے، یہ اِقامتِ عدل و اِنصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کرسکتی ہے جس کے ہاتھ میں اِقتدار ہے۔

آج کی دُنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیئے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اِنصاف کرنا صرف

حکومت وعدالت کا فریضہ ہے، عوام اس کے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک، ہر سلطنت میں حکومت اور عوام کو دو متضاد فریق بنا دیا ہے، راعی اور رعیت کے درمیان خلاف و اختلاف کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے، ہر ملک کے عوام اپنی حکومت سے عدل و انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن خود کسی انصاف پر قائم رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اسی کا نتیجہ ہے جو دُنیا آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، کہ قانون معطل ہے، جرائم کی روز افزوں ترقی ہے، آج ہر ملک میں قانون سازی کے لئے اسمبلیاں قائم ہیں، اُن پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے، ان کے نمائندے منتخب کرنے کے لئے الیکشن میں خدا کی پوری زمین ہل جاتی ہے، اور پھر یہ پورے ملک کا دِل و دِماغ ملک کی ضروریات اور لوگوں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ قانون بناتے ہیں، اور پھر رائے عامہ کے لئے شائع کرتے ہیں، رائے عامہ معلوم کرنے کے بعد یہ قانون قابلِ تنفیذ سمجھا جاتا ہے، پھر اس کے نفاذ کے لئے حکومت کی لاتعداد مشینری حرکت میں آتی ہے، جس کے ہزاروں بلکہ لاکھوں شعبے ہوتے ہیں، اور ہر شعبہ میں ملک کے بڑے بڑے آزمودہ کار لوگوں کی محنتیں بروئے کار آتی ہیں، لیکن چلی ہوئی رُسوم کی دُنیا سے ذرا نظر کو اُونچا کر کے دیکھا جائے اور جن لوگوں کو خواہ مخواہ تہذیب اور شائستگی کا ٹھیکے دار مان لیا گیا ہے تھوڑی دیر کے لئے ان کی کورانہ تقلید سے نکل کر حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو ہر شخص بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ ؎

نگاہِ خلق میں دُنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
مری نظروں میں پھیکا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

اب سے سو سال پہلے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کا ہی موازنہ کریں، اعداد و شمار محفوظ ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ جوں جوں قانون سازی بڑھی، قانون میں عوام کی مرضی کی نمائش بڑھی اور تنفیذِ قانون کے لئے مشینری بڑھی، ایک پولیس کے بجائے مختلف اَقسام کی پولیس بروئے کار آئی، اتنے ہی روز بروز جرائم بڑھے، اور لوگ اِنصاف سے دُور ہوتے چلے گئے، اور اسی رفتار سے دُنیا کی بدامنی بڑھتی چلی گئی۔

امنِ عالم کی ضمانت صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا دے سکتا ہے

کوئی مردِ رشید نہیں جو آنکھ کھول کر دیکھے، اور چلتی ہوئی رسموں کی جکڑ بندی کو توڑ کر ذرا رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو سوچے سمجھے، اور اس حقیقت پر غور کرے کہ دُنیا کا امن وسکون نرے تعزیرات سے نہ کبھی حاصل ہوا نہ آئندہ ہوگا، عالم کے امن وامان کی ضمانت صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا دے سکتا ہے، جس کے ذریعہ سارے فرائض راعی اور رعیت اور عوام اور حکومت میں مشترک ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگتا ہے، قانون کے

احترام وحفاظت کے لئے عوام یہ کہہ کر آزاد نہیں ہوجاتے کہ یہ کام حکام کا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ آیتیں بسلسلۂ قیامِ عدل و اِنصاف اسی اِنقلابی عقیدہ کی تلقین پر ختم کی گئی ہیں۔

سورۂ نساء کی اس آیت کے ختم پر فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ کا اِرشاد ہوا، اور سورۂ مائدہ کی آیت کے آخر میں اوّل تقویٰ کی ہدایت فرمائی، اور پھر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ اور سورۂ حدید کی آیت کے آخر میں اِرشاد ہوا: اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ ۔

ان تینوں آیتوں میں حکام اور عوام دونوں کو عدل و اِنصاف پر قائم رہنے اور قائم رکھنے کی ہدایات دینے کے بعد خواتمِ آیات میں سب کی نظریں اس حقیقت کی طرف پھیر دی گئی ہیں جو اِنسان کی زندگی اور اس کے خیالات اور جذبات میں اِنقلابِ عظیم پیدا کرنے والی ہے، یعنی خدا تعالیٰ کی قوّت وسلطنت اس کے سامنے حاضری اور حساب وکتاب اور جزا وسزا کا تصوّر، یہی وہ چیز تھی جس نے اب سے سو برس پہلے کی ناخواندہ دُنیا کو آج کی نسبت بہت زیادہ امن وسکون بخشا ہوا تھا، اور یہی وہ چیز ہے جس کے نظر اَنداز کردینے کی وجہ سے آج کی ترقی یافتہ آسمانوں سے باتیں کرنے والی، سیارے اُڑانے والی دُنیا امن وچین سے محروم ہے۔

روشن خیال دُنیا سن لے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وہ آسمان کی طرف چڑھ سکتے ہیں، سیاروں پر جاسکتے ہیں، سمندر میں جاسکتے ہیں، لیکن امن وامان اور سکون واِطمینان جو ان سارے سامانوں اور سارے کارخانوں کا اصل مقصد ہے، وہ نہ ان کو کسی سیارے میں ہاتھ آئے گا، نہ کسی نئی سے نئی ایجاد میں، وہ ملے گا تو پیغمبرِ عربی رُوحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور ان کی تعلیمات میں، خدا تعالیٰ کو ماننے اور آخرت کے حساب پر عقیدہ رکھنے میں، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (الرعد)، سائنس کے حیرت انگیز اِنکشافات روز بروز خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی بے مثال صنعت کاری کو اور زیادہ روشن کرتے جاتے ہیں، جن کے سامنے ہر اِنسانی ترقی اپنے عجز ودرماندگی کا اِعتراف کرکے رہ جاتی ہے، مگر ؎

"چہ سود چوں دلِ دانا وچشم بینا نیست" [۱]

قرآنِ حکیم نے ایک طرف تو دُنیا کے سارے نظام کا منشا یہی قیامِ عدل واِنصاف بتلایا، دُوسری طرف اس کا ایک بے مثال اِنتظام ایسا عجیب وغریب فرمایا کہ اگر اس کے پورے نظام کو اَپنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہی خونخوار وبدکار دُنیا ایک ایسے صالح معاشرے میں تبدیل ہوجائے جو آخرت کی جنت سے پہلے نقد جنت ہو، اور اِرشادِ قرآنی: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ (الرحمٰن) جس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کو دو جنتیں ملیں گی، ایک آخرت میں، دُوسری نقد دُنیا ہی میں، اس کا ظہور مشاہدہ میں آجائے، اور یہ کوئی صرف فرضی خیال یا خیالی اسکیم نہیں، اس

[۱] ترجمہ:- (اس اِنسانی ترقی کا) کیا فائدہ؟ جب سوچنے والا دِل اور دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے۔

پیغام کے لانے والے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی صورت میں لا کر چھوڑا ہے، اور اُن کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دُوسرے متبعِ سنت سلاطین نے جب بھی اُس پر عمل کیا تو شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے کی فرضی مثال ایک حقیقت بن کر لوگوں کے مشاہدہ میں آگئی، غریب و امیر، مزدور و سرمایہ دار کا تفرقہ یکسر مٹ گیا، قانون کا احترام ہر فرد اپنے گھروں کے بند کمروں میں، رات کی تاریکیوں میں کرنے لگا، یہ کوئی افسانہ نہیں، تاریخی حقائق ہیں، جن کا اِعتراف غیروں نے بھی کیا، اور ہر صاف دِل غیر مسلم بھی اس کے ماننے پر مجبور ہوا۔

مضمونِ آیت کے بعد آیت کی تفسیر تفصیلاً دیکھئے:۔

مذکورہ آیت میں كُونُوا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ فرمایا گیا، "قِسْط" بکسر القاف کے معنی ہیں عدل و اِنصاف، اور عدل و اِنصاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحبِ حق کا حق پورا اَدا کیا جائے، اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی داخل ہیں، اور سب قسم کے اِنسانی حقوق بھی، اس لئے قیام بالقسط کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے، مظلوم کی حمایت کی جائے، اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کا حق دِلوانے کے لئے شہادت کی ضرورت پیش آئے تو شہادت سے گریز نہ کیا جائے، اور یہ بھی داخل ہے کہ شہادت میں حق اور حقیقت کا اِظہار کیا جائے، خواہ وہ کسی کے موافق پڑے یا مخالف، یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور اِنتظام ہے، جب دو فریق کا کوئی مقدمہ ان کے سامنے پیش ہو تو فریقین کے ساتھ برابری کا معاملہ کریں، کسی ایک طرف کسی طرح کا میلان نہ ہونے دیں، گواہوں کے بیانات غور سے سنیں، معاملہ کی تحقیق میں اپنی پوری کوشش خرچ کریں، پھر فیصلہ میں پورے پورے عدل و اِنصاف کا معاملہ رکھیں۔

عدل و اِنصاف کے قیام میں رُکاوٹ بننے والے اسباب

سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی یہ دونوں آیتیں اگرچہ مختلف سورتوں کی ہیں، لیکن مضمون دونوں کا تقریباً قدرِ مشترک ہے، فرق اتنا ہے کہ عدل و اِنصاف کی راہ میں رُکاوٹ ڈالنے والی عادۃً دو چیزیں ہوا کرتی ہیں، ایک کسی کی محبت و قرابت یا دوستی و تعلق جس کا تقاضا شاہد کے دِل میں یہ ہوتا ہے کہ شہادت اُن کے موافق دی جائے تاکہ یہ نقصان سے محفوظ رہیں یا ان کو نفع پہنچے اور فیصلہ کرنے والے قاضی یا جج کے دِل میں اس تعلق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ ان کے حق میں دے، دُوسری چیز کسی کی عداوت و دُشمنی ہے، جو شاہد کو اس کے خلاف شہادت پر آمادہ کرسکتی ہے، اور قاضی اور جج کو اس کے خلاف فیصلہ دینے کی باعث ہوسکتی ہے، غرض محبت و عداوت دو ایسی چیزیں ہیں جو اِنسان کو عدل و اِنصاف کی راہ سے ہٹا کر ظلم و جور میں مبتلا کرسکتی ہیں، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی دونوں آیتوں میں انہی دونوں رُکاوٹوں کو دُور کیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں

قرابت وتعلق کی رُکاوٹ دُور کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے: اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ یعنی اگرچہ تمہاری شہادت اپنے ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں ہی کے خلاف پڑے تو بھی حق بات کہنے اور سچی شہادت دینے میں اس تعلق کا لحاظ نہ کرو۔

اور سورۂ مائدہ کی آیت میں عداوت اور دُشمنی کی رُکاوٹ کو دُور کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫ یعنی کسی قوم کا بغض وعداوت بھی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہونا چاہئے کہ راہِ عدل کو چھوڑ کر ان کے خلاف گواہی یا فیصلہ دینے لگو۔

دونوں آیتوں کے عنوان وتعبیر میں بھی تھوڑا فرق ہے، سورۂ نساء کی آیت میں: قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ فرمایا گیا، اور سورۂ مائدہ کی آیت میں: قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ ارشاد ہوا، یعنی پہلی آیت میں دو چیزوں کی ہدایت ہے، ایک ''قیام بالقسط'' اور دُوسری ''شہادت للہ''، اور دُوسری آیت میں بھی دو ہی چیزیں مأمور بہ ہیں، مگر عنوان بدل کر ''قیام للہ'' اور ''شہادت بالقسط''۔

اکثر حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اس تغیرِ عنوان سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، کہیں ''قیام بالقسط'' اور ''شہادت للہ'' سے تعبیر کر دیا گیا، کہیں ''قیام للہ'' اور ''شہادت بالقسط'' کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا، ان دونوں آیتوں کے طرزِ بیان میں یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ یا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ کا طویل جملہ اختیار فرمایا گیا، حالانکہ عدل وانصاف کا حکم صرف ایک لفظ "اَقْسِطُوْا" کے ذریعہ بھی دیا جاسکتا تھا، اس طویل جملہ کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ اتفاقی طور پر کسی معاملہ میں عدل وانصاف کر دینے سے ذمہ داری پوری نہیں ہوجاتی، کیونکہ کسی نہ کسی معاملے میں انصاف ہوجانا تو ایک ایسا طبعی اَمر ہے کہ ہر بُرے سے بُرے اور ظالم سے ظالم حاکم پر بھی صادق ہے، کہ اس سے بھی کسی معاملہ میں تو انصاف ہو ہی جاتا ہے، اس جملہ میں لفظ قَوّٰمِیْنَ استعمال فرما کر یہ بتلایا کہ عدل وانصاف پر ہمیشہ، ہر وقت، ہر حال اور ہر دوست دُشمن کے لئے قائم رہنا ضروری ہے۔

پھر ان دونوں آیتوں میں پوری دُنیا کو عدل وانصاف پر قائم کرنے اور قائم کرانے کے لئے جو زرّیں اُصول اختیار کئے گئے ہیں وہ بھی قرآنِ عظیم ہی کی خصوصیات میں سے ہیں۔

ان میں سے ایک اہم چیز تو یہ ہے کہ حکام اور عوام سب کو خدا تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور روزِ جزا کے حساب سے ڈرا کر اس کے لئے تیار کیا گیا ہے کہ عوام خود بھی قانون کا احترام کریں، اور حکام جو تنفیذِ قانون کے ذمہ دار ہیں وہ بھی تنفیذِ

قانون میں خدا او آخرت کو سامنے رکھ کر خلقِ خدا کے خادم بنیں، قانون کو خدمتِ خلق اور اصلاحِ عالم کا ذریعہ بنائیں، لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ اور مظلوم کو دفتر گردی کے چکر میں پھنسا کر مزید ظلم پر ظلم کا سبب نہ بنائیں، قانون کو اپنی ذلیل خواہشات یا چند ٹکوں میں فروخت نہ کریں قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ یا شُھَدَآءَ لِلّٰہِ فرما کر حکام و عوام دونوں کو للّٰہیت اور اخلاصِ عمل کی دعوت دی گئی ہے۔

دُوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ عدل و انصاف کے قیام کی ذمہ داری پورے اَفرادِ انسانی پر ڈال دی گئی ہے، سورۂ نساء اور مائدہ میں تو اس کا مخاطب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرما کر پوری اُمتِ مسلمہ کو بنا دیا گیا ہے، اور سورۂ حدید میں لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ فرما کر اس فریضہ کو تمام اَفرادِ انسانی پر عائد کر دیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ فرما کر اس طرف ہدایت فرما دی کہ اِنصاف کا مطالبہ صرف دُوسروں ہی سے نہ ہو، بلکہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہئے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا اِظہار کرنا پڑے تو بھی حق و انصاف کے خلاف کچھ نہ بولے، اگرچہ اس کا نقصان اس کی ذات ہی پر پڑتا ہو، کیونکہ یہ نقصان حقیر و قلیل اور عارضی ہے، اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچالی گئی تو قیامت کا شدید عذاب اپنی جان کے لئے خرید لیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ

اے ایمان والو! یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی ہے

عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ

اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے، اور جو کوئی یقین نہ کرے اللہ پر

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ﴿۱۳۶﴾

اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر وہ بہک کر دُور جا پڑا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا

جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے، پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہوگئے، پھر بڑھتے رہے کفر میں

لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

تو اللہ ان کو ہرگز بخشنے والا نہیں اور نہ دکھلا وے ان کو راہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اُتاری ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس نے پہلے اُتاری تھی۔ اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور یومِ آخرت کا انکار کرے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دُور جا پڑا ہے ﴿۱۳۶﴾ جو لوگ ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے، اللہ ان کو بخشنے والا نہیں ہے، اور نہ انہیں راستے پر لانے والا ہے ﴿۱۳۷﴾

ربطِ آیات

اُوپر زیادہ حصہ اَحکامِ فرعیہ کا مذکور اور ایمان و کفر کے مباحث کہیں کہیں معاملات مع المخالفین کے ضمن میں آ گئے ہیں، آگے یہ مباحث قدرے تفصیل سے مذکور ہوتے ہیں، اور ختمِ سورت کے بالکل قریب تک چلے گئے ہیں، ترتیبِ بیان میں اوّل اس کا بیان ہے کہ شریعت میں ایمانِ معتبر کیا ہے، پھر کفار کے مختلف فرقوں کی مذمت عقائد میں بھی اور بعض اعمال میں بھی۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو (یعنی جو مجملاً ایمان لا کر مؤمنین کے زُمرہ میں داخل ہو چکے ہیں) تم (عقائدِ ضروریہ کی تفصیل سن لو کہ) اِعتقاد رکھو اللہ کی (ذات و صفات کے) ساتھ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت) کے ساتھ اور اس کتاب (کے حق ہونے) کے ساتھ جو اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) اپنے رسول (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی، اور ان کتابوں (کے حق ہونے) کے ساتھ (بھی) جو کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم سے) پہلے (اور نبیوں پر) نازل ہو چکی ہیں (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتبِ سابقہ پر ایمان لانے میں ملائکہ اور باقی انبیاء علیہم السلام اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا بھی داخل ہو گیا) اور جو شخص اللہ (کی ذات یا صفات) کا اِنکار کرے اور (اسی طرح جو) اس کے فرشتوں کا (اِنکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کی کتابوں کا (جس میں قرآن بھی آ گیا اِنکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کے

رسولوں کا (انکار کرے) تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دُور جا پڑا، بلاشبہ جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے (اور اس بار بھی اِسلام پر قائم نہ رہے ورنہ پہلا اِرتداد معاف ہو جاتا بلکہ) پھر کافر ہو گئے، پھر (مسلمان ہی نہ ہوئے ورنہ پھر بھی اِیمان مقبول ہو جاتا بلکہ) کفر میں بڑھتے چلے گئے (یعنی کفر پر دَمِ مرگ تک ثابت اور دائم رہے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ اُن کو (منزلِ مقصود یعنی بہشت کا) راستہ دِکھائیں گے (کیونکہ مغفرت اور جنت کے لئے موت تک مؤمن رہنا شرط ہے)۔

معارف ومسائل

فوائدِ مُہمّہ

(قولہ تعالیٰ) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا اِلــخ اس سے مراد منافقین ہیں، اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اوّل اِیمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے، پھر توبہ کر کے مؤمن ہوئے، پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت کا اِنکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔ (رُوح المعانی) [1]

(قولہ تعالیٰ) لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ؀ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ان کے بار بار کفر کی طرف لوٹنے سے ان کی توفیقِ حق ہی سلب ہو جائے گی، اور آئندہ توبہ کرنے اور اِیمان لانے کا موقع ہی نصیب نہ ہوگا، ورنہ جو قاعدہ قرآن وسنت کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ کیسا ہی کافر یا مرتد ہو، اگر سچی توبہ کر لے تو پچھلا گناہ معاف ہو جاتا ہے، یہ لوگ بھی توبہ کر لیں تو معافی کا قانون کھلا ہوا ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ۝۱۳۸ۙ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ

خوشخبری سنادے منافقوں کو کہ ان کے واسطے ہے عذاب دردناک۔ وہ جو بناتے ہیں کافروں کو

اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۭ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس عزّت؟ سو عزّت تو اللہ ہی کے واسطے ہے

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۶۹

جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ساری۔ اور حکم اُتار چکا تم پر قرآن میں کہ جب سنو اللہ کی آیتوں پر

يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا

انکار ہوتے اور ہنسی ہوتے تو نہ بیٹھو اُن کے ساتھ یہاں تک کہ مشغول ہوں

فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ

کسی دُوسری بات میں، نہیں تو تم بھی انہی جیسے ہوگئے، اللہ اکٹھا کرے گا منافقوں کو

وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ

اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ۔ وہ منافق جو تمہاری تاک میں ہیں، پھر اگر تم کو

فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا

فتح ملے اللہ کی طرف سے تو کہیں: کیا ہم نہ تھے تمہارے ساتھ؟ اور اگر نصیب ہو کافروں کو تو کہیں:

اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

کیا ہم نے گھیر نہ لیا تھا تم کو اور بچادیا تم کو مسلمانوں سے، سو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۲۰ ۱۷

قیامت کے دن، اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

منافقوں کو یہ خوشخبری سنادو کہ ان کے لئے ایک دُکھ دینے والا عذاب تیار ہے ﴿۱۳۸﴾ وہ منافق جو مسلمانوں کے

بجائے کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کر رہے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کی ہے ﴿۱۳۹﴾ اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقین رکھو کہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے ﴿۱۴۰﴾ (اے مسلمانو!) یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے (انجام کے) انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ملے تو (تم سے) کہتے ہیں کہ ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' اور اگر کافروں کو (فتح) نصیب ہو تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ''کیا ہم نے تم پر قابو نہیں پالیا تھا؟ اور کیا (اس کے باوجود) ہم نے تمہیں مسلمانوں سے نہیں بچایا؟''۔ بس اب تو اللہ ہی قیامت کے دن تمہارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کا ہرگز کوئی راستہ نہیں رکھے گا ﴿۱۴۱﴾

خلاصۂ تفسیر

منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے (آخرت میں) بڑی دردناک سزا (تجویز کی گئی) جن کی یہ حالت ہے کہ (عقائد تو اہلِ ایمان کے نہ رکھتے تھے مگر وضع بھی اہلِ ایمان کی نہ رکھ سکے چنانچہ) کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا ان کے پاس (جا کر) عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ سو (خوب سمجھ لو کہ) عزت تو ساری خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے (وہ جس کو چاہیں دیں، پس اگر خدا تعالیٰ ان کو یا جن سے جا جا کر دوستی کرتے ہیں ان کو عزت نہ دیں تو کہاں سے معزز بن جاویں گے) اور (اے مسلمانو! دیکھو تم منافقین کی طرح کفار کے ساتھ خصوصیت مت رکھنا خاص کر جس وقت وہ کفریات کا تذکرہ کرتے ہوں، چنانچہ اس سورۃ مدنیہ کے قبل بھی) اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان (سورۂ اَنعام (آیت: ۶۸) میں جو مکیہ ہے) بھیج چکا ہے (جس کا حاصل یہ ہے) کہ جب (کسی مجمع میں) اَحکامِ الٰہیہ کے ساتھ اِستہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو، جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں (اور یہ مضمون اس آیت کا حاصل ہے وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ اِلخ (الانعام: ۶۸) سو یہ اِستہزاء کرنے والے مکہ میں مشرکین تھے، اور مدینہ میں یہود تو علانیہ اور منافقین صرف غرباء و ضعفاء مسلمین کے رُوبرو، پس جس طرح وہاں مشرکین کی مجالست ایسے وقت میں ممنوع تھی یہاں یہود اور منافقین کی مجالست سے نہی ہے، اور یہ ممانعت ہم اس لئے کرتے ہیں) کہ اس حالت میں تم بھی (گناہ میں) انہی جیسے ہو جاؤ گے، (گو دونوں کی نوعیت میں فرق ہو کہ ایک گناہ کفر کا ہے دُوسرا فسق کا، اور اس ممانعتِ مجالست میں کفار اور منافقین سب برابر ہیں، کیونکہ علت اس کی خوض فی الکفر یعنی کفر کی باتوں کا تذکرہ اور اس خوض

کا منشا کفر ہے، اور اس میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ سزائے کفر یعنی دوزخ کا ایندھن ہونے میں بھی دونوں برابر ہوں گے، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے (اور) وہ (منافقین) ایسے ہیں کہ تم پر اُفتاد پڑنے کے منتظر (اور آرزومند) رہتے ہیں پھر (ان کے اس اِنتظار کے بعد) اگر تمہاری فتح من جانب اللہ ہوگئی تو (تم سے آکر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ (جہاد میں شریک) نہ تھے (کیونکہ نام ونمود کو تو مسلمانوں میں گھسے ہی رہتے تھے، مطلب یہ کہ ہم کو بھی غنیمت کا حصہ دو) اور اگر کافروں کو (غلبہ کا) کچھ حصہ مل گیا (یعنی وہ اِتفاق سے غالب آئے) تو (ان سے جا کر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے (مگر ہم نے قصداً تمہارے غالب کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد نہ کی اور ایسی تدبیر کی کہ لڑائی بگڑ گئی) اور کیا ہم نے (جب تم مغلوب ہونے لگے تھے) تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا (اِس طرح کہ ان کی مدد نہ کی، اور تدبیر سے لڑائی بگاڑ دی، مطلب یہ کہ ہمارا اِحسان مانو اور جو کچھ تمہارے ہاتھ آیا ہے ہم کو بھی کچھ حصہ دِلواؤ، غرض دونوں طرف سے ہاتھ مارتے ہیں) سو (دُنیا میں گو اِظہارِ اِسلام کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرمادیں گے اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے (بلکہ کفار مجرم قرار پا کر دوزخ میں جاویں گے، اور مسلمان اہلِ حق ثابت ہو کر جنت میں جائیں گے، اور فیصلۂ عملی یہی ہے)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت مین منافقین کے لئے دردناک عذاب کی خبر دِی گئی ہے، اور اس رنج دہ خبر کو لفظِ ''بشارت'' سے تعبیر کر کے اس طرف اِشارہ فرما دیا گیا کہ ہر اِنسان اپنے مستقبل کے لئے خوشخبری سننے کا منتظر رہا کرتا ہے، مگر منافقین کے لئے اس کے سوا کوئی خبر نہیں، ان کے لئے بشارت کے عوض میں یہی خبر ہے۔

عزّت اللہ ہی سے طلب کرنی چاہئے

دُوسری آیت میں کفار ومشرکین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے اور گھل مل کر رہنے کی ممانعت اور ایسا کرنے والوں کے لئے وعید مذکور ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس مرض میں مبتلا ہونے کی اصل منشا اور سبب کو بیان کر کے اس کا لغو اور بیہودہ ہونا بھی بتلا دیا ہے، اِرشاد فرمایا: اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ یعنی کفار مشرکین کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ ملنے کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ان کی ظاہری عزّت وقوّت اور جتھے سے متأثر ہو کر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے دوستی رکھی جائے، تو ہمیں بھی ان سے عزّت وقوّت حاصل ہو جائے گی، حق تعالیٰ نے اس لغو خیال کی

حقیقت اس طرح واضح فرمائی کہ تم ان کے ذریعے عزّت حاصل کرنا چاہتے ہو جن کے پاس خود عزّت نہیں، عزّت جس کے معنی ہیں قوّت وغلبہ کے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، اور مخلوق میں سے جس کسی کو بھی کوئی قوّت وغلبہ ملتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، تو کس قدر بے عقلی ہوگی کہ عزّت حاصل کرنے کے لئے اصل عزّت کے مالک اور عزّت دینے والے کو تو ناراض کیا جائے، اور اس کے دُشمنوں کے ذریعہ عزّت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

قرآن مجید کی سورۂ منافقون میں بھی یہی مضمون ایک اضافہ کے ساتھ اس طرح آیا ہے:-

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٨

''یعنی عزّت تو صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے لئے، لیکن منافقین اس گُر کو نہیں جانتے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اور مؤمنین کا اضافہ کرکے یہ بھی بتلا دیا کہ اصل عزّت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے کچھ حصۂ عزّت عطا فرما دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے چونکہ اس کے نزدیک محبوب اور مقبول ہیں، اس لئے ان کو عزّت وغلبہ دیا جاتا ہے، کفار ومشرکین کو خود ہی عزّت نصیب نہیں، ان کے تعلق سے کسی دُوسرے کو کیا عزّت مل سکتی ہے، اس لئے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

مَنِ اعْتَزَّ بِالْعَبِيْدِ اَذَلَّهُ اللهُ۔ (جصاص) [۱]

''یعنی جو شخص مخلوقات اور بندوں کے ذریعے عزّت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کردیتے ہیں۔''

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ملکِ شام کے عامل (گورنر) سے فرمایا: ''كُنْتُمْ اَقَلَّ النَّاسِ وَاَذَلَّ النَّاسِ فَاَعَزَّكُمُ اللهُ بِالْاِسْلَامِ مَهْمَا تَطْلُبُوا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهٖ يُذِلُّكُمُ اللهُ'' (مستدرک) [۲] یعنی ''(اے ابوعبیدہؓ!) تم تعداد میں سب سے کم اور سب سے زیادہ کمزور تھے، تم کو محض اسلام کی وجہ سے عزّت وشوکت ملی ہے، تو خوب سمجھ لو اگر تم اسلام کے سوا کسی دُوسرے ذریعہ سے عزّت حاصل کرنا چاہو گے تو خدا تعالیٰ تم کو ذلیل کردے گا۔''

ابوبکر جصّاصؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں فرمایا کہ مراد آیتِ مذکورہ سے یہ ہے کہ کفار وفجار سے دوستی کرکے عزّت طلب نہ کرو، ہاں مسلمانوں کے ذریعہ عزّت وقوّت طلب کی جائے تو اس کی ممانعت نہیں، کیونکہ سورۂ منافقون کی آیت نے اس کو واضح کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مؤمنین کو عزّت بخشی ہے۔ (جصّاص) [۳]

---

۱ احکام القرآن للجصاص، سورة النساء، باب إستتابة المرتد ج:۵ ص:۱۶۳

۲ مستدرك للحاكم، كتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم باب ومن مناقب امير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه رقم الحديث:۴۴۵۵

۳ احکام القرآن للجصاص، سورة النساء، باب إستتابة المرتد ج:۵ ص:۱۶۳

یہاں عزّت سے مراد اگر ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والی آخرت کی عزّت ہے تب تو دُنیا میں اس کا مخصوص ہونا اللہ تعالیٰ کے رسول اور مؤمنین کے ساتھ واضح ہے، کیونکہ آخرت کی عزّت کسی کافر و مشرک کو قطعاً حاصل نہیں ہوسکتی، اور اگر مراد دُنیا کی عزّت لی جائے تو عبوری دور اور اتفاقی حوادث کو چھوڑ کر انجام کے اعتبار سے یہ عزّت و غلبہ بالآخر اسلام اور مسلمانوں ہی کا حق ہے، جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان رہے، دُنیا نے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا، اور پھر آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امامت و قیادت میں مسلمان صحیح اسلام پر قائم ہوجائیں گے تو پھر غلبہ انہی کا ہوگا، درمیانی اور عبوری دور میں مسلمانوں کے ضعفِ ایمان اور ابتلائے معاصی کی وجہ سے ان کا کمزور نظر آنا اس کے منافی نہیں۔

آیت وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ الخ میں قرآن مجید کی ایک اور آیت کا جو سورۂ انعام میں قبل از ہجرت مکہ مکرمہ میں نازل ہوچکی تھی حوالہ دے کر بتلایا گیا ہے کہ ہم نے تو اصلاحِ انسانی کے لئے پہلے ہی یہ حکم بھیج دیا تھا کہ کفار و فجار کی مجلس میں بھی مت بیٹھو، اور تعجب ہے کہ یہ غافل لوگ اس سے بھی آگے بڑھ گئے کہ ان سے دوستی کرنے لگے، اور ان کو عزّت و قوت کا مالک سمجھنے لگے۔

سورۂ نساء کی متذکرہ آیت اور سورۂ انعام کی وہ آیت جس کا حوالہ سورۂ نساء میں دیا گیا ہے دونوں کا مفہوم مشترک یہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار یا اُن پر استہزاء کر رہے ہوں تو جب تک وہ اس بیہودہ شغل میں لگے رہیں، ان کی مجلس میں بیٹھنا اور شرکت کرنا بھی حرام ہے، پھر سورۂ انعام کی آیت کے الفاظ میں کچھ تعمیم اور مزید تفصیل ہے، کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۞۶۸

"یعنی جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کرو یہاں تک کہ وہ مشغول ہوجائیں کسی اور بات میں، اور اگر بھلا دے تم کو شیطان تو مت بیٹھو یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ۔"

اس میں آیاتِ الٰہیہ میں جھگڑا کرنا مذکور ہے، جس میں کفر و استہزاء بھی داخل ہے، اور آیت کی تحریفِ معنوی یعنی آیاتِ قرآنی کے ایسے معانی نکالنا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی تفسیر کے خلاف، یا اجماعِ اُمت کے خلاف ہوں، یہ بھی اسی میں داخل ہیں، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بروایت ضحاکؒ منقول ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن کی تفسیر غلط یا اس میں تحریف کرنے والے یا بدعات نکالنے والے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں: "دَخَلَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ كُلُّ مُحْدِثٍ فِي الدِّيْنِ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ." (مظہری ج:۲ ص:۲۶۳)

تفسیر بالرائے کرنے والے کی مجلس میں شرکت جائز نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآنِ کریم کے درس یا تفسیر میں تفسیرِ سلف صالحین کا پابند نہیں، بلکہ ان کے خلاف معانی بیان کرتا ہے، اس کے درس و تفسیر میں شرکت بنصِ قرآن ناجائز اور بجائے ثواب کے گناہ ہے، تفسیر ''بحر محیط'' میں ابوحیانؒ نے فرمایا کہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس بات کا زبان سے کہنا گناہ ہے اس کا کانوں سے باختیارِ خود سننا بھی گناہ ہے۔

اور اس پر یہ شعر نقل کیا ہے ۔

وَسَمْعَكَ صُنْ عَنْ سِمَاعِ الْقَبِيْحِ
كَصَوْنِ اللِّسَانِ عَنِ النُّطْقِ بِهٖ

''یعنی اپنے کانوں کو بُری بات سننے سے بچاؤ، جس طرح زبان کو بُری بات کہنے سے بچاتے ہو۔'' [1]

دُوسری بات سورۂ اَنعام کی آیت میں یہ زیادہ ہے کہ اگر کسی وقت بھولے یا بے خبری سے کوئی آدمی ایسی مجلس میں شریک ہوگیا، پھر خیال آیا تو اسی وقت اس مجلس سے علیحدہ ہو جانا چاہئے، خیال ہو جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

سورۂ نساء اور سورۂ اَنعام کی دونوں آیتوں میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تک وہ لوگ اس بیہودہ گفتگو میں مشغول رہیں، اس وقت تک ان کی مجلس میں بیٹھنا حرام ہے۔

اس مسئلہ کا دُوسرا پہلو یہ ہے کہ جب وہ اس گفتگو کو ختم کر کے کوئی اور بات شروع کر دیں تو اس وقت ان کے ساتھ مجالست اور شرکت جائز ہے یا نہیں؟ قرآنِ کریم نے اس کو صراحت سے بیان نہیں فرمایا، اسی لئے علماء کا اس میں اِختلاف ہے، بعض نے فرمایا کہ ممانعت کی علت آیاتِ اِلٰہیہ کی توہین و تحریف تھی، جب وہ ختم ہوگئی تو ممانعت بھی ختم ہوگئی، اسی لئے دُوسری باتیں شروع ہو جانے کے بعد ان کی مجلس میں بیٹھنا گناہ نہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ ایسے کفار و فجار اور ظالم لوگوں کی صحبت و مجالست بعد میں بھی دُرست نہیں، حضرت حسن بصریؒ کا یہی اِرشاد ہے، انہوں نے سورۂ اَنعام کے اس جملہ سے اِستدلال فرمایا ہے: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ یعنی یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھیں، اور ظاہر ہے کہ ظالم اس گفتگو کو ختم کر دینے کے بعد بھی ظالم ہی رہے، اسی لئے اس کی صحبت و مجالست سے بعد میں بھی اِحتراز لازم ہے۔ (جصّاص) [2]

---

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۹۷

[2] احکام القرآن للجصاص، سورة النساء، باب إستتابة المرتد ج:۵ ص:۱۶۴

اور ''تفسیر مظہری'' میں قاضی صاحب رحمہ اللہ نے دونوں میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ جب کفر و اِستہزاء اور تحریفِ قرآن کی گفتگو بند ہو کر کوئی دُوسری بات شروع ہو جائے تو اس وقت بھی ایسے لوگوں کی مجلس میں شرکت بلا ضرورت تو حرام ہے، اور اگر کوئی ضرورتِ شرعی یا طبعی داعی ہو تو جائز ہے۔[1]

بُروں کی صحبت سے تنہائی بھلی

اِمام ابوبکر جصّاصؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس مجلس میں کوئی گناہ ہو رہا ہو تو مسلمان پر نہی عن المنکر کے ضابطہ سے یہ لازم ہے کہ اگر اس کو روکنے کی قدرت ہے تو قوت کے ساتھ روک دے، اور یہ قدرت نہیں ہے تو کم از کم اس گناہ سے اپنی ناراضگی کا اِظہار کرے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس مجلس سے اُٹھ جائے،[2] یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ چند لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کیا کہ وہ شراب پی رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کے بارے میں ثابت ہوا کہ وہ روزہ رکھے ہوئے ہے، اس نے شراب نہیں پی، لیکن ان کی مجلس میں شریک تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو بھی سزا دِی کہ وہ ان کی مجلس میں بیٹھا ہوا کیوں تھا۔ (بحرِ محیط)[3]

تفسیر ابن کثیر میں اس جگہ یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَجْلِسْ عَلٰى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ۔ (ابن کثیر ج:۱ ص:۵٦٧)[4]

''یعنی جو شخص اللہ پر اور روزِ آخرت پر اِیمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ ایسے دسترخوان یا کھانے کی میز پر بھی نہ بیٹھے جہاں شراب کا دور چلتا ہو۔''

مذکورہ بحث میں مجلس سے اُٹھ جانے کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کے لئے یہ شرط ہے کہ شرعی حیثیت سے اس مجلس کے چھوڑ دینے میں کوئی گناہ لازم نہ آتا ہو، مثلاً مسجد میں جماعت کی شرکت ضروری امر ہے، اگر وہاں کوئی خلافِ شرع کام ہونے لگے تو جماعت اس کی وجہ سے ترک نہ کرے بلکہ صرف قلبی ناراضگی پر اِکتفا کرے، اسی طرح کوئی اور ضروری مجلس جس کی ضرورت شریعت سے ثابت ہے، اگر وہاں کچھ لوگ کوئی خلافِ شرع کام کرنے لگیں، تو دُوسروں کے گناہ کی وجہ سے اس مجلس کو چھوڑ کر خود گناہ کا اِرتکاب کرنا معقول اور دُرست نہیں، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اگر ہم، لوگوں

---

۱ تفسیر المظهری تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲٦۳

۲ احکام القرآن للجصاص بحوالۂ بالا۔

۳ تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۴ ص:۲۹٦

۴ وجامع الترمذی، ابواب الإستئذان والأدب، باب دخول الحمام ج:۲ ص:۱۰۷

کے گناہ کی وجہ سے اپنے ضروری کام ترک کر دیا کریں، تو ہم فساق و فجار کے لئے سنت و شریعت کے مٹانے کا راستہ ہموار کر دیں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اہلِ باطل کے ساتھ مجالست کی چند صورتیں ہیں:-

اوّل:- ان کے کفریات پر رضا کے ساتھ، یہ کفر ہے۔ دوم:- اظہارِ کفریات کے وقت کراہیت کے ساتھ، یہ بلاعذر فسق ہے۔ سوم:- کسی ضرورتِ دُنیوی کے واسطے مباح ہے۔ چہارم:- تبلیغِ اَحکام کے لئے عبادت ہے۔ پنجم:- اِضطرار اور بے اِختیاری کے ساتھ، اس میں معذور ہے۔

کفر پر راضی ہونا کفر ہے

آخرِ آیت میں اِرشاد فرمایا: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ یعنی اگر تم ایسی مجلس میں بطیبِ خاطر شریک رہے جس میں آیاتِ اِلٰہیہ کا اِنکار یا اِستہزاء یا تحریف ہو رہی ہو تو تم بھی اُن کے گناہ کے شریک ہو کر انہی جیسے ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ خدانخواستہ تمہارے جذبات و خیالات بھی ایسے ہیں کہ تم ان کے کفریات کو پسند کرتے اور اس پر راضی ہوتے ہو، تو حقیقۃً تم بھی کافر ہو کیونکہ کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہے۔ اور اگر یہ بات نہیں تو ان کی مثل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح وہ اِسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دِین کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں تم اپنی اس شرکت کے ذریعہ ان کی اِمداد کر کے معاذ اللہ ان کی مثل ہو گئے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ

البتہ منافق دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا، اور جب کھڑے ہوں نماز کو

قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کے دِکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ

اُدھر میں لٹکتے ہیں دونوں کے بیچ، نہ اُن کی طرف، اور نہ اِن کی طرف، اور جس کو گمراہ کرے

اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ

اللہ تو ہرگز نہ پاوے گا تو ان کے واسطے کہیں راہ۔ اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ

اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا لیا چاہتے ہو اپنے اُوپر اللہ کا

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

اِلزام صریح۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہیں، حالانکہ اللہ نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور جب یہ لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے دِکھاوا کرتے ہیں، اور اللہ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں ﴿۱۴۲﴾ یہ کفر و اِیمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے طور پر اِن (مسلمانوں) کی طرف ہیں، نہ اُن (کافروں) کی طرف۔ اور جسے اللہ گمراہی میں ڈال دے، تمہیں اس کے لئے ہدایت پر آنے کا کوئی راستہ ہرگز نہیں مل سکتا۔ ﴿۱۴۳﴾ اے اِیمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے پاس اپنے خلاف (یعنی اپنے مستحقِ عذاب ہونے کی) ایک کھلی کھلی وجہ پیدا کر دو؟ ﴿۱۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ منافق لوگ (اِظہارِ اِیمان میں) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے (گو ان کی چال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور گو ان کا اِعتقاد اللہ کے ساتھ چال بازی کرنے کا نہ ہو، مگر ان کی یہ کارروائی مشابہ اسی کے ہے کہ جیسا یہی اِعتقاد ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں، اور (چونکہ دِل میں ایمان تو ہے نہیں، اور اس لئے نماز کو فرض نہ سمجھیں نہ اس میں ثواب کا اِعتقاد رکھیں، اس لئے) جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے

ہیں (کیونکہ نشاط اِعتقاد اور اُمید سے پیدا ہوتا ہے) صرف آدمیوں کو (اپنا نمازی ہونا) دِکھلاتے ہیں (تاکہ مسلمان سمجھیں) اور (چونکہ محض نماز کا نام ہی کرنا ہے اس لئے اس نماز میں) اللہ تعالیٰ کا ذِکر (زبانی) بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر (یعنی محض صورت نماز کی بنالیتے ہیں، جس میں نماز کا نام ہوجاوے، اور عجب نہیں کہ اُٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو، کیونکہ جہر کی ضرورت تو بعض نمازوں میں اِمام کو ہوتی ہے، اِمامت توان کو کہاں نصیب ہوتی، مقتدی ہونے کی حالت میں اگر کوئی بالکل نہ پڑھے فقط لب ہلاتا رہے تو کسی کو کیا خبر ہو، تو ایسے بداِعتقادوں سے کیا بعید ہے کہ زبان بھی نہ ہلتی ہو) معلق ہو رہے ہیں دونوں کے (یعنی کفار و مؤمنین کے) درمیان میں، نہ (پورے) اِدھر نہ (پورے) اُدھر (کیونکہ ظاہر میں مؤمن تو کفار سے الگ اور باطن میں کافر تو مؤمنین سے الگ) اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ عزمِ فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کردیتے ہیں) ایسے شخص کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی سبیل (یعنی راہ) نہ پاؤ گے (مطلب یہ کہ ان منافقین کے راہ پر آنے کی اُمید مت رکھو، اس میں منافقین کی تشنیع ہے اور مؤمنین کی تسلی کہ ان کی شرارتوں سے رنج نہ کریں) اے اِیمان والو! تم مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو (خواہ منافق ہوں، خواہ مجاہر ہوں) دوست مت بناؤ (جیسا منافقین کا شیوہ ہے، کیونکہ تم کو ان کی حالت کفر و عداوت کی معلوم ہوچکی) کیا تم (ان سے دوستی کرکے) یوں چاہتے ہو کہ اپنے اُوپر (یعنی اپنے مجرم و مستحقِ عذاب ہونے پر) اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم کرلو (حجتِ صریحہ یہی ہے کہ ہم نے جب منع کردیا تھا پھر کیوں کیا)۔

معارف و مسائل

مسئلہ:- (قولہ تعالیٰ) قَامُوْا كُسَالٰى جس کسل کی یہاں مذمت ہے وہ اِعتقادی کسل ہے، اور جو باوجود اِعتقادِ صحیح کے کسل ہو وہ اس سے خارج ہے، پھر اگر کسی عذر سے ہو جیسے مرض و تعب و غلبۂ نوم تو قابلِ ملامت بھی نہیں، اور اگر بلا عذر ہو تو قابلِ ملامت ہے۔ (بیان القرآن) [1]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾

بے شک منافق ہیں سب سے نیچے درجے میں دوزخ کے، اور ہرگز نہ پاوے گا تو ان کے پاس کوئی مددگار۔

[1] بیان القرآن تحت هٰذه الآية ج:٢ ص:١٦٧

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ

مگر جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اِصلاح کی اور مضبوط پکڑا اللہ کو اور خالص حکم بردار ہوئے اللہ کے،

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

سو وہ ہیں اِیمان والوں کے ساتھ، اور جلد دے گا اللہ اِیمان والوں کو

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

بڑا ثواب۔ کیا کرے گا اللہ تم کو عذاب کرکے اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو، اور اللہ

شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

قدردان ہے سب کچھ جاننے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

یقین جانو کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، اور ان کے لئے تم کوئی مددگار نہیں پاؤ گے ﴿۱۴۵﴾ البتہ جو لوگ توبہ کرلیں گے، اپنی اِصلاح کرلیں گے، اللہ کا سہارا مضبوطی سے تھام لیں گے اور اپنے دِین کو خالص اللہ کے لئے بنالیں گے تو ایسے لوگ مؤمنوں کے ساتھ شامل ہوجائیں گے، اور اللہ مؤمنوں کو ضرور اَجرِ عظیم عطا کرے گا ﴿۱۴۶﴾ اگر تم شکرگزار بنو اور (صحیح معنی میں) اِیمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر آخر کیا کرے گا؟ اللہ بڑا قدردان ہے، (اور) سب کے حالات کا پوری طرح علم رکھتا ہے ﴿۱۴۷﴾

خلاصۂ تفسیر

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے اور (اے مخاطب) تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ

پائے گا (جواُن کواس سزا سے بچا سکے) لیکن (ان میں سے) جولوگ (نفاق سے) توبہ کرلیں اور (مسلمانوں کے ساتھ جو اُن کے ایذا رساں معاملات تھے ان کی) اِصلاح کرلیں (یعنی پھر ایسی باتیں نہ کریں) اور (کفار سے جو بغرض ان کی پناہ میں رہنے کے دوستی کرتے ہیں اس کو چھوڑ کر) اللہ تعالیٰ پر وثوق (اور توکل) رکھیں اور (رِیا کو چھوڑ کر) اپنے دِین (کے اعمال) کو خالص اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کیا کریں (غرض اپنے عقائد کی، معاملات کی، اخلاقِ باطنی کی، اعمال کی، سب کی دُرستی کرلیں) تو یہ (تائب) لوگ (ان) مؤمنین کے ساتھ (درجاتِ جنت میں) ہوں گے (جو کہ پہلے سے کامل اِیمان رکھتے ہیں) اور (ان) مؤمنین کو اللہ تعالیٰ (آخرت میں) اَجرِ عظیم عطا فرمائیں گے (پس جب یہ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے تو ان کو بھی اَجرِ عظیم ملے گا، اور اے منافقو!) اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم (ان کی نعمتوں کی جو تم پر ہیں) سپاس گزاری کرو اور (اس سپاس گزاری کا طریقہ ہمارا پسندیدہ یہ ہے کہ تم) اِیمان لے آؤ (یعنی خدا تعالیٰ کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا جو تم کو سزا دینے سے چل جاوے، صرف تمہارا کفر جو اَشد درجے کا کفرانِ نعمت ہے سبب ہے تمہاری سزا کا، اگر اس کو چھوڑ دو تو پھر رحمت ہی رحمت ہے) اور اللہ تعالیٰ (تو خدمت کی) بڑی قدر کرنے والے (اور خدمت گزاری کے خلوص وغیرہ کو) خوب جاننے والے ہیں (پس جو شخص اِطاعت واِخلاص سے رہے اس کو بہت کچھ دیتے ہیں)۔

معارف ومسائل

(قولہ تعالیٰ) وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل مقبول ہے جو رِیا سے پاک ہو، اور محض اسی کی ذات کے لئے ہو، کیونکہ مخلص کے معنی فقہاء نے یہ بیان کئے ہیں:-

اَلَّذِیْ یَعْمَلُ لِلّٰهِ لَا یُحِبُّ اَنْ یَّحْمَدَهُ النَّاسُ عَلَیْهِ۔ (بحوالہ مظہری) [۱]

''یعنی مخلص وہ آدمی ہے جو عمل محض اللہ ہی کے لئے کرے، اور اس بات کو وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کے عمل کی تعریف کریں۔''

[۱] وتفسیر ابن ابی حاتم سورۃ البقرۃ، رقم الحدیث: ۱۳۱۳

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اللہ کو پسند نہیں کسی بُری بات کا ظاہر کرنا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ ہے

سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ

سننے والا جاننے والا۔ اگر تم کھول کر کرو کوئی بھلائی یا اس کو چھپاؤ یا معاف کرو بُرائی کو، تو اللہ بھی

كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ

معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے۔ جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں

اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ

کہ فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو،

وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ

اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں ایک راہ۔ ایسے لوگ وہی ہیں اصل کافر،

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر

وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ

اور جدا نہ کیا ان میں سے کسی کو، اُن کو جلد دے گا اُن کے ثواب،

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع

اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بُرائی علانیہ زبان پر لائی جائے، اِلَّا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سب کچھ سنتا، ہر بات جانتا ہے ﴿۱۴۸﴾ اگر تم کوئی نیک کام علانیہ کرو یا خفیہ طور پر کرو، یا کسی بُرائی کو معاف کر دو، تو (بہتر ہے، کیونکہ) اللہ بہت معاف کرنے والا ہے (اگرچہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے۔ ﴿۱۴۹﴾ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا اِنکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے اور کہتے ہیں کہ کچھ (رسولوں) پر تو ہم اِیمان لاتے ہیں اور کچھ کا اِنکار کرتے ہیں، اور (اس طرح) وہ چاہتے ہیں کہ (کفر اور اِیمان کے درمیان) ایک بیچ کی راہ نکال لیں ﴿۱۵۰﴾ ایسے لوگ صحیح معنی میں کافر ہیں، اور کافروں کے لئے ہم نے ذِلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ﴿۱۵۱﴾ اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اِیمان لائیں، اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہ کریں، تو اللہ ایسے لوگوں کو ان کے اجر عطا کرے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۵۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ بُری بات زبان پر لانے کو (کسی کے لئے) پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے (کہ اپنے مظالم کی نسبت کچھ حکایت شکایت کرنے لگے تو وہ گناہ نہیں) اور اللہ تعالیٰ (مظلوم کی بات) خوب سنتے ہیں (اور ظالم کے ظلم کی حالت) خوب جانتے ہیں (اس میں اِشارہ ہے کہ مظلوم کو بھی خلافِ واقعہ کہنے کی اِجازت نہیں، اور ہر چند کہ ایسی شکایت جائز تو ہے لیکن) اگر نیک کام علانیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو (جس میں معاف کرنا بھی آ گیا) یا (بالخصوص) کسی (کی) بُرائی کو معاف کر دو تو (زیادہ افضل ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں (باوجودیکہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح اِنتقام لے سکتے ہیں، مگر پھر بھی اکثر معاف ہی کر دیتے ہیں، پس اگر تم ایسا کرو تو اوّل تو تخلق باخلاقِ الٰہیہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا اِتباع ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرنے کی اُمید ہوگی) جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ (جیسا ان کے عقیدہ اور قول سے جو آگے آتا ہے صاف طور پر لازم آتا ہے) اور (کفر کرتے ہیں) اس کے رسولوں کے ساتھ (یعنی بعض کے ساتھ تو صراحۃً، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے منکر تھے، اور کل کے ساتھ لزوماً جیسا آگے آتا ہے) اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں (باعتبار اِیمان لانے کے) فرق رکھیں اور (اپنے اس عقیدہ کو زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعضوں پر تو اِیمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں (اس قول اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

بھی کفر لازم آ گیا، اور سب رسولوں کے ساتھ بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور ہر رسول نے سب رسولوں کو رسول کہا ہے، جب بعض کا اِنکار ہوا تو اللہ تعالیٰ کی اور بقیہ رسولوں کی تکذیب ہوگئی، جو کہ ضد ہے تصدیق اور اِیمان کی) اور یوں چاہتے ہیں کہ کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں (کہ نہ سب پر ایمان رہے جیسے مسلمان سب پر اِیمان رکھتے ہیں، اور نہ سب کا اِنکار رہے جیسا کہ مشرکین کرتے تھے سو) ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں (کیونکہ کفر بالبعض بھی کفر ہے، اور اِیمان اور کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جب اِیمان بالجمیع نہ ہوا تو کفر ہی ہوا) اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے (وہی ان کے لئے بھی ہوگی) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اِیمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی اور ان میں سے کسی میں (اِیمان لانے کے اِعتبار سے) فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرورت ان کا ثواب دیں گے اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں (اس لئے اِیمان لانے سے پہلے جتنے گناہ ہو چکے ہیں، سب بخش دیں گے، اور چونکہ وہ) بڑے رحمت والے ہیں (اس لئے اِیمان کی برکت سے ان کے حسنات کو مضاعف کر کے خوب ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں سے پہلی آیت اور دُوسری آیت دُنیا سے ظلم و جور کے مٹانے کا ایک قانون ہے، مگر عام دُنیا کے قوانین کی طرح نہیں جس کی حیثیت صرف آمرانہ ہوتی ہے، بلکہ ترغیب و ترہیب کے انداز کا ایک قانون ہے جس میں ایک طرف تو اس کی اِجازت دے دی گئی ہے کہ جس شخص پر کوئی ظلم کرے تو مظلوم اس کے ظلم کی شکایت، یا کسی عدالت میں چارہ جوئی کر سکتا ہے، جو عین عدل و اِنصاف کا تقاضا اور اِنسدادِ جرائم کا ایک ذریعہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک قید بھی سورۂ نحل کی آیت میں مذکور ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ یعنی اگر کوئی شخص تم پر ظلم کرے تو تم بھی اس سے ظلم کا بدلہ لے سکتے ہو، مگر شرط یہ ہے کہ جتنا ظلم و تعدی اس نے کیا ہے بدلہ میں اس سے زیادتی نہ ہونے پائے، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ظلم کے جواب میں ظلم کی اجازت نہیں، بلکہ ظلم کا بدلہ اِنصاف سے ہی لیا جا سکتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت ہے کہ بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے مگر صبر کرنا اور معاف کر دینا بہتر ہے۔

اور آیتِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس پر کسی نے ظلم کیا ہو، اگر وہ ظلم کی شکایت، حکایت لوگوں سے کرے تو یہ غیبتِ حرام میں داخل نہیں، کیونکہ اس نے خود اس کو شکایت کرنے کا موقع دیا ہے۔ غرض قرآنِ حکیم نے ایک طرف تو مظلوم کو ظلم کا مساوی بدلہ لینے کی اِجازت دے دی، اور دُوسری طرف اعلیٰ اخلاق کی تعلیم، عفو و درگزر اور اس کے بالمقابل آخرت کا عظیم فائدہ پیشِ نظر کر کے مظلوم کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے اس جائز حق میں اِیثار سے کام لے، ظلم کا اِنتقام نہ

لے، اِرشاد فرمایا:-

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿١٤٩﴾ یعنی ”اگر تم کوئی نیکی ظاہر کر کے کرو یا خفیہ طور پر کرو، یا کسی کے ظلم اور بُرائی کو معاف کردو تو یہ بہتر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والے اور بڑی قدرت والے ہیں۔“

اس آیت میں اصل مقصد تو ظلم کے معاف کرنے سے متعلق ہے، مگر اس کے ساتھ علانیہ اور خفیہ نیکی کا بھی ذِکر فرما کر اس طرف اِشارہ کردیا کہ یہ عفو درگزر ایک بڑی نیکی ہے جو اس کو اِختیار کرے گا اللہ تعالیٰ کے عفو ورحمت کا مستحق ہوجائے گا۔

آخرِ آیت میں فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿١٤٩﴾ فرما کر یہ بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ قادرِ مطلق ہیں، جس کو چاہیں سزا دے سکتے ہیں، اس کے باوجود بہت معاف کرنے والے ہیں، تو اِنسان جس کو قدرت و اِختیار بھی کچھ نہیں، وہ اگر اِنتقام لینا بھی چاہے تو بہت ممکن ہے کہ اس پر قدرت ہی نہ ہو، اس لئے اس کو تو عفوودرگزر اور بھی زیادہ مناسب ہے۔

یہ ہے رفعِ ظلم اور اِصلاحِ معاشرہ کا قرآنی اُصول اور مربیانہ انداز کہ ایک طرف برابر کے اِنتقام کا حق دے کر عدل واِنصاف کا بہترین قانون بنادیا، دُوسری طرف مظلوم کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر عفوودرگزر پر آمادہ کیا، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہے جس کو قرآنِ کریم نے دُوسری جگہ اِرشاد فرمایا:-

فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿٣٤﴾ (الشوریٰ) یعنی ”جس شخص کے اور تمہارے درمیان دُشمنی تھی اس طرزِ عمل سے وہ تمہارا مخلص دوست بن جائے گا۔“

عدالتی فیصلہ اور ظلم کا اِنتقام لے لینے سے ظلم کی روک تھام ضرور ہوجاتی ہے، لیکن فریقین کے دِلوں میں وہ ایک دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں جو آئندہ پھر باہمی جھگڑوں کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور یہ اخلاقی درس جو قرآنِ کریم نے دیا اس کے نتیجہ میں گہری اور پُرانی عداوتیں دوستیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

تیسری اور چوتھی اور پانچویں آیت میں قرآنِ حکیم نے یہ کھلا ہوا فیصلہ دیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو مانے مگر اس کے رسولوں پر اِیمان نہ لائے، یا بعض رسولوں کو مانے اور بعض کو نہ مانے وہ اللہ کے نزدیک مؤمن نہیں، بلکہ کھلا کافر ہے، جس کی نجاتِ آخرت کی کوئی راہ نہیں۔

اِسلام مدارِ نجات ہے، کسی مخالف مذہب میں نجات نہیں ہوسکتی

قرآنِ حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور کج رَوی کو پوری طرح کھول دیا ہے جو دُوسرے اہلِ

مذاہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقائد کو بطور ''نوتہ'' اور ''ہبہ'' کے پیش کرنا چاہتے ہیں، اور قرآن وسنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دُوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اِسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پاسکتا ہے۔'' حالانکہ یہ لوگ سب رسولوں کے یا کم از کم بعض رسولوں کے منکر ہیں، جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اِعلان کردیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اِسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف اور ہمدردی وخیرخواہی اور اِحسان ورواداری کے معاملے میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن اِحسان وسلوک اپنے حقوق اور اپنی ملکیت میں ہوا کرتے ہیں، مذہبی اُصول وعقائد ہماری ملکیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کرسکیں، اِسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنی سرحدات کی حفاظت میں نہایت محتاط اور سخت بھی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی اور اِنتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رُسومِ کفر سے پوری طرح اِعلانِ براءت بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے، اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح حفاظت بھی کرتا ہے، وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دُوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔

اگر اِسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب وملت میں نجات ہوسکتی ہے تو اس کو مذہبِ اِسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس کے لئے سردھڑ کی بازی لگادینا اُصولاً غلط اور خلافِ عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآنِ حکیم کا نزول معاذ اللہ بیکار اور فضول ہوجاتا ہے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے۔

اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں اِرشاد ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ یعنی ''وہ لوگ جو اِیمان لائے، اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں جو بھی اللہ پر اور یومِ آخرت پر اِیمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اَجر ان کے رَبّ کے پاس محفوظ ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہو غمگین ہوں گے۔''

اس آیت میں چونکہ اِیمانیات کی پوری تفصیل دینے کے بجائے صرف اِیمان باللہ والیوم الآخر پر اِکتفا کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھورے مطالعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں، اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر اِیمان رکھنا نجات کے لئے کافی ہے، رسولوں پر اِیمان شرطِ نجات نہیں، اور یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کی اِصطلاح میں اِیمان باللہ وہی

معتبر ہے جو ایمان بالرسل کے ساتھ ہو، ورنہ محض خدا کے اقرار و توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے، قرآنِ کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے:-

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ (البقرۃ) یعنی "ان کا ایمان اس وقت معتبر ہوگا جبکہ وہ عام مسلمانوں کی طرح ایمان اختیار کریں، جس میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول لازم ہے، ورنہ پھر سمجھ لو کہ وہی لوگ تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان کے لئے کافی ہے، اور وہ بہت سننے والا جاننے والا ہے۔"

اور پیشِ نظر آیات میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بتلادیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی ایک رسول کا بھی منکر ہو وہ کھلا کافر ہے، اور اس کے لئے عذابِ جہنم ہے، ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسل کے ساتھ ہو، اس کے بغیر اس کو ایمان باللہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

آخری آیت میں پھر ایجابی طور پر بیان فرمادیا گیا ہے کہ نجاتِ آخرت اُنہی لوگوں کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے سب رسولوں پر بھی ایمان رکھیں، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

اِنَّ الْقُرْآنَ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔ [1]

"یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر و تشریح کرتا ہے۔"

خود قرآنی تفسیر کے خلاف کوئی تفسیر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا

تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہلِ کتاب کہ تو ان پر اُتار لائے لکھی ہوئی کتاب آسمان سے، سو مانگ چکے ہیں

مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ

موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز اور کہا: ہم کو دِکھلادے اللہ کو بالکل سامنے، سو آپڑی ان پر بجلی

بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

ان کے گناہ کے باعث، پھر بنالیا بچھڑے کو بہت کچھ نشانیاں پہنچ چکنے کے بعد،

[1] عمدۃ القاری، کتاب التفسیر، باب سورۃ الزمر ج:۲۸ ص:۱۷۳

فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ

پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا، اور دِیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح۔ اور ہم نے اُٹھایا ان پر

الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا

پہاڑ قرار لینے کے واسطے اور ہم نے کہا: داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے، اور ہم نے کہا کہ زیادتی مت کرو

فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

ہفتہ کے دن میں اور ہم نے ان سے لیا قول مضبوط۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) اہلِ کتاب تم سے (جو) مطالبہ کررہے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کوئی کتاب نازل کرواؤ، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ) یہ لوگ تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کرچکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے (موسیٰ سے) کہا تھا کہ ہمیں اللہ کھلی آنکھوں دِکھاؤ، چنانچہ ان کی سرکشی کی وجہ سے ان کو بجلی کے کڑکے نے آ پکڑا تھا، پھران کے پاس جو کھلی کھلی نشانیاں آئیں، ان کے بعد بھی انہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا تھا۔ اس پر بھی ہم نے انہیں معاف کردیا، اور ہم نے موسیٰ کو واضح اِقتدار عطا کیا ﴿۱۵۳﴾ اور ہم نے کوہِ طور کو ان پر بلند کرکے ان سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان سے کہا تھا کہ (شہر کے) دروازے میں جھکے ہوئے سروں کے ساتھ داخل ہونا، اور ان سے کہا تھا کہ تم سنیچر کے دن کے بارے میں حد سے نہ گزرنا، اور ہم نے ان سے بہت پکا عہد لیا تھا ﴿۱۵۴﴾

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں یہود کی بداِعتقادیوں کا ذِکر کرکے ان کی مذمت مذکور تھی، ان آیات میں بھی ان کی کچھ دُوسری خراب حرکتوں کی ایک طویل فہرست اوران قباحتوں کی بنا پر ان کے عذاب وسزا کا ذِکر ہے، اور یہ سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے اہلِ کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوا دیں سو (آپ ان لوگوں سے اس کو عجیب نہ سمجھئے کیونکہ یہ فرقہ ایسا معاند ہے کہ) انہوں نے (یعنی اس فرقہ کے جو لوگ موسیٰ علیہ السلام کے وقت موجود تھے انہوں نے) موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی، اور یوں کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا (بلا حجاب) دِکھلا دو، جس پر اُن کی گستاخی کے سبب ان پر کڑک بجلی آپڑی، پھر (اس سے بڑھ کر ان کی یہ حرکت ہو چکی ہے کہ) انہوں نے گوسالہ کو (پرستش) کے لئے تجویز کیا تھا بعد اس کے کہ بہت سے دلائل (تعیینِ حق و باطل کے) ان کو پہنچ چکے تھے (مراد ان دلائل سے معجزات ہیں موسیٰ علیہ السلام کے جن میں سے غرقِ فرعون تک بہتوں کا مشاہدہ ہو چکا تھا) پھر ہم نے ان سے درگزر کر دیا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بڑا رُعب دیا تھا (اس رُعب پر اور ہماری درگزر و عنایت پر ان لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ نہ عنایت سے متأثر ہوتے تھے نہ رُعب سے) اور ہم نے ان لوگوں سے (توراۃ پر عمل کرنے کے) قول وقرار لینے کے واسطے کوہِ طور کو اُٹھا کر ان کے اُوپر (محاذات میں) معلق کر دیا تھا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی سے داخل ہونا اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یومِ ہفتہ کے بارے میں (جو حکم تم کو ملا ہے کہ اس میں شکار نہ کریں اس میں حدِ شرع سے) تجاوز مت کرنا اور (اس کے علاوہ اور بھی) ہم نے ان سے قول وقرار نہایت شدید لئے (جس کا بیان وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (البقرۃ: ۸۳) میں مذکور ہے، لیکن ان لوگوں نے باوجود اس قدر اہتمام کے پھر اپنے عہدوں کو توڑ ڈالا)۔

معارف و مسائل

یہودیوں کے کچھ سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور آپ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر لکھی ہوئی کتاب آسمان سے نازل ہوئی تھی، اسی طرح کی ایک کتاب آپ بھی آسمان سے لائیں، تو ہم اِیمان لے آئیں گے۔ ان کا مطالبہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ دِل سے اِیمان لانا چاہتے تھے، اور یہ اُن کی ایک شرط تھی، بلکہ وہ ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے کوئی نہ کوئی عذر کرتے ہی رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقتِ حال سے آگاہ فرمایا، اور ان کی تسلی کر دی کہ درحقیقت یہ قوم ہی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو ستاتی ہی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے بڑی سے بڑی حرکت بھی کر گزرتی ہے، ان کے آباء و اجداد نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی زیادہ بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دِکھلا یا جائے، ان کی اس گستاخی پر آسمان

سے بجلی آئی اور ان کو ہلاک کر دیا، پھر توحید اور خدائے واحد لاشریک کے براہین و بینات کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے کے بعد بھی خالقِ حقیقی کے بجائے بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہم نے عفو و درگزر سے کام لیا، ورنہ تو موقع اس کا تھا کہ ان کا قلع قمع کیا جاتا، اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے غلبہ عطا کیا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ ان لوگوں نے توراۃ کی شریعت کو ماننے سے صاف اِنکار کر دیا تھا تو ہم نے پہاڑ ''طور'' اُٹھا کر ان پر معلق کر دیا کہ شریعت کو ماننا ہی ہوگا، ورنہ پہاڑ کے نیچے کچل دیئے جاؤ گے۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ جب شہر ''ایلیا'' کے دروازہ میں داخل ہو تو نہایت عاجزی سے اِطاعتِ خداوندی کے جذبے سے سرشار، سر جھکائے ہوئے داخل ہو، یہ بھی ہم نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ ہفتہ کے روز مچھلیوں کا شکار نہ کھیلو، یہ ہمارا حکم ہے اس سے روگردانی نہ کرو، اور اس طرح ہم نے ان سے مضبوط عہد لے لیا تھا، لیکن ہوا یوں کہ انہوں نے ایک ایک کر کے اَحکام کی خلاف ورزی کی، اور ہمارے عہد کو توڑ ڈالا تو ہم نے دُنیا میں بھی اُن کو ذلیل کر دیا، اور آخرت میں بھی اُن کو بدترین سزا بھگتنی ہوگی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

اُن کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق

وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ

اور اس کہنے پر کہ ہمارے دِل پر غلاف ہے، سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کر دی ان کے دِل پر کفر کے سبب، سو اِیمان نہیں لاتے

اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵۵ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝۱۵۶ وَّقَوْلِهِمْ

مگر کم۔ اور ان کے کفر پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر۔ اور ان کے اس کہنے پر کہ

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ

ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا، اور انہوں نے نہ مارا اس کو

وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

اور نہ سولی پر چڑھایا، ولیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے، اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے ہیں

لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ

تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف اٹکل پر چل رہے ہیں، اور اس کو قتل نہیں

يَقِيْنًا ۙ ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

کیا بے شک، بلکہ اس کو اُٹھالیا اللہ نے اپنی طرف، اور اللہ ہے زبردست حکمت والا۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور جتنے فرقے ہیں اہلِ کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاویں گے اس کی موت سے پہلے، اور قیامت کے دن

يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ ۚ

ہوگا ان پر گواہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس لئے کہ انہوں نے اپنا عہد توڑا، اللہ کی آیتوں کا اِنکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا، اور یہ کہا کہ ہمارے دِلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے کفر کی وجہ سے اللہ نے اُن کے دِلوں پر مہر لگادی ہے، اس لئے وہ تھوڑی سی باتوں کے سوا کسی بات پر اِیمان نہیں لاتے ﴿۱۵۵﴾ ـــــ اور اس لئے کہ اُنہوں نے کفر کا راستہ اِختیار کیا، اور مریم پر بڑے بھاری بہتان کی بات کہی، ﴿۱۵۶﴾ اور یہ کہا کہ: "ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابنِ مریم کو قتل کردیا تھا" حالانکہ نہ اِنہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا تھا، نہ اُنہیں سولی دے پائے تھے، بلکہ اُنہیں اِشتباہ ہوگیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بارے میں اِختلاف کیا ہے، وہ اس سلسلے میں شک کا شکار ہیں، انہیں گمان کے پیچھے چلنے کے سوا اس بات کا کوئی علم حاصل نہیں ہے، اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل نہیں کرپائے ﴿۱۵۷﴾ بلکہ اللہ نے اُنہیں اپنے پاس اُٹھالیا تھا، اور اللہ بڑا صاحبِ اِقتدار، بڑا حکمت والا ہے ﴿۱۵۸﴾ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے ضرور بالضرور عیسیٰ (علیہ السلام) پر اِیمان نہ لائے، اور قیامت کے دن وہ ان لوگوں کے خلاف گواہ بنیں گے ﴿۱۵۹﴾

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں بھی یہود کی شرارتوں کا ذِکر تھا، اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان پر لعن طعن اور سزا کا بیان ہوا تھا، ان آیات میں بھی یہود کے بعض جرائم کی تفصیل مذکور ہے، اس کے ضمن میں حضرت عیسیٰ کے متعلق ان کے باطل خیال کی تردید کی گئی ہے، اور یہ واضح کردیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم وستم سے بچا کر زِندہ آسمان پر اُٹھا لیا ہے، یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کردیا ہے اور ان کو سولی دِی ہے، یہ سراسر جھوٹا دعویٰ ہے، جس شخص کو انہوں نے قتل کیا تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے، بلکہ ان کے ہم شکل ایک دُوسرا شخص تھا، جس کو قتل کر کے یہ لوگ یوں سمجھنے لگے کہ ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کردیا ہے۔

خلاصۂ تفسیر

سو ہم نے (ان کی حرکتوں کی وجہ سے) سزائے لعنت وغضب وذِلت ومسخ وغیرہ) میں مبتلا کیا (یعنی) ان کی عہدشکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر (وانکار) کی وجہ سے اَحکامِ اِلٰہیہ کے ساتھ اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء (علیہم السلام) کو (جو اُن کے نزدیک بھی) ناحق (تھا) اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب یعنی اِسلام کا اثر نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ اس پر رَدّ فرماتے ہیں کہ یہ مضبوطی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے (کہ حق بات کی ان میں تأثیر نہیں ہوتی) سو ان میں اِیمان نہیں مگر قدرے قلیل، (اور قدرے قلیل اِیمان مقبول نہیں پس کافر ہی ٹھہرے) اور (ہم نے ان کو سزائے لعنت وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مبتلا کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے اور (تفصیل اس کی یہ ہے کہ) حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے (جس سے تکذیب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی لازم آتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے ان کی براءت ظاہر فرما چکے ہیں) اور (نیز بطور تفاخر کے) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کردیا (یہ کہنا خود دلیل ہے عداوت کی، اور عداوت انبیاء کے ساتھ کفر ہے، نیز اس میں دعویٰ ہے قتل کا، اور قتلِ نبی بھی کفر ہے، اور دعویٰ کفر کا بھی کفر ہے) حالانکہ (علاوہ کفر ہونے کے خود ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کیونکہ) انہوں نے (یعنی یہود نے) نہ اُن کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اِشتباہ ہوگیا، اور جو لوگ (اہلِ کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اِختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں، بجز تخمینی

باتوں پر عمل کرنے کے، اورانہوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اُٹھالیا (اور ایک اور شخص کو ان کا ہم شکل بنادیا اور وہ مصلوب ومقتول ہوا، اور یہی سبب ہوا یہود کے اِشتباہ کا، اور اس اِشتباہ نے اہلِ کتاب میں اختلاف پیدا کیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی قدرت والے) حکمت والے ہیں (کہ اپنی قدرت وحکمت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچالیا اور اُٹھالیا، اور یہود کو بوجہ تشبیہ کے پتہ بھی نہ لگا) اور (یہود کو اپنا کذب وبطلان اِنکارِ نبوّتِ عیسویہ میں بہت جلد دُنیا ہی میں ظاہر ہوجائے گا، کیونکہ وقتِ نزولِ آیت سے لے کر کسی زمانہ میں) کوئی شخص اہلِ کتاب (یعنی یہود میں) سے (باقی) نہ رہے گا، مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوّت) کی اپنے مرنے سے (ذرا) پہلے (جبکہ عالمِ برزخ نظر آنے لگتا ہے) ضرور تصدیق کرے گا (گو اس وقت کی تصدیق نافع نہیں، مگر ظہور بطلان کے لئے تو کافی ہے تو اس سے اگر اَب ہی اِیمان لے آویں تو نافع ہوجاوے) اور (جب عالمِ دُنیا اور عالمِ برزخ دونوں ختم ہوچکیں گے یعنی) قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان (منکرین کے اِنکار) پر گواہی دیں گے۔

معارف ومسائل

سورۂ آلِ عمران کی آیت يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ الآیۃ (آلِ عمران:۵۵) میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دُشمن یہود کے عزائم کو ناکام بنانے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی دستبرد سے بچانے کے سلسلہ میں پانچ وعدے فرمائے تھے، جن کی تفصیل اور مکمل تشریح وتفسیر سورۂ آلِ عمران کی تفسیر میں بیان ہوچکی ہے، ان وعدوں میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ یہود کو آپ کے قتل پر قدرت نہیں دی جائے گی، بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف اُٹھالیں گے، اس آیت میں یہود کی شرارتوں اور جھوٹے دعووں کے بیان میں اُس وعدۂ اِلٰہیہ کی تکمیل اور یہود کے مغالطہ کا مفصل بیان اور یہود کے اس قول کی مکمل تردید ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے۔

ان آیات میں واضح کیا گیا کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ یعنی ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا، بلکہ صورتِ حال یہ پیش آئی کہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کردیا گیا۔

یہود کو اِشتباہ کس طرح پیش آیا؟

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر میں اِمام تفسیر حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا اِرادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہوگئے، حضرت مسیح علیہ السلام بھی ان

کے پاس تشریف لے آئے، ابلیس نے یہود کے اس دستے کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے تیار کھڑا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دیا، اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کر دیا جائے، اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو، ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا، آپ نے اس کو اپنا کُرتا، عمامہ عطا کیا، پھر اس پر آپ کی مشابہت ڈال دی گئی، اور جب وہ باہر نکل آیا تو یہود اُسے پکڑ کر لے گئے اور سولی پر چڑھا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھا لیا گیا۔ (قرطبی)

بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے ایک شخص طیطلانوس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے بھیجا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو مکان میں نہ ملے، اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اُٹھا لیا تھا، اور یہ شخص جب گھر سے نکلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا، یہود یہ سمجھے کہ یہی عیسیٰ ہے، اور اس اپنے ہی آدمی کو لے جا کر قتل کر دیا۔ (مظہری)

ان میں سے جو بھی صورتِ حال پیش آئی ہو، سب کی گنجائش ہے، قرآنِ کریم نے کسی خاص صورت کو متعین نہیں فرمایا، اس لئے حقیقتِ حال کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے، البتہ قرآنِ کریم کے اس جملہ اور دُوسری تفسیری روایات سے یہ قدرِ مشترک ضرور نکلتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو زبردست مغالطہ ہوگیا تھا، حقیقی واقعہ ان سے پوشیدہ رہا، اور اپنے اپنے گمان وقیاس کے مطابق انہوں نے طرح طرح کے دعوے کئے، اور ان کے آپس میں ہی اختلافات پیدا ہوگئے، اسی حقیقت کی طرف قرآنِ کریم کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ؁ کہ ان کے پاس صحیح علم کی بنیاد پر کوئی یقینی بات نہیں ہے، جن جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کر کے طرح طرح کے دعوے کئے ہیں یہ سب شک اور اٹکل کی باتیں ہیں، صحیح صورتِ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو تنبہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے ہی آدمی کو قتل کر دیا ہے، اس لئے کہ یہ مقتول چہرے میں تو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مشابہ ہے، لیکن باقی جسم میں ان کی طرح نہیں، اور یہ کہ اگر یہ مقتول مسیح (علیہ السلام) ہیں تو ہمارا آدمی کہاں ہے؟ اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح (علیہ السلام) کہاں ہیں؟

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ؁ اللہ جل شانہٗ زبردست قدرت و غلبہ والا ہے، یہود لاکھ دفعہ قتل کے منصوبے بناتے لیکن جب اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کا ذمہ لیا تو اس کی قدرت و غلبہ کے سامنے ان کے منصوبوں کی حیثیت کیا ہے، وہ قدرت والا ہے، صرف مادّہ کے پرستار انسان اگر رفعِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے تو یہ ان کی اپنی کمزوری ہے، وہ حکمت والا ہے، اس کا ہر فعل حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

آخر میں اسی مضمون کے تتمہ کے لئے فرمایا کہ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ یہ لوگ اس وقت اگرچہ بغض وحسد کی وجہ سے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باطل خیالات رکھتے ہیں، نیز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا بھی اِنکار کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جبکہ ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اس وقت انہیں یقین ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہمارا خیال تھا وہ سب باطل تھا۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر میں گزری ہے کہ مَوْتِهٖ کی ضمیر اہلِ کتاب کی طرف راجع کی جائے، اور آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ یہ یہود اپنی موت سے چند لمحے پیشتر جب عالمِ برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت پر اِیمان لے آئیں گے اگرچہ اس وقت کا اِیمان ان کے حق میں نافع نہیں ہوگا، جس طرح کہ فرعون کو اس کے اس اِیمان نے فائدہ نہیں دیا تھا جو وہ غرق ہونے کے وقت لایا تھا۔

دُوسری تفسیر جس کو صحابہؓ و تابعینؒ کی بڑی جماعت نے اِختیار کیا ہے اور حدیثِ صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، یہ ہے کہ مَوْتِهٖ کی ضمیر حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہلِ کتاب اگرچہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر اِیمان نہیں لاتے، یہود تو انہیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انہیں العیاذ باللہ مفتری اور کاذب قرار دیتے ہیں، اور نصاریٰ اگرچہ ان پر اِیمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بعض تو ان میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ یہود ہی کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے، اور بعض اِعتقاد کے غلو میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ قرآنِ کریم کی اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت پر صحیح اِیمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اس زمین پر پھر نازل ہوں گے تو یہ سب اہلِ کتاب ان پر صحیح اِیمان لے آئیں گے، نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اِعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے قتل کر دیئے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے۔ اس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دُنیا سے فنا کر دیا جائے گا اور اس زمین پر صرف اِسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے:-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ: لَیَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْیَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَلَیَقْتُلَنَّ الدَّجَّالَ وَلَیَقْتُلَنَّ الْخِنْزِیْرَ وَلَیَكْسِرَنَّ الصَّلِیْبَ وَتَكُوْنَ السَّجْدَةُ وَاحِدَةً لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ثُمَّ قَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ: وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ: وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ، قَالَ

اَبُوْ هُرَيْرَةَ: قَبْلَ مَوْتِ عِيْسٰى، يُعِيْدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ (قرطبی) [1]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور اس وقت عبادت صرف پروردگارِ عالم کی ہوگی۔

اس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآنِ کریم کی یہ آیت بھی پڑھ لو جس میں اسی حقیقت کا ذِکر کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ ان پر ان کی موت سے پہلے اِیمان لے آئے گا۔ آپ نے فرمایا: عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت سے پہلے، اور تین باران الفاظ کو دُہرایا۔''

آیتِ مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بروایتِ صحیحہ ثابت ہے، جس میں قَبْلَ مَوْتِهٖ سے مراد قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قرار دیا ہے، جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے متعلق ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کے نزول سے اللہ جل شانہٗ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں، وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اس زمین پر ہی اِن کی وفات ہوگی۔

اس کی تائید سورۂ زُخرف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ (الزخرف:٦١) یعنی ''عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں، پس تم قیامت کے آنے میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو۔'' مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے یہاں پر لکھا ہے کہ اِنَّهٗ کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک علامت ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے کہ وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور اُن کا آنا قیامت کی علامات میں سے ہوگا۔

اس آیت میں ایک دُوسری قراءت ''لَعَلَمٌ'' بھی منقول ہے، اس سے یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں، کیونکہ ''عَلَمٌ'' بِفَتْحِ اللَّامِ [2] کے معنی علامت کے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی اسی کی مؤید ہے: ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ، قَالَ: خُرُوْجُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:٦ ص:١١ [2] لام کے زَبر کے ساتھ۔

الْقِيَامَةِ"۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کے بارے میں منقول ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔ (ابنِ کثیر) [1]

خلاصہ یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ قَبْلَ مَوْتِهٖ کے ساتھ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیثِ صحیح کے ساتھ تفسیر کو شامل کیا جائے تو اس سے واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ ہونا اور پھر قربِ قیامت میں نازل ہو کر یہود پر مکمل غلبہ پانا ثابت ہو جاتا ہے، اسی طرح آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ سے بھی حسبِ تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ یہ مضمون یقینی ہو جاتا ہے۔

اِمامِ تفسیر ابنِ کثیرؒ نے آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کی تفسیر میں لکھا ہے:-

وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَخْبَرَ بِنُزُوْلِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِمَامًا عَادِلًا۔ (ابن كثير) [2]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے دُنیا میں نازل ہونے کی خبر دی ہے۔"

ان روایاتِ متواترہ کو ہمارے اُستاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جمع فرمایا، جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے، حضرت اُستاذؒ کے حکم پر احقر نے اس مجموعے کو بزبانِ عربی مرتب کیا، حضرتؒ نے اس کا نام "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" تجویز فرمایا، جو اسی زمانے میں شائع ہو چکا تھا، حال میں حلب شام کے ایک بڑے عالم علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے مزید شرح وحواشی کا اِضافہ کر کے بیروت میں اعلیٰ کتابت کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ قطعی اور اِجماعی ہے جس کا منکر کافر ہے

یہ مضمون آیتِ مذکورہ سے بھی واضح ہو چکا ہے، اور اس کی پوری تفصیل سورۂ آلِ عمران میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے، اس میں ان شبہات کا بھی جواب مذکور ہے جو اس زمانے کے بعض ملحدین کی طرف سے اس عقیدہ کو مشکوک بنانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْهِدَايَةِ۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر، سورة الزخرف رقم الآية:۵۷ ج:۷ ص:۲۳۶

[2] تفسیر ابن کثیر تحت الآية المذكورة ج:۷ ص:۲۳۶

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ

سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں اُن پر بہت سی پاک چیزیں جو اُن پر حلال تھیں

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ

اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت۔ اور اس وجہ سے کہ سود لیتے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی،

وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ

اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق، اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے واسطے جو اُن میں ہیں

عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

عذاب دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

غرض یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے اُن پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو پہلے اُن کے لئے حلال کی گئی تھیں، اور اس لئے کہ وہ بکثرت لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے ﴿۱۶۰﴾ اور سود لیا کرتے تھے، حالانکہ اُنہیں اس سے منع کیا گیا تھا، اور لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے۔ اور ان میں سے جو لوگ کافر ہیں، اُن کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۶۱﴾

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں یہود کی شرارتوں کا اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان کی سزا کا ذِکر تھا، ان آیات میں بھی ان کی کچھ اور قباحتوں کا بیان ہے، اور سزا کی ایک اور نوعیت کا بھی ذِکر ہے، وہ یہ کہ قیامت میں تو انہیں عذاب ہوگا ہی، اس دُنیا میں بھی ان کی گمراہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سی پاکیزہ چیزیں جو پہلے سے حلال تھیں بطور سزا کے ان پر حرام کر دی گئیں۔

خلاصۂ تفسیر

سو یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب (جن میں سے بہت سے اُمور سورۂ بقرہ میں ذِکر کئے) ہم نے بہت سی پاکیزہ (یعنی حلال ونافع اور لذیذ) چیزیں جو (پہلے سے) ان کے لئے (بھی) حلال تھیں (جیسا آیت کُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (آلِ عمران: ۹۳) میں ہے) ان پر (شریعتِ موسویہ میں) حرام کردیں (جن کا بیان سورۂ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ الخ (انعام: ۱۴۶) میں ہے، اور وہاں بھی یہ بتلایا گیا ہے کہ ان حلال پاک چیزوں کو ان پر حرام کرنا ان کے گناہوں اور نافرمانیوں کی بنا پر ہوا تھا ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ الخ) اور (شریعتِ موسویہ میں بھی وہ سب حرام ہی رہیں کوئی حلال نہ ہوئی) بسبب اس کے کہ (وہ آئندہ بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے، مثلاً یہی کہ) وہ (اَحکام میں تحریف کرکے یا حکمِ خداوندی کو چھپا کر) بہت سے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی دِینِ حق کے قبول کرنے) سے مانع بن جاتے تھے (کیونکہ ان کی اس کارروائی سے عوام کو خواہ مخواہ اِلتباس ہوجاتا تھا، گو طلبِ صادق سے وہ اِلتباس دُور ہوجانا ممکن تھا) اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو (توراۃ میں) اس سے ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ (یعنی غیر مشروع ذریعہ) سے کھا جاتے تھے، (پس اس طریقِ حق میں رُکاوٹ بننے، سود لینے اور ناجائز طریقوں سے دُوسروں کا مال کھا جانے کی وجہ سے اِس شریعت کی بقا تک تخفیف نہ ہوئی، البتہ شریعتِ جدیدہ عیسویہ میں کچھ اَحکام بدلے تھے، جیسا آیت وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (آلِ عمران: ۵۰) سے معلوم ہوتا ہے، اور شریعتِ محمدیہ میں بہت تخفیف ہوگئی جیسا (وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ الخ (الاعراف: ۱۵۷) سے ثابت ہے، یہ تو دُنیوی سزا تھی) اور (آخرت میں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے (البتہ جو موافق قاعدۂ شرعیہ کے اِیمان لے آوے اس کی پچھلی جنایتیں سب معاف ہوجائیں گی)۔

معارف ومسائل

شریعتِ محمدیہ میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، لیکن وہ کسی جسمانی یا رُوحانی ضرر کی وجہ سے حرام کردی گئیں، بخلاف یہود کے کہ ان پر جو طیبات حرام کردی گئی تھیں ان میں کوئی جسمانی یا رُوحانی ضرر نہیں تھا، بلکہ ان کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر حرام کردی گئی تھیں۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں اور ایمان والے سو مانتے ہیں اُس کو جو نازل ہوا تجھ پر

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اور جو نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آفریں ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو اور جو دینے والے ہیں زکوٰۃ کے

ع ۲۲/۲ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر سو ایسوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب۔

آسان ترجمۂ قرآن

البتہ ان (بنی اسرائیل) میں سے جو لوگ علم میں پکے ہیں، اور مؤمن ہیں، وہ اس (کلام) پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو (اے پیغمبر!) تم پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، اور قابلِ تعریف ہیں وہ لوگ جو نماز قائم کرنے والے ہیں، زکوٰۃ دینے والے ہیں اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اَجرِ عظیم عطا کریں گے ﴿۱۶۲﴾

ربطِ آیات

اُوپر کی آیات میں اُن یہود کا ذِکر تھا جو اپنے کفر پر قائم تھے، اور مذکورہ بالا منکرات میں مبتلا تھے، آگے ان حضرات کا بیان ہے جو اہلِ کتاب تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور وہ صفات جو اُن کی کتابوں میں خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں آپ میں پوری پوری دیکھیں تو اِیمان لے آئے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام واُسید وثعلبہ رضی اللہ عنہم، ان آیات میں انہی حضرات کی تعریف وتوصیف مذکور ہے۔

خلاصۂ تفسیر

لیکن ان (یہود) میں جو لوگ علم (دِین) میں پختہ (یعنی اس کے موافق عمل کرنے پر مضبوط) ہیں (اور اسی آمادگی

نے ان پر حق کو واضح اور قبولِ حق کو سہل کر دیا جو آگے اصلاً وفرعاً مذکور ہے) اور جو (ان میں) ایمان لانے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے (نبیوں کے پاس) بھیجی گئی (جیسے توراۃ وانجیل) اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں، اور جو (ان میں) زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں (سو) ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثوابِ عظیم عطا فرماویں گے۔

معارف ومسائل

آیت میں جن حضرات کے لئے اجرِ کامل کا وعدہ ہے وہ ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے ہے، اور جہاں تک نفسِ نجات کا تعلق ہے وہ عقائدِ ضروریہ کی تصحیح پر موقوف ہے، بشرطیکہ خاتمہ بالایمان کی سعادت نصیب ہو۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور اُن نبیوں پر جو ان کے بعد ہوئے اور وحی بھیجی

إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ

ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور عیسیٰ پر اور ایوب پر

وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ

اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر اور ہم نے دی داؤد کو زبور۔ اور بھیجے ایسے رسول کہ

قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ

جن کا اَحوال ہم نے سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا اَحوال نہیں سنایا تجھ کو، اور باتیں کیں اللہ نے

مُوسٰى تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ ج رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ

موسیٰ سے بول کر۔ بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تاکہ باقی نہ رہے لوگوں کو

عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ

اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد، اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ لیکن اللہ

يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ج وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ط

شاہد ہے اس پر جو تجھ پر نازل کیا کہ یہ نازل کیا ہے اپنے علم کے ساتھ، اور فرشتے بھی گواہ ہیں،

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيدًا ﴿١٦٦﴾ ط إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللّٰهِ

اور اللہ کافی ہے حق ظاہر کرنے والا۔ جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے

قَدْ ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا

وہ بہک کر دور جا پڑے۔ جو لوگ کافر ہوئے اور حق دبا رکھا

لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ لا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ

ہرگز اللہ بخشنے والا نہیں ان کو اور نہ دکھلاوے گا ان کو سیدھی راہ۔ مگر راہ دوزخ کی

خٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾

رہا کریں اس میں ہمیشہ، اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہارے پاس اسی طرح وحی بھیجی ہے جیسے نوح اور ان کے بعد دوسرے نبیوں کے پاس بھیجی

تھی، اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کے پاس، اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی ﴿۱۶۳﴾ اور بہت سے رسول ہیں جن کے واقعات ہم نے پہلے تمہیں سنائے ہیں، اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ہم نے ان کے واقعات تمہیں نہیں سنائے۔ اور موسیٰ سے تو اللہ براہِ راست ہم کلام ہوا ﴿۱۶۴﴾ یہ سب رسول وہ تھے جو (ثواب کی) خوشخبری سنانے اور (دوزخ سے) ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تا کہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ﴿۱۶۵﴾ (یہ کافر لوگ مانیں یا نہ مانیں) لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے، اس کے بارے میں وہ خود گواہی دیتا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں، اور (یوں تو) اللہ کی گواہی ہی بالکل کافی ہے۔ ﴿۱۶۶﴾ یقین جانو کہ جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں ﴿۱۶۷﴾ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے، (اور دُوسروں کو اللہ کے راستے سے روک کر ان پر) ظلم کیا ہے، اللہ ان کو بخشنے والا نہیں ہے، اور نہ ان کو کوئی اور راستہ دِکھانے والا ہے ﴿۱۶۸﴾ سوائے دوزخ کے راستے کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بات اللہ کے لئے بہت معمولی بات ہے ﴿۱۶۹﴾

ربطِ آیات

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ سے یہودیوں کا ایک احمقانہ سوال نقل کر کے تفصیل سے اس کا اِلزامی جواب دیا گیا، یہاں ایک دُوسرے عنوان سے اسی سوال کو باطل کیا جا رہا ہے کہ تم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان لانے کے لئے یہ شرط لگاتے ہو کہ آپ آسمان سے لکھی ہوئی کتاب لا کر دِکھلائیں، تو بتلاؤ کہ یہ جلیل القدر انبیاء جن کا ذِکر ان آیات میں ہے ان کو تم بھی تسلیم کرتے ہو، اور ان کے حق میں تم اس طرح کے مطالبات نہیں کرتے، تو جس دلیل سے تم نے ان حضرات کو نبی تسلیم کیا ہے یعنی معجزات سے، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی معجزات ہیں، لہٰذا ان پر بھی ایمان لے آؤ، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارا یہ مطالبہ طلبِ حق کے لئے نہیں، بلکہ عناد پر مبنی ہے۔

آگے بعثتِ انبیاء علیہم السلام کی حکمت بھی بیان کر دی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتلا دیا گیا کہ یہ لوگ اگر آپ کی نبوّت پر اِیمان نہیں لاتے تو اپنا انجام خراب کرتے ہیں، آپ کی نبوّت پر تو خدا بھی گواہ ہے، اور خدا کے فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

ہم نے (کچھ آپ کو انوکھا رسول نہیں بنایا جو ایسی واہی تباہی فرمائش کرتے ہیں، بلکہ) آپ کے پاس (بھی ایسی ہی) وحی بھیجی ہے جیسی (حضرت) نوح (علیہ السلام) کے پاس بھیجی تھی، اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس (بھیجی تھی) اور (ان میں سے بعضوں کے نام بھی بتلا دیتے ہیں کہ) ہم نے (حضرات) اِبراہیم اور اِسماعیل اور اِسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں) اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے پاس وحی بھیجی تھی اور (اسی طرح) ہم نے داؤد (علیہ السلام کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، چنانچہ ان) کو (کتاب) زَبور دی تھی، اور (ان کے علاوہ) اور (بعضے) ایسے پیغمبروں کو (بھی) صاحبِ وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل (سورۂ انعام وغیرہ مکی سورتوں میں) ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور (بعضے) ایسے پیغمبروں کو (صاحبِ وحی بنایا) جن کا حال (ابھی تک) ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام کو بھی صاحبِ وحی بنایا، چنانچہ ان) سے اللہ تعالیٰ نے خاص خاص طور پر کلام فرمایا (اور) ان سب کو (ایمان پر) خوشخبری (نجات کی) دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے (آنے کے) بعد کوئی عذر (ظاہراً بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی اشیاء کا حسن وقبح عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا، پھر ہماری کیا خطا) اور (یوں) اللہ تعالیٰ پورے زور (اور اِختیار) والے ہیں (کہ بلا اِرسالِ رُسل بھی سزا دیتے تو بوجہ اس کے کہ مالکِ حقیقی ہونے میں منفرد ہیں، ظلم نہ ہوتا، اور درحقیقت عذر کا حق کسی کو نہ تھا لیکن چونکہ) بڑے حکمت والے (بھی) ہیں (اس لئے حکمت ہی اِرسال کو مقتضی ہوئی، تا کہ ظاہری عذر بھی نہ رہے، یہ بیانِ حکمت درمیان تبعاً آ گیا تھا، آگے اِثبات نبوّتِ محمدیہ کر کے جواب کی تکمیل فرماتے ہیں، کہ گو وہ اپنے اس شبہ کے رفع ہونے پر بھی نبوّت کو تسلیم نہ کریں) لیکن (واقع میں تو ثابت ہے اور اس کے ثبوت پر دلیلِ صحیح قائم ہے، چنانچہ) اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجا بھی (کس طرح) اپنے علمی کمال کے ساتھ (جس سے وہ کتاب معجزۂ عظیمہ ہوگئی جو کہ نبوّت کی دلیل قاطع ہے، ایسی کتاب معجز کے ذریعہ سے آپ کی نبوّت کی) شہادت دے رہے ہیں (یعنی دلیل قائم کر رہے ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ کتابِ معجز نازل فرمائی اور اِعجاز دلیلِ نبوّت ہے، پس دلیل سے تو واقع میں نبوّت ثابت ہے، رہا کسی کا ماننا نہ ماننا تو اوّل تو اس کا خیال ہی کیا) اور (اگر طبعاً اس کو جی ہی چاہتا ہو تو ان سے افضل مخلوق یعنی) فرشتے (آپ کی نبوّت کی) تصدیق کر رہے ہیں، (اور مؤمنین کی تصدیق مشاہد ہی تھی، پس اگر چند حمقاء نے نہ مانا نہ سہی) اور (اصل بات تو وہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت (یعنی اقامت دلیل فی الواقع) کافی ہے (کسی کی تصدیق وتسلیم کی آپ کو حاجت ہی نہیں) جو لوگ (ان حجِ قاطعہ

کے بعد بھی) منکر ہیں اور (طرّہ یہ کہ اوروں کو بھی) خدائی دِین سے مانع ہوتے ہیں (حق سے) بڑی دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں (یہ تو دُنیا میں ان کے مذہب کا حاصل ہے، اور اس کا ثمرہ آخرت میں آگے سنو کہ) بلاشبہ جو لوگ (حق کے) منکر ہیں اور (حق سے مانع بن کر) دُوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوائے جہنم کی راہ کے اور کوئی راہ (یعنی جنت کی راہ) دِکھلائیں گے اس طرح پر کہ اس (جہنم) میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کریں گے، اور اللہ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے (کچھ سامان نہیں کرنا پڑتا)۔

معارف و مسائل

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ اس سے معلوم ہوگیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے، اور انبیائے سابقین علیہم السلام پر جیسے وحیٔ اِلٰہی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی، تو جس نے اُن کو مانا اِس کو بھی ضرور ماننا چاہئے، اور جس نے اِس کا اِنکار کیا گویا اُن سب کا منکر ہوگیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل اِبتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی، گویا اوّل حالت محض اِبتدائے تعلیم کی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہوکر اس قابل ہوگئی کہ ان کا اِمتحان لیا جائے، اور فرمانبرداروں کو اِنعام اور نافرمانوں کو سزا دِی جائے، چنانچہ انبیائے اُولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی سے شروع ہوا، اور وحیٔ اِلٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر بھی اوّل عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔

خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام سے پہلے حکمِ اِلٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی، اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہوچکی اور لوگوں کو حکمِ خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا، تو اَب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا، اوّل حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا، اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ انبیاء کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو حضرت نوح اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دینے میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ مکہ کو پوری تنبیہ کردی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذابِ عظیم کا مستحق ہوگا۔ (فوائد علامہ عثمانی) [1]

---

[1] تفسیر عثمانی تحت هذه الآية ج:۱ ص:۳۱۶

حضرت نوح علیہ السلام کی ذات خود ایک معجزہ تھی، ساڑھے نوسو سال کی عمر آپ کو عطا کی گئی تھی، آپ کا کوئی دانت نہیں گرا تھا، نہ آپ کا کوئی بال سفید ہوا، آپ کی جسمانی طاقت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اور پوری عمر قوم کی ایذارسانی کو صبر کے ساتھ سہتے رہے۔ (مظہری)[1]

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ہیں انہیں بالاجمال ذِکر کر کے ان میں سے جو اُولوالعزم اور جلیل القدر انبیاء ہیں ان کا بطورِ خاص بھی ذِکر کر دیا گیا، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سب انبیاء ہیں، اور انبیاء کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی ہے، کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے، کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنے رسول سے بات کرتے ہیں، غرض جس طریقہ سے بھی وحی آجائے اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، لہٰذا یہود کا یہ کہنا کہ "توراۃ کی طرح لکھی ہوئی کتاب نازل ہوتب مانیں گے، ورنہ نہیں" خالص حماقت اور کفر ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے ہیں جن میں سے تین سو تیرہ اصحابِ شریعت رسول تھے۔ (قرطبی)[2]

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مؤمنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر کی مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے، سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور پیغمبروں نے راہِ حق بتلائی، تو اَب دِینِ حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا، وحیٔ اِلٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے رُوبرو کوئی حجت نہیں چل سکتی، بلکہ سب حجتیں قطع ہوجاتی ہیں، اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئی، آپ نے ان سے فرمایا: بخدا تم یقیناً جانتے ہو کہ میں خدا کا برحق رسول ہوں۔ انہوں نے اس کا اِنکار کر دیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوگئی: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ[3] جس میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کتابِ معجز کے ذریعہ سے جو اس کے علمی کمال کا مظہر ہے آپ کی نبوّت پر گواہ ہے، اس نے یہ جان کر کتاب نازل کر دی ہے کہ آپ اس کے اہل ہیں، اور فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں، اور علیم وخبیر ذات کی شہادت کے بعد پھر کس دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔

---

۱ تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۲۷۵

۲ وكذا في المستدرك للحاكم رقم الحديث:۴۱۲۶ باب ذكر نبي الله وروحه إلخ وتفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۶ ص:۱۹

۳ دلائل النبوة للبيهقي رقم الحديث:۷۸۶ باما جاء في دخول عبدالله بن سلام رضي الله عنه۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ منکر ہیں، اور تورات میں جو آپ کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو چھپاتے ہیں، اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دینِ حق سے باز رکھتے ہیں، سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہوگی نہ ہدایت۔ جس سے خوب معلوم ہوگیا کہ ہدایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں منحصر ہے، اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے، اس سے یہودیوں کے سب خیالات کی تغلیط کر دی گئی۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ط

اے لوگو! تمہارے پاس رسول آچکا ٹھیک بات لے کر تمہارے ربّ کی، سو مان لو تاکہ بھلا ہو تمہارا،

وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ اللّٰهُ

اور اگر نہ مانوگے تو اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور ہے اللہ

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

سب کچھ جاننے والا حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر آگئے ہیں۔ اب (ان پر) ایمان لے آؤ، کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اور اگر (اب بھی) تم نے کفر کی راہ اپنائی تو (خوب سمجھ لو کہ) تمام آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، اور اللہ علم اور حکمت دونوں کا مالک ہے ﴿۱۷۰﴾

ربطِ آیات

یہودیوں کے اعتراضات کا جواب اور نبوّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کے اِثبات کے بعد اَب تمام جہان کے انسانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر ایمان لے آؤ۔

خلاصہ تفسیر

اے تمام (جہان کے) لوگو! تمہارے پاس یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سچی بات (یعنی سچا دعویٰ، سچی دلیل) لے کر تمہارے پروردگار (جل شانہٗ) کی طرف سے تشریف لائے ہیں سو (مقتضا اثبات دعویٰ بالدلیل الصحیح کا یہ ہے کہ) تم (ان پر اور جو جو یہ فرماویں سب پر) یقین رکھو (جو پہلے سے یقین لائے ہوئے ہیں وہ اس پر قائم رہیں، اور جو نہیں لائے اب اختیار کرلیں) یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (کیونکہ نجات ہوگی) اور اگر تم منکر ہوگئے تو (تمہارا ہی نقصان ہے، خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) خدا تعالیٰ کی (تو) ملک ہے یہ سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں (موجود ہے (تو ایسے بڑے عظیم الشان مالک، قادر کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہو، مگر اپنی خیر منالو) اور اللہ تعالیٰ (سب کے ایمان وکفر کی) پوری اطلاع رکھتے ہیں (اور دُنیا میں جو پوری سزا نہیں دیتے تو اس لئے کہ) کامل حکمت والے (بھی) ہیں (وہ حکمت اس کو مقتضی ہے)۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ

اے کتاب والو! مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو اللہ تعالیٰ کی شان میں مگر پکی بات،

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ

بے شک مسیح جو ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلام ہے جس کو ڈالا مریم کی طرف

وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا

اور رُوح ہے اس کے ہاں کی، سو مانو اللہ کو اور اس کے رسولوں کو، اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس بات کو چھوڑ و بہتر ہوگا

لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي (وقف لازم)

تمہارے واسطے، بے شک اللہ معبود ہے اکیلا، اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ

ع ۲۳

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور کافی ہے اللہ کارساز۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے اہلِ کتاب! اپنے دِین میں حد سے نہ بڑھو، اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو محض اللہ کے رسول تھے، اور اللہ کا ایک کلمہ تھا جو اس نے مریم تک پہنچایا، اور ایک رُوح تھی جو اسی کی طرف سے (پیدا ہوئی) تھی، لہٰذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور یہ مت کہو کہ (خدا) تین ہیں۔ اس بات سے باز آجاؤ، کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اللہ تو ایک ہی معبود ہے، وہ اس بات سے بالکل پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، اور سب کی دیکھ بھال کے لئے اللہ کافی ہے۔ ﴿۱۷۱﴾

ربطِ آیات

ماقبل کی آیات میں یہود کو خطاب تھا اور انہی کی گمراہیوں کی تفصیل ذِکر کی گئی، اس آیت میں نصاریٰ کو خطاب ہے اور ان کی بداعتقادی اور خدا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے باطل خیالات کی تردید کی گئی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اہلِ کتاب! (یعنی انجیل والو!) تم اپنے دِین (کے بارے) میں (عقیدۂ حقہ کی) حد سے مت نکلو اور خداتعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو (کہ نعوذ باللہ وہ صاحبِ اولاد ہے، جیسا بعض کہتے تھے اَلْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ یا وہ مجموعۂ آلہہ کا ایک جزو ہے جیسا بعض کہتے تھے: اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ اور بقیہ دو جز ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے اور ایک حضرت جبریل علیہ السلام کو، جیسا آیت آئندہ ۱۷۲ میں وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ کے بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے، اور بعضے حضرت مریم علیہا السلام کو جیسا اِتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ سے معلوم ہوتا ہے، یا وہ عین مسیح ہے جیسا بعض کہتے تھے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ غرض یہ سب عقیدے باطل ہیں) مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ (پیدائش) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) مریم تک (حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے) پہنچایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں (کہ اس جان کو حضرت مریم کے جسم میں بواسطہ نفخ حضرت

جبریل علیہ السلام کے پہنچا دیا تھا، باقی نہ وہ ابن اللہ ہیں، نہ تین میں کے ایک ہیں، جیسا عقائد مذکورہ میں لازم آتا ہے) سو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (اور وہ موقوف ہے توحید پر، پس توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ (خدا) تین ہیں (مقصد منع کرنا ہے شرک سے اور وہ سب اقوالِ مذکورہ میں مشترک ہے، اس شرک سے) باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا (اور توحید کے قائل ہو جاؤ کیونکہ) معبودِ حقیقی تو ایک ہی معبود ہے (اور) وہ صاحبِ اولاد ہونے سے منزّہ ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں سب اس کی ملک ہیں (اور ان کا منزّہ اور مالک علی الاطلاق ہونا دلیل ہے توحید کی) اور (ایک دلیل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں (اور ان کے سوا سب کارسازی میں ناکافی ومحتاج الی الغیر اور ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتے ہیں، اور یہ کفایت صفاتِ کمال سے ہے، اور صفات کا کمال لوازمِ اُلوہیت سے ہے، جب وہ غیر اللہ میں منتفی ہے پس اُلوہیت میں بھی منفی ہے، لہٰذا توحید ثابت ہے)۔

معارف ومسائل

وَ كَلِمَتُهٗ اس لفظ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ ہیں، مفسرین نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں:-

۱- امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کارفرما ہوتے ہیں، ایک عامل نطفہ ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمہ "کُنْ"، فرمانا جس کے بعد وہ بچہ وجود میں آجاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں چونکہ پہلا عامل منتفی ہے، اس لئے دوسرے عامل کی طرف نسبت کرکے آپ کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے[1]، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مادّی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف کلمہ "کُنْ" سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچا دیا جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آگئی۔

۲- بعض نے فرمایا کہ "كَلِمَةُ اللهِ"، "بَشَارَةُ اللهِ" کے معنی میں ہے، اور مراد اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اللہ جل شانہٗ نے فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ کی جو بشارت دی تھی اس میں "کلمہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے: اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ۔

۳- بعض نے فرمایا "كَلِمَة" آیت اور نشانی کے معنی میں ہے، جیسا کہ دوسری جگہ یہ لفظ آیت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے: وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا۔

[1] روح المعانی تحت هذه الآية ج:٤ ص:٣٢٦

وَرُوْحٌ مِّنْهُ اس لفظ میں دو باتیں قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''رُوح'' کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور دُوسرے یہ کہ اللہ جل شانہٗ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے اس نسبت کا کیا مطلب ہے؟

اس سلسلہ میں مفسرین کے متعدّد اقوال منقول ہیں:-

۱- بعض نے فرمایا: عرف کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شے کی طہارت اور پاکیزگی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو مبالغہ کے لئے اس پر ''رُوح'' کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں چونکہ کسی باپ کے نطفہ کا دخل نہیں تھا، اور وہ صرف اللہ جل شانہٗ کے ارادہ اور کلمہ ''کُنْ'' کا نتیجہ تھے، اس لئے اپنی طہارت و نظافت میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو ''رُوح'' کہا گیا، اور اللہ کی طرف نسبت اُن کی تعظیم و تشریف کے لئے ہے، جس طرح مساجد کی تعظیم کے لئے اُن کی نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے ''مساجد اللہ'' یا کعبہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے ''بیت اللہ'' کہا جاتا ہے، یا کسی اطاعت شعار بندہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے ''عبداللہ'' کہا جاتا ہے، چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے: اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ۔

۲- بعض حضرات نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مردہ دِلوں میں رُوحانی حیات ڈال کر پھر زندہ کر دیں، چونکہ وہ رُوحانی حیات کا سبب تھے جس طرح رُوح جسمانی حیات کا سبب ہوا کرتی ہے، اس لئے اس اعتبار سے ان کو ''رُوح'' کہا گیا، جیسا کہ خود قرآنِ کریم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ: ۵۲) کیونکہ قرآنِ کریم بھی رُوحانی حیات بخشتا ہے۔

۳- بعض نے فرمایا کہ رُوح کا استعمال راز کے معنی میں ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی عجیب و غریب پیدائش کی وجہ سے چونکہ اللہ جل شانہٗ کی ایک نشانی اور راز تھے، اس لئے انہیں ''رُوح اللہ'' کہا گیا۔

۴- بعض نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اور اصل عبارت یوں تھی: ''ذُوْ رُوْحٍ مِّنْهُ'' اور چونکہ ذی رُوح ہونے میں سب حیوان برابر ہیں، اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کا امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ان کی نسبت اللہ جل شانہٗ نے اپنی طرف کر دی۔

۵- ایک قول یہ بھی ہے کہ رُوح، نفخ (پھونک) کے معنی میں ہے، حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں اللہ کے حکم سے پھونک دیا تھا، اور اسی سے حمل قرار پا گیا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور معجزہ کے صرف نفخ سے پیدا ہو گئے تھے اس لئے آپ کو ''رُوح اللہ'' کہا گیا، قرآنِ کریم کی دُوسری آیت: فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (التحریم: ۱۲) سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدّد احتمالات بیان کئے گئے ہیں، بہر حال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اللہ کا ایک جز ہیں، اور یہی رُوح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اِنسانی شکل میں ظاہر ہوگئی ہے۔

لطیفہ

علامہ آلوسیؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک نصرانی طبیب نے حضرت علی بن الحسین واقدی سے مناظرہ کیا، اور ان سے کہا کہ تمہاری کتاب میں ایسا لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جزو ہیں، اور دلیل میں یہ آیت پڑھ دی جس میں وَرُوْحٌ مِّنْهُ کے الفاظ ہیں۔ علامہ واقدی نے ان کے جواب میں ایک دُوسری آیت پڑھ دی وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: ۱۳) (اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی اللہ سے ہے، اور مِّنْهُ کے ذریعہ سے سب چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کردی گئی ہے) اور فرمایا کہ وَرُوْحٌ مِّنْهُ کا اگر مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جزو ہیں تو اس آیت کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ کا جزو ہے؟ یہ جواب سن کر نصرانی طبیب لاجواب ہوا اور مسلمان ہوگیا۔[1]

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ جن بڑے بڑے فرقوں میں تقسیم تھے، تثلیث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اُصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عین خدا ہیں، اور خدا ہی بشکلِ مسیح دُنیا میں اُتر آیا ہے، دُوسرے فرقہ کا کہنا یہ تھا کہ مسیح ابن اللہ ہے، اور تیسرا فرقہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے، باپ، بیٹا، مریم۔ اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے، دُوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ رُوح القدس کو اقنومِ ثالث کہتا تھا، غرض یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالثِ ثلاثہ تسلیم کرتے تھے، اس لئے قرآنِ کریم میں تینوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی، اور نصاریٰ پر یہ واضح کردیا گیا ہے کہ حق ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مسیح (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا شدہ اِنسان اور خدا کے سچے رسول ہیں، اس سے زیادہ جو کچھ کہا جاتا ہے سب باطل اور لغو ہے، خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے، یا اِفراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں، یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآنِ کریم نے بے شمار آیات میں ایک طرف تو نصاریٰ اور یہود کی گمراہی کو واضح کیا، اور دُوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ رفیع اور عند اللہ ان کے مقامِ اعلیٰ کو واضح فرمایا ہے، تاکہ اِفراط وتفریط کے کج راہوں میں سے حق کا معتدل راستہ نمایاں ہوجائے۔

---

[1] روح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۳۲۷

عیسائی عقائد اور ان کے مختلف پہلوؤں پر اور اس کے بالمقابل اسلام کی حقانیت پر اگر تفصیلی معلومات حاصل کرنا ہوں تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی مشہورِ عالم کتاب ''اِظہارُ الحق'' کا مطالعہ کریں، جس کا عربی سے ترجمہ مع شرح و تحقیق[۱] حال میں دار العلوم کراچی نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۱۷۱) یعنی آسمان اور زمین میں اُوپر سے نیچے تک جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کہیئے اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کارسازی کے لئے وہی کافی اور بس ہے، کسی دُوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلایئے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہوسکتی ہے؟

خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اُس کی ذاتِ پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کی حاجت، جس سے معلوم ہوگیا کہ مخلوقات میں کسی کو خدا کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو اِیمان اور عقل دونوں سے محروم ہے۔

دِین میں غلو حرام ہے

(قولہ تعالیٰ) لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ اس آیت میں اہلِ کتاب کو غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا، ''غلو'' کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، اور اِمام جصّاصؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں فرمایا:-

اَلْغُلُوُّ فِي الدِّيْنِ هُوَ مُجَاوَزَةُ حَدِّ الْحَقِّ فِيْهِ۔[۲]

''یعنی دِین کے بارے میں غلو یہ ہے کہ دِین میں جس چیز کی جو حد مقرّر کی گئی ہے اس سے آگے نکل جائے۔''

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں کو اس حکم کا مخاطب اس لئے بنایا گیا کہ غلو فی الدین ان دونوں میں مشترک ہے، اور یہ دونوں فرقے غلو فی الدین ہی کے شکار ہیں، کیونکہ نصاریٰ نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے اور ان کی تعظیم میں غلو کیا، اُن کو خدا، یا خدا کا بیٹا، یا تیسرا خدا بنا دیا، اور یہود نے ان کے نہ ماننے اور رَدّ کرنے میں غلو کیا، ان کو رسول بھی نہ مانا، بلکہ معاذ اللہ ان کی والدہ ماجدہ مریم بتول پر تہمت لگائی اور ان کے نسب پر عیب لگایا۔

چونکہ غلو فی الدین کے سبب یہود و نصاریٰ کی گمراہی اور تباہی مشاہدہ میں آچکی تھی، اس لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو اس معاملہ میں پوری اِحتیاط کی تاکید فرمائی، مسندِ احمد میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی

---

[۱] بائبل سے قرآن تک (ناشر)

[۲] احکام القرآن للجصاص، سورة النساء، باب إستتابة المرتد ج:۵ ص:۱۷۵

روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔

''میری مدح و ثنا میں ایسا مبالغہ نہ کرو جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے معاملہ میں کیا ہے، خوب سمجھ لو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس لئے تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہا کرو۔''

(اس روایت کو بخاری اور ابن مدینی نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح السند قرار دیا ہے)[1]

خلاصہ یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہوں، میرا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس سے آگے بڑھانا کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں مجھے شریک قرار دے دو، یہ غلو ہے، تم نصاریٰ کی طرح کہیں اس غلو میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اور یہود و نصاریٰ کا یہ غلو فی الدین صرف انبیاء ہی کی حد تک نہیں رہا، بلکہ انہوں نے جب یہ عادت ہی ڈال لی تو انبیاء علیہم السلام کے حواریین اور متبعین اور ان کے نائبین کے مقابلہ میں بھی یہی برتاؤ اختیار کرلیا، رسول کو تو خدا بنا دیا تھا، رسول کے متبعین کو معصوم کا درجہ دے دیا، پھر یہ بھی تنقید و تحقیق نہ کی کہ یہ لوگ حقیقۃً انبیاء کے متبع اور ان کی تعلیم پر صحیح طور سے قائم بھی ہیں یا محض وراثۃً عالم یا شیخ سمجھے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ان کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو خود بھی گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کو اور بڑھاتے تھے، دِین اور تدین ہی کی راہ سے ان کا دِین برباد ہوگیا، قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کی اس حالت کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (التوبۃ:۳۱) یعنی ان لوگوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی معبود کا درجہ دے دیا، اس طرح رسول کو تو خدا بنایا ہی تھا، اتباعِ رسول کے نام پر پچھلے مذہبی پیشواؤں کی بھی پرستش شروع کردی۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی اُمتوں کے دِین کو دِین ہی کے نام پر برباد کردیا ہے، اسی لئے ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو اس وباءِ عظیم سے بچانے کے لئے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

حدیث میں ہے کہ حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رَمیٔ جمرات کے لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کرلائیں، انہوں نے متوسط قسم کی کنکریاں پیش کردیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: ''بِمِثْلِھِنَّ بِمِثْلِھِنَّ'' یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رَمی کرنا چاہئے، پھر فرمایا:-

---

[1] مسند احمد، مسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، رقم الحدیث:۳۹۸، وصحیح البخاری، کتاب الأنبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم إلخ ج:۱ ص:۴۹۰

اِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّيْنِ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي دِيْنِهِمْ۔ [1]

''یعنی غلو فی الدین سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پہلی اُمتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک وبرباد ہوئیں۔''

اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوئے:-

فوائدِ مُہمّہ

اوّل یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں ان کی حدِ مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی، بڑے بڑے پتھر اُٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

دُوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حدِ شرعی وہ ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے متعین فرمادی، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

تیسرے یہ واضح ہوگیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حدِ مسنون سے تجاوز کیا جائے۔

حبِ دُنیا کی حدود

ضرورت سے زیادہ دُنیا کے مال ودولت اور عیش وعشرت کی طمع اِسلام میں مذموم ہے، اور اس کے ترک کرنے کی ہدایتیں بھی قرآن میں بکثرت وارِد ہیں، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں طمعِ دُنیا اور حبِ دُنیا سے منع فرمایا وہیں اپنے قول عمل سے اس کی حدود بھی متعین فرمادی ہیں کہ نکاح کرنے کو اپنی سنت قرار دیا، اور اس کی ترغیب دی، اولاد پیدا کرنے کے فوائد اور درجات بتلائے، اہل وعیال کے ساتھ حسنِ معاشرت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو فرض قرار دیا، اپنی اور ان کی ضروریات کے لئے کسبِ معاش کو فریضۃٌ بعد الفریضۃ فرمایا، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور مزدوری کی لوگوں کو تاکید فرمائی، اِسلامی حکومت کا قیام اور اِسلامی نظام کی ترویج کو فریضۂ نبوّت قرار دے کر اپنے عمل سے پورے جزیرۃ العرب میں ایک نظامِ مملکت قائم فرمایا، اور خلفائے راشدینؓ نے اس کو دُنیا کے مشرق ومغرب میں پھیلادیا، جس سے معلوم ہوا کہ بقدرِ ضرورت ان چیزوں کا اِشتغال نہ حبِ دُنیا میں شمار ہے نہ حرص وطمع میں۔

یہود ونصاریٰ نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، اور رَہبانیت میں مبتلا ہوگئے، قرآنِ حکیم نے ان کی اس کج رَوی کو ان الفاظ میں رَدّ فرمایا: وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (الحدید:۲۷) یعنی ''ان لوگوں نے اپنی طرف سے رَہبانیت کے یعنی ترکِ دُنیا کے طریقے اِختیار کرلئے جو ہم نے ان کے ذمہ نہ لگائے

[1] مسند احمد، مسند عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رقم الحدیث: ۳۳۰۵

تھے، پھر جو چیزیں خود عائد کر لی تھیں ان کو پورا بھی نہ کر سکے۔''

سنت اور بدعت کی حدود

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات اور معاشرت سب ہی چیزوں میں اپنے قول وعمل سے اِعتدال کی حدود مقرّر فرمادی ہیں، اور ان سے پیچھے رہنا کوتاہی اور آگے بڑھنا گمراہی ہے، اسی لئے آپ نے بدعات اور محدثات کو بڑی شدّت کے ساتھ روکا ہے، اِرشاد فرمایا:-

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَّكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔ [۱]

''یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔''

بدعت اسی چیز کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل میں صراحۃً یا اِشارۃً موجود نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے لکھا ہے کہ اِسلام میں بدعت کو اس لئے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دِین کا راستہ ہے، پچھلی اُمتوں میں یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اِضافے کر لئے اور ہر آنے والی نسل ان میں اِضافے کرتی رہے یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دِین کیا تھا، اور لوگوں کے اِضافے کیا ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے اندر یہ بیان فرمایا ہے کہ تحریفِ دِین کے دُنیا میں کیا کیا اسباب پیش آئے ہیں، اور شریعتِ اِسلام نے ان سب کے دروازوں پر کس طرح پہرہ بٹھایا ہے کہ کسی سوراخ سے یہ وبا اس اُمت میں نہ پھیلے۔

علماء ومشائخ کی تعظیم واِتباع میں راہِ اِعتدال

ان اسباب میں سے دِین کے بارے میں تعمق وتشدّد یعنی غلو فی الدین کو بڑا سبب قرار دِیا، [۲] مگر افسوس ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر اِہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود آج اُمتِ مسلمہ اسی غلو کی بُری طرح شکار ہے، دِین کے سارے ہی شعبوں میں اس کے آثار نمایاں ہیں، ان میں سے بالخصوص جو چیز ملت کے لئے مہلک اور اِنتہائی مضر ثابت ہورہی ہے وہ دِینی مقتداؤ پیشواؤں کا معاملہ ہے، مسلمانوں کی ایک جماعت تو اس پر گئی ہے کہ مقتداو پیشوا، علماء وعرفاء کوئی چیز نہیں، کتابُ اللہ ہمارے لئے کافی ہے، جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ سکتے ہیں، هُمْ رِجَالٌ

---

[۱] سنن النسائي، كتاب صلوة العيدين، باب كيف الخطبة ج:۱ ص:۲۳۴

[۲] حجة الله البالغة ج:۱ ص:۲۲۸ تا ۲۳۰

وَنَحْنُ رِجَالٌ یعنی وہ بھی آدمی ہیں، ہم بھی آدمی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے واقف ہے نہ قرآن کے حقائق و معارف سے، نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تفسیر سے، محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگا، قرآنِ کریم کی جو تفسیر و تشریح خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلاواسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرامؓ سے منقول ہے اس سب سے قطع نظر جو بات ذہن میں آگئی، اس کو قرآن کے سر تھوپ دیا، حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلّم کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں کو پہنچا دیتے، رسول کو معلّم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف کتاب اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی بھی علم و فن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر کبھی کوئی شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا، ڈاکٹری یا طبِ یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا، انجینئری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینئر نہیں بنا، کپڑا سینے یا کھانا پکانے کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا باورچی نہیں بنا، بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم و تعلّم اور معلّم کی ضرورت سب کے نزدیک مُسلّم ہے، مگر افسوس کہ قرآن و سنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لئے کسی معلّم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں بہہ گئی کہ صرف قرآن کے مطالعہ کو کافی سمجھ بیٹھے، علمائے سلف کی تفسیروں اور تعبیروں کو اور ان کے اِقتداء و اِتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔

دُوسری طرف ایک بھاری جماعت مسلمانوں کی اس غلو میں مبتلا ہوگئی کہ اندھا دھند جس کو چاہا اپنا مقتدا اور پیشوا بنالیا، پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی، نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتدا اور پیشوا بنا رہے ہیں، یہ علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اُترتا ہے یا نہیں؟ اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے مخالف تو نہیں؟ شریعتِ اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طریقۂ کار یہ بتلایا کہ کتاب اللہ کو رِجالُ اللہ سے سیکھو، اور رِجالُ اللہ کو کتابُ اللہ سے پہچانو، یعنی قرآن و سنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعہ پہلے ان لوگوں کو پہچانو جو کتاب و سنت کے علوم میں مشغول ہیں، اور اُن کی زندگی کتاب و سنت کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے، پھر کتاب و سنت کے ہر اُلجھے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر و تشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو، اور ان کا اِتباع کرو۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ

مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ فرشتوں کو جو مقرّب ہیں،

وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ﴿١٧٢﴾

اور جس کو عار آوے اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا،

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُم

پھر جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے انہوں نے اچھے تو ان کو پورا دے گا اُن کا ثواب اور زیادہ دے گا

مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ

اپنے فضل سے، اور جنہوں نے عار کی اور تکبر کیا سو ان کو عذاب دے گا

عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

عذاب دردناک اور نہ پاویں گے اپنے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

مسیح کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھ سکتے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں، اور نہ مقرّب فرشتے (اس میں کوئی عار سمجھتے ہیں)۔ اور جو شخص اپنے پروردگار کی بندگی میں عار سمجھے، اور تکبر کا مظاہرہ کرے، تو (وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ) اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کرے گا ﴿١٧٢﴾ پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے نیک عمل کئے ہوں گے، ان کو ان کا پورا پورا ثواب دے گا، اور اپنے فضل سے اس سے زیادہ بھی دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے (بندگی کو) عار سمجھا ہوگا اور تکبر کا مظاہرہ کیا ہوگا، تو ان کو دردناک عذاب دے گا، اور ان کو اللہ کے سوا اپنا کوئی رکھوالا اور مددگار نہیں ملے گا ﴿١٧٣﴾

خلاصہ تفسیر

(نصاریٰ خواہ مخواہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اِلٰہ یا جزوِ اِلٰہ بنا رہے ہیں، خود حضرت) مسیح (کی یہ کیفیت ہے کہ سکونتِ ارض کی حالت میں تو ان کا اقرار عبدیت جو کہ مُبطلِ اُلوہیت ہے، مشہور اور سب کو معلوم ہی ہے) لیکن اب بھی سکونتِ سماء کی حالت میں کہ سکونتِ ارض سے ارفع اور مظنہ تعلّی کا ہے، یا قیامت تک وہ جس حالت میں ہوں ان سے کوئی

پوچھ کر دیکھے اس حالت میں بھی) ہرگز خدا کا بندہ بننے سے عار (اور اِنکار) نہیں کریں گے اور نہ مقرّب فرشتے (کبھی عار کریں گے، جن میں حضرت جبریل علیہ السلام بھی ہیں، جن کو اِلٰہ کا ایک جزو مانتے ہیں، خود ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے) اور (وہ عار کریں کیسے اس عار کرنے کا ایسا بُرا انجام ہے کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو (اس کا انجام سن لو) خدا تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس (یعنی حساب کے موقع پر) جمع کریں گے پھر جو لوگ (دُنیا میں) ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے اچھے کام کئے ہوں گے (یعنی عبد بنے رہے ہوں گے، کیونکہ حاصل عبدیت کا یہی ایمان اور اَعمال ہیں) تو ان کو تو ان کا پورا ثواب (بھی) دیں گے (جو کہ ایمان اور اَعمال پر منصوص ہے) اور (اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں گے (جس کی تفصیل منصوص نہیں) اور جن لوگوں نے (عبد بننے سے) عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پاویں گے۔

معارف و مسائل

اللہ کا بندہ ہونا اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزّت ہے

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ الخ یعنی مسیح کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں، اور نہ ہی اللہ کے مقرّب فرشتوں کو عار ہے، اس لئے کہ اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزّت ہے، حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر و قیمت پوچھئے ان کو اس سے کیسے ننگ اور عار آسکتا ہے، البتہ ذِلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دُوسرے کی بندگی میں ہے، جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا، اور مشرکین فرشتوں کو بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے، سو ان کے لئے ہمیشہ کو عذاب اور ذِلت ہے۔ (فوائدِ عثمانی) [1]

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا

اے لوگو! تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے ربّ کی طرف سے سند اور اُتاری ہم نے تم پر روشنی

مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ

واضح۔ سو جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط پکڑا تو ان کو داخل کرے گا

[1] تفسیر عثمانی تحت هٰذه الآیة ج: ۱ ص: ۳۱۹

فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾

اپنی رحمت میں اور فضل میں اور پہنچادے گا ان کو اپنی طرف سیدھے راستہ پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی روشنی بھیج دی ہے جو راستے کی پوری وضاحت کرنے والی ہے ﴿۱۷۴﴾ چنانچہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اسی کا سہارا تھام لیا ہے، اللہ ان کو اپنے فضل اور رحمت میں داخل کرے گا، اور انہیں اپنے پاس آنے کے لئے سیدھے راستے تک پہنچائے گا۔ ﴿۱۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اے (تمام) لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک (کافی) دلیل آچکی ہے (وہ ذاتِ مبارک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے (وہ قرآن مجید ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ تم کو بتلایا جائے وہ سب حق ہے جن میں مضامینِ مذکورہ بھی داخل ہیں) سو جو لوگ اللہ پر اِیمان لائے (جس کے لئے توحید وتنزیہ کا اِعتقاد لازم ہے) اور انہوں نے اللہ (کے دِین) کو (یعنی اِسلام کو) مضبوط پکڑا (جس کے لئے رسول اور قرآن کی تصدیق لازم ہے) سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں (یعنی جنت میں) داخل کریں گے اور اپنے فضل میں (لے لیں گے یعنی دُخولِ جنت کے علاوہ اور بھی نعمائے عظمیٰ دیں گے جن میں دِیدارِ الٰہی بھی داخل ہے) اور اپنے تک (پہنچنے کا) ان کو سیدھا راستہ بتلادیں گے (یعنی دُنیا میں ان کو طریقِ رضا پر قائم وثابت رکھیں گے، اور اسی سے تارکِ اِیمان واعمالِ صالحہ کی حالت معلوم ہوگئی کہ ان کو یہ ثمرات نہ ملیں گے)۔

معارف ومسائل

برہان سے کیا مراد ہے؟

(قولہ تعالیٰ) قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ (رُوح)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو لفظ ''برہان'' سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ آپ کی ذاتِ مبارک اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ، آپ کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپ کی نبوّت اور آپ کی رِسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی اِحتیاج باقی نہیں رہتی، تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔

اور نور سے مراد قرآن مجید ہے (رُوح) جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (المائدۃ) یعنی ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے'' (بیان القرآن) [۱] اس آیت میں جس کو ''نور'' کہا گیا ہے آگے اسی کو ''کتاب مبین'' کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغائر کو چاہتا ہے، لہٰذا ''نور'' اور ''کتاب'' ایک چیز نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ تغائرِ عنوان کا کافی ہے، اگرچہ مصداق اور معنون ایک ہی ہے۔ (رُوح) [۲]

اور اگر ''نور'' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہو، اور ''کتاب'' سے مراد قرآن مجید ہو تو یہ بھی صحیح ہے (رُوح)، [۳] لیکن اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نورِ محض ہونا ثابت نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے، سو کہہ دے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا، اگر کوئی مرد مرگیا

لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ

اور اس کے بیٹا نہیں اور اس کے ایک بہن ہے تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑ مرا، اور وہ بھائی وارث ہے اس بہن کا اگر نہ

يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ

ہو اس کے بیٹا، پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو پہنچے دو تہائی اس مال کا جو چھوڑ مرا، اور اگر

---

[۱] بیان القرآن، سورۃ المائدۃ آیۃ:۱۵ ج:۲ ص:۱۴

[۲] روح المعانی تحت الآیۃ المذکورۃ ج:۴ ص:۴۲۸

[۳] بحوالۂ بالا۔

كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

کئی شخص ہوں اسی رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے، بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ١٧٦ؑ

تمہارے واسطے تاکہ تم گمراہ نہ ہو، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) لوگ تم سے (کلالہ کا حکم) پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کی اولاد نہ ہو، اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے آدھے کی حق دار ہوگی۔ اور اگر اس بہن کی اولاد نہ ہو (اور وہ مر جائے، اور اس کا بھائی زندہ ہو) تو وہ اس بہن کا وارث ہوگا۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو بھائی کے ترکے سے وہ دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔ اور اگر (مرنے والے کے) بھائی بھی ہوں اور بہنیں بھی، تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اللہ تمہارے سامنے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو، اور اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔ ١٧٦

ربطِ آیات

شروع سورت کے ذرا بعد میراث کے اَحکام مذکور تھے، پھر وہاں سے تقریباً ایک پارہ کے بعد دُوسرے اَحکام کے ساتھ حکمِ میراث کی طرف پھر عود ہوا تھا، اب ختمِ سورت پر پھر عود ہے اسی کی طرف، شاید تین جگہ اس کے متفرق کر دینے میں حکمت یہ ہو کہ اِسلام سے پہلے میراث کے باب میں بہت ظلم تھا، پس سورت کے اوّل میں، وسط میں، آخر میں اس کے ذِکر فرمانے سے مخاطبین کو اِہتمامِ بلیغ اس باب میں مفہوم ہوگا، جس سے وہ بھی زیادہ اِہتمام کریں۔

خلاصۂ تفسیر

لوگ آپ سے (میراثِ کلالہ کے باب میں یعنی جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت کرتے ہیں، آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے (وہ یہ ہے کہ) اگر کوئی شخص مر جائے جس کی

اولاد نہ ہو (یعنی نہ مذکر، نہ مؤنث اور نہ ماں باپ ہوں) اور اس کے ایک (عینی یا علاتی) بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی بعد حقوقِ متقدمہ اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو اس کو دیا جائے گا، ورنہ پھر اسی پر رَدّ ہو جائے گا) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہوگا اگر (وہ بہن مر جائے اور) اس کے اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر (ایسی) بہنیں دو (یا زیادہ) ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے (اور ایک تہائی عصبہ کو، ورنہ بطور رَدّ کے انہی کو مل جائے گا) اور اگر (ایسی میّت کے جس کے نہ اولاد ہے نہ والدین خواہ وہ میّت مذکر ہو یا مؤنث) وارث چند (یعنی ایک سے زیادہ ایسے ہی) بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو (ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دُہرا، بہن کو اِکہرا، لیکن عینی بھائی سے علاتی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں، اور عینی بہن سے کبھی وہ ساقط ہو جاتے ہیں، کبھی حصہ گھٹ جاتا ہے، جس کی تفصیل کتبِ فرائض میں ہے) اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم (ناواقفی سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو تذکیر و احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (پس اَحکام کی مصلحتوں سے بھی مطلع ہیں اور اَحکام میں ان کی رعایت کی جاتی ہے، یہ حکمت کا بیان ہے)۔ [1]

معارف و مسائل

فوائدِ مُہمّہ

۱- قولہ تعالیٰ یَسْتَفْتُوْنَكَ ۚ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ۚ اس جگہ کلالہ کے حکم اور اس کے سببِ نزول بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ جیسا پہلے وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ (النساء:۱۷۰) فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہلِ کتاب کا حال ذِکر فرمایا تھا، ایسے ہی اِرشاد: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ اِلخ (النساء:۱۷۵) کے بعد اَصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطریق تمثیل ذِکر فرمایا، تاکہ وحی سے اِنحراف کرنے والوں کی گمراہی اور بُرائی اور وحی کا اِتباع کرنے والوں کی حقانیت اور بھلائی خوب سمجھ میں آجائے۔

۲- اسی کے ذیل میں دُوسری بات یہ بھی ظاہر ہوگئی کہ اہلِ کتاب نے تو یہ غضب کیا کہ ذاتِ اقدس سبحانہ وتعالیٰ کے

---

[1] یہ خلاصۂ تفسیر ''بیان القرآن'' سے مأخوذ ہے، اور وہاں یہ عبارت اسی طرح ہے، مگر راجح قول کی بنا پر کلالہ ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ میّت کی ماں اس کی وفات کے وقت زندہ نہ ہو، بلکہ اگر ماں زندہ ہو تو بھی میّت کلالہ ہوسکتا ہے، چنانچہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۲ کی تفسیر میں جو صفحہ: ۳۷۳ پر اسی جلد میں گزری ہے ''ماں'' کا لفظ موجود نہیں ہے، لہٰذا راجح قول کی بنا پر یہ لفظ یہاں بھی نہ ہونا چاہئے، یہاں یہ لفظ لکھنے میں بظاہر ''بیان القرآن'' میں تسامح ہوا ہے، لہٰذا اِعتماد اس تفسیر پر کیا جائے جو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۲ کے ذیل میں ذِکر کی گئی ہے۔ محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۲۹/۳/۱۴۲۴ھ

لئے شریک اور اولاد جیسے شنیع اَمر کو اپنا اِیمان بنالیا اور وحیٔ اِلٰہی کا خم ٹھونک کر خلاف کیا، اور اَصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے کہ اُصولِ اِیمان اور عبادات تو درکنار معاملاتِ جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متجسس اور منتظر رہتے ہیں، اور ہر اَمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتے ہیں، اپنی عقل اور خواہش کو حاکم نہیں سمجھتے، اگر ایک دفعہ میں تشفی نہ ہوئی تو مکرّر حاضرِ خدمت ہوکر دریافت کرتے ہیں ؎

''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا'' [۱]

اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی بلا حکمِ وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے، اگر کسی امر میں حکمِ وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزولِ وحی کا اِنتظار فرماتے، جب وحی آتی تب حکم فرماتے۔ نیز اِشارہ ہے اس طرف کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہلِ کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں تھی جو بوقتِ حاجت اور حسبِ موقع متفرق نازل ہونے میں ہے، کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اس صورت میں سوال کرسکتا ہے، اور بذریعہ وحیٔ متلو اس کو جواب مل سکتا ہے، جیسا کہ اس موقع میں اور قرآن مجید کے بہت سے مواقع میں موجود ہے۔ اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافتِ ذِکرِ خداوندی و عزّتِ خطابِ حق عز و جل ایسے فخرِ عظیم پر مشتمل ہے جو کسی اُمت کو نصیب نہیں ہوا، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾ (البقرۃ)۔ جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے، اور اِختلاف کے موقع میں جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق وحی نازل ہوگئی قیامت تک ان کی خوبی اور نیک نام باقی رہے گا۔ سو کلالہ کے متعلق سوال و جواب کا ذِکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اِشارہ فرمادیا۔ (فوائدِ عثمانی) [۲]

تَمَّتْ سُوْرَةُ النِّسَآءِ وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ

جلد دوم تمام شد

---

[۱] ترجمہ:- راستے کے تفاوت (فرق) کو دیکھئے کہاں سے کہاں تک ہے۔

[۲] تفسیر عثمانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص: ۳۲۱، ۳۲۲

تفسیر معارف القرآن میں قرآنِ کریم کی سورتوں کی فہرست